

مطبع کریمی پریس لاہور بیرون موری دروازہ سرکلر روڈ باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر انور علی خان پبلشر سے شائع ہوا

Shabab i Urdu





جلد ۱۷ نمبر ۴ بابت ماہ جنوری ۱۹۲۹ء عیسوی

شذرات

(۱) جناب ادیب - سید اشفاق حسین صاحب مالک جالون والے بی اسٹور جامع مسجد دہلی کا مشکور ہے جنہوں نے اسے سلطانہ ڈائری برائے حساب خانہ داری عنایت فرمائی ہے۔ یہ کارآمد ڈائری سلطانہ بیگم مالکہ جالون والے بی اسٹور خانہ داری ڈپو کے ایما اور مشورہ سے تیار ہوئی ہے۔ اس ڈائری کے صفحے مثل کتب کاغذ کے ورق کی طرح ہیں گویا بازاری ڈائریوں کے برعکس لمبائی اور چوڑائی میں چار حصہ ہیں۔ فہرست مضامین یہ ہے۔ جنتری سنہ ۱۹۲۸ء جنتری سنہ ۱۹۲۹ء۔ معلومات محکمہ ڈاک۔ معلومات محکمہ تار۔ ریلوے قواعد اور پرچہ جات جنتری سود بحساب شرح ماہواری و سالانہ ہندوستانی و انگریزی سالے۔ کارآمد باتیں مثل ہدایتیں نقشہ فہرست ملازمان تنخواہ ملازمان۔ سبزی ترکاری و روزنامچہ و کرایہ ان کے علاوہ تاریخ لکھنے ہیں اس قسم کی جنتری ہم نے پہلے نہیں دیکھی۔ طباعت دیدہ زیب ہے۔ قیمت مجلد دو روپے چار آنہ بلا جلد دو روپے (تک) ہے۔ خانہ داری ڈپو سے مل سکتی ہے

---

(۲) جناب خواجہ کمال الدین صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی کے نام نامی سے دنیا واقف ہے آپ فرقہ احمدی کی طرف سے مبلغ اسلام ہیں۔ احمدیوں سے بعض مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی اختلاف ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ جو خدمت اسلام اس فرقہ سے ظہور میں آئی ہے وہ [illegible] ہے مثل ترجمہ قرآن مجید زبان انگریزی۔ حیات رسول مقبول زبان انگریزی اور یورپ و افریقہ میں اشاعت اسلام یہ کل کارنامے ہیں۔ خواجہ کمال الدین کو اگر اردو میں تبلیغ کا حریص کہا جائے تو بجا ہے۔ آپ نے کئی عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں آپ کی تازہ تصنیف [illegible] ہے جس میں فیوضات سورہ فاتحہ درج ہیں اور دلکش پیرایہ میں دکھایا گیا ہے۔ کہ قرآنی دعائیں ہمارے انسانی معاشرت۔ اقتصاد۔ اخلاق اور روحانیات پر کیا اثر ہے۔ کتاب ہر پہلو سے قابل قدر اور لائق ہے۔ قیمت ساڑھے چار آنہ ہے۔ مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل لاہور سے دستیاب ہو گی۔

(رسالہ سلطانہ اسسٹنٹ ایڈیٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شباب اردو

عجیب سیر

لائق علی جب تک مفلس رہا پابند صوم و صلوٰۃ تھا۔ جب تک قلاش رہا عبادت گزار دیندار تھا۔ یکایک زمانے نے رنگ بدلا اور وہ دولتمند ہوگیا۔ منعم ہو کر اس کی کایا پلٹ گئی۔ اب وہ سنگدل اور بے رحم کاہل داری اور بدعادت شرابی عیاش اور بدکار رہا۔ ہر وقت کچھ گھوڑے کی خرمستی رہتی تھی جو لوگ پہلے اسے مفلسی میں دیکھا تھا اب اسے پہچان نہ سکتے تھے۔ وہ چہرہ جو یاد الٰہی کے زمانہ میں نورانی تھا اب اس پر پھٹکار برستی تھی۔ سچ ہے عیاشی سے قلب ماہیت ہو جاتی ہے انسان آدمیت کھو کر وہ حیوان بن جاتا ہے۔ چہرہ کا روپ جاتا رہتا ہے۔ دل میں جتنے اٹھتے ہیں اور روح مرجھا کر پھول کی طرح کملا جاتی ہے۔

ایک رات وہ معمول سے زیادہ پی گیا اور بدمستی کی حالت میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ مہتہ رلے میو ہسپتال کے پھاٹک کے سامنے جا کھڑا ہوا کہ جہاں چار سڑکیں ملتی ہیں۔ اسے آگے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی

اور قدم اٹھانے کو جی نہ چاہتا تھا کہ ایک ٹانگہ دکھائی دیا جو وہاں سکھ کے باغ کے برج کے نزدیک کھڑا تھا۔ اس بارہ بج چکے تھے۔ ایک کامل تھا رات کی تاریکی نے اندھیر مچا رکھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی تھی۔ ہو کا عالم تھا۔ ہاں کسی کسی وقت اُلو کی ہوک سنائی دیتی یا کچھ فاصلہ پر کتے بھونک رہے تھے۔ شاید تاریکی میں انہیں بلائیں اور ڈائنیں نظر آرہی تھیں۔ اس وقت ٹانگے کا موجود ہونا انوکھی بات تھی لیکن لائق علی کو اس وقت غور اور خوض کی فرصت یا مجال نہ تھی وہ نشہ میں مست تھا اور ہوا کے گھوڑے پر سوار وہ لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ ٹانگے کے قریب گیا۔ دفعتاً اسے معلوم ہوا کہ سیاہ پوش کوچوان دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یک بیک لائق علی کا سر چکرانے اور جی مالش کرنے لگا اور کلیجہ میں تشنج کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گرم سلاخ لوہے سے اُسے داغ رہا ہے۔ اسوقت کسی نامعلوم طاقت نے اُسے کشاں کشاں ٹانگہ میں بٹھا دیا اور تشنج کے رفع ہونے میں اُس نے دیکھا کہ ٹانگے کا روغن سیاہ تھا۔ گھوڑے کا رنگ مشکی تھا۔ کوچوان کا لباس کالا تھا۔ اور کوچوان کی وردی سرمئی تھی کوچوان نے سخت کرخت اور گونج دار آواز میں پوچھا کہ کہاں لے چلوں۔ تو لائق علی کے منہ سے جو اس وقت نشے میں تھا۔ بیساختہ نکلا "جہنم میں" اس وقت اس کے دل میں درد اُٹھا۔ درد کئی قسم کا ہوتا ہے۔ ایک درد سے بدن میں ٹیسیں پڑنے لگتی ہیں۔ ایک درد جسم کو چیرتا ہے۔ ایک درد سے مقام درد میں جلن اور سوزش کی وجہ سے انسان بے حال ہو جاتا ہے۔ یہ درد آخرالذکر قسم کا درد تھا جس سے لائق علی بیتاب اور اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ پہلے تو یہ درد عارضی تھا اور صرف ایک لمحہ میں نابود ہو گیا۔ ٹانگہ سرپٹ جا رہا تھا۔ گھوڑے کو پر لگے ہوئے تھے اور لائق علی کی نیم باز آنکھیں عجیب وغریب نظارے دیکھ رہی تھیں۔ وہ سمجھے ہوئے تھا کہ کوچوان اسے جانتا ہے اور اسے گھر کی طرف لیجا رہا ہے مگر کیسا گھر اور کہاں کی جائے سکونت ہر چند کہ ٹانگہ اُڑا جا رہا تھا اور تیزی رفتار کی وجہ سے ہچکولے لے رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کسی دیوار یا درخت سے ٹکرا کر چکنا چور ہونے کو ہے مگر عرصہ گذر گیا اور گھر نہ آیا۔ گھبرا کر لائق علی نے کڑک کر کہا او کوچوان کیا تیرے دماغ میں خلل ہے ابے او سرپھرے کہاں جا رہا ہے کیا تو چاہتا ہے کہ میری ہڈیاں سرمہ ہو جائیں۔ کوچوان نے جواب میں غرا کر کہا کہ سڑک کی مرمت ہو رہی ہے۔ اس لئے دوسری راہ سے چکر کاٹ کر جا رہا ہوں

کوچوان کی آواز میں کچھ اس قسم کا تحکم تھا کہ لائق علی مرعوب ہو کر خاموش ہو گیا مگر پھر ایک لمحہ اور صرف ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں بڑی شدت سے درد اٹھا اور اس نے کہا کہ یہ احمق ناحق چکر لگائے اور روپے ضائع کرے۔ میں تو صرف ایک گھنٹہ کا کرایہ دوں گا۔ اس سے زیادہ ایک کوڑی بھی اسے نہیں ملے گی۔ اس اثنا میں اسے یہ معلوم ہوا کہ کوئی اسکی طرف رومال ہلا کر اسی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ غور سے دیکھا تو وہ ٹبی بازار کی مشہور رقاصہ تھی۔ اور وہ گاڑی سری سے قدم روانستہ اسی طرف کہ جدھر ٹانگہ دوڑ رہا تھا۔ جا رہی تھی۔ لائق علی کو اس بازاری سے نفرت تھی۔ اسے دیکھ کر وہ خوش ہوا مگر جب ٹانگہ اس کے قریب آیا تو گھوڑے نے ایک دولتی ماری جس سے ٹانگہ میں زلزلہ آگیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ رقاصہ دور پیچھے رہ گئی اور پھر نظروں سے غائب ہو گئی۔ لائق علی نے چاہا کہ کوچوان کو آڑے ہاتھ لے مگر گالی اس کے ہونٹوں میں رک گئی اس وقت اسے لاہور کا ایک چھٹا ہوا گرگا جو اسکا یار غار تھا اور سایہ کی طرح قمار خانوں میں اس کے ساتھ رہتا تھا اور جسے بادہ خوار اور رند گسار اپنا پیر و مرشد اور شہر کے عیاش اپنا گرو گھنٹال سمجھتے تھے۔ اسے دکھائی دیا وہ بھی اسی سڑک پر دوڑا جا رہا تھا لائق کو دیکھ کر چلایا کہ چلو چلو گھبراؤ نہیں ہم سب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمیں بھی پہنچا جاؤ۔ بس اتنی آواز آئی تھی کہ ٹانگہ اس سے دور نکل گیا۔ اس کے بعد شہر کے نامی لچے اور شہدے جو اس کے ہم نشین تھے اسے دکھائی دیئے۔ یہ سب کے سب بھی اسی سڑک پر بھاگ رہے تھے گویا سب کی منزل مقصود ایک ہے۔ انہیں دیکھ کر اسے تسکین تو ہوئی مگر ٹانگہ کی تیز رفتار اسے سخت پریشان کر رہی تھی ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ ایک بات واقعی عجیب تھی اور وہ یہ تھی۔ کہ اس دوڑ میں اسے جسے دیکھا وہ مغموم۔ مایوس اور خوفزدہ معلوم ہوتا تھا۔ اور لطف یہ تھا کہ سب کے سب ایک ہی طرف جا رہے ہیں اور تیز قدمی سے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی حالت سے اس پر بھی اثر کیا۔ اور وہ بھی خوفزدہ ہو گیا۔ اب گھوڑا ہانپ رہا تھا اور پسینہ پسینہ ہو گیا تھا مگر پھر بھی اسی تیزی کے ساتھ جا رہا اور پچھلی ٹانگوں پر پچھاڑے مار رہا اور قدم بقدم بڑھ رہا تھا کہ اچانک اس نے ایک پیر مرد دیکھا جس کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب تھی مگر جوانی کا جن ابھی تک سر پر سوار تھا۔ اسی نے لائق علی کو بزم عیش و عشرت کا راستہ دکھایا تھا اس نے اسے

وام عاشقی میں پھنسا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرایا اور ہاتھ سے اشارہ کہا کہ ہاں بڑھے چلو یہ ٹڈا سٹرک پر چلتا نہ تھا یہ حشرات الارض کی طرح رینگ رہا تھا۔ جب تانگہ اس ٹڈے کے قریب آیا تو گھوڑے نے خطرناک چھلانگ ماری اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اسکے لائق علی کو ایسا جھٹکا لگا کہ وہ کانپ گیا۔ اس اثنا میں اسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک سیاہ سایہ خود بخود اس کے چہرے پر نمودار ہو کر اس کی آنکھوں کی طرف آرہا ہے اور قریب ہے کہ اُسے بصارت سے محروم کر دے۔ ساتھ ہی دل میں وہی درد اٹھا اور جاں معدوم ہو گیا۔ جب درد اٹھتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی لوہے کی گرم سرخ سلاخ سے اس کے دل اور جگر کو داغ دیتا ہے۔ اس نے دہل کر اپنے اس ہاتھ میں تھمی چابک تانگے کی طرف بڑھا دیا اور اسے یقین ہو گیا کہ تمام سیاہ دھبہ وہم تھا۔ مگر تو اس کا چہرہ خوف سے سکڑنے لگا کیونکہ وہ ان تمام کو موت سمجھتا تھا

انگڑائی بھی پھر رہا ہے ساتھ جا رہا تھا۔ وقت صرف اتنا تھا کہ کوچوان اب کچھ بول رہا تھا اور اس کی آواز میں ایک عجیب سوز اور ترنم تھا۔ اور یہ ترنم اسی قسم کا تھا کہ جس کا حال ہم نے انگریزی ناولوں میں پڑھا ہے جو بحری چڑیلوں کی آواز میں پیدا ہو کر بدقسمت اہل جہاز کو تباہی کے گرداب میں پھنسا دیتا ہے۔ اس ترنم کے ساتھ ان آوازوں کی گنگناہٹ موجود تھی جو اس نے راہ میں سنی تھیں اور جو اب دور پیچھے رہ گئی تھیں۔ ناگاہ اسے معلوم ہوا کہ تانگے کی چھت سے کوئی چیز اسے گھور رہی ہے۔ اور اس کی طرف جھانک رہا ہے مگر چہرے پر تحسب آزردگی اور بدحواسی طاری ہے۔ اسے خدا۔ اسے خدا۔ لائق علی کی والدہ مرحومہ کا چہرہ تھا۔ عالم بے اختیاری میں اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور اب اس نے دیکھا کہ تانگہ شہر اور آبادی سے باہر جنگل اور ویرانہ میں دوڑ رہا ہے۔ سب تاریکی تاریکی آگے سے کئی درجہ بڑھ گئی ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا اور تمام علامات وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ وہ بھی تاریک ہیں مگر اس تاریکی میں بھی وہ صورتیں جو یکے بعد دیگرے اس نے دیکھی تھیں برابر دوڑ رہی ہیں۔ گویا ان صورتوں کا نقشہ بدل گیا ہے یعنی رواں اب پہلے کی طرح جوان اور حسین اور چھیل چھبیلی نہیں رہیں۔ رنگ ہوائی عارضہ سیاہ ہو گیا ہے نرم گال زرد ہیں اور جھک گئے ہیں۔ ہونٹوں کی لالی جاتی رہی ہے۔ دانتوں میں کیڑا لگ کر کھوکھلے ہیں۔ وہ ہنستا ہوا چہرہ سکڑ رہا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے کلیجہ تھامے ہوئے دوڑ رہی ہے

چاہتی ہے کہ ٹھہر جائے مگر ٹھہر نہیں سکتی اس کے پیچھے پیچھے وہی تمام صورتیں جو راہ میں ملی تھیں سب پیران نود سالہ ہیں۔ سب کی پیٹھ خم ہے۔ منہ میں دانت نہیں۔ پیٹ میں آنت نہیں چہرہ اداس ہے۔ دل میں وسواس ہے۔ منہ کچھ بڑبڑا رہے ہیں مگر چونکہ بولے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ سب یکساں گلیوں رہ کر جانب اسٹیشن دوڑ رہے ہیں چاہتے ہیں کہ کسی طرح ٹھہر جائیں مگر ٹھہرنا ناممکن اور طاقت سے باہر ہے دفعتاً پھر اس کے دل میں وہی درد اٹھا اور پھر والدہ مرحومہ کا چہرہ تانگہ کی چھت پر سے جھانکنے لگا مگر اس دفعہ وہ چہرہ دھندلا تھا۔ لائق علی نے چاہا کہ تانگہ سے کود پڑے۔ مگر دوڑتے ہوئے تانگہ سے کودنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ آخر اس نے چلا کر کہا کہ کوچوان سردار آگے مت جاؤ۔ ٹھہر جاؤ مگر کوچوان نے شعلہ فشاں آنکھوں سے دیکھ کر کہا کہ صاحب میں ٹھہر نہیں سکتا مجھے ٹھہرنے کا حکم نہیں اور یہ بات خلاف معمول و دستور بھی ہے۔ مگر لائق علی نے کڑک کر کہا تجھے ٹھہرنا ہوگا اور اٹھ کر اسے مکا مارنے کی کوشش کی کوچوان نے بے پروائی سے قہقہہ لگایا اور کہا صاحب۔ میں ٹھہر نہیں سکتا۔ جس گھر میں تم نے جانے کو کہا تھا وہاں جانا ہوگا۔ اس راہ میں ٹھہرنا ناممکن ہے۔ لائق علی نے مکا مارنے کو ہاتھ اٹھایا تھا مگر ابھی کوچوان کے قریب ہاتھ نہ گیا تھا کہ اس کی انگلیاں شل ہو گئیں۔ وہ بیقرار ہو کر چپ رہ گیا۔ اب تانگہ کی چھت سے پھر ایک چہرہ اسکی طرف جھانکنے لگا۔ اس نے غور سے دیکھا تو یہ اس کا اپنا چہرہ تھا۔

اس موقعہ پر اس کی روح کی کوئی نہانی طاقت جو ابھی تک آلائش سے پاک تھی گو پژمردہ تھی مگر زندہ تھی۔ اور برانگیختہ ہو گئی۔ اس کی قوت ارادی عہد سے جاگ اٹھی۔ اسے ماں کا چہرہ پھر دکھائی دیا۔ اب وہ بالکل دھندلا نہ تھا

وہ پھر کڑک کر بولا کہ کوچوان تجھے ٹھہرنا ہوگا۔ میں جو کہتا ہوں کہ ٹھہرنا ہوگا۔ یہ کہہ کر اس نے باگیں اس کے ہاتھ سے کھینچ لیں۔ اس میں غیر معمولی توانائی پیدا ہو گئی۔ تانگہ لڑکھڑایا ہلا اور اسکی رفتار کم ہو گئی۔ وہ درد جو اس کے دل کو سرد گرم ہونے سے مانع رہا تھا اس وقت کام آیا اس سے اس کی ہمت دوبالا ہو گئی۔ قوت ارادی میں بس کوئی [illegible] کر اسکی آواز آئی مگر وہ عمل پیرا ہوئے۔ لائق علی کا قاعدہ تھا کہ ارادہ کا پکا تھا۔ اس نے باگیں زور سے کھینچیں

جس سے اُس کے ہاتھوں کا چمڑا کاغذ کی طرح پھٹ گیا آخر ٹانگہ انہیں قدموں پر ٹھہر گیا اور یکایک ٹھہرنے سے لائق علی گر کر منہ کے بل کیچڑ میں جا پڑا۔ گرتے گرتے اُس نے دیکھا کہ گھوڑا اور کوچوان لڑھک کر ایک غار میں جا پڑے اور غائب ہو گئے جس میں شب یلدا کی تاریکی تھی اور بحر ظلمات کی گہرائی۔ پھر جب وہ اٹھا تو وہ ٹانگے کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ ناچار وہ اپنے آپ کو اور ٹانگے کو بصد مشکل کھینچتا اور گھسیٹتا چڑھائی پر روشنی کے رُخ لے گیا۔ اور جب اس نے روشنی کی روح افزا جھلک دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال کے ایک کمرہ میں پلنگ پر دراز ہے۔ ایک گھنٹہ ہوا جب وہ سڑک پر بیہوش ہو کر گرا تو لوگ اسے اٹھا کر ہسپتال لے آئے تھے۔

چیف اڈیٹر (خان احمد حسین خان)

کوہ منصوری

مبارک اللہ کوہ منصوری تیری رعنائیاں   تیرے پرتو سے رخ مہتاب ہیں زیبائیاں
صبحدم برق تبسم کی قیامت زائیاں   یاد آتے ہی سرکیوں نے لگیں انگڑائیاں

جسے دیکھا تجھ کو پھر وہ اور کا گاہک نہیں
تو پہاڑوں کی ہے ملکہ اس میں کوئی شک نہیں

میرے احساسات کو بیدار تو نے کر دیا   عقل پر رہ کار کو وجدان سا رہبر دیا
حس دیما فکر دی اور نطق کا جوہر دیا   روح جس پی چھک گئی لبریز وہ ساغر دیا

عشق کی سرمستیاں ہیں جس کا افسانہ ہے
دل نئے توحید کا چھلکا ہوا پیمانہ ہے

میری محنت کا مٹایا دل سے رنج بیش و کم   تیرے استقلال نے بخشی رہنمائی دمبدم
قطرہ رن آتی راہ میں ہوتے ہیں ارباب ہمم   ڈگمگا اٹھتے جہاں ہیں اہل تعقل کے قدم

موم سے بھی نرم چلنے ہو گئے پتھر کے
ایک اشارے میں ترے عقدے کھلے اقدیر کے

یہ ترا حسن و جمال اور یہ ترا اوج کمال　　　آسماں جھک جھک کے پڑھتا ہے کتاب [illegible]
کہہ سکے توصیف تیری یہ بشر کی کیا مجال　　　ناطقہ سر در گریباں ہے زباں خامہ لال

سر دلستان حقیقت کیا ہے تیری ماہیت
ایک خاموشی تری اور لاکھ درس معرفت[1]

سازِ فطرت کا عجب تو نغمۂ خاموش ہے　　　دیدہ و دل کیلئے جام مئے سرجوش ہے
میکدہ معمور ہے اور شور نائو نوش ہے　　　جسکو جتنا ہوش ہو آتا ہی وہ مدہوش ہے

گلشن فردوس کی تجھ سے ہوائیں مست ہیں
تیرے جلوے مست ہیں تیری ادائیں مست ہیں

قدرتِ صانع کی تو اک مجسم شان ہے　　　ماہ وشوں کی جاں ہو عشاق کا ایماں ہے
بے نہ عارف ہیں اک جہاں سیطوفاں ہی　　　ذوق کی انتہا کی ہر گھڑی ساماں ہے

گرچہ عالم ہے ترے ضبط کے آئینوں کے
بیخودی میں راز سربستہ زباں پر آئیں کے

اللہ اللہ وہ ترے دلکش مناظر کی بہار　　　گھری گھری گھٹائیں گنگناتے آبشار
شام کو رنگ شفق سے ہر طرف گلگوں دیار　　　اور سحر کو قطرۂ شبنم کا پھولوں پر نکھار

چار سو گلہائے خودرو کی ہیں بیساکار زباں
جسم بن گیا ہے گل فروشوں کی دکاں

وہ سنہری دھوپ اس پر گھٹا چھائی ہوئی　　　پیچ و خم راہوں کی جیسے زلف بل کھائی ہوئی
آسماں پر کہکشاں تکتی ہے شرمائی ہوئی　　　لو ستاروں کی نظر پڑتی ہے للچائی ہوئی

ہر طرف پھیلا ہوا ہے ایک عالم نور کا
تیرے سینے میں یہاں سایہ ہے کوہ طور کا

---

[1] اس رباعی کی طرف اشارہ ہے جو مصوری کے ر[illegible] ہوئی

ہے تمام کا [illegible] دم محو ہے ساحل　　　[illegible] سکوت کا [illegible]
فطرت کی موسیوں میں کونائی ہے　　　[illegible] مطار سر [illegible]

جو گل ہے ترا وہ حور کا رخسارہ ہے　　جلوۂ سرشار تیرا حسبِ نظارہ ہے
تو سراپا حسن ہے اور حسن کا گہوارہ ہے　　دیدۂ انجم میں تجھ سے نور اے مہ پارہ ہے

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی　　(داغ)
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

وہ ترا ساحل موسم معتدل آب و ہوا　　کیسا ہی بیمار آیا آتے ہی پائی شفا
دکھ گیا اور سکھ ملا اسے کافر سحر نما　　ایک اثر لیکن تڑپتا تھا تڑپتا ہی رہا

دردمندانِ محبت کا کوئی چارہ ہے کوئی
اے مسیحا میرے غم کا کوئی مداوا ہے کوئی

(اثر)

مداری کی بیوی

"بندہ پرور!" بوڑھے مداری نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اس میں کیا دھرا ہے؟ صرف عادت اور مشق کی بات ہے۔ طبیعت کا رجحان اس فن کی جانب ہونا چاہیئے اور ذرا گرفت مضبوط ہونا چاہیئے بس۔ مگر ان سب کے علاوہ زیادہ تر مستقل مزاجی اور مشق کی ضرورت ہے۔ روز مرہ کی مشق۔ سالہا سال کی جی توڑ اور صبر آزما مشق۔"

اس کی سادگی اور انکساری پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ مجھے ہزاروں مداری اور شعبدہ بازوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ خواہ ایسے ہی ہوں۔ ہاتھ کی صفائی کی تعریف میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیں [illegible] یہ لکھنا ہے کہ اس بوڑھے کی پاک ایک ہی بیچارا اُن کے لئے دھوکا ہے۔ میں نے اکثر [illegible] اپنے [illegible] بازاری کھیل تماشوں بابت تہوار کے موقعوں پر امیروں کی کوٹھیوں پر [illegible] دکھلاتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے مخصوص فن میں ماہر تھا۔ کسی عورت کو لکڑی کے تختے [illegible] کھڑے کر دیا اور دور سے چھریاں پھینک پھینک کر عورت کے جسم کے گرد [illegible] کے درمیان۔ سر کے اطراف۔ بازوؤں کے موڑ پر گلے کے [illegible] چھریوں کا

ایک آہنی جاگہ بنا دیا۔ اس کام میں کوئی غیر معمولی خوبی نہیں ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ اس فن کے چند نکات سے آپ واقف ہو جائیں۔ یہ چھریاں مطلق تیز نہیں ہوتیں اور نیم سے کچھ دور تختہ پر آسانی سے گڑ جاتی ہیں۔ ہاں اگر کوئی امر قابل توجہ ہے تو چھریاں پھینکنے کی تیزی۔ سپید چمکدار پھلوں کی دل دھڑکا دینے والی برق آسا چمک۔ اور ہوا میں اُن کا وہ جاں گسل خم جو وہ اپنے زندہ ہدف کی طرف جاتے وقت بناتی ہیں۔ بس یہ باتیں ہیں جو اس محض معمولی ہنر کو ہیبت ناک شکل دے کر قابل ذکر بنا دیتی ہیں

لیکن اس بوڑھے مداری کے کھیلوں میں کوئی چال کوئی فریب۔ کوئی آنکھ میں دھول ڈالنے والا معاملہ نہ تھا۔ سارا کام نہایت سنجیدگی اور دیانتداری سے بتلایا جاتا رہا۔ اس کی چھریاں استروں کی مانند تیز تھیں اور وہ آہنی تختے میں گوشت سے بالکل نزدیک [illegible] کرتا تھا انگلی کے نیچے نیچے زاویوں کے درمیان اس کی چھریاں جاکر گڑ جاتی تھیں۔ سر کی اطراف ایک درخشاں ہالہ تیار ہو جاتا تھا اور گلا چھریوں کے آہنی گلوبند سے مزین ہو جاتا تھا اور کسی شخص کو اس فولادی شکنجہ سے بلا اپنی رگیں کاٹے اور خون بہائے بچ نکلنا غیر ممکنات سے تھا۔ سب سے قابل توجہ بات جو تماشے کی دقتوں اور مداری کے کرشموں میں اضافہ کرتی تھی۔ یہ تھی کہ کھیل کے وقت اس کی آنکھوں پر موٹی موم جامے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

یہ کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی کہ سامعین کے ہجوم میں سے بہت کم لوگ اس کے کام کو سمجھ سکتے تھے۔ کیونکہ عام لوگ اُسے معمولی سڑکوں پر کھیلنے والے بازاری مداریوں سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ تعصب ہاری ہیں آنکھوں میں پٹیاں باندھنا بات محض معمولی سی بات ہو کر رہ گئی ہے اور ہر فرد اپنے دل میں مطمئن رہتا ہے کہ اس میں کوئی نہایت معمولی سی چال ہوتی ہے جو اس کے سمجھ میں نہیں آتی۔

"مداری ہمیں بڑا احمق تصور کر رہا ہے" لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ "بھلا اندھا دیکھے کہ وہ اس قدر صحیح نشانہ لے سکتا ہے؟"

اس کا خیال تھا کہ ہم جانتے ہیں [illegible] اسے نہیں [illegible] ہوتا گیا جو اور سے مطلوبہ نظر میں آئے اور [illegible] یہ راز اس ماہر کام کے لئے بنا گیا ہوگا

کام ترک کر لیے تھے۔ لیکن وہ اکثر اس بات سے قدر کرتا تھا کہ لوگ اُس کے نقاب کا کھوکھلی معائنہ کرلیں مگر اس طرح لوگوں کے دلوں کو تسکین دینا ایک امر محال تھا۔ کیونکہ لوگ آپس میں کانا پھوسی کرکے نقاب دکھانا آپ کو ارا نہ کرتے تھے۔ حالانکہ "ہاں ہاں دیکھ لیا ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے" کے الفاظ لے ساتھ وہ اس کو ایسا کر دیتے تھے۔ مگر دروازے کے ملحق ہوتے ہی آپس میں بالکل مختلف قسم کی گفتگو شروع ہو جاتی تھی۔ "ارے تم نے دیکھا۔ اس کا نقاب تو بالکل حالت سے خالی نہیں۔ اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے۔ وہ دیکھاوا اس کا نتیجہ ہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی صفائی اور وفا داری ہماری سمجھ میں نہ آسکے"۔

غور سے مطالعہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کو حسرت و یاس کے ڈھانچے میں ایک دروسر ۔۔۔ بست بہاں ہے۔ مجھے اطمینان کامل تھا کہ یہ بوڑھا کسی شخص کو فریب دینے کے لئے میں ۔۔۔ اور جب مجھے اس سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے نہایت صاف اور کھلے الفاظ میں ۔۔۔ اپنے خیالات کا اظہار ۔۔۔ کر دیا۔ اور اُس کے ہنر کی اس حد تک تعریف کی جسکا کہ میں واقعی اسے مستحق سمجھتا ہوں۔ میرے تحسین آمیز کلمات اور اس سے کہیں زیادہ میری منصف مزاجی سے وہ بہت متاثر ہوا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں اسقدر جلد گہرے دوست بن گئے۔ اس نے نہایت خلوص دلی اور انکساری سے اپنے ہنر کے انتہائی راز کا انکشاف ۔۔۔ سمجھنے سے یکسر قاصر ہے چند الفاظ میں کر دیا۔ وہ زبردست راز وہ اصلی حقیقت ۔۔۔ ان سیدھے سادے الفاظ پر مشتمل تھی

"فارغ البالی اور روز مرہ کی مشق ۔۔۔ سالہا سال کی متواتر مشق"

اس کی طبیعت ۔۔۔ نے کیا سمجھا ۔۔۔ لگا جس میں نے نہایت سادگی سے اس سے کہا کہ "تم کو میں فریب دینے کے قابل تصور ہی نہیں کرتا"

"ہاں" اس نے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ ہاں۔ ناقابل۔ بالکل ناقابل۔ ایک بڑی حد تک ناقابل ۔۔۔ جس کا تصور تک آپ کے لئے دشوار ہے۔ آہ کیا میں آپ کو اس ناقابلیت کا حال بتلاؤں؟ ۔۔۔ مگر ۔۔۔ کیا فائدہ"۔

اس کے چہرے پر ایک گہری اُداسی چھا گئی اور اُس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں آنسوؤں کے

بڑے بڑے قطروں سے پر ہو گئیں لیکن میری ہمت نہ پڑی کہ میں اس کے دل کی [illegible] کو پوچھوں۔ جذبات کے اُٹھتے ہوئے تلاطم کو دبانے کی کوشش میں میں خاموش بیٹھا تھا۔ مگر میری خاموشی سے ہزارہا [illegible] گھونٹ سے بکتے اور اس لئے کہ تشنہ رہتے تھے جو سوالات کرنے کی خواہش سے میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ سوالات جس میں مداری کے عمیق راز ان کو عبور کرنے کا اضطراب نہاں تھا جن کا حوالہ اس نے ابھی ابھی مجھے دیا تھا۔ کچھ دیر مجھے تاکنے کے بعد اور میری بیقراری کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے آخر میں اس نے خود کہا۔

"ہاں [illegible] لیکن اسے بتلانے میں کیا حرج ہے۔ آپ میری باتوں کو سمجھ سکیں گے"

"اور پھر یکلخت نہایت غضبناک ہو کر۔ کیا تم وہ کمبخت لو [illegible] ہی گئی [illegible]"

"کون؟" میں نے اس کے لہجہ کی تعبیر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون؟ میری بیوفا بیوی [illegible]" اس نے وہی لہجہ قائم رکھتے ہوئے جواب دیا۔ میری بیوی

آہ عورت [illegible] آ [illegible] کر جہاں کی عورت ہے۔ اُف بس یہ سمجھیے کہ انسانی لباس میں ایک شیطان ہے۔ بلکہ شیطان سے کہیں بدرجہا بدتر۔ آہ چڑیل۔ ڈائن۔ تجھے خدا سمجھے [illegible] آہ [illegible] آپ کیا جانیں؟ ہاں

اُس نے میری اس [illegible] کو [illegible] کر لیا۔ وہ میرا [illegible] ہے ـــ اور یہی وجہ ہے کہ میں اُس سے اس درجہ [illegible] رکھتا ہوں ـــــ۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ مجھ سے بیوفائی کی ہے ـــ مگر [illegible] ہوتا ہے اور وفا میں درگذر رہی ہے۔ [illegible] مگر وہ اس سے بڑھ کر [illegible] جرم سے بھی کئی ہیں ـــ ہاں کبھی نہیں معاف کر سکتا ـــــ آہ [illegible] گنہگار جاری ہے ـــ"

مداری کا [illegible] ایک تصویر۔ اس کے [illegible] آلود مگر مضبوط ہاتھوں کی مٹھیاں کبھی بندھی اور کبھی کھلی تھیں [illegible] ایک ہلکا رنگ درد و تاثر کا بھی چڑھا ہوا [illegible]

[illegible] رات [illegible] سامنے میں [illegible] کے پیچھے سے جھک کر کھڑی ہوئی تھی اور جس کی انگلیوں کے [illegible] کے اردگرد [illegible] سے بھی زیادہ تیز چھریاں

جسم سے جو ایک زردی پر لکڑی میں یبوست کی جاتی تھیں - اس مداری کی بیوی تھی - اُس کی عمر قریب چالیس سال کی ہوگی اور یقیناً عالم شباب میں خوبصورت رہی ہوگی لیکن اس کی رفتہ رفتہ زائل ہوتی ہوئی خوبصورتی میں کچھ کرشمگی کچھ وحشی پن تھا - جو دلوں میں بجائے محبت کے دہشت بھر دیتا ہے۔

میں نے بارہا غور کیا ہے کہ جب مداری اس کے جسم سے لگی ہوئی چھری تختہ میں پیوست کرتا تھا تو وہ ایک عجیب انداز سے ہنستی تھی جو اسقدر آہستہ ہوتی تھی کہ سنائی تک نہ دیتی تھی لیکن اس ہنسی میں نہایت پُر معنی ہنسی ہوا کرتی تھی - جس سے طعنہ زنی کے آثار مترشح رہتے تھے میں نے ہمیشہ اس ہنسی کے معنی سمجھنے میں غلطی کی - میرا خیال تھا کہ یہ ہنسی اُس لاپرواہی کا ثبوت دیتی ہے جس سے وہ تختہ سے کھڑی ہوتی ہے اور اُس اٹل اعتماد کا جو اُسے پھینکنے والے کے کبھی نہ غلطی کرنے والے ہاتھ پر ہے - اس لئے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ لوٹتے مداری نے مجھ سے کہا -

"کبھی آپ نے اس کی ہنسی پر غور فرمایا ہے - اُس کی شیطانی ہنسی جس سے وہ ہمیشہ مجھ پر طعن کرتی ہے - اس کی پرولانہ ہنسی - کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میں اُسے کوئی ایذا نہیں پہنچا سکتا - کوئی نہیں حالانکہ وہ سخت ترین سزا کی مستحق ہے ___ اور میری دلی خواہش ہے کہ میں "

"نہیں - تم اسے ایذا پہنچانا چاہتے ہیں؟ آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" میں نے سوال کیا -

'توبہ - توبہ' اس نے جواب دیا - یہ بھی کوئی مشکل بات ہے جو آپ نہیں سمجھ رہے ہیں میں اسے مار ڈالنا چاہتا ہوں ___ "

'مار ڈالنا چاہتے ہو؟ اپنی بیوی کو؟' میں نے پھر پوچھا -

ہاں - ہاں - مار ڈالنا چاہتا ہوں - کیونکہ ___ کیونکہ اُس نے مجھ سے بے وفائی کی ہے نہیں نہیں - اس وجہ سے نہیں - اس جرم کے لئے میں نے اُسے معاف کر دیا - ان سب سالوں کا جو ہر شخص کو ہی سامنا کرنا پڑتا ہے - میں بھی عادی ہو گیا ہوں - میں نے اسے معاف کر دیا - لیکن ان الفاظ کے ساتھ کہ "کچھ خبردار - میں کسی نہ کسی دن تیرا گلا کاٹ ڈالوں گا یکھ اگر تو بار بار آئی تو میں تیرا جوں کر ڈالوں گا اور کسی کو سان و گمان تک بھی نہ ہوگا کہ یہ جرم میں نے

قصداً کیا ہے ۔۔۔ دیکھو میرا جرم محض اتفاق پر محمول کیا جائے گا اور بس "

" اُف - اُف " میں نے حیرت سے کہا ۔ " اور تم نے اپنی بیوی سے یہ سب کہدیا "

" ہاں - ہاں - میں نے کہدیا - ضرور کہدیا - اور مذاق سے نہیں - غصہ سے میں سمجھا تھا کہ مجھے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے - اور میں آسانی سے اس کام کو انجام دے سکتا ہوں کسقدر آسان کام تھا ؟ اس سے زیادہ اور آسان کام میرے لئے کیا ہو سکتا ہے - میرے پیشہ کا لحاظ رکھئے ۔ غور فرمائیے ۔ میرے انداز میں صرف آدھ انچ کی غلطی - بلکہ اس سے بھی کم اور اور - میں اس کی شہ رگ میں اپنا نشتر پیوست کر سکتا تھا - میرے چاقو استرے سے زیادہ تیز ہیں اور بس - جب شہ رگ ہی کٹ گئی تو ۔۔۔ پھر کیا ؟ ۔۔۔ الوداع ۔۔۔ اخون سرخ خون نہ نکلے گا - دو دو انچ دھاروں کے پُر زور فوارے اُٹھنے شروع ہوں گے اور صرف چند لمحوں کے اندر ۔۔۔۔۔ سب کچھ ہو جائے گا ۔ میں ایسا انتقام لے لونگا ۔ "

" یہ حقیقت ہے مسٹر جیمس " اس نے ایک ذرا خاموشی کے بعد پھر شروع کیا ۔

" اور اس میں میری جان کا مطلق خطرہ نہیں - صرف ایک قابل افسوس حادثہ - اس سے زیادہ اور کیا ؟ انداز کی ایک ادنیٰ غلطی - ہاتھ میں ایک خفیف رعشہ اس قسم کی روز مرہ کی غلطیاں ہیں مجھ پر آخر کسی بات کا الزام لگایا جائے گا ؟ قتل کا ؟ ہرگز نہیں - حادثہ - حادثہ محض حادثہ - یہی نہیں - لوگ مجھ پر رحم کریں گے - ترس کھائیں گے - آہ میری پیاری بیوی - میں رو رو کر سسکیاں لے لے کر کہوں گا - آہ میرے رنج و غم کی شریک - میری نصف روزی کی کیا ہوائی ۔۔۔ آہ تیرے بغیر میری زندگی کیونکر ہوگی - میرے کاموں میں میرا ساتھ کون دے گا - میرے انداز پر اتنا بھروسہ کون کرے گا - آہ - آہ - ا - اور یقین جانئے لوگ مجھ پر رحم کھائیں گے کیوں ٹھیک ہے نہ ؟ "

" ٹھیک - ٹھیک " میں نے سوا دیا ۔ " اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا "

" تو آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ یہ انتقام میرا بہترین انتقام ہو گا - انتقام جو میں دیدہ دلیری سے لے سکتا ہوں ۔۔ بے خوف ہو کر لے سکتا ہوں ۔ "

" ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے "

"یقیناً" اس نے کہا۔ "مگر اسے یہیں رہنے دیجئے۔ اب غور فرمائیے کہ جب میں نے اُسے اس قسم کی کھلی دھمکی دی ہوگی تو اس نے کیا جواب دیا ہوگا۔ آپ فراموش نہیں کر سکتے۔ کہ اس وقت میں رنج و غصہ سے دیوانہ ہو رہا تھا اور اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تیار تھا"

"اُس نے تمہاری خوشامد کی ہوگی" میں نے جواب دیا "روئی ہوگی گڑگڑائی ہوگی۔ کہا ہوگا کہ تم ہرگز ایسا نہ کرو گے۔ تم بہت نیک طینت انسان ہو"

"نہیں نہیں" اس نے بات کاٹ کر کہا "میں اتنا نیک طینت نہیں ہوں جتنا آپ خیال کر رہے ہیں۔ میں جرم کرنے سے نہیں ڈرتا۔ خون کرنے سے نہیں گھبراتا۔ میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں۔ مگر فائدہ کیا ہوگا۔ کم از کم وہ میرے حالات سے واقف ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اور ـــــ اور ـــــ جرم خصوصیت کے ساتھ آپ کو معلوم ہے"

"اور پھر بھی وہ ڈری نہیں؟"

"نہیں" مداری نے بستر پر ہاتھ ٹیکے ہوئے جواب دیا "میرے الفاظ کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میری اس پوری تقریر کو اُس نے ایک حقارت آمیز قہقہہ میں یہ کہکر گم کر دیا کہ یہ کوری دھمکی ہے۔ تم اس پر عمل نہیں کر سکتے ـــ"

وہ میرا منہ تکنے لگا اور پھر بولا۔ "اور وہ حقیقت میں ٹھیک کہتی تھی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرے لئے یہ کام کیوں ناممکن تھا؟"

"نہیں۔ کیوں نہیں؟"

"آہ۔ تو آپ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ عجب بروز اتنی آسان سی بات آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے بتلا دیا ہے کہ کس جانفشانی اور مسلسل مشق کے بعد میں نے چھریوں کو آنکھ بند کر کے پھینکنا سیکھا ہے"

"ہاں۔ پر اس سے کیا ہوا؟"

"افسوس آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس بات کو لو۔ بدبخت میری عورت تک سمجھ گئی جس کے باعث میرے لئے اس قدر مشکلات در پیش ہوئیں۔ سنیئے۔ میں نے سالہا سال مشق کی ہے۔ متواتر مشق کی ہے۔ یہاں تک کہ اب میں بغیر سمجھے بوجھے۔ بغیر [illegible] سے

کام لئے۔ چھریاں پھینکتا ہوں۔ میرا انداز اب کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ غلط اندازی اب میرے امکان سے باہر ہے۔ اگر میں غلط پھینکنا چاہوں تو میرا ہاتھ مجھے دھوکا دیتا ہے۔ میری حکم عدولی کرتا ہے۔ افسوس میں بے بس ہوں۔ غلط اندازی میرے لئے ناممکن ہے۔"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو"

"ہاں مجھے افسوس ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں حرف بحرف سچ ہے۔ کاش۔ کاش خیر۔۔۔ میں نے فی الحقیقت انتقام لینے کی کوشش کی ہے۔ انتقام۔ انتقام۔ آہ میں دن رات اس کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس کے لئے میں دیوانہ تھا۔ اور اسے اپنے لئے آسان سمجھتا تھا۔ اس چڑیل کی بیہودگی اور ناقابل معافی گستاخیوں سے تنگ آکر میں نے بارہا اُسے مار ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آہ آتش انتقام بجھانے کے لئے میں نے کیا کیا نہیں کیا۔ اپنی چھریوں کو منجھے ہوئے راستے سے صرف نصف انچ الگ پھینکنے کی کوشش میں میں نے اپنی پوری قوتیں صرف کر دی ہیں۔ صرف نصف انچ جو اسکا گلا کاٹنے کے لئے بس ہے۔ آہ میں نے خواہش کی۔ ہزار بار خواہش کی۔ کوشش کی مگر وائے قسمت بے سود۔ لاحاصل ــــ اور بدکردار عورت کی حقارت آمیز ہنسی۔ ہر وقت۔ ہر وقت۔ میرا مضحکہ اُڑاتی ہے۔ اُسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ میں اُسے ایذا نہیں پہنچا سکتا ــــ اور اسی لئے وہ ہنستی ہے اور مجھے طعنے دیتی ہے۔ اور میں واقعی اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ اُف۔ اُف"

بوڑھے مداری کے چہرے پر وحشت برسنے لگی۔ اسکی آواز بھرا گئی۔ اسکی خون کبوتر کی طرح سرخ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ بمشکل وہ اپنے جذبات پر قابو پا سکتا تھا۔ آخر اسی عالم میں اُس نے دانت پیس پیس کر کہا۔

"آہ۔ وہ مجھے خوب سمجھ چکی ہے۔ وہ میرے علم کے راز ہائے دقیق سے واقف ہے۔ وہ میری سالہا سال کی متواتر مشق کا ضروری نتیجہ جانتی ہے۔ وہ میرے دل کی عمیق گہرائیوں کی راز داں ہے۔ وہ میرے پیشہ کے باریک ترین نکات اور میری کمزوریوں کو اس حد تک سمجھی ہے کہ خود میں سمجھا ہوں۔ وہ جانتی ہے کہ میں کبھی نہ غلطی کرنے والا، کم

تمہیں بن کر رہ گیا ہوں۔ میں حسن کا ہر ہر پردہ اسی جگہ پر درست ہے۔ میں جواب میرے آخری دم تک ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بگڑ سکتی۔ تمہیں حسن کا وہ ہر وقت ہنس ہنس کر مضحکہ اُڑاتی ہے آہ وہ میرے ہستی کے سب سے زبردست راز سے واقف ہے۔ اس کا یہ جرم میں ہرگز معاف نہیں کر سکتا ——— وہ جانتی ہے کہ میں غلطی نہیں کر سکتا"

(ماخوذ)　　　　(سید ممتاز اشرف قادری)

ایک حسین جوگن

فطرت کی گلکاری تو ہے　　　گل کی پراکت ماری تو ہے
موج بادِ بہاری تو ہے　　　اک تصویر جماری تو ہے
پھر اپنا اعجاز دکھا دے
ہاں ہاں پھر وہ راگ سنا دے
پی آ ۔ پی نا ۔ کل نا ۔ آ ۓ

حسن ہے تیرا نورِ عریاں　　　سر اجلوہ صبح درخشاں
قامت دلجو فتنۂ دوراں　　　بانِ تمنا روحِ ارماں
آگ لگی ہے دل میں بجھا دے
ہاں ہاں پھر وہ راگ سنا دے
پی آ ۔ پی نا ۔ کل نا ۔ آ ۓ

ظالم صورت بھولی بھالی　　　حسن سے اپنے خود متوالی
آنکھ البیلی کالی کالی　　　لمبی لمبی پلکوں والی
حسن کو دیکھے مست بنا دے
ہاں ہاں پھر وہ راگ سنا دے
پی آ ۔ پی نا ۔ کل نا ۔ آ ۓ

حور سراپا بشکلِ انسانی　　　حسن کی ملکہ ، روپ کی رانی
کون کہے گا تجھ کو فانی　　　اُف ری نزاکت اُف ری جوانی
تو جب چاہے حشر اٹھا دے
ہاں ہاں پھر وہ راگ سنا دے
پی آ - بی لے - کل نا - آوے

شانوں پر وہ بکھرے گیسو　　　نیچی نگاہیں آنکھ میں آنسو
دست بہ سار و ساز بہ زانو　　　بیٹھ نہ یوں خاموش ابھی تو
چھیڑ وہ دھن جو دل کو ہلا دے
ہاں ہاں پھر وہ راگ سنا دے
پی آ - بی لے - کل نا - آوے

غم ہے ترے انداز سے پیدا　　　عشق حسن ناز سے پیدا
سوز ہے تیرے ساز سے پیدا　　　درد تری آواز سے پیدا
روتا ہوں میں اور رلا دے
ہاں ہاں پھر وہ راگ سنا دے
پی آ - بی لے - کل نا - آوے

ہار گلوں کا زیب گلو ہے　　　کچھ ہیں فسردہ کچھ میں بو ہے
حسن میں تیرے عشق کی بو ہے　　　حسن بھی تو ہے عشق بھی تو ہے
کون ہے تو یہ خود ہی بتا دے
ہاں ہاں پھر وہ راگ سنا دے
پی آ - بی لے کل نا - آوے

سکس (سورولی)

ضمیر کی قدر

ایک گاؤں میں ایک نوجوان سوداگر رہتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ بال گھنگریالے تھے بشاش طبیعت تھی۔ اور وہ گانے کا بہت شائق تھا۔ جوانی میں اس کو شراب پینے کی عادت تھی۔ مگر جب اس کی شادی ہوگئی تو اس نے اس بدعادت کو چھوڑ دیا:

موسم گرما میں ایک دن میلے پر جانے کا ارادہ کیا۔ اور اپنے بال بچوں اور بیوی سے اجازت چاہی۔ مگر اس کی بیوی نے اصرار کیا۔ اور کہا "آج مت جاؤ۔ کیونکہ میں نے ایک منحوس خواب دیکھا ہے" سوداگر ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا "شاید تم اس بات کی فکر کرتی ہو کہ میں میلے پر جا کر فضول خرچی کروں گا۔" بیوی نے جواب دیا۔ "خیر یہ تو میں نہیں کہہ سکتی۔ کہ کیا وجہ ہے۔ لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ میں نے ایک برا خواب دیکھا ہے۔ میں نے کیا دیکھا۔ کہ تم میلے سے واپس آ گئے ہو اور جونہی تم نے ٹوپی اتاری تمہارے سر کے بال سفید تھے۔" سوداگر پھر ہنس پڑا اور بولا۔ "یہ تو خوش قسمتی کی نشانی ہے یقین جانو کہ میں میلے پر اپنا مال نفع پر بیچ کر تمہارے لئے کئی تحفے لاؤں گا۔"

القصہ سوداگر اپنے گھر سے روانہ ہوا۔ ابھی آدھا ہی سفر طے کیا ہوگا کہ اسے ایک اور مسافر ملا جس سے کہ وہ بخوبی واقف تھا۔ دونوں نے رات کو اکٹھے ایک ہی سرائے میں قیام کیا۔ مل کر چائے پی۔ اور متصل کمروں میں آرام کیا۔ سوداگر کو عام طور پر جلدی نیند آجایا کرتی تھی۔ اور خاص کر آج کیونکہ اس نے صبح صادق ٹھنڈے ٹھنڈے سفر کرنا تھا۔ لہذا اس نے علی الصباح اپنے کوچوان کو آ جگایا اور کہا "گھوڑا تیار کرو" اور پھر خود سرائے والے سے حساب رہائش و خوراک بیباق کر کے روانہ ہوا۔ پچیس میل سفر کے بعد گھوڑوں کو آرام اور چارہ دینے کے لئے ٹھیر گیا۔ خود ایک سرائے میں اتر پڑا اور چائے وغیرہ پینے کے بعد کچھ آرام کر کے سارنگی نکال کر بجانا شروع کر دیا۔

(۲)

یکایک کیا ہوا۔ ایک گاڑی سرائے کے دروازے پر آ ٹھیری جس میں سے ایک

افسر مع دو سپاہیوں کے نیچے اترا۔ اُس نے فوراً سوداگر سے دریافت کرنا شروع کیا کہ تم کون ہو۔ اور کہاں سے آئے ہو۔ سوداگر نے اس کے سوالات کا خاطر خواہ جواب دے کر چائے پیش کی۔ لیکن افسر متواتر سوالات کی بارش کرتا رہا اور اس نے پھر پوچھا "تم رات کو کہاں تھے؟ اکیلے تھے یا کوئی اور بھی ساتھ تھا؟ اگر ساتھ تھا تو کیا تم نے اُسے صبح کو دیکھا؟ نیز اتنے سویرے روانہ ہونے کی کیا ضرورت؟ سوداگر کو بڑا تعجب ہوا کہ ان سوالات سے کیا مراد۔ مگر معقول جواب دے کر اتنا کہا "کیا آپ مجھے کوئی چور یا ڈاکو سمجھتے ہیں۔ جو ایسی باتیں پوچھتے ہیں۔ میں سوداگر ہوں۔ اور اپنے کام پر جا رہا ہوں آپ کو اس میں خلل دینے سے کیا واسطہ؟ اس پر افسر نے سپاہیوں کو بلایا اور سوداگر سے کہا۔ میں اس ضلع کا پولیس کپتان ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ جس مسافر کے ساتھ تم نے رات کاٹی وہ صبح کو قتل کیا ہوا پایا گیا۔ ہم تمہاری تلاشی لیں گے۔ بس وہ سرائے میں گھس گئے۔ بستر کھول دیا۔ اور تلاشی لینی شروع کر دی۔ یکلخت کپتان نے بستر میں سے ایک چھرا نکالا۔ اور کہا "یہ یہاں کیسے اور یہ لہو کیسا؟" سوداگر چھرا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ صرف اتنا بڑبڑایا۔ "یہ چاقو　　میرا　　میرا نہیں　　مجھے　　مجھے پتہ نہیں"۔ کپتان نے کہا۔ "چونکہ تم مقتول مسافر کے ساتھ ٹھہرے۔ رات اکٹھی گذاری تمہارے سوا اور کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ لہذا یقیناً تم ہی قاتل ہو۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم نے قتل کر کے کتنا روپیہ چرایا"۔ سوداگر بولا۔ "خدا کی قسم۔ میں نے چائے پینے کے بعد اُس مسافر کی شکل تک بھی نہ دیکھی۔ میرے پاس سوائے اپنے آٹھ ہزار روپیہ کے ایک کوڑی تک بھی نہیں۔ اور نہ ہی یہ چاقو میرا ہے"

"سوداگر کی آواز ہلکی پڑ گئی۔ چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اور اس طرح کانپنے لگا جیسے کہ ملزم وہی ہے۔ کپتان پولیس نے حکم دیا کہ سوداگر کی مشکیں باندھ کر گاڑی میں ڈال دو۔ سپاہیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اور سوداگر کا روپیہ اور اسباب لے کر اُس کے جیل خانے میں داخل کر دیا گیا۔

(۴۳)

بعد ازاں سوداگر کے چال چلن کی تصدیق کی گئی اور اس کے گاؤں سے پتہ چلا۔ کہ پہلیں میں شراب پیتا تھا مگر اب اچھے چال چلن کا آدمی ہے۔ آخر کار اُس کا قتل کے جرم میں چالان کیا گیا۔ عدالت نے اُس کو مجرم قرار دے کر جلا وطنی کی سزا دی۔ اُس کی بیوی بڑی غمزدہ تھی۔ بیچے بیچے بچے تھے۔ بچوں کو لے کر قیدخانے کے دروازے پر سپاہیوں سے اجازت چاہی کہ خاوند کو دیکھ لے۔ پہلے تو سپاہیوں نے انکار کیا۔ لیکن بعد ازاں مشکل سے منت سماجت کے لیے پر اجازت دیدی۔ بیوی نے دیکھا۔ کہ اس کا خاوند ہتھکڑی بیڑیوں میں جکڑا ہوا دیگر مجرمان کے ساتھ زمین پر پڑا ہوا ہے بیوی سے خاوند کی بُری حالت دیکھ کر رہا نہ گیا۔ بیہوشی طاری ہو گئی۔ اور دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ بڑی دیر کے بعد ہوش آنے پر اپنے بال بچوں کو لے کر خاوند کے سامنے آ بیٹھی۔ اور گھر کے حالات سے آگاہ کیا۔ بعد ازاں خاوند سے دریافت کیا۔ "بھلا تم پر یہ بجلی کیونکر گری"۔ خاوند نے بھی سارا قصہ کہہ سنایا۔ بیوی نے پوچھا۔ "تو پھر اب کیا کرنا چاہیئے"۔ خاوند بولا۔ "ہمیں بادشاہ سے رحم کی درخواست گذارنی چاہیئے" بیوی نے کہا۔ "درخواست تو میں پہلے گذار چکی ہوں لیکن نامنظور ہو گئی ہے" قیدی سوداگر نے کچھ جواب نہ دیا۔ آنکھیں نیچی کر کے رونے لگا۔

بیوی ـــــ "میرا خواب بے معنی نہ تھا۔ کیا ہی منحوس دن تھا کہ تم نے میرا کہنا نہ مانا۔ اچھا پیارے خاوند اب مجھے سچ سچ تو بتاؤ۔ کہ آیا تم نے واقعی یہ جرم کیا"۔

"اوہو تم بھی مجھ پر جرم کا شبہ کرتی ہو۔ اب میری رہائی کی کوئی امید نہیں"۔ یہ کہہ کر سوداگر زار زار رونے لگا اتنے میں سپاہی نے آکر خاوند کو بیوی سے علیحدہ کر دیا اور سوداگر نے بیوی کو آخری خیرباد کہی۔ یہ دیکھ کر کہ اسکی بیوی کو بھی اس کی صداقت پر اعتماد نہیں۔ سوداگر نے مکمل فیصلہ کر لیا کہ سوائے خدا کے اور کوئی اس راز کو نہیں جانتا خدا کی مدد کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اگر کوئی رہائی کی امید ہو سکتی ہے تو اُسی کے کرم و فضل سے ہی ہو سکتی ہے۔ لہذا اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کی ذات پاک پر چھوڑ دیا۔

نہ کوئی دیگر درخواست گذاری۔ دن رات خدا کی یاد میں مست رہتا تھا۔

(۴)

پورے چھبیس سال کا عرصہ جلاوطنی میں گذارا۔ سر کے بال برف کی مانند سفید ہو گئے داڑھی لمبی ہو گئی۔ بشاشت کا نام و نشان نہ رہا۔ کمر جھک گئی۔ آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ کم بولتا تھا۔ زیادہ تر یاد الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ حکام جیل اُس کی ہر طرح سے قدر کرتے تھے۔ قیدی اس کو صوفی کے نام سے بلاتے تھے۔ اور جب کبھی قیدیوں نے درخواست وغیرہ گذارنی ہوتی تھی۔ تو پہلے اُسے اپنا ہمراز بناتے تھے۔ جب کبھی قیدیوں میں خانہ جنگی ہوتی تھی۔ تو وہ جج قرار دیا جاتا تھا۔ اس کا فیصلہ سب بسر و چشم مانتے تھے۔ اُس کا فیصلہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ اس عرصہ دراز میں اُسے گھر سے کوئی پیغام موصول نہ ہوا۔ اتنا پتہ بھی نہ چلا کہ آیا اُس کے عیال و اطفال زندہ ہیں۔ یا مر چکے ہیں۔ آخر کار ایک دن کچھ قیدی آئے اور جب شام کو پرانے قیدی اُن سے ملے تو اُن سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک قیدی تو ہمارے سوداگر کے گاؤں کا باشندہ تھا۔ سوداگر نے نووارد قیدی سے اپنا نام لے کر دریافت کیا کہ اس سوداگر کے خاندان کا کیا ہوا۔ نووارد قیدی نے جواب دیا حالانکہ ان کے باپ کو جلاوطنی کی سزا ہو گئی مگر پھر بھی یہ خاندان فارغ البال ہے۔ خوش حال ہے۔ بعد ازاں نووارد نے پوچھا "کیوں بڑے میاں آپ یہاں کیسے آئے؟" سوداگر گھبرایا اور بات چھپانے کی کوشش کی مگر اس کے اصرار کرنے پر بولا "میں اپنے گناہوں کی وجہ سے اس سزا کا مستحق تھا"۔ نووارد نے پھر دریافت کیا "آخر تمہارے گناہ کون سے ہیں"۔ بوڑھا قیدی پھر بولا۔

"میری تقدیر میں یہاں کی خاک چھاننی لکھی تھی"۔ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا۔ مگر دوسرے قیدیوں نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس پر نووارد نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا "او۔ یہ تو بڑا عجیب واقعہ ہے"۔ قیدی پوچھنے لگے "کیوں؟ تم اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو کیا تم نے اسے کبھی دیکھا"۔ نووارد چپ سا رہ گیا۔ صرف اتنا کہا کہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہم تم پھر ایک دوسرے سے مل گئے اس پر سوداگر کو کچھ شبہ ہو گیا اور پوچھا "کیوں بھائی

کیا یہ حال پہلے تم نے کہیں سنا؟"
"یہ ماجرا ان ایام میں سہر ودولشر کی زبان پر تھا۔ عرصہ زیادہ ہو گیا ہے۔ مجھے یاد نہیں"۔
بوڑھا قیدی ۔"شاید تم نے سنا کہ قاتل کون تھا"۔
نووارد ہنس پڑا اور بولا ۔"قاتل وہی جس کے ہاں چھرا نکلا۔ جب تمہارے سرہانے چھرا رکھا گیا۔ تو کیا تم کو پتہ تک بھی نہ چلا۔ قاتل جب تک پکڑا نہ جائے اُسے قاتل نہیں کہا جاتا"۔ بوڑھے قیدی کو مکمل یقین ہو گیا کہ قاتل نووارد ہی ہے۔ ورنہ اُسے کیونکر پتہ چلا کہ چھرا اُس کے سرہانے رکھا گیا تھا۔ اُسے ساری رات نیند نہ آئی تھی نہ آئی ۔ بیوی بچوں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی ۔ اس وقت کا نقشہ بھی کھچ گیا۔ جبکہ وہ میلے پر جا رہا تھا ۔ اور بیوی نے اُسے منع کیا تھا ۔
سارنگی بجانا بھی یاد آ گیا۔ جوانی کے حالات کا پورا نقشہ بندھ گیا۔ نووارد کی حرکت پر اتنا غمزدہ ہوا کہ خودکشی پر آمادہ ہوا۔ مگر نہیں بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور جان پر کھیل جانے تک کی بھی پرواہ نہ کی۔ ٹھان لی کہ نووارد کو اس کی حرکت کا مزا چکھانا ہے نووارد کی شکل تک سے بیزار ہو گیا۔ نیند حرام ہو گئی ۔

(۵)

سوداگر ایک رات اتفاقاً جیل میں چل پھر رہا تھا کہ نووارد کو ایک سرنگ کھودتے دیکھا۔ جونہی نووارد نے بھی دیکھا۔ فوراً کہا۔ خبردار ! اگر بات کھول دی تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔ ہاں اگر چاہو تو تم بھی میرے ساتھ قید سے رہائی پا سکتے ہو"۔ قیدی سوداگر غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا ۔" مجھے قید سے بھاگ نکلنے کی آرزو نہیں اور نہ تمہیں میرے مارنے کا کوئی حق۔ تم نے تو درحقیقت مجھے آج سے چھبیس برس پہلے ہی مار دیا۔ باقی رہا یہ کہ میں یہ راز فاش کروں یا نہ ۔ یہ میری مرضی یا خدا کی مرضی"
دوسرے دن حکام جیل کو سراغ مل گیا کہ کوئی قیدی نقب لگا کر نکلنے کی فکر میں ہے ۔ تمام قیدیوں کو اکٹھا کر کے جیل کے افسر نے تفتیش شروع کر دی ۔ کوئی پتہ نہ چلا۔ جس کو

کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ راز فاش کرنے سے ڈرتے تھے۔ آخرکار افسر سوداگر قیدی سے یوں
مخاطب ہوا۔ "بوڑھے بابا! تم جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ
سچ بتاؤ کہ سرنگ کس نے کھودا" نووارد کے چہرے پر کسی قسم کی بے چینی کے آثار نہ تھے
اسی طرح کھڑا تھا جیسے کہ اس کو سرنگ کھودنا تو درکنار۔ اس کا علم تک بھی نہ تھا۔ بوڑھے
قیدی کے ہونٹوں اور ہاتھوں پر لرزہ چھا گیا۔ کچھ دیر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ سوچنے لگا
"میں ایسے آدمی کو جس نے میری زندگی تباہ کر دی۔ کیوں بتا دوں۔ وہ کئے کا پھل کیوں
نہ پائے۔ لیکن اگر راز فاش کر دیا تو اس کا کوڑوں سے کچومر نکال دیں گے۔ یہ بھی اغلب
ہے کہ میرا شبہ غلط ہو خواہ مخواہ گناہگار رہوں گا"۔ افسر جیل نے پھر کہا۔ "سچ سچ بتا دو۔
کہ سرنگ کس نے کھودا ہے۔ بڑے میاں! تم تو سچائی کے پتلے ہو۔ سچ سے کیوں دریغ
کرتے ہو"۔ بوڑھے سوداگر نے ایک بار نووارد قیدی پر نظر ڈالی اور کہا۔ "صاحب! میں
نہیں بتا سکتا۔ خدا کی مرضی نہیں کہ میں ظاہر کر دوں۔ آپ کے مزاج میں جو آئے مجھ پر
زور و جبر کریں۔ میں آپ کے ہاتھوں میں ہوں"۔ افسر نے چند بار کوشش کی مگر بے سود
اسی پر معاملہ ختم ہو گیا۔

(۶)

بوڑھا قیدی کچھ نیند کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کہ کوئی آدمی اس کے
بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ بوڑھے سوداگر نے فوراً غور دیکھ کر پہچان لیا کہ وہ نووارد ہی تھا
بوڑھے قیدی نے نووارد سے دریافت کیا۔ "کہو! کیا چاہتے ہو"۔ نووارد قیدی شرم
کے مارے بول نہ سکا۔ منہ پر خاموشی کی مہر لگ گئی۔ آخرکار بوڑھا قیدی اٹھ بیٹھا۔ اور
بولا۔ "ذرا بتاؤ تو سہی۔ کیا چاہتے ہو؟" نووارد نے بوڑھے کی طرف جھک کر دھیمی
آواز میں کہا۔ "بابا جی! اپنا جان کر معاف کر دو"۔ "معاف کس لئے؟"
"تاجر کا قاتل میں ہی بدقسمت تھا۔ میں نے ہی خون آلودہ چھرا تمہارے بستر
میں چھپایا تھا۔ میری تو یہ خواہش تھی۔ کہ تمہیں بھی قتل کر دیا جائے لیکن باہر سے کچھ آواز
سنائی دی جس کی وجہ سے میں جلدی سے چھرا تمہارے بستر میں چھپا کر کھڑکی سے

رہ حکہ ہو گیا"۔

بوڑھا قیدی خاموش تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کہا جائے۔ لووارد دو زانو بیٹھا اور بوڑھے سے دست بستہ عرض کی۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کرو۔ میں جرم کا اقبال کروں گا اور تمہاری رہائی ہو جائیگی۔ تم عیال و اطفال سے مل جاؤ گے"۔

بوڑھے قیدی نے جواب دیا۔ "یہ سب کچھ کہنا تو تمہارے لئے آسان ہے۔ لیکن تمہاری وجہ سے پورے چھبیس سال سے زندہ درگور ہوں۔ بھلا اب کہاں جا سکتا ہوں۔ میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ بچے مجھے بھول گئے ہوں گے۔ اب جانے کے لئے کوئی جگہ نہیں"۔

لووارد قیدی ہلنے نہ پایا۔ اور سر فرش پر ٹیک دیا۔

"بڑے ابا! مجھے معاف کرو جس طرح بھی ہو۔ معاف کرو۔ میرا ضمیر مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ مجھے مار پیٹ سے بھی اتنا درد کبھی نہیں ہوا۔ جتنا کہ تمہاری غمناک حالت سے رونا آتا ہے۔ میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ چین تب ہی آئے گا۔ جب تم خود مجھے دل سے معاف کر دو گے"۔ یہ کہہ کر لووارد قیدی زار و قطار رونے لگا۔

جب بوڑھے قیدی نے اس کی حالت دیکھی تو اس سے بھی نہ رہا گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ اور بولا۔ "خدا ہی تجھے معاف کر دے گا۔ کیا خبر میں تم سے بھی ہزار درجہ زیادہ گناہگار ہوں گا"۔ یہ لفظ کہہ کر اس کا دل ہلکا ہو گیا اور گھر جانے کی خواہش اس کے دل سے جاتی رہی۔ قید خانے کو چھوڑنے کی کوئی آرزو نہ رہی۔ آخری وقت کا انتظار کرنے لگا۔ لووارد قیدی نے افسر جیل سے کہہ ہی دیا۔ حالانکہ بوڑھے قیدی نے اس سے کہا تھا کہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

لووارد نے اپنے گناہ کا اقبال کر لیا۔ لیکن جب بوڑھے قیدی کی رہائی کا حکم صادر ہوا تو وہ کوٹھری میں مردہ پایا گیا

(ٹالسٹائی)

(نور احمد چودھری بی اے (امرر))

بغاوت

(افسانہ)

عزیز کلثوم کی المناک وفات کو دس روز گزر گئے تھے آخر اس کی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس کے والدین کے لئے اس کی موت ایک آندھی تھی۔ ایک طوفان تھا۔ جو ان کی زندگی کی مسرتوں کو بھی بہا کر لے گیا۔

اس غمناک طوفان عظیم کے بعد اس کے بدنصیب والدین کی زندگی بعینہ ان درختوں کے مشابہ ہوگئی جو کسی سخت آندھی اور طوفان کے باعث بالکل ننگے ہو جاتے ہیں اور جن پر پتوں اور شاخوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ان دس ایام میں اس کی والدہ اپنی حقیقی عمر سے دس سال زائد دکھائی دینے لگی۔ اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے اور چہرے کی سرخی جاتی رہی۔ اس کی آنکھیں ہر وقت کی گریہ و بکا سے سرخ انگارہ سی رہنے لگیں۔

رشید کو اپنی زندگی میں متعدد بار مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ افلاس و عسرت سے پریشان حال رہتا تھا۔ اور ضروریات نے اسکو خستہ حال و ناچار بنا رکھا تھا۔ تاہم اس کی اکلوتی بچی صرف اس کی مسرتوں کا سرمایہ اور خوشیوں کی ایک شعاع تھی۔ وہ محض اس کے لئے زندہ تھا۔ اس کی بھولی بھالی باتیں اور دلفریب ادائیں ماں اور باپ دونوں کی زندگی کو خوشگوار بنائے ہوئے تھی۔ جسے دیکھ دیکھ کر وہ جیتے تھے۔ رشید اس بچی کو اپنی قسمت کا ایک ہیرا سمجھتا تھا۔ جوں جوں اس کا سن و سال بڑھتا جاتا تھا اسی نسبت سے اسکی مسرتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ امیدوں کا ایک عالیشان قلعہ تیار کر رہا تھا۔ کلثوم اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس اسکول کو بھی اس پر فخر تھا۔ اسکول بھر میں ایسی حسین و جمیل بچی کوئی دوسری نہ تھی۔ امر مستزاد یہ کہ وہ نہایت ذہین قابل اور بہترین سیرت کی حامل تھی۔ جس کے باعث وہ تمام استانیوں اور لڑکیوں کی نگاہ میں ہر دلعزیز تھی۔ افسوس! صد افسوس!! رشید کی مسرتیں یک لخت رنج و غم

سے مل گئیں۔ امیدیں حسرتوں میں مدغم ہو گئیں۔ اور تمام تمنائیں اور آرزوئیں پامال ہو گئیں۔ اب قسمت اس کو ناشاد بنا کر دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی زندگی ایک دھندلی تاریک اور ہولناک شب یلدا کی مانند نا امیدی و نامرادی کا مخزن بن گئی۔ اس مسلسل غم کے باعث شب کو کئی گھنٹے اس کی آنکھیں نیند سے نا آشنا رہتی تھیں اور جب مضمحل دماغ تھوڑی دیر کے لئے اس کو خواب غفلت سے ہمکنار کر دیتا تو وہ جاگ اٹھتا۔ اور کلثوم کلثوم پکارنا شروع کر دیتا۔ ان ساری امیدوں اور دلاویز ارادوں کا طالب ہونا جو اس بچی کی زندگی سے وابستہ تھیں۔

اس نے مجھ سے متعدد بار کہا کہ شاید ڈاکٹر، آہ اس کی بچی کی زندگی کو بچا سکیگا لیکن وہ دس روپے اپنی فیس لئے بغیر نہیں آتا۔ کیا یہ ظالم دولت کے دیوتا رحم سے مبرا ہیں؟ اس نے اپنی تمام توجہ کو محض دولت سمیٹنے پر مرکوز کر رکھا ہے۔ کیا تم اسکو کسی نہ کسی طرح ترغیب و تحریص سے نہیں لا سکتے؟ میں اپنی عورت کے تمام زیورات فروخت کر چکا ہوں۔ کیا تم میری تجویز پر عملدرآمد کروگے؟

میں نے کہا۔ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ بالخصوص یہ ڈاکٹر اور وکلاء دولت کے رسیا ہوتے ہیں۔ ہم غریب اور گمنام لوگوں کی ہستی ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ ہم لوگوں سے بات کرنا بھی یہ عار سمجھتے ہیں

رشید نے کہا۔ "جب اس کی ماں کسی وجہ سے کھانا پکانے سے قاصر رہتی تو کلثوم خود کھانا پکاتی تھی۔ صبح کے کھانے کے بعد ہم دونوں ساتھ جاتے تھے۔ میں دفتر چلا جاتا اور وہ اپنے سکول میں جایا کرتی۔ اسکول سے واپسی کے بعد گھر میں آکر پھر وہ کام کاج میں مشغول ہو جاتی اور کام سے فارغ ہونے کے بعد رات گئے تک وہ اپنا سبق یاد کرتی رہتی۔ جب کبھی آدھی رات کو میری آنکھ کھل جاتی تو میں لیمپ کی روشنی میں اس کو پڑھتے ہوئے پاتا۔ میں اس کو مجبور کرتا۔ کہ پڑھنا ختم کر دے۔ اور اپنے بستر پر جا کر سو جائے

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد پھر رشید نے بولنا شروع کر دیا۔ اس نے کہا:" وہ آخر میں بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی ماں نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا کہ اس کو دونوں وقت دودھ

پینے کے لئے لا دیا کرو۔ لیکن میں کیسے لا سکتا تھا۔ ادھر میں اس کی شادی اور جہیز کی فکر میں
گھلا جا رہا تھا۔ میں مجبور ہوں کہ میں کبھی اس کے لئے کوئی چیز کافی طور پر مہیا نہ کر سکا۔ وہ دودھ
دودھ نہ مٹھائی اور نہ اچھا لباس اور آخر میں دس روپے کی قلیل رقم میسر نہ ہونے پر اس کو
مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ آہ! ہولناک افلاس نے مجھے تباہ کر کے چھوڑا۔

اس نے اپنی گذشتہ مصائب اور تکالیف کے ہزاروں چھوٹے بڑے واقعات گن
ڈالے کہ کس طرح روپیہ کی کمی کے باعث اس کی امیدیں اور توقعات ناکامی و شکستگی کا منہ دیکھتی
رہیں۔ اس کی خواہشات پامال ہوتی رہیں۔ اور اس کے لاعلاج مصائب میں روز افزوں
اضافہ ہوتا رہا۔

رشید کی حالت غم و الم کے باعث روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے دوستوں
نے ارادہ کیا کہ اس کی طبیعت کو کسی دوسری طرف مائل کرنا چاہئے۔ ورنہ اغلب ہے کہ یہ
پاگل نہ ہو جائے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔ تم کو صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے
نہ چھوڑنا چاہئے۔ ایک متحمل مزاج انسان کی طرح اس کا مقابلہ کرو۔ اگر تمہیں اپنی عزیز
بچی کی مفارقت کا افسوس ہے تو ہمیں قوم کی غریب بچوں کی خدمت کرنی چاہئے۔ تمہاری
بچی ہمارے ظالمانہ معاشری مراسم کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھائی گئی ہے۔ روزمرہ ہزاروں
بچے دودھ و روٹی نہ ملنے کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ میرے عزیز ترین
دوست اکرم اس قدر اپنے دل کو مغموم مت بنائیے۔

ابھی ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ رشید کے پیر جی مع اپنے چند حواریوں کے
کلثوم کی تعزیت کے لئے آئے۔ یہ وہی پیر جی تھے جن کے پاس رشید کلثوم کی بیماری
کے دوران میں گیا تھا۔ اور ان سے کہا تھا کہ از راہ لطف و کرم مجھے دس روپے بطور
قرض دیدیجئے۔ میری بچی سخت بیمار ہے اور یہ دس روپے ڈاکٹر صاحب کو بطور فیس کے
دوں گا۔ لیکن پیر جی نے باوجود اس کی منت و سماجت کے روپے نہیں دیئے تھے۔ انہوں
نے پوچھا۔ بچی کو کیا ہوا؟‘

بچی افلاس و غربت کے باعث بیمار رہتی تھی۔ آخری ایام میں اس کو روزمرہ بخار ہو جاتا

تھا۔ آخرکار یہ بخار اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا اور اس نے اپنی جان شیریں آفریندۂ جہاں کو سونپ دی:

پیر جی کا ایک ہمراہی بولا " قرض لیا ہو یا چوری کی ہوتی "

میں نے کہا۔ سچ کہتے ہو۔ بالکل سچ کہتے ہو اگر غریب امیروں کی چوری کر سکتے تو پھر غریب غریب کیوں ہوتے ؟ —— افسوس تو یہی ہے کہ غریبوں ہی کے لئے قانون ہے اور وہی قانون کی زد میں آتے ہیں ۔

پیر جی ۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ قانون صرف غرباء کے لئے ہے اور دولتمندوں پر عائد نہیں ہوتا۔

میں نے کہا " بس تمول قانون پر حکومت کرتا ہے اور قانون غربا پر جو آدمی کسی دوسرے شخص سے یہ کہتا ہے کہ تم میرے بس میں ہو۔ پچاس روپیہ ابھی دو۔ ورنہ پھر تمہاری زندگی —— وہ ایک ڈاکو ہے ۔ لیکن جو آدمی کسی دوسرے سے یہ کہتا ہے کہ یہ میری طاقت میں ہے کہ میں تمہاری بچی کو اچھا کر دوں گا۔ مجھے پچاس روپے لطور فیس دو۔ ورنہ میں اس کا علاج نہیں کر سکتا۔ اور اگر علاج نہ کراؤ گے تو وہ مر جائے گی ۔ کیا وہ آدمی قابل عزت یا قابل شہرت ہو سکتا ہے ؟

پیر جی نے اسپر خاموشی اختیار کر لی۔

رشید نے پیر جی سے عرض کیا " حضور میری غریب کلثوم میری عسرت سے واقف تھی اس نے کبھی مجھ سے روپے یا اچھی چیزوں کا مطالبہ نہیں کیا۔ ایکدن اس نے مجھے ایک ایسی آواز میں جس میں لرزش پائی جاتی تھی۔ کہا تھا۔

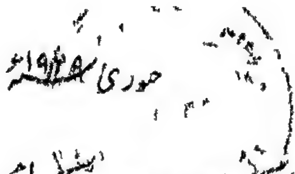
" ابا جان! کل مجھے ایک نئی ساڑھی لا دیجئے ۔ میں اپنی سہیلیوں سے چھپ نہیں سکتی ان میں سے ایک نے میری بوسیدہ ساڑی کو پھاڑ دیا اور سب مجھ پر آوازے کسنے لگیں میں کل اسکول نہیں جاؤں گی ۔ لیکن میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ میں نے کلثوم سے کہا۔ بیٹی تم مجھ پر غصے نہ ہو۔ میں پہلی تاریخ سے قبل تمہارے لئے ساڑی نہیں لا سکتا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے میرے پاس سے چلی گئی۔

اس وقت میں نے ارادہ کیا تھا کہ دفتر کے روپے کو خورد برد کر کے اپنی لڑکی کی ضروریات پوری کروں۔ لیکن میرے ضمیر اور اخلاق نے مجھے ملامت کی اور میں اس جرم کے ارتکاب سے بچ گیا۔ لیکن کلثوم موت کے منہ میں جا پڑی۔ جس کا باعث محض میری ذات ہے۔ اس کی آواز لڑکھڑائی اور غم سے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

میں نے کہا "خدا تعالیٰ یہاں پر غرباء کی اخلاقی قوت کا مظاہرہ دیکھئے ——— یہی وہ اخلاقی زنجیر ہے جو غریبوں کو اپنے دولتمند آقاؤں سے کبھی جعل سازی نہیں کرنے دیتی غریبوں کو امیروں کا محافظ بنائے ہوئے ہے۔

لیکن میرے محترم پیرجی! کیا آپ نے امیروں میں بھی یہ اخلاقی خوبی کبھی دیکھی کہ وہ غرباء کو موت سے بچانے کے لئے ان کی مدد کرتے ہوں؟ روزانہ نہ صرف سینکڑوں نہ صرف ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی فاقہ کشی کر رہے ہیں۔ جو یہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کشمکش حیات میں اپنے جسم و روح کا اتحاد برقرار رکھ سکیں۔ جن کو ناکافی خوراک ملتی ہے نان شبینہ کے محتاج ہیں۔ بدن ڈھانپنے کے لئے کپڑے میسر نہیں آتے اور گھر رہنے کیلئے نہیں کہ ان میں رہ کر زندگی کے دن کاٹ سکیں

ان کی زندگیاں موت و حیات کے درمیان معلق ہیں۔ سدا ان سے کوسوں دور ہے اور ہزاروں فاقہ کشی کی بدولت موت کے منہ میں چلے جا رہے ہیں۔ ہزاروں فقیر پاؤں اور سر سے ننگے سردی اور گرمی میں سڑکوں اور بازاروں کی گندی گلیوں پر پڑے نظر آتے ہیں دنیا میں سرمایہ داروں کی کمی نہیں متعدد کروڑپتی موجود ہیں جو ان کو دیکھتے ہیں لیکن جن کے قلب میں ذرہ بھر بھی رحم کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اخوت انسانی کا نام مٹا جا رہا ہے۔ کسی دولتمند کا دل موم نہیں ہوتا کہ ان ننگوں کو کپڑا پہنا دے اور ان فاقہ مستوں کی شکم پری کر دے۔ پیر اور صوفی اپنے حال میں مست ہیں۔ اخبارات آپس کی جنگ و جدل میں مصروف ہیں۔ ریوائٹرز دنیا بھر کے کلبوں اور مجلسوں کی دعوتوں اور ضیافتوں کی خبریں دنیا کے کونے کونے تک پہنچا رہا ہے۔ تاریخ نویس آئندہ نسلوں کے لئے تاریخ بنا رہے ہیں۔ دنیا کے فلاسفر اور پروفیسر اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں۔ لیڈر



ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے خواہاں ہیں۔ اسمبلی ٹکٹ والا کان عہدوں کے لئے
ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہے ہیں۔ لیکن غریبوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ کیا
یہی امراء کا اخلاق ہونا چاہیئے؟

اس پر میں نے اپنی تقریر کا رُخ پیری کی طرف کر دیا۔ میں نے کہا۔

"آپ کیوں دنیا کو فریب اور مکر کی تعلیم دے رہے ہیں۔ جاہل مریدوں سے اپنی طاغوت
پرستی کے ذریعے لاکھوں روپے ہتھیا کر اپنے لئے عالیشان محل تیار کر لئے ہیں۔ کیا
اسوۂ حسنہ یہی ہے کیا یہی تبلیغ ہے۔ کیا تعویذوں اور گنڈوں سے اسلام پھیلا تھا۔ کیا
اس جھوٹی اشتہار بازی سے نومسلموں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کاش اگر مسلمان آج
سچی اور حقیقی اسلامی تعلیم کا نمونہ عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کر لے تو پھر آپ دیکھیے کہ کس طرح
غیر مسلم جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہیں۔ میں نے کہا اس کبر و مکر کے جامے کو
اُتار دیجئے۔ اور مخلص مسلمانوں کی زندگی اختیار کیجئے اور لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۂ حسنہ
کی تشریح کی۔ آج مسلمانوں نے قرآن کریم کو پس پشت ڈال کر پیروں کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔
وہ پیر جن کو صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کی پیروی کا [illegible] حصول نے
محض اپنے اشتہاروں اور دیگر ذرائع سے عوام اور جہلا کے طبقہ کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے
وہ جن کے اعمال باطنی کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہاں بجز [illegible] کچھ نہیں رکھا
سو ہر وقت اپنی نمود نمائش کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور مریض و لاغر عقیدت مندوں سے اپنے
نفوس کو خوش رکھتے ہیں۔ بتائیے یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ کیا یہ مسلمانوں کی گاڑھی
کمائی سے دنیا میں عیش و تنعم کی زندگیاں اختیار کئے ہوئے ہیں؟ خدا کے لئے اس
ریاکارانہ عبا کو اُتار ڈالئے اور رنگے ہوئے کپڑے پہن کر لوگوں کو دھوکے اور فریب
کی تعلیم نہ دیجئے۔"

آپ لوگ صبغۃ اللہ سے ہزاروں کوس دور ہیں آج وہ دین جس کو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام نے اپنے خون سے سینچا تھا۔ اس کی یہ مصنوعی دنیا دار اور جھوٹے
مکار تو ہیں کہ کے اسلام کے لئے باعث زوال و ننگ و عار ثابت ہو رہے ہیں ابھی میری

تقریر جاری تھی۔ کہ پیرجی کا چہرہ غیض و غضب سے تمتما اٹھا۔ اس مرید حق و صداقت کی باتیں سننے کی ان میں تاب نہ رہی تھی۔ پیرجی اور ان کے حواری ایسی ظاہری تجلیات و جمالیات کے ساتھ وہاں سے جانے کے لئے بیتاب نظر آتے تھے۔ وہ کف افسوس مل رہے تھے۔ کہ وہ کیوں یہاں آکر ذلیل ہوئے۔ آخر پیرجی یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ تم نے مقدس صوفیائے کرام کی توہین کی ہے۔ اس لامذہبیت سے توبہ کرو ورنہ اس کا نتیجہ تمہاری تباہی و بربادی ہوگا۔ پیرجی مع اپنے حواریوں کے چل دیئے۔

رستم نے کہا۔ "آہ عزت ایک نہایت خوناک چیز ہے اور یہ جھوٹی دنیا کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے جو جھوٹے اخلاق اور ریاکاری میں محیط ہے۔ غربا اگر افلاس و غربت سے مر جائیں۔ تو ان کی جانب کوئی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا غربا قعر ذلت میں گرے پڑے ہیں۔ آہ میری غریب بچی ان ظالم لوگوں کی کج خلقی اور عدم کا شکار ہو کر مجھے داغ مفارقت دے گئی۔ مجھے ان لوگوں کے خلاف بغاوت کرنی چاہیئے یہی پیرجی جنکی خدمت میں سیکڑوں مرتبہ میں نے نذر و نیاز کے چڑھاوے چڑھائے لیکن جب میں ان سے بھی امداد کا طالب ہوا تو انہوں نے بھی چشم مروت پھیر لی تھی۔ بلکہ غضبناک نگاہوں سے میری جانب دیکھا تھا۔

میں آج سے پیرجی کی کید و خدع کے ریشمی پھندے سے آزاد ہوتا ہوں اب میں پیروں اور ان سرمایہ داروں کے خلاف علم بغاوت بلند کروں گا۔ اور ایک جدید انقلاب کی طرح ڈالوں گا اور دنیا کو ان جھوٹے پیروں اور سرمایہ داری کی لعنت سے آزاد کراؤں گا

(راقم غلام احمد خاں)

قطرۂ اشک

فلک حُسن کا ٹوٹا ہوا تارا ہوں میں
بجلیاں جسمیں ہیں لاکھوں وہ شرارا ہوں میں

چودھویں رات کے عارض پہ چمکتا ہوں کبھی
اور آغوشِ سمندر میں تڑپتا ہوں کبھی
بے ثباتیِ جہاں پر کبھی رو دیتا ہوں
طفلکِ دل کیلئے ہار پرو دیتا ہوں
اسے بھی لوگو نہ پہچانا کہ کیا ہوں میں   خلق کہتی ہے بس اک اشک کا قطرہ ہوں میں
میں ہوں وہ اشک ہیں مجھ میں وہ معانی مضمر
ایک قطرہ میں ہیں پوشیدہ مرے لاکھ گہر
ماہتاب کے کبھی جسم سے اک یاد کے
بیمار کے پہلو میں آنکھوں سے کبھی دختر کے
صورتِ عشق کبھی آنکھوں سے عاشق دلھن کے
جس کا شوہر کہ چلا جاتا ہو جانبِ رَن کے
بس کہ ہو لب پہ خموشی کا نشاں دل میں ہو درد
جو ہو عصمت کی دیوی جس کی کہ ہو آہیں سرد
صورتِ برق کبھی آنکھوں سے اس بچے کے
جو کہ سایہ سے ہو محروم پدر مادر کے
لاکھ روکیں مجھے پلکیں میں ٹپک جاتا ہوں   میں چمکتے ہوئے ساغر سے چھلک جاتا ہوں
کون ہوں کیا ہوں بتاؤں تمہیں اے اہل جہاں
میں ہوں یوسف مری آنکھیں ہیں چاہِ کنعاں
میں ہوں وہ اشک ہیں مجھ میں وہ معانی پنہاں
ہے فلک جان لے گر میری حقیقت انساں
میری ہستی سے ہی وحدت کا عجب راز عیاں
ایک قطرہ میں مرے لاکھوں ہیں دریا پنہاں
میں ہوں وہ اشک کہ گر چشم ملائک روتیں

مجھ کو آنکھوں سے گرا کے سروِ ناز اں ہو گئیں

گو ہوں ناچیز ہے لیکن بڑی قیمت میری آب جیواں ہے سے زیادہ قیمت میری

(شاہ احسان الرحمٰن بسمل ـ بی ـ اے)

بھوت

مغرب میں اب بھوت مستقل عداں رک گیا ہے عرب ان مجھے میں ہیں انہی آسیب کے معمولی سے منسوب کردئیے ہیں۔ ایک مقدمہ کا ذکر مغرب کے اخباروں میں ہو چکا ہے کہ واقعات ایک راز سربستہ ہیں۔ ۱۷۶۰ء میں ولیم کینٹ اور اسکی منکوحہ بیوی کی بہن فینی لورول سے فیلڈ کے نزدیک کاکس لین سٹریٹ کے باہر کوک لین میں مسٹر پارسنز کے مکان میں رہنے لگے۔ کینٹ اپنے کام سے وہاں سے چلا گیا۔ فینی مکان پر رہی اور طبیعت کی خرابی کی وجہ سے پارسنز کی گیارہ سالہ لڑکی کو اپنے بستر میں سلانے لگی۔ دو ایک ہی روز میں راتوں کو کھٹکے اور کھٹکے کی آواز سے انکی آنکھ کھل کھل جاتی۔ پارسنز نے اس بات کا کہ کیا شخص اسکو یہی سوجھی کے رات کو دیر تک کام کرے وہ ایک لیے یہ معمول کیا۔ جانے سے پہلے کینٹ نے پارسنز کو ۲ پونڈ دیئے تھے۔ واپس آکے اس نے یہ واپس مانگے۔ اس پر کچھ جھگڑا ہوا۔ وہ وہاں سے اٹھ کے بارٹلٹ کورٹ کلارکن ویل چلا گیا۔ فینی وہاں جا کے ۱۷۶۱ء میں چیچک میں بیمار ہو کے مر گئی۔ اس وقت پارسنز کے ہاں کھٹکے اور کھٹکے کی آوازیں بند رہیں۔ اب وہ پھر شروع ہو گئیں۔ پارسنز نے ان آوازوں پر غور کر کے انکا مطلب کا اعلان ہوا کہ فینی کی روح سوال سے یہ کہہ رہی ہے کہ کینٹ کو پکڑو پھانسی دو کیونکہ اس نے اسے زہر دے کے مار ڈالا ہے

پارسنز کی اور مدد سے اس کا ذکر کرتے رہے راستے میں اس کا غل مچ گیا۔ لوگ جوق در جوق اس لڑکی کے کمرے میں جا کے کان لگا کے سنتے۔ کینٹ کے خلاف الزام روز روز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ موجودہ آدمیوں میں سے کوئی میری امداد کرے

اس سے معلوم کر سکتا ہے کہ میری قبر پر جا کے کان دھرے میں اندر سے اپنے صندوقچے
کھٹ کھٹا کروں گی۔ لوگ وہاں گئے لیکن وہاں سے کوئی آواز نہ آئی۔ اس کے بعد
چند راتوں کو یہ کھٹکا بند رہا۔ آخرکار لڑکی کو دھمکایا گیا کہ اگر یہ کھٹکا اس رات کو پھر
ہوا تو چاہئے کہ ماں سے اقبال کرا لیا جائے کہ یہ سارا تماشہ مکاری ہے۔ اور ماں بیٹی کو
حوالات میں دیدیا جائے گا۔ چنانچہ اگلی رات کو یہ کھٹکا پھر شروع ہوا۔ لڑکی کی
تلاشی لی گئی تو اسکی انگیا میں لکڑی کی ایک لکڑی کی چھوٹی سی تختی نکلی۔ جس سے غالباً یہ
کھٹکھٹے اور کھٹکے کی آواز آتی تھی۔ سب کو تعجب یہ رہا کہ پہلے کئی مرتبہ اس کی تلاشی
لی گئی تو یہ تختی برآمد ہوئی تھی۔ بہرحال گورنمنٹ نے ان دونوں ماں بیٹی پر مقدمہ چلایا کہ انہوں
نے سازش کرکے اس کی جان خطرہ میں ڈالی اور اسکی شہرت کو صدمہ پہنچانے کے لئے
یہ جال پھیلا رکھا ہے۔ چنانچہ انہیں سزا ہو گئی۔

آج کل کے اخبارات میں کرسمس کے متعلق پُرلطف مضامین نکل رہے ہیں۔ کرسمس
کی شام کو انگیٹھی کے گرد بیٹھنے والوں میں سنسنی پیدا کرنے کے لئے پچھلی سی بھوتوں کی کہانیاں
کہی جا رہی ہیں۔ ان میں گلیمس کے بھوتوں کا واقعہ قابل ذکر ہے۔ یہ محل سٹرتھمور کے
امرا اور اسکی بیوی کی جائے سکونت تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کے ایک مخفی کمرہ میں پہلے
زمانہ کی ایک سنسنی خیز یادگار پائی جاتی ہے۔ اس کمرہ کا داخلہ اس خاندان کے
قانون یا رواج کے مطابق صرف تین شخصوں کو معلوم ہونا چاہئے۔ اس محل کے مالک
اس کے جانشین اور کوئی تیسرے شخص کو جسے وہ اپنا یہ راز ظاہر کرنا چاہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اوگلوی قوم کے چند آدمیوں کو اس کمرہ میں بھوکوں سے مار ڈالا
گیا۔ ان کی ہڈیاں اب تک اس میں موجود ہیں۔ انکی بے چین روحیں رات کو کراہتی
ہیں اور یہ آواز ہر شخص سن سکتا ہے۔ روایت ہے کہ اوگلویوں کو لنڈسیوں نے
شکست دیدی۔ انہوں نے گلیمس میں آ کے رحم کی التجا کی۔ گلیمس کے سردار کو ان سے
سخت نفرت تھی۔ اس لئے ان سب کو محل کے سب سے نیچے کے کمرہ میں بند کر دیا۔
جہاں وہ بھوک کی سختیاں جھیلتے جھیلتے ختم ہو گئے۔ یہ کمرہ بند رہا لیکن اب اس کے

دروازہ کو بعد میں بند کروا دیا گیا ہے۔ محل کے ایک مالک نے دروازہ کھول کے اس راز کو معلوم کرنا چاہا۔ کہ یہ آوازیں کیوں آتی ہیں۔ جو کچھ اس نے وہاں دیکھا آج تک کسی پر ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس نے اندر جھانکا ہی تھا کہ وہ سہم سہم کر فوراً پیچھے کو ہٹ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے حکم دیا کہ کوئی اس دروازہ کو آئندہ نہ کھولے۔ اس لیے اس دروازہ کو اینٹوں سے چنوا دیا۔ اس دن سے آج تک یہ راز حل نہیں ہوا۔ یہ بھی اب نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کمرہ ہے کدھر۔ لیکن بعض آدمیوں نے اس کی رات کو عجیب عجیب آوازیں سنی اور عجیب عجیب نظارے دیکھے ہیں۔

بیری پوم رائے کے پرانے خوبصورت قلعہ کے متعلق دو کہانیاں مشہور ہیں ایک یہ ہے کہ ایک خوبصورت عورت بیش بہا کپڑے پہنے مایوسی سے ہاتھ ملتی نظر آتی ہے اور اس کا نظر آنا کسی آنے والی موت کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ جب کبھی یہ عورت نظر آئی کوئی نہ کوئی موت ضرور واقع ہو گئی۔ دوسری کہانی نارمن زمانہ سے متعلق ہے

پومری خاندان کے ایک لڑکے نے اپنی بہن کو اپنے خاندان کے ایک دشمن کے پاس باغ کے ایک کنج میں کھڑے دیکھ لیا۔ اس نے اسی وقت دونوں کو مار ڈالا۔ یہ پتہ نہ چلا کہ کس جگہ اور کس طرح مارا۔ اس محل کے اندر ایک زینہ ہے جو دیواروں کے آثار میں سے ہوتا ہوا ایک برج سے خلا میں جا پہنچتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ جرم یہاں واقع ہوا کیونکہ جب اوپر کی نہایت اونچی کھڑکی سے چاندنی اندر آتی ہے تو ایک مرد اور ایک عورت کی دھندلی شکلیں خلا میں آمنے سامنے کھڑی ایک دوسرے کے پاس پہنچنے اور بغلگیر ہونے کے لئے کشمکش کرتی نظر آتی ہیں۔ اپنی زندگی سے آج تک وہ ملنے کی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یعنی جب زندہ تھے ملنے کی فکر میں تھے کہ قتل ہو گئے۔ اب مرنے کے بعد بھی وہ اسی عمل کو ادا کرتے ہیں اور مل نہیں سکتے۔

لیڈمیں اور برنڈفورڈ کے درمیان میں کلورلی ایک گاؤں ہے جہاں کے متعلق مشہور ہے کہ کرسمس کے موقع پر ایک مرتبہ ایک بھوت نظر آتا ہے۔ جب

شاہ جیمس تخت پر بیٹھا اس زمانہ میں کلوزلی ہال میں سرہوگ کلوزلی رہا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی اور دونوں بچوں کو قتل کر ڈالا۔ جسکی پاداش میں مارک کیسل میں اسے پھانسی دیدی گئی۔ ۱۸۷۷ء میں ایک پادری کو اسی ہال میں مدعو کیا گیا چنانچہ وہ آکے یہاں ٹھہرا۔ رات کو اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز اس کے سینہ پر چڑھ کے اس کو سختی سے دبا رہی ہے۔ بستر ہلا اور وہ فرش پر جا پڑا۔ وہ پلنگ پر پھر لیٹ گیا اور دو دفعہ اسی طرح گرا گرا دیا گیا۔ اب اس نے بیٹھ کے یہ دیکھنا چاہا کہ کوئی چیز نظر آتی ہے یا نہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک نائٹ (سردار) جو غالباً سرہوگ کلوزلی تھا ہال کے برابر احاطۂ گرجا میں ٹہل رہا ہے۔ اس کے بعد ڈیڑھ سو برس سے برابر یہ بھوت بڑے دن سے تین یا چار دن پہلے نظر آتا رہا ہے۔

محمد ظفر (گڑگانوہ)

دالیا

شکست یافتہ شاہ شجاع نے اورنگ زیب کے خوف سے بھاگ کر آراکان کے راجہ کے ہاں پناہ لی اس کے ساتھ اس کی تینوں حسین لڑکیاں تھیں۔ آراکان کے راجہ نے چاہا کہ شاہ شجاع اپنی بیٹیوں کی اس کے راجکماروں کے ساتھ شادی کردے۔ اس تجویز سے شاہ شجاع بہت ناراض ہوا۔ ایک روز راجہ کے حکم سے کشتی پر سوار کرکے دریا کی منجدھار میں لے جاکر شاہ شجاع کو مع کنبے قبیلے کے غرق کر دینے کی مذموم کوشش کی گئی۔ اس مصیبت کے وقت چھوٹی لڑکی آمنہ کو باپ نے اپنے ہاتھ سے دریا کی گود میں ڈال دیا۔ بڑی لڑکی نے خودکشی کرلی۔ شجاع کا ایک معتمد افسر رحمت علی منجھلی شہزادی زلیخا کو لے کر بہتا ہوا بھاگ نکلا۔ شجاع نے لڑتے لڑتے وہیں جان دیدی۔

آمنہ کو بیر لہریں بہالے گئیں اور خدا کے فضل وکرم سے وہ ایک لوٹتے

ماہی گیر کے جال میں زندہ نکل آئی۔ اسی ماہی گیر کے ہاں اسکی غور پرداخت ہوئی :
اسی دوران میں آراکان کا معمر راجہ اس جہان فانی سے چل بسا۔ اب بڑا شہزادہ اس کے تخت پر بیٹھا ہے۔

(۱)

ایک روز صبح کے وقت بوڑھے ماہی گیر نے آکر بیٹی جھڑکی کے لہجہ میں کہا۔
"تینی!"

ماہی گیر نے آراکانی زبان میں آئینہ کا نیا نام تینی رکھا ہے ؛
ماہی گیر نے کہا "تینی! آج صبح صبح مجھے ہو کیا گیا ہے ؟ کام دھندے کو بالکل ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ میرا اپنا حال کہاں ہے ؟ میری وہ رسی اٹھا کر کشتی پر بس رکھی۔"
آئینہ ماہی گیر کے پاس آئی اور تعظیم بجالا کر کہا۔ "بڈھے! آج میری بہن آئی ہے اس لئے آج کام سے چھٹی ہے"۔
بڈھے نے حیرت کے انداز میں کہا۔ "تیری کون سی بہن تینی ؟"
زلیخا جانے کہاں سے نکل آئی اور بولی۔ "میں ہوں"
بڈھا سناٹے میں آگیا۔ اس کے بعد زلیخا کے بالکل پاس جاکر اس نے غور اسکا چہرہ دیکھا۔ اس کا پہلا سوال یہی تھا۔ "تو کوئی کام دھندا بھی جانتی ہے ؟"
آئینہ نے جواب دیا۔ "بڈھے بہن کی طرف سے میں کام کروں گی۔ وہ کوئی کام نہیں کر سکتی"۔
بڈھے نے تھوڑی دیر سوچ کر زلیخا سے پوچھا۔ "تو رہے گی کہاں ؟"
زلیخا بولی۔ "آئینہ کے پاس"
بڈھے نے سوچا۔ یہ تو بڑی آفت ہوئی۔ اس نے زلیخا سے پوچھا۔
اور کھائے گی کیا ؟"
"اس کا کچھ فکر نہیں ہے"
یہ کہہ کر زلیخا نے بے پروائی کے ساتھ ایک اشرفی ماہی گیر کے سامنے پھینک دی

آئینہ نے وہ انتری اٹھاکر ماہی گیر کے ہاتھ میں دی اور جھکے جھکے کہا "بڈھے اا ب اور کچھ نہ کہنا۔ کام پر جا۔ دیر ہو گئی ہے"۔

زلیخا بھیس بدلکر بہت سے مقامات میں پھرتی پھراتی آخرکار آئینہ کا پتہ لگاکر کسی نہ کسی طرح ماہی گیر کے جھونپڑے میں آپہنچی ہے۔ اس کا حال بیان کرنے کے لئے ایک جدا کہانی چاہئے۔ اس کے محافظ شیخ رحمت نے اپنا نام تبدیل کرکے آراکان کے دربار میں ملازمت کرلی ہے ۔

(۲)

چھوٹی سی ندی بہ رہی تھی۔ گرمیاں ابھی شروع ہوئی تھیں۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے لگنے سے کیلوں کے سرخ رنگ کے پھولوں کی پنکھڑیاں جھڑجھڑکر گر رہی تھیں:

زلیخا اور آئینہ دونوں اسی درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ زلیخا نے آئینہ سے کہا اماجان کی موت کا انتقام لینے کے لئے ہی خدا نے ہم دونوں کو موت کے منہ سے بچایا ہے۔ اس کے سوا مجھے تو اور کوئی سبب نظر نہیں آتا"۔

آئینہ نے ندی کے دوسرے کنارے پر دور تریں جنگل کو جو نامعاف سلسلے کی مانند نظر آرہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے آہستہ سے کہا "بس اا ب یہ باتیں نہ چھیڑو۔ مجھ یہ دنیا ایک طرح سے عزیز ہو گئی ہے۔ مرنا چاہیں تو مردجوں جرات کرکے مریں۔ مجھے اس جہان میں کوئی تکلیف نہیں ہے"۔

زلیخا بولی "چھی چھی آئینہ تو تیرا دی ہے ذرا سوچ تو سہی۔ کجا دتی کا تخت اور کجا اراکان کے ماہی گیر کی جھونپڑی"!

آئینہ نے ہنسکر جواب دیا "بس اا بڈھے کی یہ جھونپڑی اور کیلوں کے درختوں کا یہ سایہ اگر کسی لڑکی کو دلی کے تخت سے بہتر معلوم ہو تو دلی کا تخت اس کے لئے ایک بھی آنسو نہیں بہائے گا"۔

زلیخا نے ذرا لے رُخی سے کہا "تیرا کچھ قصور نہیں ہے۔ تو اُن دنوں بالکل

یاد ان کی تھی۔ لیکن ذرا غور کر۔ دیکھ تو سہی ابا جان تجھ ہی کو سب سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ اسی لئے تجھے اپنے ہاتھوں سے دربدر کر دیا تھا۔ اس زندگی کو اس ناگ کی دی ہوئی موت سے بڑھ کر مت خیال کر۔ اگر تو باپ کا بدلہ لے سکے تو تیرا ایمان ٹھیک ہے۔ ورنہ اس زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے"

امینہ چپ چاپ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ زلیخا کو یہ بخوبی معلوم ہو گیا کہ اس نے ان باتوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ اسکا دل بیتے شباب اور کسی سوار کی یاد میں محو تھا۔ باہر کی اس ہوا اور رنگین سڑک کے ساتھ نئی زندگی سے وابستہ بہت سی امیدوں اور خواہشوں کو پیدا کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک لمبی سانس لے کر آمنہ بولی۔ "بس اب میں ذرا گھر کا کام دھندا کرنے جاتی ہوں۔ میں نہیں پکاؤں گی تو بڈھا بھوکا ہی رہ جائے گا"

(۳)

آمنہ کی حالت دیکھ کر زلیخا بہت اداس ہوئی۔ وہ بیٹھی بیٹھی اس کی حالت پر غور کرنے لگی۔ اسی وقت یکایک کسی کے کودنے کا دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی پیچھے سے کسی نے آ کر زلیخا کی دونوں آنکھیں ڈھانپ دیں۔

زلیخا نے ڈر کر کہا "کون ہے؟"

آواز سنکر اس نوجوان نے زلیخا کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اور سامنے آیا اس نے بے دھڑک ہو کر بلا کسی پس و پیش کے زلیخا سے کہا "تم تو تنہا ہو"

گویا زلیخا تن کر بیٹھی تھی اور نوجوان نے اپنی معمولی عقل کے زور سے اسکی چالاکی پکڑ لی ہے۔

زلیخا اپنے کپڑے سنبھال کر غرور کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کڑی نگاہ سے اس نے نوجوان کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد پوچھا "تم کون ہو؟"

نوجوان نے جواب دیا "تم مجھے نہیں پہچانتیں۔ [illegible]"

[illegible] پیچھا کر [illegible] اور یہاں آ گئی [illegible] اس نوجوان [illegible] جواب [illegible]

دیکھ کر آمنہ زور سے ہنس پڑی۔

آمنہ نے رقیجا سے کہا۔ "بہن! اس کی باتوں کا تم برا نہ ماننا۔ یہ بھی کوئی آدمی ہے؟ یہ تو ایک جنگلی ہرن ہے۔ اگر اس نے کچھ بے ادبی کی ہو تو میں اسے سزا دوں گی۔ ڈالیا! تو نے کیا کیا؟"

ڈالیا۔ (یہی اس نوجوان کا نام تھا) اسی لہجہ میں بول اٹھا۔ "تم آنکھیں ڈھانپی تھیں میں سمجھا تھا تم بیٹھی ہے مگر وہ تو تم نہیں ہے۔"

رقیجا نے یک بیک بڑے غصے کا اظہار کر کے کہا۔ "پھر وہی! چھوٹا منہ بڑی بات! تو نے میری آنکھیں کب ڈھانپی تھیں؟ تیری بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ بالخصوص اگر پہلے کی مشق ہو۔ لیکن سچ کہتا ہوں میں آج میں ذرا ڈر گیا تھا"

یہ کہہ کر ڈالیا نے چھپا کر رقیجا کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے آمنہ کی طرف دیکھا اور چپ چاپ ہنسنے لگا۔

آمنہ نے کہا۔ "بس۔ تو بڑا ڈھیٹ اور گنوار ہے۔ تو شہزادی کے روبرو کھڑے ہونے کے لائق نہیں۔ تجھے میں آداب مجلس کی تعلیم دوں گی۔ دیکھ اس طرح سلام کر"

یوں کہہ کر آمنہ نے شان سے ابھرے ہوئے نازک جسم کو لچک کے ساتھ جھکا کر رقیجا کو سلام کیا۔ ڈالیا نے بصد مشکل اس کی نہایت ناکمل پیروی کی:

اس کے بعد آمنہ نے کہا۔ "اس طرح تین قدم پیچھے ہٹ آ۔"

ڈالیا ذرا پیچھے ہٹ گیا

آمنہ نے کہا۔ "پھر سلام کر"

ڈالیا نے پھر سلام کیا۔

اس طرح پیچھے ہٹاتی اور سلام کراتی آمنہ ڈالیا کو دروازے کے پاس لے گئی۔ دوسری طرف جھونپڑی کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے آمنہ نے ڈالیا سے کہا۔ "اس کے اندر چل"

ڈالا اس کے اندر چلا گیا۔

آمنہ نے باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔ اور "ذرا گھر کا کام کر آگ سلگا رکھ" وہ اپنی بہن کے پاس چلی گئی۔

اس نے زلیخا سے کہا۔ "بہن اچھا نہ ہوا۔ یہاں کے آدمی اسی طرح کے ہیں میں تو اس کے اودھم سے اکتا گئی ہوں"۔ لیکن آمنہ کے چہرے پار رنگ ڈھنگ سے اس بات کی صداقت کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ بہت سی باتوں میں یہاں کے آدمیوں کے حق میں اسکی نامناسب طرفداری نظر آتی ہے۔

زلیخا نے حتی الوسع غصے کا اظہار کر کے کہا۔ "واقعی آمنہ! سارا حال دیکھ کر مجھ کو بڑا تعجب آتا ہے ایک غیر نوجوان کی یہ مجال کہ وہ آکر تیرے بدن کو ہاتھ لگائے!"

آمنہ اپنی بہن کی آواز میں آواز ملا کر بولی۔ "ہاں بہن اگر کسی بادشاہ۔ یا نواب کا بیٹا آکر ایسی حرکت کرتا تو ضرور بے عزتی کے ساتھ دھتکار دیا جاتا"

زلیخا سے ہنسی روکی نہیں گئی۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "سچ تو آمنہ لگتا مجھے اس گنوار چھوکرے کے لئے ہی یہ دنیا اتنی پیاری لگتی ہے؟"

آمنہ نے جواب دیا۔ "ہاں! سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص میرے بہت کام آتا ہے۔ کھیل اور کھیل ہی میں لا دیتا ہے۔ انکار کر لاتا ہے۔ کسی کام کے لئے پکارو تو دوڑا آتا ہے۔ میں اکثر ارادہ کرتی ہوں کہ اسے اسکی ڈھٹائی کی سزا دوں۔ لیکن مجھ سے یہ ہوتا نہیں۔ اگر میں اپنی آنکھیں خوب لال پیلی کر کے کہتی ہوں کہ "دیکھ! میں تجھ سے بہت ناخوش ہوں" تو وہ چپ چاپ میرے منہ کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے۔ اس ملک میں شاید اسی طرح ہنسی مذاق کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ میں نے بھی آزما کر دیکھ لیا۔ کہ دو گھونسے مار دو تو وہ بحال ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھو یہ اس جھونپڑے میں بند کر رکھا ہے۔ اگر اسے وہ ستاتا تو ہوگا۔ دروازہ کھول کر دیکھ لو وہ خوش ہو کر آگ سلگا رہا ہوگا۔ میں کیا کروں بہن! اسیر تو میرا کچھ

داؤ نہیں چلتا۔"

زلیخا نے کہا "اچھا۔ میں کوشش کر کے دیکھوں گی"

آسیہ ہنس کر عاجزی سے بولی "نہیں امیں تمہارے پیروں پڑتی ہوں اُسکو
اب کچھ نہ کہنا۔"

آسیہ نے یہ بات اس انداز سے کہی۔ گویا وہ نوجوان ایسا پالتو ہرن ہے
ابھی تک اس کا جنگلی پن دور نہیں ہوا۔ یہ خوف دامنگیر ہے کہ کسی دوسرے شخص کو
دیکھ کر ڈر کے مارے وہ کہیں رو چکر نہ ہو جائے

اسی وقت ماہی گیر نے آ کر پوچھا۔ "آج دالما نہیں آیا تھی؟"

آسیہ نے جواب دیا "آیا ہے"

ماہی گیر "کہاں گیا؟"

آسیہ "وہ بڑی شرارت کر رہا تھا۔ اس لئے اُس گھر میں بند کر رکھا ہے"

بڈھے نے کچھ سوچ کر کہا "اگر وہ تنگ کرتا ہے تو ناراض نہ ہونا۔ چھوٹی عمر
میں سبھی اسی طرح شرارتیں ہوا کرتے ہیں۔ اُسے برا سخت و سست مت کہنا۔
الیاس نے کل ایک بھالو (ارکان کی اشرفی) دیکر مجھ سے تین مچھلیاں لی تھیں"

آسیہ بولی۔ "کچھ فکر نہ کرو بڈھے ابا میں اس سے آج دو بھالو وصول کر لوں گی۔
اور اُسے ایک مچھلی بھی نہیں دینی پڑے گی"

اپنی پرورش کی ہوئی لڑکی کو اسی چھوٹی سی عمر میں اسقدر چالاک اور ہوشیار
دیکھ کر بوڑھا بہت خوش ہوا۔ اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلا گیا۔

(۴)

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ چند روز میں دالما کی آمد و رفت کے بارے میں زلیخا
کی رائے تبدیل ہو گئی۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نظر
نہیں آتی۔ دریا میں جسطرح ایک طرف روانی اور دوسری طرف کنارہ ہوتا ہے۔
اسی طرح عورت کے دل میں ایک طرف جوش اور دوسری طرف دنیا کی شرم و حیا

ہوتی ہے۔ لیکن مہذب سوسائٹی کے پراسرار کان کے اس علاقے میں وہ دنیا ہی کہاں ہے؟
یہاں صرف ایک موسم میں درخت پھولتے ہیں۔ سامنے کی پیلی ندی برسات میں بڑھ کر جاڑے میں صاف ہو کر اور گرمیوں میں سکڑ کر عجب خوشنما منظر پیش کرتی ہے۔ یہاں چڑیوں کے پر خوش چہچہوں میں کسی کے خیال جلیں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جنوبی ہوا اس پار کے گاؤں سے لوگوں کی آواز اس پار لے آتی ہے۔ لیکن یہاں کوئی سرگوشیاں کرنے والا موجود نہیں ہے

مسمار شدہ مکان پر جس طرح بڑھتے ہوئے گھاس پھوس کا جنگل کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں کچھ عرصہ بود و باش رکھنے سے قدرت کے حسن حملے سے انسان کی بنائی ہوئی دنیاداری کی مضبوط دیوار غیر معلوم طریقے سے منہدم ہو جاتی ہے اور چاروں طرف قدرتی دنیا کے ساتھ ہم آہنگی و یکرنگی پیدا ہو جاتی ہے علاوہ اس کے کمزور صنف کو خوش قسمتی باہم ایک دوسرے کے لائق مرد اور عورت کی جوڑی ملنے کا نظارہ دیکھنے سے ہوتی ہے۔ وہ اور کسی چیز سے نہیں ہوتی۔ عورتوں کے لئے اسقدر پر اسرار اسقدر راحت افزا اور اسقدر اشتیاق کی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ماہی گیر کی جھونپڑی میں تنہائی اور مفلسی کے سائے میں زلیخا کا غرور اور عزت و مرتبہ کا خیال خود بخود کم ہو گیا۔ تو پھولے ہوئے کیلوں کے درختوں کے سائے میں آمنہ اور ڈالیا کی ملاقات کا دلکش عمل دیکھ کر اسے بڑی خوشی محسوس ہونے لگی

معلوم ہوتا ہے اس کے شباب بھرے سینے میں بھی ایک ان بجھی تشنگی۔ ایک ناکام آرزو پیدا ہو گئی تھی اور وہ اسے رنج و راحت کی لہروں سے بے چین کئے دیتی تھی۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر کسی روز ڈالیا کے آنے میں دیر ہو جاتی۔ تو جسطرح آمنہ بیقرار ہو جاتی تھی۔ اسی طرح زلیخا بھی بیتابی کے ساتھ اُسکی راہ دیکھا کرتی۔

جب دونوں اکٹھے ہو جاتے تو زلیخا بیٹھی ہوئی انہیں محبت کی اس نگاہ سے دیکھتی تھی جس سے کہ مصور اپنی تازہ بنائی ہوئی تصویر کو ذرا دور سے دیکھتا ہے۔ کبھی کبھی لڑائی جھگڑا بھی کرتی تھی۔ جھوٹ موٹ شکایتیں کرتی تھی۔ اور بعض اوقات آمنہ کو چھیڑتے

میں مدد کرنے کے آسیب زدہ لوگوں کے لئے دعا ان سے ملنے میں رکاوٹیں پیدا کرتی تھی
خود مختار ہندوستان اور غیر مہذب اقوام کے لوگوں میں ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی
ہے۔ دونوں ہی خود مختار اور اپنی اپنی سلطنت کے مالک واحد ہوتے ہیں۔ دونوں کسی
قاعدے والوں کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ دونوں ہی میں قدرت کی اصلی عظمت اور
سادگی پائی جاتی ہے۔ صرف متوسط خیال لوگ ہیں یا ان لوگوں میں جو شاستروں اور
مذہبی کتابوں کے گن گن کر قدم رکھتے ہیں۔ اس کے خلاف طرز عمل پایا جاتا ہے۔ وہی لوگ
بڑوں کے سامنے خادم۔ چھوٹوں کے سامنے آقا۔ اور کسی بری جگہ جا پھنسیں تو بالکل
ہی نا اہل بن کر رہ جاتے ہیں۔ کمار ڈالیا طبیعت کا ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ وہ
لڑکا تھا۔ شہزادیوں سے اسے کسی قسم کی لاج لحاظ نہ تھا۔ شہزادیاں بھی اسے اپنے
برابر کا آدمی خیال کرتی تھیں۔ وہ خوش طبع۔ سادہ لوح۔ ظرافت پسند لڑکا ہر
حالت میں نڈر اور شرم و لحاظ سے مبرا رہتا تھا۔ اس کے چال چلن میں غرور کا کوئی اثر
نظر نہیں آتا تھا۔

لیکن اس نسل کو دیکھنے ملنے کے باوجود بھی زلیخا کا دل کبھی کبھی روٹھا سا رہتا
وہ سوچتی تھی کہ شہزادی کی زندگی کیا یوں ہی کٹنی چاہیئے؟

ایک روز صبح کے وقت ڈالیا کے آتے ہی زلیخا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور
پوچھا۔ "ڈالیا کیا تم مجھے یہاں کی راہ دکھلا سکتے ہو؟"

ڈالیا۔ "جی ہاں۔ کیوں۔ کیا کام ہے؟"

زلیخا۔ "میرے پاس ایک چوغہ ہے۔ وہ پہن کر میں آپ کے ساتھ میں گھومنا چاہتی
ہوں۔"

پہلے تو ڈالیا کو حیرت ہوئی۔ اس کے بعد وہ زلیخا کے چہرے کی طرف دیکھ کر
قاتلانہ ... دیکھ کر ہنسنے لگا۔ گویا اسے مزے کی بات ... اس سے
... تھی۔ اگر ... کے تمام ... ہے اور کوئی
بات ... کے ... سے پہلے ... پر اس

"اس ایک کے برتاؤ پر راجہ کو کس قدر اچھا ہو گیا اس کے دل میں یہی خیال آنے لگا یہی تصویر اس کی آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ وہ بار بار زور زور سے ہنسنے لگا

(۵)

دوسرے ہی دن رحمت بی نے چپکے سے زلیخا کو ایک خط لکھ کر آگاہ کیا کہ راجہ کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ دونوں شہزادیاں باہر کے جھونپڑے میں جو دو پاس رکھتی ہیں۔ وہ چھپ کر آمنہ کو دیکھ آتا ہے اور اسیر عاشق ہو گیا ہے اس کے ساتھ شادی کرنے کی غرض سے اسے بہت جلد محل میں لانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ شاید انتقام کا اس سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آسکتا۔ زلیخا نے مضبوطی سے آمنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "خدا کی مرضی صاف نظر آتی ہے۔ آمنہ اپنی زندگی کا فرض ادا کرنے کا یہی بہترین موقع ہے۔۔۔ اب اس لہو و لعب میں کھیلتے رہنا۔ اچھا نہیں معلوم ہوتا"

ڈالیا۔ اسی جگہ موجود تھا۔ آمنہ نے اسکی طرف دیکھا۔ وہ اس طرح ہنس رہا تھا جیسے کوئی تماشہ دیکھ کر ہنستا ہو۔ اسے ہنستے دیکھ کر آمنہ کے دل پر صدمہ گذرا۔ بولی "جانتے ہو ڈالیا میں رانی بننے جاتی ہوں"

ڈالیا نے کہا "۔ خوب مدت کے لئے تو نہیں"

آمنہ کو تکلیف سی ہوئی اور حیرت بھی۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ "واقعی یہ کتنی بے رحم ہے اس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک روا رکھنا دیوانہ پن ہے"

آمنہ نے ڈالیا کو ڈرانے اور خبردار کرنے کی غرض سے کہا۔ "راجہ کو مار کر کیا میں وہاں سے زندہ لوٹ آؤں گی؟"

ڈالیا نے آمنہ کی بات کو ٹھیک سمجھ کر جواب دیا۔ "ہاں لوٹنا تو مشکل ہی ہے"

آمنہ کے دل کا غصہ ایک دم اتر گیا۔

زلیخا کی طرف منہ پھیر کر اس نے [illegible] کہا۔ "میں تیار ہوں"

ڈالیا کی طرف پیٹھ کر رہی دل [illegible]

پہلے میں راجہ کے خلاف [illegible]

اس کے بعد کوئی اور کام کروں گی"۔

یہ سن کر دالیا کو خوب مزا آیا۔ گویا اگر یہ کارروائی عمل میں آئی تو شہزادے مرنے کی دل لگی ہو گی

(٦)

سوار۔ پیدل۔ جھنڈے۔ ہاتھی۔ باجے اور روشنی سے ماہی گیر کا گھر بھر گیا۔

راجہ کے محلات میں دونوں شہزادیوں کے لے جانے کے لئے دو پالکیاں آئیں۔

اتینہ نے تیجا کے ہاتھ سے کٹار لے لی۔ وہ چند لمحے اس کے ہاتھی دانت کے دستے کی صفائی کو دیکھتی رہی۔ اس کے بعد کپڑا ہٹا کر اپنے سینے پر اس کی دھار آزمائی۔ زندگی کے پھول کے پاس ایک بار کٹار لگا کر پھر میان میں رکھ کر اُسے چھپا کر کرتی میں رکھ لیا

اتینہ کی بڑی خواہش تھی کہ ملک عدم کے سفر سے پیشتر ایک مرتبہ دالیا سے ملاقات ہو جائے۔ مگر وہ کل سے عدم پتہ ہے۔ تو کیا دالیا کی ہستی میں روٹھنا یہاں تھا؟

پالکی پر سوار ہونے سے پہلے اتینہ نے پُرنم آنکھوں سے اس جھونپڑی پر نگاہ ڈالی جو اس کے عہد طفلی کی پناہ تھی۔ اسی جھونپڑی کے آس پاس کے درختوں کو اور ندی کو دیکھا ماہی گیر کا ہاتھ پکڑ کر اتینہ نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔ "اچھا تو پھر بڈھے ابا میں جاتی ہوں تیجی تو جاتی ہے۔ اب تیرے گھر کا کام کاج کون کرے گا؟"

ماہی گیر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اتینہ نے کہا۔ "بڈھے ابا اگر دالیا یہاں آئے تو یہ انگوٹھی اُسے دیدینا۔ کہنا یہی پہلے وقت دے گئی ہے"

یہ کہہ کر اتینہ نے انگوٹھی دیدی اور جھٹ پٹ پالکی پر سوار ہو گئی۔ بڑی دھوم دھام کے ساتھ دونوں شہزادیوں کی پالکیاں شاہی محلات کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اتینہ کی شام گاہ وہ جھونپڑا۔ ندی کا کنارا۔ اور کیلوں کا جنگل تاریکی اور عالم خموشی سے ایک اداس سماں ہو گیا۔

دونوں پالکیاں صدر دروازے سے گذر کر محلات کی ڈیوڑھی پر پہنچیں۔ دونوں بہنیں پالکیوں پر سے اتر پڑیں۔ آئینہ کے چہرے پر ہنسی تھی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ زلیخا کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

وہ بس یہیں تک دور تھا۔ اس کا حوصلہ بہت بڑھا چڑھا ہوا تھا۔ مگر اس وقت اسکا دل دھڑک رہا تھا۔ فرط محبت سے بے چین ہو کر زلیخا نے بہن کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اپنے دل میں زلیخا نے کہا "افسوس اپنی محبت کے غصہ سے توڑ کر میں اس شگفتہ پھول کو کون ہی خون کی ندی میں بہانے لگی ہوں!"

لیکن اب کچھ سوچنے یا غور کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہزار ہا چراغوں کی روشنی سے منور راہ دکھاتی لونڈیاں باندیاں آگے آگے چلیں اور ان کے پیچھے پیچھے دونوں بہنیں آگے بڑھیں۔

راجہ کے رنگ محل کے دروازے پر پہنچ کر آئینہ نے زلیخا سے کہا "بہن!"

زلیخا نے آئینہ کو گلے سے لگا کر اس کا منہ چوم لیا۔

دونوں آہستہ آہستہ رنگ محل میں داخل ہوئیں۔

کمرے کے اندر شاہی پوشاک زیب تن کئے ایک بیش قیمت پلنگ پر راجہ بیٹھا تھا۔ آئینہ مارے شرم و لحاظ کے دروازے سے تھوڑی دور ٹھٹک کر رہ گئی۔

زلیخا نے آگے بڑھ کر راجہ کے پاس پہنچ کر دیکھا۔ وہ چپ چاپ تماشہ کی ہنسی ہنس رہا ہے۔ زلیخا پکار اٹھی "ڈالیا!"

آئینہ بیہوش ہو گئی۔

پرند بسمل کی طرح گری ہوئی آئینہ کو اٹھا کر ڈالیا (راجہ) اپنے پلنگ پر لے گیا۔ جب آئینہ کو ہوش آیا تو اس نے کرتی سے کٹار نکال کر اپنی بڑی بہن کی طرف دیکھا۔ بڑی بہن نے ڈالیا کی طرف دیکھا۔ ڈالیا چپ چاپ ہنستے ہنستے دونوں کی طرف دیکھنے لگا اور کٹار بھی میان سے ذرا منہ نکال کر یہ تماشہ دیکھ کر کھلکھلاتی ہوئی ہنسنے لگی۔

(ٹیگور)　　　　(رام سروپ کوشل)

نالۂ افروز

چارہ گر شوقِ شہادت کا بیاں ہونے تو دے
ہر دہاں زخم کو میری زباں ہونے تو دے

زور ہے بازو میں اُس کے بامری گردیں ہے
تیغ قاتل آج اسکا امتحاں ہونے تو دے

پھر سناؤں گا تجھے اے جنوں کی داستاں
پیرہن پھٹ پھٹ کے پہلے دھجیاں ہونے تو دے

سیتے سیتے رک گئے ہیں کس لئے بخیہ گر کا یہ ہاتھ
سینے والے زخم میری داستاں ہونے تو دے

تجھ کو کب بھائیگا میرا اور اُن کا اختلاط
حسرتِ دل کچھ تو پوری آسماں ہونے تو دے

زخم ابھریں جب دکھاؤں تجھکو پھولوں کی بہار
سینۂ سوزاں کو رشکِ بوستاں ہونے تو دے

اُن پہ کھل جائیگا اے افروز تیرا حالِ زار
جذبۂ دل کو کاشفِ سرِ نہاں ہونے تو دے

(عزیز اللہ خاں افروز ۔ رامپوری)

سپنا یا خواب

اس میں شک نہیں کہ بعض خواب سچے ہوتے ہیں ۔ لیکن بہت کم ۔ مثلاً زلیخا کا خواب مشہور ہے ۔ سچے سپنے کو عربی میں رویائے صادقہ کہتے ہیں ۔

جاہل اقوام جیسا کہ اپنی زندگی کے تمام مشاہدوں کو سچا سمجھتی ہیں ۔ تقریباً ویسے ہی حالات ان کے خواب کے متعلق ہیں ۔ جو چیزیں وہ خواب میں دیکھتے ہیں ۔ وہ انہیں صحیح تسلیم کرتے ہیں ۔ انکا خیال ہے کہ نیند میں بعض اوقات مشیت ایزدی کے مطابق روح جسم سے علیحدہ ہو کر طرح طرح کے مقامات دیکھتی ہے ۔ جنگلوں پہاڑوں اور دریاؤں کی سیر کرتی ہے زندہ اور گزرے ہوئے احباب سے ملاقات اور گفتگو کرتی ہے ۔ اور اس سیر و سیاحت کے بعد پھر سونے والے جسم میں واپس آجاتی ہے ۔ صرف موت کے بعد ہمیشہ کے لئے جسم کو چھوڑ جاتی ہے ۔ شاید اس حالات کے زیر اثر بزرگ اور فقیر شہروں سے

کنارہ کش ہو کر تارک الدنیا ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔ جنگلوں اور ویرانوں میں جھونپڑیاں بنا کر رہتے ہیں تاکہ آرام سے دوسروں کی روحوں سے خواب میں ملیں اور ان سے زمانہ مستقبل کے متعلق کچھ واقفیت حاصل کریں۔ اس بات کی تیاری کے لئے وہ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں۔ اور رات کو عجیب و غریب طرح سوتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ روحیں نیند میں خواہ سدہ کی ملاقات کے لئے جاتی ہیں۔

ان لوگوں نے خواب نامے لکھ کر تعبیریں بتائی ہیں۔ آسٹریلیا میں پرانے حکیموں کا فرض منصبی تھا کہ وہ لوگوں کو خواب کی تعبیر بتائیں۔

جاہل فرقے میں جو لوگ خواب کو کم سچا سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ کرۂ ہوائی میں ارواح الشیاطین موجود ہیں۔ جو مختلف وضع قطع اختیار کر سکتے ہیں یہ نیند میں انسان کے اندر گھس جاتے ہیں۔ پھر انسان خواب دیکھتا ہے۔ اور یہ شیطان کے چیلے کیڑے مکوڑے۔ سانپ بچھو اور درندے بن کر انسان کو ڈراتے۔ اسے ہوا میں اڑاتے زمین پر گراتے اور طرح طرح کے شعبدے دکھاتے ہیں۔

لقمان سچے خواب خدا کی طرف سے۔ اور بیہودہ لغو بدہضمی اور بیماری کی وجہ سے سمجھتا تھا۔ ارسطو کا خیال تھا کہ خواب میں وہی چیزیں نظر آسکتی ہیں۔ جو کہ انسان وقت بیداری اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے۔ افلاطون کا خیال بھی اس سے ملتا جلتا ہے اس کا عقیدہ تھا کہ عالم بیداری یا کچی نیند میں جو سے انسان دیکھتا ہے۔ نیند میں بھی اسی طرف اسکا خیال لگا رہتا ہے۔ اور پھر دماغ خود بخود تصویر باندھا چلا جاتا ہے اور یہ تمام خیالات خواب کی صورت میں نظر آتے ہیں

دراصل جیسے نیند میں یک گونہ کج فہمی یا قوت متخیلہ کی بیداری اور غلط سواری کا نتیجہ ہیں۔ نیند میں دماغ بیرونی دنیا سے کچھ بے خبر ہو جاتا ہے۔ جب نیند میں قوت متخیلہ ذاتی یا کسی بیرونی وجہ سے حرکت پڑتی ہے۔ تو وہ ہر طرف گھوڑے دوڑاتی ہے اور طرح طرح کے سین دکھاتی اور سناتی ہے کیونکہ سوچ کا بھی مادہ نیند کے ساتھ

آرام میں ہوتا ہے۔ اس لئے یہ خیالی شے یا تصور نیند میں ہمیں درست امر واقعہ اور صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اور انسان ان کی بے ترتیبی کو محسوس نہیں کرتا۔ دماغ کی آگاہی کئی چیزوں پر مبنی ہے۔ ان میں ایک تو بڑی بات سوچ بچار ہے۔ دوسری پرانے مشاہدات اور واقعات اور احساسوں کی یادداشت اور ان پر ہی صحت خیال اور دماغی سنجیدگی کا انحصار ہے۔ عالم بیداری میں خیالی تصویروں اور اصل چیزوں کی شناخت یا تمیز کا دار و مدار بھی ان ہی پر ہے۔ تیسری بات قوت ارادہ ہے جسکی بدولت ہم اپنا نقطۂ نگاہ بدل سکتے اور نقل مکان کر سکتے ہیں۔ نیز اسی توجہ کو ایک کام اور ایک شے میں قائم کر سکتے ہیں۔ نیند میں گذشتہ مشاہدات کا خزانہ اور یادداشتوں اور حسیات کا مجموعہ بالکل بند ہوتا ہے۔ ادراک اور قوت ارادی غیر حاضر۔ اس لئے خواب میں خیالات کی بلند پروازی بالتصور کے شعبدے ہمیں عجیب وغریب نظارے سینما کی طرح دکھاتے ہیں۔ اور ہم انہیں اسوقت سچی چیزیں سمجھتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ہم نیند میں ایسا محسوس کر لیتے ہیں کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ تمام نفس خواب کے شعبدے ہیں

خواب کا آغاز یا تو دماغ کے میدان خیال یا جسم کے دوسرے حصوں سے احساس کے دروازوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً جب معدہ میں کوئی خلل واقع ہو تو رات بھر خوابوں سے لے چلی رہتی ہے۔ اور کمبخت خوابیں بھی بڑی ہی ڈراؤنی قسم کی آتی ہیں اور جب کبھی بازو یا ٹانگ سوئے پڑے کسی ترچھی آڑی طرز پر دب جائیں اور بعد میں ذرا جھنجھنی سی پیدا کر دیں۔ تو خواب میں انسان اڑنے دوڑنے اور چلنے پھرنے وغیرہ کے کرشمے دیکھتا ہے۔ اور اگر کپڑوں کا دباؤ وغیرہ پڑ جائے تو انسان کبھی اپنے کو ننگا اور کبھی دبا ہوا یا پھانسی میں لٹکا ہوا پاتا ہے۔ جب کبھی نیند میں کواڑ یا زنجیر کی آہٹ سے خواب شروع ہو۔ تو ضمیر اسکی ترجمانی بادلوں کی گرج بجلی کی کڑک توپوں [illegible] لڑائی کی ہولناک حادثوں سے کرتا ہے۔ اگر سوتے وقت کبھی منہ کا ذائقہ خراب ہو تو زبان خواب میں ہزاروں بد ذائقہ چیزیں چکھتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ شروع سے آخر تک خواب ایک ہی صورت رکھے۔ عالم خواب کے گھوڑے بے تحاشہ بے ڈھنگی دوڑ

دوڑتے ہیں ۔ اگر آدمی ایسا ایک دانت اکھڑا پاتا ہے تو زمین پر گرتے گرتے وہ ایک چٹان بن جاتا ہے اور ایک آن میں کوہ ہمالیہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ جوں کا ایک قطرہ بحرالکاہل یا بحر اوقیانوس سے بھی وسیع نظر آتا اور ساری دنیا ڈوبنے کو تیار ہوتا ہے ۔

خواب میں گو انسان اپنے آپ کو ہزاروں میل ہوا میں اڑتا پائے لیکن چارپائی پر کبھی اسکا دو انچ سے زائد نہیں ہلتا ۔ کیونکہ ہمارے پٹھے قوت ارادی کے ماتحت کام کرتے ہیں جو کہ اکثر خواب میں کام نہیں کرتی ۔ خواب میں دراصل چلنا پھرنا ایک شاذ و نادر بات ہے

خواب اور نیند آپس میں وابستہ ہیں ۔ جیسے اکثر آدھی رات گذر جانے کے بعد جب نیند ہلکی ہو جاتی ہے تو آتے ہیں ۔ جو لوگ زیادہ ہلکی نیند سوتے ہیں ۔ وہ زیادہ خواب دیکھتے ہیں ۔ عورتوں کی نیند مردوں کی نسبت ہلکی ہوتی اس لئے وہ نسبتاً بہت دیکھتی ہیں اور ان کے خواب زیادہ رنگین متنوع و عجیب و غریب ہوتے ہیں ۔ اور انہیں خواب کی یاد بھی اچھی ہوتی ہے ۔ یہ عام طور پر معلوم ہے کہ خواب بیداری کے وقت جلد بھول جاتے ہیں ۔ اور خواب کی یادداشت کمی ہوتی ہے ۔ لیکن خواب میں کئی دفعہ عرصہ سے بھولی ہوئی باتیں جو کہ باوجود کوشش کے بھی عالم بیداری میں یاد نہیں آسکیں ۔ پھر واضح ہو جاتی ہیں ۔ اور بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسے سوالات خواب میں انہوں نے حل کر لئے ہیں جن کے حل کرنے کی کوشش وہ سالہا سال سے کر رہے تھے کسی بار بھولا ہوا سپنا پھر خواب میں یاد آجاتا ہے ۔

بعض اوقات خواب میں انسان اپنی خودی کو بھول جاتا ہے اور اپنے آپ کو کچھ کا کچھ دیکھتا ہے یعنی ایک لمحہ وہ ایکٹر ہے دوسرے لمحہ وہ خود ہی تماشائی ہوتا ہے ۔ بعض لوگ خواب میں اپنی شخصیت نام وغیرہ کچھ کا کچھ اختیار کر لیتے ہیں اور کچھ عرصہ تک بادیۂ تک فرضی نام وغیرہ کے ماتحت دنیاوی کاروبار کو انجام دیتے رہتے ہیں ۔ خواب کے بعد مذہبی خیالوں اور زندگی کے اصولوں کا بدل جانا بھی اسی طرح غیر ممکن بات نہیں ہے

دماغی بیماریوں میں سپنے اکثر کثرت سے آتے ہیں اور ایک ہی سپنا بار بار دق کرتا ہے

مرض ہسٹیریا (اختناق الرحم) کا آغاز کبھی بعض اوقات خواب ہی میں ہوتا ہے۔ دھاوت سراہنوں کو خواب میں سانپ بچھو اور عجیب و غریب جانور اور کیڑے مکوڑے اکثر بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں اور ان سے وہ بہت ڈرتے ہیں۔ کنجوسوں کے سپنے مردار اور دولت کے لٹنے سے پُر ہوتے ہیں۔

بچے چار سے سات سال تک کی عمر میں خواب دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ بچپن میں اکثر خواب میں بچے چونک پڑتے ہیں۔ اور رو دیتے ہیں۔ سوائے ڈر کے انہیں اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ ۱۵ سے ۳۵ سال کی عمر تک سپنے بکثرت آتے ہیں۔ اور ۶۵ سال کی عمر کے بعد بہت قلیل ہو جاتی ہیں۔ جو شخص بچپن ہی میں یا پیدائش کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اندھا ہو جائے تو اسے خواب میں نظر نہیں آتا۔ لیکن وہ سن سکتا ہے۔ اگر اگر پانچ سے سات سال کے درمیان کہیں اندھا ہو جائے تو خواب میں اسے کچھ نہ کچھ بصارت کے کرشمے نظر آتے ہیں۔ اور جو سات آٹھ سال کی عمر کے بعد آنکھیں کھوئے تو وہ عالم خواب میں صاحب بصیرت سے کسی طور پر کم نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو بچپن ہی میں بہرہ ہو جائے اسے خواب میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن سنائی نہیں دیتا۔ اگر کان آٹھ دس سال کی عمر کے بعد خراب ہو جائیں تو انسان خواب میں بہرہ نہیں ہوتا۔

ایک شخص جو بچپن سے اندھا اور بہرہ ہے وہ اگر تعلیم کی وجہ سے بولنا سیکھ گیا ہو تو وہ خواب میں بول لے گا۔ اور محسوس کرے گا۔ لیکن اسے دکھائی اور سنائی نہیں دیگا

۵۵ سے ۶۵ فیصدی خوابوں میں قوت باصرہ۔ پانچ فیصدی سے ۱ فیصدی قوت سامعہ ۲ فیصدی میں قوت ذائقہ۔ اور ۱۔ فیصدی میں قوت شامہ کی کچھ فہمی کام کرتی ہیں۔ ۱ فیصدی خوابوں میں انسان حرکات سکنات کرتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ انسان نیند میں خواب کے مزے لیتے اور طرح طرح کی سیر کرتے ہیں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کتا اور بندر بھی خواب دیکھتے ہیں۔ شکاری کتا دوسرے کتوں کی نسبت خواب اور نیند کا زیادہ عادی ہوتا ہے اور شکار کے بعد تھک کر لیٹتا ہے تو خواب میں طرح طرح کے نظارے دیکھتا ہے۔

(جو سدل حال خیال)

جلوہ گاہِ مجاز

یہ عجب طرح کا کمال ہے تری حسنِ جلوہ طراز میں
کبھی مصر میں ہوا جلوہ گر کبھی سرزمینِ حجاز میں

کبھی اتفاق سے میں گیا کسی بزمِ راز و نیاز میں
نظر آئے سر بسجود سب جو ملے تھے راہِ مجاز میں

جو مری وفا کا لحاظ ہو مرے دردِ عشق کا پاس ہو
تو مجھے ضرور کرے طلب کوئی اپنی محفلِ ناز میں

مجھے رنگِ دہر کی کیا خبر تری چشم تو ہے وہ فتنہ گر
سرِ التفات کا راز مرا جی لگا نہ نماز میں

مری عقل و ہوش کا مضحکہ جو اڑائے کوئی تو ٹھیک ہے
غمِ مختصر کی ہے جستجو مجھے زندگی دراز میں

مجھے حرم کا نہیں حوصلہ مری بے بسی کو تو دیکھئے
کہ تڑپ رہی ہیں تمنائیں لبِ صابندہ نواز میں

وہی جوش ہے وہی ولولے وہی ہمتیں وہی حوصلے
مری دل کو مردہ سمجھ نہ تو جو یہ جب ہی محفلِ ناز میں

ترے حسن کی یہ نمائشیں جو ہیں تیوروں ہی پہ منحصر
مرے عشق کا کوئی واقعہ نہ رہے گا پردۂ راز میں

ملا مجھکو کیفِ عبودیت نظر آئی شانِ ربوبیت
مرا قبلہ نما تھا جو جھکایا سر کو نماز میں

نہ ملائے سحر کی تلخیاں نہوں مائلِ غمِ آرزو
کہ ہزار لطف اٹھائے ہیں تری جلوہ گاہ مجاز میں

نہیں راحت ایسا ہی خود غرض ترے وصل کی جو کری ہوں
فقط اک نظر کی ہے آرزو نہاں اسکے قلبِ گداز میں

(محمد و راحت علی خاں راحت)

مسئلہ سالمات

(گلدستہ سے ہوستہ)

قرون وسطی کے محققوں اور عالموں کا یہ خیال تھا کہ مادہ باریک باریک ریزوں سے مرکب ہے جنہیں وہ اسلاف کی طرح عناصر اربع تصور کرتے تھے۔ یعنی آگ۔ پانی۔ ہوا۔ خاک تمام اجسام ان چاروں عنصروں کی ترکیب اور اجتماع سے بنے ہیں۔ مگر ان کا تناسب سب جسموں میں مختلف ہوتا ہے۔ لیکن عناصر کا جو مفہوم آج کل ہے وہ اس زمانے سے بہت

مختلف ہے۔ اس زمانے کے کئی فلاسفروں کا یہ خیال تھا کہ عنصر ایک دوسرے میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ راجر بیکن جو ۱۲۱۴ء اور ۱۲۹۴ء کے درمیان گزرا ہے۔ انگلستان کا ایک نامور فیلسوف اور زبردست محقق تھا۔ اسکی رائے میں عناصر اربع ہائیلے کے بنے ہوئے ہیں۔ (یونانی میں "ہائیلے" کے لغوی معنی لکڑی کے ہیں) ایک عنصر دوسرے کی ماہیت میں تبدیل ہو سکتا ہے اور ایک چیز کو دوسری شے میں بدلا جا سکتا ہے۔ اس عالم کے خیال کی رو سے گندم سے انسان بن سکتا ہے۔ اور انسان گیہوں میں بدل سکتا ہے جس وقت زمانۂ حال کے سائنس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں بھی یہ نظریہ غالب اور رائج تھا۔ اور اٹھارھویں صدی تک اس پیر فرتوت کی طرح عالم وجود میں رہا جس کے حواس خمسہ سلب ہو چکے ہوں اور ہر وقت چارپائی پر پڑا رہتا ہو۔ جب سائنس جدید کے اصول اولیہ کی چھان بین ہو رہی تھی اور اسکی شاندار عمارت کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ تو کئی بلند فکر اور بالغ نظر محقق سمجھتے تھے کہ مادہ ذروں سے مرکب تو ہے مگر یہ ذرے ذروں کی قسم سے نہیں ہیں۔ لارڈ بیکن جو علوم حال کے اصول اولیہ کے موجد اور طریق تحقیق و تفتیش کے بانی اول اور اس زمانہ کے سائنسدانوں کے باوا آدم کہلانے کے مستحق ہیں۔ اپنی معرکۃ الآرا کتاب میں یونانی حکما اور محققین کے قیاسات سالمات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اس طریقہ سے ہم سالمات کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ اس کی رو سے خلا ملا ہیولی وجزا مانا جاتا ہے۔ اور مادہ غیر متغیر قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں تصور غلط ہیں۔ البتہ اس طریقۂ تحقیقات کی عمل پیرائی سے ان حقیقی ذروں کی حقیقت ہم پر عیاں ہوتی ہے۔ جس سے ہم پہلے ہی سے واقف ہیں۔ لارڈ بیکن نے اسی تحقیق و تجسس سے مسئلہ مادہ میں بیش قیمت اور قابل قدر اضافہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ حرارت ذروں کی حرکت ہے۔ چنانچہ آپ رقمطراز ہیں:-

"حرارت حرکت ہے جو جسم کے ادنیٰ ذروں کے درمیان سے گزر جاتی ہے۔ اس کی روک تھام ہو سکتی ہے اور وہ منعکس ہو سکتی ہے۔ اور اس سے مخالف سمت میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ آگ اور حرارت کی تیزی کی یہی وجہ ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ذروں کے مجموعے ہوتے ہیں۔ جو حرارت پاکر متحرک ہو جاتے ہیں اور ایک

دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور جس سے حرارت کے رو رہیں پیدا ہوتی ہے میکس کے حال ہیں ذروں کے مابین ایک غیر محسوس بے وزن اور استمراری شے ہے۔ جسے وہ "جوہر" یا "روح" کہہ کر پکارتے ہیں۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو تفتیش و تجسس مزید کی روشنی میں اسے "استحر" کے نام سے موسوم کرتے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ محسوس اجسام کے اندر ایک جوہر ہے۔ جسکی حرکت اور جس کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ جسم کے اندر ایک غیر مدلی اور غیر محسوس جوہر اصلی ہے۔ اور وہ اس کے اندر چھپا رہتا ہے۔ اگر وہ نکال دیا جائے تو اجسام سکڑتے اور خشک ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کے اندر رہے تو انہیں نرم بناتا اور پگھلاتا ہے۔ جوہر کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ واضح رہے کہ لارڈ میکس مادہ کی کلیت کو مسلسل سمجھتے تھے۔

دے کارت۔ فرانس کا نہایت مشہور فلاسفر تھا۔ ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۵۰ء میں انتقال کیا۔ بعض لوگ اسے فلسفہ جدید کا "مورث اعلیٰ" سمجھتے ہیں۔ اس نے ۱۶۴۴ء میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پرنسیپیا فلاسوفیہ۔ یعنی اصول فلسفہ" شائع کی تھی۔ جس میں اسے مسئلہ سالمات پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی اور اسے ایک نہایت اہم اور زبردست مسئلہ قرار دیا۔ اس نے اس بحث میں دکھایا کہ جو کچھ ہم صاف صاف محسوس کرتے ہیں وہ صحیح اور حقیقی ہے اس میں کسی قسم کا دھوکا نہیں ہے۔ یہ عقل جس شئے کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اسپر عیاں و آشکار ہوتی ہو۔ اسکی تجسس صریح ہوتی ہے۔ اس لیے اس اصول کو اجزائے مادہ پر عاید کیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ سالمات ناقابل تفریق نہیں ٹھہر سکتے۔ چاہے وہ اجزا کیسے ہی چھوٹے اور ادنے کیوں نہ ہوں تاہم ہم انہیں چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں) اور جہاں تک چاہیں انہیں تقسیم در تقسیم کے قاعدے کے تابع کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس نظریہ میں ان کی لاتفریق لاانتہا کو تسلیم کر لیا۔ دے کارت یہ بھی کہتا ہے۔ کہ خلا محال ہے جس میں ذرے۔ لہذا عقل اسے تسلیم کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ توسیع مکانی گویا توسیع مادہ ہے یعنی خلا میں کسی شئے کا پھیلاؤ۔ ۔۔ یہ مادہ سے

باقی آئندہ ۔۔۔ (جے آر ۔۔۔)

جذباتِ محمود

وہ دل جو گلشنِ ایجاد کو سنوار آیا
تمہاری محفلِ الفت سے شرمسار آیا

نقاب اب تو اٹھا خون ہو گیا دل کا
شباب حسن ہیں صدقہ ترا اُتار آیا

نگاہ حسن کی بڑی مستیوں میں غرق ہوئی
عجب کیف یہ رنگِ شباب بار آیا

ڈھونڈھ ہوا ہے مقتل کے جانیوالو ڈھونڈھو
ابھی ابھی تمہیں قاتل وہاں پکار آیا

نگاہِ ناز نے وہ دل میں بجلیاں بھر دیں
کہ مٹتے مٹتے بھی اُسکو نہ کچھ قرار آیا

کہاں تھا شوق جنازہ کو سر اٹھا لیتا
وفا کا ہاتھ انہیں کھینچ کر اُبھار آیا

مرے لہو سے تیرے ہی یاد حیراں چلی ہر سو
چمن ہیں جا کے بھی حسرتِ کشِ بہار آیا

یہ اسکا فرض تھا جسنے کہ کر دیا زخمی
نگاہ ناز یہ کیوں دل کو اعتبار آیا

ہر اک لحد پہ پڑھی فاتحہ ستمگر نے
نگاہیں بھر لیں جسدم مرا مزار آیا

بکھر گئے والے تری جوں ڈبائی پھول
ٹھہر ٹھہر کے یہ گلدستہ بہار آیا

وفا ہے ہستیوں کا رنگ خود
طلسم نقش وفا کو وہی ابھار آیا

تڑپ گیا مرے خون جگر کا ہر قطرہ
لحد کے سامنے جو وقت جاں نثار آیا

چمن میں آگ لگا دی جب اہل گلشن نے
خزاں کی برق کو تب اس گھڑی قرار آیا

پلٹ کے جاتا ہے کیوں قتل گاہ سے قاتل
ٹھہر ٹھہر کے ترا دل سے جاں نثار آیا

کسی نے نقش ابھارا نہ عشق کا محمود
جو کام آیا تو اک قلب داغدار آیا

(جانصاحب) محمود علی خاں عرف آغا علی خاں تعلقدار)

نیلے سمندر کی کہانی

کہتے ہیں کہ آوٹی کے ستیوں کی یہ خواہش ہوئی کہ اپنی وادی کے بیچ میں ایک مندر بنائیں - اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے پیالے پر سامان اور مصالحہ جمع کیا اور ایک

عظیم الشان عمارت بننے لگی۔ لیکن جب ختم ہونے کو تھی تو یکایک گر پڑی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ معمار اور مزدوران الگ حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہوا۔ پھر دوبارہ مندر تعمیر کیا گیا تو وہ بھی عین تکمیل کے وقت گر کر پاش پاش ہو گیا۔ جب تیسری مرتبہ بھی یہ ہی حال ہوا تو بادشاہ نے ایک مشہور و معروف رمال کو بلا کر پوچھا کہ تم اپنے علم کے زور سے دریافت کرو کہ مندر کی تعمیر کو کیا چیز روکتی ہے۔ اُس نے غور و خوض کے بعد بتایا کہ سرزمین مشرق میں ایک ولی رہتا ہے وہ اس راز سے آگاہ ہے۔ اس کے پاس جاؤ۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کس خاص مقام میں سکونت پذیر ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد ایک خوش وضع۔ بذلہ سنج۔ نیک نہاد۔ دلیر اور جری لاما کو یہ خدمت سپرد ہوئی وہ گھر سے نکلا اور مدت تک تاتاری قبیلوں کے گھروں میں خاک چھانتا پھرا۔ مگر اس کی محنت بار آور نہ ہوئی۔ مایوس ہو کر وہ واپس آ رہا تھا کہ اس کا گذر ان وسیع میدانوں میں ہوا۔ جو دشت کو سے جدا کرتے ہیں۔ راہ میں یکایک اس کا زین بند ٹوٹ گیا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا جھونپڑا نظر آیا جہاں ایک غریبانہ خیمہ استادہ تھا۔ لاما اس خیمہ کی طرف گیا۔ اس خیمہ میں ایک پیر مرد عبادت الٰہی میں مصروف تھا۔ لاما نے اسے دعا دی۔ پیر مرد نے اسے چولھے کے پاس بٹھا لیا۔ یہ پیر مرد اندھا تھا۔ لاما نے کہا کہ میں نہایت رنج اور قلق سے دیکھتا ہوں کہ تم نابینا ہو۔ پیر مرد نے جواب دیا کہ ہاں مدت سے میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ میں سورج کی چمک اور سبزۂ گلشن کی لہک نہیں دیکھ سکتا۔ مگر بندگی اور عبادت میرا غم غلط کر رہی ہے۔ تمہارے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے قبیلے سے نہیں ہو۔ لاما نے کہا کہ جناب کا خیال درست ہے میں مشرق کی طرف کا ایک غریب لاما ہوں۔ میں نے منت مانی تھی کہ ان تمام مندروں کے درشن کروں گا جو منگول کے علاقوں میں تعمیر ہوئے ہیں۔ اور بزرگوں کے سامنے سر نیاز جھکاؤں گا۔ یہاں میرا زین بند ٹوٹ گیا ہے اور تمہارے خیمہ میں مرمت کے لئے آیا ہوں۔ بوڑھے نے کہا کہ افسوس میں خود تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نابینا ہوں۔ مگر اس خیمہ میں کئی جری بیٹیاں بڑی

ہیں۔ تم خود تلاش کر لو۔ ہنگام تلاش بوڑھا بولا کہ اے مشرقی سرزمین کے آقا تم بڑے نیک
کام کے لئے گھر سے نکلے ہو تمہیں مبارک ہو۔ منگول قوم کے علاقوں میں بڑے بڑے شاندار
مندر موجود ہیں۔ بت والوں کو کبھی یہ نصیب نہ ہوگا کہ وہ کبھی ایسا مندر تعمیر کر سکیں
انکی کوشش ہمیشہ رائگاں جائے گی۔ زمین کے اندر سمندر رہتا ہے۔ اس کی لہریں ہمیشہ
مندر کی بنیادوں کو گراتی اور مسمار کرتی رہے گی اور اسطرح گراتی رہے گی جیسے کوئی چور
نقب لگا رہا ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر سرمرد بولا کہ میں نے یہ الفاظ ان لئے منہ سے
نکالے ہیں کہ تم قوم منگول کے لاما ہو۔ کبھی یہ راز اگر اوٹی کا کوئی لاما ملے تو اسے نہ بتانا
اگر یہ راز بھولے سے بھی تم نے افشا کر دیا تو ہمارا ملک تباہ ہو جائے گا۔ اوٹی والے اسی
وادی سے سمندر کے پانی کا رخ ادھر کر دیں گے اور ہمارے ہرے بھرے میدانوں میں ایک
خوفناک سیلاب آ جائے گا۔ ابھی کور چشم سرمرد کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے نہ پائے تھے۔
کہ اصلی الڈ کھڑا ہوا اور کڑک کر بولا۔ او بدقسمت بوڑھے ابھی جا اپنے آپ کو جلدی بچا
اب کوئی دم میں سمندر کا پانی یہاں آ جائے گا۔ خبردار ہو جا وادئی اوٹی کا ایک لاما ہوں"
یہ کہکر اوٹی کا لاما گھوڑے پر سوار ہو لیا اور برق خاطف کی طرح چشم زدن میں
ریگستان سے گذرتا ہوا غائب ہو گیا۔

اندھے پر بجلی سی گر گئی۔ پہلے تو وہ دم بخود رہ گیا۔ پھر چلا چلا کر رونے اور اپنے
بال نوچنے لگا۔ اتنے میں اس کا بیٹا اپنے مویشی چراگاہ سے لیکر آ گیا۔ بوڑھے نے چلا کر
کہا کہ بیٹا کیا دیکھتا ہے گھوڑے پر زین ڈال کٹار سنبھال اور مغرب کی طرف ہوا ہو جا۔ ایک
اصلی لاما گھوڑا سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ بچ کر جانے نہ پائے اسے قتل کر ڈال اس نے
میرے بڑھاپے کی مٹی خراب کی ہے۔ نوجوان نے خوفزدہ ہو کر کہا کہ ابا جان خیر تو ہے آپ کیسی الجھی
گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ بزرگ ہیں۔ عابد ہیں آپ ایک اصلی کو صرف اس خطا پر کہ اس نے
ہیں سدھ چرانا ہے واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس اصلی کو زیں بند کی ضرورت
ہوگی۔ اندھے نے بیتاب ہو کر کہا کہ بس بس میں سری سمت کرتا ہوں۔ جا جا جلدی جا
اس اصلی کو بے دریغ قتل کر ورنہ ہمارے قبیلہ کے تمام لوگ غرق ہو جائیں گے۔

نوجوان کو یقین ہو گیا کہ میرا باپ دیوانہ ہو گیا ہے۔ یا عارضی طور پر اس کے دماغ میں خلل واقع ہوا ہے ناچار اسے خوش کرنے کو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اڈنی کے لاما کے تعاقب میں نکلا۔ اور کچھ فاصلہ پر اسے جا لیا۔ اور کہا "اے مرد مرتاض میں نے آپ کا ہرج کیا اور راہ میں روکا آپ کی منزل کھوٹی ہوتی ہے جس کے لئے میں شرمسار اور طالب معافی ہوں۔ بات یہ ہے کہ آج صبح آپ ہمارے خیمہ میں ٹھہرے تھے۔ اور ایک زین بند لے آئے جو میرا بوڑھا باپ غم اور غصہ سے بیتاب ہو رہا ہے اور اس نے مجھے تمہیں مار ڈالنے کا حکم دیا ہے بچہ اور بوڑھا یکساں ہوتے ہیں۔ اس لئے میں باپ کا حکم جو غالباً عارضی دیوانگی کا نتیجہ ہے ماننے کو تیار نہیں ہوں آپ مجھے وہ زین بند واپس دیدیں تاکہ اس کا غصہ ٹھنڈا کر سکوں۔ یہ سنکر اڈنی کا لاما گھوڑے سے اترا۔ اور زین بند واپس دے کر بولا۔ تمہارے بزرگ باپ نے خود یہ زین بند مجھے دیا تھا۔ اب وہ پچھتاتا ہے۔ اس لئے اسے واپس لے جاؤ۔ بوڑھے اکثر وہمی مزاج ہوتے ہیں۔ گھڑی میں تولہ تو گھڑی میں ماشہ پھر بھی ہمارا فرض ہے کہ ان کی عزت کریں"۔

نوجوان زین بند لے کر خیمہ میں واپس آگیا

اب رات ہو چکی تھی خیمہ کے گرد گلہ بان جمع تھے۔ بوڑھا زار زار گریہ و زاری کر رہا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ ولی کیوں رو رو کر جان کھو رہا ہے۔ اس اثنا میں نوجوان آگیا۔ اور پکارا کہ ابا ابا۔ اپنی طبیعت کو سنبھالو۔ میں زین بند لے آیا ہوں۔ بوڑھے نے کہا "او ناخلف کیا ہوا کیا تم نے اسے ہلاک کر دیا"۔ لڑکے نے کہا کہ میں نے اسے امان دی اور اپنے ملک کو واپس جانے کی اجازت دیدی۔ وہ نیک آدمی تھا۔ اگر میں اسے قتل کرتا۔ تو میرا جرم ناقابل معافی تھا۔ بوڑھے نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا کہ مغرب نے مشرق پر فتح پائی خدا کی مرضی یہی تھی۔ پھر گلہ بانوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا کہ بھاگو یہاں سے جسقدر جلد ہو سکے اپنے مویشی اور بھیڑیں لے کر یہاں سے نکل جاؤ ورنہ بہتا ہوا پانی تمہیں تباہ کر دے گا۔ یہ کہکر وہ خیمہ میں منہ کے بل زمین پر پڑ گیا۔ اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد زیر زمین گرج کی آواز سنائی دی ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ تیز رو ندیاں بڑے زور و شور سے بہہ رہی ہیں۔ اور لہریں اور موجیں اچھلتی کودتی ایک دوسرے پر گرتی پڑتی۔ پہاڑیوں سے ٹکراتی۔ شور مچاتی۔ ہنگامہ حشر برپا کرتی بلندی سے جانب نشیب اترتی آ رہی ہیں۔ جھیل کے پاس جو جوہڑ تھا اسمیں تلاطم برپا ہو گیا پھر بھونچال آیا۔ اور ہیبت ناک دھماکوں کے ساتھ زمین پھٹ گئی اور وہ پانی جو زیر زمین تھا۔ عجب کھلبلی اور تیزی کے ساتھ نکلا اور ایک وسیع سمندر کی طرح میدان میں پھیل گیا۔ اسوقت ہزاروں انسان اور حیوان جنہیں بھاگنے کی مہلت نہ ملی تھی۔ لقمہ اجل ہوئے اور سب سے پہلے کور چشم پیر مرد ہلاک ہوا۔

اوٹی کے لاما نے وطن پہونچکر اہل وطن کو اصلیت سے آگاہ کیا۔ اور بتایا کہ یہ زلزلہ اسوجہ سے آتا ہے کہ زیر زمین سمندر کی رخ گردانی مشرق کی طرف کر دی گئی ہے اس کے بعد تعمیر کا کام جو نادل ناخواستہ چھوڑ دیا گیا تھا از سر نو جوش و خروش سے پھر شروع ہوا اور آخر کار وہ عظیم الشان مندر بن گیا۔ جو اسوقت تک موجود ہے۔ پھر بہت سے کسوں نے اس مندر کے ارد گرد اور قرب و جوار میں مکان بنا لئے اور اسطرح رفتہ رفتہ عظیم الشان شہر آباد ہو گیا جسے بعد میں لاہسا کہنے لگے۔ اور بدھ مت کا دار الخلافہ بن گیا۔ لاہسا کے لفظی معنی "ارواح کی سرزمین" ہیں۔ پہلے سمندر کی یہ عجیب و غریب کہانی کوکونور اور لاہسا میں زبان زد خلائق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ من گھڑت کہانی تاریخی اصلیت سے بہت دور ہے۔

(نسرہ بیگم)

نمکدانِ ظرافت

ناولسٹ۔ افسوس میری کتاب ناپسند کی گئی۔ اب میں اسی ندی پر جاؤں اور کتے کو مار کر خودکشی کر لوں گا۔ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں

کتب فروش۔ بھئی کتے کو تو نہ مارنا۔ دو روپیے کو بکجائے گا۔ باقی تم جانو

بیوی - (چلا کر) میاں دوڑنا - دوڑنا - دوڑ
میاں - (دوڑ کر) کیوں! کیوں!! کیوں!!!
بیوی - "چوہے دان لگانا - چوہے دان - میں نے ابھی چوہے کی آہٹ سنی ہے"۔

لیڈی - "سنا ہے تمہارے بیٹے کی شادی ہے - امید ہے وہ خوش نصیب ہوگا"
جنٹلمین - "کیوں نہیں - یورپ کی جنگ عظیم میں بھی تو وہ زندہ اور سلامت واپس آگیا تھا"

باپ - "بیٹا میں سنتا ہوں - کہ اپنی ماں کے روبرو تم نے کئی بار جھوٹ بولا ہے - کیا تم وعدہ کرتے ہو - کہ آئندہ ہمیشہ سچ بولو گے؟
بیٹا - "ہاں ابا جان"
باپ - "شاباش! دیکھو باہر کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے"
بیٹا - "ابا قصائی بل لے کر آیا ہے - کہو تو کہہ دوں کہ ابا گھر نہیں ہیں"

لڑکی - (باپ سے) "ابا دیکھو نا - بھائی جان کہتے تھے کہ سرخ جھنڈی دکھانے سے گاڑی ٹھہر جاتی ہے"۔
باپ - "(جوش سے رہ جانے کی وجہ سے پریشان تھا) ہاں ٹھیک ہے"
لڑکی - "لیکن میں نے تو کتنا اپنے سرخ دوپٹے کو ہلایا - مگر گاڑی کیوں نہیں ٹھہری؟

بہن - "ہیں ہیں - اصغری یہ چوری کی عادت تم نے کس سے سیکھی ہے -
اصغری - "آپا جان کیٹی (بلی کا نام) سے"۔

ماسٹر - محمود کیا گلاب جامن کے واسطے انگریزی میں کوئی لفظ ہے؟
محمود - جی ہاں   **ماسٹر** - "اچھا بتاؤ"
محمود - "گلاب جامن کو انگریزی میں روز جامن کہتے ہیں"۔

مجسٹریٹ - "اس مقدمہ میں عجیب بات یہ ہے - کہ تم نے بکس لوٹ لیا - لیکن اس کے قریب اثاثے میں نوٹ پڑے تھے وہ نہیں چھیڑے؟"
ملزم - "خدا کے لئے اس بات کا ذکر نہ کیجئے - میری جورو اسی فرو گذاشت پر میری جان کھاتی رہتی ہے"۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر رشیدہ سلطانہ)

آندھی

۱ محمد الحبیب کی سکونت مراکو کے جنوبی صحراؤں میں تھی۔ وہ صحرا جس میں بہت کم سیاح گئے ہیں۔ اس کا دوست تصحیر میں رہائش پذیر تھا۔ دوسرے تیسرے سال محمد الحبیب اپنے دوست کی ملاقات کو آتا تھا اور چند ہفتے رہ کر واپس چلا جاتا تھا۔ ہر چند کہ سفر دور و دراز تھا۔ مگر دوست کی محبت اُسے سرور کھینچ لاتی تھی۔ آپس دن اونٹ پر سیگوودل تک پہنچنے میں لگتے۔ اور پھر وہاں سے جہاز کرایہ پر لے کر بس یوم میں تصحیر آ جاتا تھا۔ بحری راستہ سے اسے نفرت تھی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ محمد الحبیب اپنے دوست کے ہاں مہمان اور رقص باغ میں فروکش تھا۔ دوست کی فرمائش پر اس نے اپنے صحراؤں کی آندھی کے حالات اسطرح بیان کئے۔ یہ سرگذشت محمد الحبیب کے اپنے الفاظ میں اسطرح پر ہے

(۲) خدا کا موسم بہار گذر چکا تھا اور خدا کا موسم گرما موجود تھا۔ موسم اچھا ہو یا برا خدا کا موسم ہے اور ہر دن خدا کا دن ہے۔ خوشی کے ایام میں ہم صرف زمانۂ حال کو دیکھتے ہیں اور مصیبت کے وقت ہم خوشی کے ایام بھول جاتے ہیں۔ دن آتے ہیں اور جاتے ہیں لیکن خدا کے دفتر میں ایک ایک دن کا اندراج ہوتا ہے

(۳) موسم گرما میں سخت گرمی پڑنے لگی اور گرمی کے باعث گھاس سوکھ گئی۔ اور پتھریلی گھاٹیوں میں چشمے اور تالاب خشک ہو گئے۔ ہم بلندی سے نیچے میں چلے گئے۔ اور اپنے سیاہ خیمے نصب کر کے وہیں رہنے لگے۔ جو مقامات نشیب میں ہیں وہاں گرمی میں بھی پانی کا قحط نہیں ہوتا ہماری تعداد مرد۔ عورتیں اور بچے ملا کر ستر کے قریب تھی اور ہمارے ساتھ بکریوں کے گلّے اور اونٹ تھے۔ دنیا و مافیہا سے ایسی جائے سکونت نہ لئے رہتے تھے۔

(۴) ایک دن ہمارا قیام ایک نخلستان میں ہوا جہاں ہم نے اپنے خیمے جو بکری کی پشم اور اون کے تھے۔ لگائے۔ اور بکریوں اور اونٹوں کو چرانے کے لئے چھوڑ دیا۔

صرف دودھ دینے والی اونٹنیاں رکھ لیں۔ ہماری گذران کھجوروں اور اونٹنیوں کے دودھ پر تھی کبھی کبھی دعوت کے موقعہ پر ہمیں روٹی اور گوشت اور حلیم بھی میسر آجاتی تھی۔ گرمی میں کسی کی مجال نہیں کہ شکار کے لئے خیمے سے باہر جائے۔ دھوپ کی تپش ہر ذی روح کو ادھ موا کر دیتی ہے۔ دن کے وقت آتش بار ہوا کا دروازہ جو ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور رات کو آدھی رات تک اور آدھا دن ہم صرف مکانات میں بسر کرتے تھے۔ ہم میں جو حافظ قرآن تھے وہ کلام مجید پڑھ کر اور سنا کر داخل ثواب ہوتے تھے۔

(۶) اس طرح پر دن آتے اور جاتے تھے۔ اور ایک ایک دن خدا کے دفتر میں درج ہو رہا تھا۔ یکایک آندھی کی علامتیں نمودار ہوئیں۔ جو جانے والوں کے لئے مال جان ہے۔ تین دن تک تو ہلکی ہلکی ہوا چلتی رہی۔ چوتھے دن آندھی آگئی۔ اور ریت برسنے لگا۔ پھر بگولوں نے ریت کے ستون کھڑے کر دیئے۔ ہمارے ہونٹ خشک تھے۔ ہماری پیاس بجھی ہوئی تھیں۔ اور ہم بارگاہ خداوندی میں اپنی سلامتی کی دعا مانگ رہے تھے۔ کیونکہ گرمی عذاب دوزخ اور قہر خدا ہے۔ ہم نے ہر چند چاہا کہ پانی کے کنویں ریت سے بچ جائیں مگر ممکن نہ ہوا۔ ہمیں کوئی سرپوش نہ ملا۔ اور کنویں ریت سے بھر گئے۔ ہماری آنکھوں میں ریت بھرا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں سن تھا اور اگر کچھ دکھائی دیتا تھا تو وہ موت تھی۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ جب ہمارے مشکیزے جو ہم نے پانی سے بھر کر ریت میں دبا دیئے تھے خالی ہو جائیں گے تو پھر جانبر ہونا ناممکن ہے۔

دعائیں مانگیں۔ بچے بلک اور عورتیں بین کر رہی تھیں۔ اور آندھی برابر چل رہی تھی۔

(۷) ہماری بھیڑیں جنگل میں منتشر تھیں۔ وہ تمام دم بند ہو کر رہ گئیں۔ کوئی بھی زندہ نہ رہی۔ اونٹ گردن پھیلائے زمین پر پڑے تھے۔ اور پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ ان میں سے جو اٹھ کر صحرا کی طرف دوڑتا تھا۔ ریت کے بگولے فوراً اس کا کام تمام کر دیتے تھے۔ اس وقت تک آندھی برابر چل رہی تھی

(۸) آخر ہمارا پانی ختم ہونے پر آگیا۔ اور ہم سمجھ گئے کہ اب ہم تھوڑی دیر کے مہمان ہیں اسوقت آندھی کے زور اور ہوا کے شور میں ہم نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہ حال تھا کہ ریت کی بوچھاڑ سے ہمارا دم گھٹا جاتا تھا۔ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی اور اگر نکلتی تھی تو بہ مشکل سنائی دیتی تھی۔ بعض کی یہ رائے تھی کہ توکل بر خدا یہیں پڑے رہو۔ اور دیکھو پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اور بعض کہتے تھے کہ نہیں کوشش شرط ہے۔ قدم اٹھاؤ اور گرتے پڑتے ایسی جگہ کی تلاش کرو جہاں پانی میسر آسکے۔ ہم میں بعض پیاس سے نڈھال تھے تشنگی نے انہیں اتنا کمزور کر دیا تھا کہ دو قدم چلنے کی طاقت نہ تھی۔ ناچار ہم میں سے جو چلنے کے قابل تھے۔ سیدھے اونٹوں پر لاد کر چل کھڑے ہوئے۔ ہمارے ہمراہی جو پیچھے رہ گئے تھے۔ خدا جانے ان پر کیا بیتی اور کہاں مرے۔ وہ پھر ہمیں دکھائی نہیں دیئے آندھی اب تک برابر چل رہی تھی؛

(۹) میرا پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ صرف ایک بڑا پیالہ پانی سے لبریز باقی تھا۔ اس پر میں نے گیلا کپڑا ڈال دیا۔ اور اسے ریت کے نیچے رکھ دیا۔ مشکیزے گرمی سے جگہ جگہ سے پھٹ کر چھلنی ہو چکے تھے۔ اور اس لائق نہ تھے کہ ان میں پانی رکھا جائے۔ میری اہلیہ بہت بیتاب تھی۔ میں نے اسے کہا کہ بیوی گھبراتی کیوں ہو۔ جان خدا کی دی ہوئی ہے۔ اسکا مال ہے۔ جب چاہے لے لے۔ موت اور زندگی اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے کرم سے مایوس ہونا گناہ۔ کتنے ہم سے پہلے موت کو لبیک کہہ چکے ہیں۔ اور کتنے ہمارے بعد کہیں گے۔ ابھی تک پیالہ پانی کا موجود ہے۔ آج رات تم اور میں پیاسے رہیں گے علی الصباح اپنے بچہ کو پانی دیں گے۔ جسوقت وہ سیر ہو جائے گا تو تھوڑا تھوڑا پانی ہم بھی پی لیں گے۔ اور باقی پانی بچہ کے لئے رہنے دیں گے۔ تاکہ وہ ہمارے سامنے پانی کو ترستا نہ جائے؛

(۱۰) یہ کہہ کر ہم دونوں سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ہمارا بچہ جسکی عمر صرف سال کی تھی ہماری پائنتی پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا اسوقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا بچہ درخیمہ میں ایستادہ ہے اور اس کے قریب ایک ہرن کھڑا ہے

میرے بچے کے ہاتھ میں وہی پانی کا پیالہ ہے اور پیاسے ہرن کو پانی پلا رہا ہے۔ وحشی ہرن مطلق نہیں ڈرتا۔ اور کھڑا ہوا مرے لیے لے کر پانی پی رہا ہے۔ میں نے یہ نظارہ خواب سمجھا۔ مگر یہ سماں نہ تھا۔ میں نے فوراً اپنی بیوی کو جگایا۔ اس اثنا میں ہرن پانی پی کر میرے بچے کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ میرے بچے نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اسکی گردن کو بوسہ دیا۔ میری بیوی نے چیخ ماری اور کہا لو پانی کا پیالہ جو باقی تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب موت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ابھی تک آندھی برابر چل رہی تھی

(۱۱) یکایک میری بیوی کے ہونٹ پیاس سے خشک ہونے لگے اور وہ تشنگی سے تڑپنے لگی اور چلائی کہ اے خدا کب میرا وقت آئے گا۔ اس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے میں نے اُس سے کہا صبر کرو صبر خدا بڑا کارساز ہے۔ اور مسبب الاسباب ہے۔ یکایک آندھی تھم گئی۔ ہوا بند ہو گئی۔ ابر آسمان پر محیط ہو گیا اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔

(ترجمہ)   (ربیتوں)

شکستہ دل

(فسانہ)

شکیل حسن دولتمند والدین کا اکلوتا بیٹا۔ ماں کی آنکھوں کا نور اور باپ کے دل کا سرور تھا۔ ماں باپ اس پر جان دیتے تھے۔ اس کی معمولی تکلیف سے بے چین ہو جاتے تھے۔

قدرت نے حسن ظاہری اسے دریا دلی سے دیا تھا۔ اسکی منگنی عہد طفلی میں ایک امیر گھرانے میں ہو چکی تھی۔ اسکی منسوبہ عذرا بھی زہرہ جمال اور پری تمثال تھی۔ شکیل کے والد کی تو مرضی تھی کہ جب بی اے کی ڈگری حاصل کر لے تو اسکی شادی رچائی جائے۔ مگر اس کی ماں نے نہ مانا۔ اور ابھی وہ ایف اے کلاس میں تھا کہ شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ الغرض شادی بڑی شان و شوکت اور تزک احتشام سے ہوئی۔ طرفین نے روپیہ کو ٹھیکریوں کی طرح لٹایا اور پانی کی طرح بہایا۔ اور خیر سے دُلھن بیاہ کے بعد دولھا کے گھر آگئی

تکمیل حسن کو اپنی عورت لقا بیوی عذرا سے کمال درجہ کی محبت تھی۔ دونوں کی محبت گل و بلبل کی محبت تھی اور پروانے کی محبت۔ سرو اور قمری کی محبت تھی۔ بیس سال کے عرصہ میں اس نے بی۔ اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور باپ کے رسوخ سے اسکی رسائی اعلیٰ حکام تک تھی۔ چھوٹتے ہی تحصیلدار ہو گیا۔ اور اپنے علاقہ میں جاتے ہی عذرا کو جسکی مفارقت اسے ایک پل گوارا نہ تھی اپنے پاس بلا لیا۔ اب عذرا اپنے شوہر کی اقلیم دل کی ملکہ تھی۔ اور اسکی موجودگی میں تکمیل حسن کو دن عید اور رات شبرات تھی۔

زوال قسمت ہوا ہم کو ثابت　　نہ یکساں رہے گا زمانہ کسی کا

چند سال اسطرح سے گذر گئے۔ یکایک پھر گئی زمانہ نے نقشہ بدل دیا۔ صحبت بد کی تاثیر سے رفتہ رفتہ تکمیل کو مے نوشی کی عادت ہو گئی اور وہ سرشار رہنے لگا۔ عذرا جانتی تھی اور خوب جانتی تھی کہ شراب خانہ خراب اُم الخبائث ہے۔ خدائے ذوالجلال نے قرآن پاک میں اس کا استعمال منع فرمایا ہے۔ اور رسول مقبول کا حکم ہے کہ مسلمانوں کو شراب سے بچو گناہ کی کنجی اور شیطان کا دروازہ ہے۔ جب شیطان نفس انسان پر قابض ہو جاتا ہے۔ تو اس کو شراب کی ترغیب دے کر اس سے ہر ناجائز فعل کرواتا ہے۔ اور شرابی کی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ جبتک وہ توبہ نہ کرے قبول نہیں ہوتے۔ اس لئے اس نے ہزار کوشش کی لاکھ سمجھایا کہ کسی طرح اس کا پیارا شوہر سمجھ جائے اور اس عادت بد سے باز رہے۔ مگر ممکن نہ ہوا۔ استاد ذوق نے سچ کہا ہے۔ ؎

اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

جسوقت وہ شوہر کو سمجھاتی اور کہتی تھی کہ دیکھو صاحب یہ کمبخت عزت۔ دولت صحت۔ نیکی۔ دین ایمان سب کی دشمن ہے۔ ایک دن یہ باعث خانہ ویرانہ ہو گی تو وہ ہنس دیتا تھا اور کہتا تھا کہ تمہیں وہم ہے مجھے تو شراب سے نفرت ہے۔

جب عذرا کی سعی لاحاصل رائگاں گئی اور اسکا شوہر ہر وقت نشے میں مست

رہنے لگا۔ تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگی اور ہر وقت پژمردہ رہنے لگی۔ یہاں تک کہ سوز نہانی سے سخت بیمار ہو گئی۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ شکیل نے جب دیکھا کہ اس کی پری رخسار بیوی کا گلنار رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوتا جا رہا ہے اور وہ وقت قریب ہے کہ اسے دق یا سل کا عارضہ ہو جائے تو اس نے فریب سے کام لیا۔ ہزاروں قسمیں کھائیں۔ سیکڑوں وعدے کئے کہ اب کبھی شراب کو منہ نہ لگاؤں گا۔ اگر اسے پھر چکھوں تو تمہارا اور خدا کا مجرم ہوں گا دیکھو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ اور نوکری چھوڑ کر کہیں ڈوب مروں گا۔ تمہاری افسردگی سے میرا جینا دوبھر ہو رہا ہے۔ برائے خدا میرے حال زار پر رحم کرو۔ اور شگفتہ ہو جاؤ۔ قصہ مختصر عیار شکیل نے صاف دل عذرا کو اتنی تسلیاں دیں۔ کہ اسے یقین آ گیا۔ کہ اب اس کے شوہر نے واقعی سچے دل سے بادہ گساری سے توبہ کر لی ہے اس نے خدا کا شکر کیا۔ اور دن بدن تندرست ہونے لگی۔ خوشی کی کثرت سے چند دن میں اسکا چہرہ پھر کندن کی طرح دمکنے لگا

عرصہ گذر گیا۔ اب بظاہر شکیل عابد و زاہد تھا اور عذرا کو اس کے زہد و تقویٰ پر یقین کامل تھا۔ اسے کیا خبر کہ جب کبھی دورہ پر جاتا ہے یا کہیں دعوت ہوتی ہے تو میخوار دوستوں کا جمگھٹا ساتھ رہتا ہے اور بار بار بادہ پرستی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ یہ پردہ داری عذرا کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئی۔ بادہ خواری رنگ لائی۔ رفتہ رفتہ یار دوستوں نے جو شیطان مجسم تھے۔ اسے بد ذات عورتوں کی طرف مائل کر دیا۔ جن دوستوں کے ہاں محفل رقص و سرود میں آمد و رفت شروع ہو گئی اب گویا اس زمانہ کا آغاز ہو گیا۔ کہ جس کی نسبت ہمارے رسول نے فرمایا ہے کہ قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میری امت کے لوگ شراب اور ہیکڑی کریں گے سود کھائیں گے۔ حرام کو حلال سمجھیں گے رات شراب و کباب اور ناچنے گانے والی عورتوں کی صحبت میں گذاریں گے اور صبح کو بندروں اور سوروں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے اور زمین میں دھنس جایا کریں گے

مثل مشہور ہے کہ سو دن چور کے اور ایک دن شاہ کا۔ آخر عرب عذرا کو اصلیت معلوم ہو گئی۔ اور اسپر غم والم کا پہاڑ گر پڑا۔ سینہ دل چکنا چور ہو گیا۔ اللہ اکبر ایک وقت وہ تھا کہ شکیل عذرا کے سامنے مجرموں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا اپنے فعل کی معافی چاہتا تھا اور ایک وقت یہ تھا کہ عذرا کے حسن کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ غمگین دل اور پژمردہ چہرے اور سرد آہوں کی اسے مطلق پروا نہیں اس کے خیال میں یہ اضطراب بے معنی اور بیقراری وصول ہے۔ عذرا کا گھر جو گلزار ارم تھا اب دوزخ سے بدتر ہے۔ اب اسے کبھی ہنسی نہیں آتی۔ اس کی آنکھوں کا حسین مسرت ہر وقت رقصاں تھی اب یہ حال ہے۔ ؎

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے ہے | کاسۂ نرگس میں خون شبنم رہے ہے

اب وہ کسی سے بات نہیں کرتی۔ اسکا دل جو کبھی راحت اور مسرت کا خزانہ تھا۔ اب مصائب اور آلام کی آماجگاہ ہے۔ اب وہ ہے۔ اور دل شکستہ۔ دل ہے اور زمانہ ماضی کی یاد۔ یاد ہے اور حسرت و یاس۔ یاس ہے اور بحر غم کا تلاطم۔ اس کی حالت زبان حال سے کہہ رہی ہے۔ ؎

دل گذرتا ہو مرا حسرت و ارمانوں میں | شب کو دل رہتا ہو گذری ہوئی افسانوں میں

گو شکیل اب وہ شکیل نہیں رہا جو کبھی عذرا کی ہر ادا کا دیوانہ تھا۔ لیکن عذرا کے دل میں شکیل کی شمع محبت بدستور روشن ہے۔ شاید مرنے کے بعد بھی گل نہ ہو گی۔ جب سہیلیاں ملنے کو آتی ہیں تو وہ یہ شعر پڑھتی ہے۔ ؎

میں وہ چراغ ہوں جسکو فروغ ہستی نے | قریب صبح کیا روشن اور بجھا بھی دیا

(مسز شیخ مرید احمد سب انسپکٹر پولیس)

محبت والے

داور حشر جب آئیں گے محبت والے | بھول جائینگے قیامت کو قیامت والے

اسقدر محو محبت ہو کہ عشاق کی طرح | نقش تصویر خیالی ہیں محبت والے

شب کو ہیں ماہی بے آب تو دل کو سیماب | کیسے مختلف طبیعت ہیں محبت والے

شمع کا رم میں جاؤ وہیں پگھل کر رونا — موم ہو جاتے ہیں پروانے محبت والے
زخم دل تمغۂ عزت ہے ترے اہل وفا — اسکو سینے سے لگاتے ہیں محبت والے
سوز کو درد کو ایثار کو اور خدمت کو — اپنا ایمان سمجھتے ہیں محبت والے
بخدا خاک مری ان کے قدم چومے گی — مری تربت پہ جب آئیں گے محبت والے
عالم حسن میں توام ہیں زوال اور کمال — دیکھ لیں چاند کا منہ پیاری صورت والے
سرمہ کر دیتے ہیں پتھر کو پگھل کر آنسو — اتنے شہ زور ہیں نیرنگ طبیعت والے
دل کی اقلیم اگر مصر محبت ہو جائے — ماہ کنعاں کی طرح آئیں محبت والے

قیس و فرہاد کو بھی ساتھ لئے چل احمد
پیش محشر میں اکٹھے ہوں محبت والے

چیف ایڈیٹر (احمد حسین خاں)

کیا آپ کا گھر ان کتابوں سے خالی ہے؟

روح القرآن تبلیغ کے مطلب کی کتاب ہے ہر مبلغ ہر واعظ ہر اسلامی انجمن ہر مسلمان کے پاس یہ کتاب موجود رہنی چاہئے اسمیں کلام پاک کے کل مضامین کی فہرست مختلف عنوانوں میں نہایت ترتیب سے محققانہ طریقہ سے اور موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے تیار کی گئی ہے ذرا سی دیر میں آیت مطلوبہ عربی کا مادہ واقف ہو جانا اسکی مدد سے ہر آیت کا مطلب سمجھ سکتا ہے اعلیٰ آیتوں کی حاشیوں میں رکوع کی آیت وار اصلاحوں در رسالوں کے سویرے کا کام کر دیا ہے

روحانی کرشمے مسمریزم و عمل کیا کام کرتی ہیں اس کتاب سے معلوم کیجئے۔ اس میں روحوں کے سچے واقعات درج کئے گئے ہیں مرنے کے بعد روح کوئی ڈرنے کی چیز نہیں۔ اس کتاب سے خوب تر بیوں پر علمی روشنی پڑتی ہے۔ قیمت (۸)

ماں بچہ کی نگہداشت۔ گھر گھر بچوں کی بے وقت موت اور ماؤں کی خرابی صحت کا کہرام مچا ہوا ہے۔ یہ کتاب زخمی دلوں کے لئے صحیح کا مرہم ہے۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ۱ر

رفیق زمیندار۔ ملک ہر شخص کا بہترین رہبر ہے۔ دیہاتی اصلاح پر اس سے بہتر عالمانہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اسمیں طرح طرح کی بیماریوں سے بچنے اور جوڑنے مویشی پالنے اور انکی بیماریوں کو دور کرنے اور بچوں کو پالنے اور پڑھانے وغیرہ کے عملی طریقے بتائے گئے ہیں دوسرا ایڈیشن قیمت (۸)

ان کتابوں کا محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ یہ کتابیں مولوی محمد طاہر صاحب ایم اے ایل ایل بی کی تصنیف ہیں علاوہ ازیں لکھائی چھپائی کاغذ وغیرہ عمدہ

مولوی محمد عمر مہتمم سلسلہ سرمایہ اطفال گڑگانوہ پنجاب









مهدار مکل



ٹوڈر مل

جلد ۷ نمبر ۵ بابت ماہ فروری ۱۹۲۹ء

شذرات

پروفیسر رام سروپ صاحب کوشل ایم۔ اے کے نام نامی سے تمام ہندوستان واقف ہے۔ آپ روشن ضمیر انسان اور سدا بہار مصنف ہیں۔ آپ کی طبیعت میں بلا کی آمد ہے اور ذہن اس قدر رسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ زود نویس اتنے ہیں کہ ہم نے اس طرح کے قلم برداشتہ لکھنے والے بہت کم دیکھے ہیں۔ آپ بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں اور جو احسان آپ نے اردو زبان پر کیا ہے۔ وہ محتاج بیاں نہیں۔ آپ کی تازہ تصنیف **پیام محبت** ہے جو اردو زبان میں اسی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے ایک نہایت دلچسپ پیرائے میں ثابت کیا ہے۔ کہ ہم لوگ جو ہندوستان میں آباد ہیں۔ بھائی بھائی ہیں۔ خواہ ہمارا مذہب یا عقیدہ کچھ ہی ہو۔

اس دعوے کو پروفیسر صاحب موصوف نے شری کرشن بھگوان۔ حضرت محمد خیر البشر۔ بابا نانک۔ حضرت مسیح۔ بھگوان بدھ۔ حضرت زرتشت۔ راجہ رام موہن رائے۔ بھگوان مہاویر سوامی اور سوامی دیانند سرسوتی کی سوانح عمری اور ان کی تعلیم سے ثابت کیا ہے۔ اس بے بدل کتاب کو آپ نے حضرت بانیٔ اسلام کے دیگر تمام بزرگوں کی تصاویر سے آراستہ کیا ہے۔ جناب رسُول کی سیرت کے ساتھ مکّہ معظمہ کا فوٹو ہے۔ طرز بیاں دلکش اور برجستہ۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔ پروفیسر صاحب اسوقت غالباً آئی۔ سی۔ ایس ہوتے۔ لیکن محض ادبی خدمت کے لئے آپ نے ایک شاندار آسامی کو ترک کر کے ایثار کا انوکھا ثبوت دیا ہے۔ یہ خوبصورت اور دلکش کتاب دیوان چند اینڈ سنز تاجران کتب ریلوے روڈ لاہور سے ایک روپیہ چھ آنہ کو دستیاب ہو سکتی ہے۔ اس کی ضخامت ۳۲۵ صفحے ہے۔

ایڈیٹر کرامت اللہ صبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شباب اردو



علم دین دین مسیحی کی برکات سے محروم عیسائی تھا اس میں شک نہیں کہ وہ دولت مند اور صاحبِ جمال تھا۔ مگر قدرت نے اُسے وہ حسن دیا تھا جسے "مہلک حسن" کہنا چاہیے۔ یعنی وہ حسن جو جنگل کے شیر، صحرا کے پلنگ، ریگستان کے اژدہا اور سمندر کے نہنگ میں دکھائی دیتا ہے اور جس سے شکار مبہوت ہو کر موت کے منہ میں خود بخود چلا آتا ہے۔ اس مہلک حسن اور بے پایاں دولت کی بدولت علم دین کا یقین تھا کہ تمام جہاں کی دختراں تو اُس کی کنیزیں ہیں جسے چاہے وہ اپنا بنا سکتا ہے بیشک اُس نے دولت کی طاقت اور اپنے حسن کی طلسمی [illegible] لیکن گھر تباہ اور برباد کئے مگر [illegible]

ہر فرعونے را موسیٰ ؏

سکندرہ بھی عیسائی باپ کی بیٹی تھی۔ ماں کے دفعتہ جاں بحق ہونے سے وہ بے سہارا ہو گئی۔ ساتھ ہی مفلسی نے اُسے پریشان کر دیا۔ مجبور ہو کر وہ ایک سوداگر کی عالیشان دکان پر ملازم ہو گئی۔ صبح سے لیکر شام تک گاہکوں کو جو اس دکان پر طرح طرح کے اسباب خریدنے آتے اشیائے فروختنی دکھاتی تھی اور جب دکان بند ہوتی تو گھر واپس آتی تو تھک کر چور ہو جاتی تھی۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ صرف چالیس روپے ماہوار ملتے تھے جس سے مشکل گذران ہوتی تھی۔ چالیس میں سے دس روپے مکان کا کرایہ دینا پڑتا اور دس روپے مادر چرچ لیتی تھی۔ ایک دن علم دین اس دکان پر گھڑی خریدنے آیا۔ سکندرہ کو دیکھا اور فریفتہ ہو گیا۔ اُس کا فریفتہ ہونا حق بجانب تھا کیونکہ سکندرہ خورشید جمال تھی۔ ماہ پیکر تھی۔ اُس کی آنکھیں فرنگستان کی لڑکیوں جیسی۔ اُس کے بال سنہری اور جسم نازک اور سڈول تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر بیس سال کی تھی مگر بظاہر سولہ سال سے اوپر معلوم نہ ہوتی تھی۔



”نہیں نہیں میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ میں واپس جاؤں گی۔“

جس وقت سکندرہ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تو رنگ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ علم دین حیران تھا کہ اسے کیا ہو گیا۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دونوں موٹر میں سوار ہو کر ہوٹل میں آئے تھے۔ موٹر باہر کھڑی تھی۔ چائے پی کر علم دین جو باہر گیا تو اُس کی عدم موجودگی میں اصلیت کھل گئی اور سکندرہ کو معلوم ہو گیا کہ اُس نے سخت غلطی کی کہ ایک چھپے ہوئے بدمعاش کے قول و قرار پر اعتبار کیا اور اس کے ساتھ چلی آئی۔ بات یہ ہوئی کہ علم دین کی عدم موجودگی میں کہیں ہوٹل کا خانساماں کمرے میں آ گیا اور اُس نے سکندرہ کو مسز علم دین کہہ کر مخاطب کیا اور اسی خانساماں کی زبانی اُسے معلوم ہو گیا کہ علم دین نے رجسٹر میں اُسے اپنی بیوی درج کرایا اور رات وہاں ٹھہرنے کا بندوبست کیا ہے۔ اُسے وہ یہ کہہ کر لایا تھا کہ میں تمہیں اپنی ماں کے پاس جو مہو میں ہے لیے چلا ہوں۔ وہاں چند دن تم رہو گی اور پھر حسب ضابطہ شادی کی رسوم ادا کی جائیں گی۔ ہوٹل میں ٹھہرتے وقت اُس نے یہ یقین دلایا تھا کہ صرف چائے پینے اور سستانے کو ٹھہرے ہیں ابھی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔

علم دین جب اس کمرے میں جہاں سکندرہ بیٹھی تھی داخل ہوا اور اُس کی زبان سے وہ کلمات جو اوپر درج ہو سکے ہیں سنے تو حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا۔

"تمہاری یہ بات کیا ہے۔ آخر تم بدل کیوں گئیں؟"

سکندرہ نے کہا "اس لئے کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ تم دغاباز ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ غدار ہو۔ میری عقل پر پتھر پڑے تھے میں نے تم کو شریف سمجھا۔ اب میں واپس جاؤنگی۔"

علم دین۔ "کہاں اور کس جگہ جاؤ گی۔ تم نے تو دوکان کی نوکری چھوڑ دی۔ اب تم کسی طرح واپس نہیں جا سکتیں دیکھو تم بدنام ہو جاؤ گی۔ کہیں کی نہ رہو گی۔ اس میں شک نہیں کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ میری بیوی پہلے سے موجود ہے لیکن میں تمہیں رانیوں اور شہزادیوں کی طرح رکھوں گا۔ تمہاری سواری کے لئے موٹر۔ تمہاری رہائش کے لئے عالیشان کوٹھی۔ تمہارے استعمال کے لئے زرق برق لباس اور الماس نگار زیور ہوں گے۔"

سکندرہ "میں تمہاری تمام چیزوں پر لعنت کرتی ہوں۔ بہتر ہے کہ مجھے واپس جانے دو ورنہ پچھتاؤ گے"

علم دین "سکندرہ ہوش کی دوا کرو۔ تم لاہور سے بتیس ۳۲ میل کے فاصلہ پر ہو۔ بیشک ہوٹل اسٹیشن سے قریب ہے۔ مگر اب کوئی گاڑی لاہور نہیں جاتی۔ تمہیں تمام رات یہاں ٹھہرنا پڑیگا۔ تم کہا کرتی تھیں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اب تمہیں کیا ہو گیا"

سکندرہ۔ "میں اندھی تھی اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مجھے تم سے کبھی محبت نہیں ہوئی میں تمہارے دھوکے میں آ گئی ہوں تمہیں نفرت اور حقارت اور لعنت کے قابل سمجھتی ہوں"

یہ کہکر سکندرہ کرسی سے کھڑی ہو گئی اور دروازے کی طرف چلی مگر علم دین دروازے میں ڈٹ گیا اور راستہ روک لیا۔ خوش قسمتی سے اسوقت ہوٹل کا منیجر جو بوڑھا پارسی تھا آ گیا۔ سکندرہ نے اُسے کہا کہ میں لاہور جانا چاہتی ہوں۔ یہ صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ مجھے ضروری جانا ہے یہ دو نوٹ دس دس روپے کے آپ کی نذر ہیں۔ کوئی انتظام کر دیجئے۔ منیجر نے کہا کہ بانو اس وقت سوائے اس کے اور کچھ بندوبست نہیں ہو سکتا کہ آپ اس لاری میں جو تیار کھڑی ہے بیٹھ جائیں۔ دو گھنٹے میں آپ لاہور پہنچ جائینگی سکندرہ نے منیجر کا شکریہ ادا کیا اور اسباب اُٹھا کر اُس کے ساتھ ہو لی۔ اور علم دین منہ دیکھتا رہ گیا +



لاہور پہنچکر سکندرہ کچھ عرصہ بیکار رہی۔ پھر ایک سہیلی کی کوشش سے ہسپتال میں نرس ہو گئی۔ ایک

سال کے بعد جن ایام میں یہ نرس تھی۔ اتفاق سے مسٹر ایس لال بیرسٹر موٹر سے گر پڑا۔ سر میں سخت چوٹ آئی اور بیہوش ہوگیا۔ اُس کے تعلق دار اُسے ہسپتال لے گئے۔ جہاں عمل جراحی کے بعد اُسے تین ماہ تک ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ تندرست ہوکر جانے سے رخصت ہوا تو اُسے معلوم ہوا کہ ہسپتال کا کمرہ سکندرہ کی موجودگی میں اُسکے لئے فردوس بریں تھا اور اس کی عدم موجودگی میں اُس کی عالیشان کوٹھی دوزخ سے بدتر ہے۔ یہی حال سکندرہ کا تھا مسٹر لال کے چلے جانے کے بعد ہسپتال اُس کے حق میں زندان بلا ہوگیا محبت کی آگ دونوں طرف بھڑک اُٹھی۔ اِدھر سکندرہ بیقرار تھی تو اُدھر بیرسٹر صاحب بیتاب تھے ؎

دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی

مسٹر لال کی عمر پچیس ۲۵ سال کی تھی۔ وہ ایک دیار قدر رسا جوان تھا۔ ورزشی بدن جسم سانچے میں ڈھلا ہوا اور فراخ سینہ جس سے غیر معمولی جسمانی طاقت کا ثبوت ملتا تھا۔ بیرسٹر صاحب کی شہرت کا آفتاب اس وقت نصف النہار میں تھا۔ دس سال سے وہ وکالت کر رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ مسٹر رام نرائن کے ریٹائر ہونے پر وہ ضرور ہائی کورٹ کے جج ہونگے۔ لوگوں کا گمان درست نکلا۔ اور ایسا ہی ہوا — بیرسٹر صاحب کے جج ہوتے ہی سکندرہ نے ہسپتال کی نوکری چھوڑ دی اور بڑے دن کی تعطیلوں میں اُس کی شادی مسٹر لال سے ہوگئی۔ شادی سے پہلے سکندرہ نے کئی بار چاہا کہ علم دین کی حرکت سے بیرسٹر صاحب کو آگاہ کردے مگر حوصلہ نہ پڑا ٭

چھ سال گذر گئے۔ چھ سال کے بعد مسٹر لال آنریبل سر ایس لال اور سکندرہ لیڈی لال کہلانے لگیں ایک دن کا ذکر ہے کہ لیڈی لال اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ ایک شخص ان کی ملاقات کے لئے آیا اور کہنے لگا "لیڈی صاحبہ۔ گردش زمانہ اسی کا نام ہے۔ ایک دن وہ تھا کہ آپ ایک سوداگر کی دکان پر نوکرانی کی حیثیت میں کام کرتی تھیں اور میں امیر کہلاتا تھا اور اب آپ امیر اور میں فقیر ——"

یہ شخص علم دین تھا سات آٹھ سال کے عرصہ میں اس کی قلب ماہیت ہوچکی تھی۔ جنہوں نے اس عرصہ سے پہلے اُسے دیکھا تھا اگر اب دیکھتے تو ہرگز پہچان سکتے۔ وہ قبل از وقت بوڑھا ہوگیا تھا۔ بال سفید تھے۔ چہرہ لمبا اور پچکا ہوا تھا۔ اس کا لباس میلا اور بوسیدہ تھا۔ جب بولا تو لیڈی لال نے اُسے پہچانا۔ وہ سیدھی ہوکر کرسی پر بیٹھ گئیں اور علم دین سے اس طرح مخاطب ہوئی ۔

سکندرہ "مسٹر علمدین تم یہاں کیوں آئے میرے گھر میں تمہارا کیا کام ہے؟"
علم دین۔ مالو کیا تم مجھے بھول گئیں۔ وہ محبت جو اُن حال ہو گئی؟
سکندرہ۔ زبان سنبھالو۔ مجھے صرف اپنے شوہر سے محبت ہے تم سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ میں کم سمجھ لڑکی تھی۔ تمہارے دام فریب میں پھنسنے کو تھی کہ خدا نے بچا لیا۔ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ تم رذیل اور پاجی ہو۔ میں نہیں قابل نفرت سمجھتی ہوں اور تم اس قابل نہیں ہو کہ میرے گھر میں قدم رکھو۔ آخر تم کس لئے یہاں آئے ہو؟"
علم دین "۔ مالو میں بہت تنگدست ہوں۔ میں نے کل سے کھانا نہیں کھایا۔ میرا کلیجہ بیٹھا جاتا ہے لیکن میں فقیر نہیں ہوں اگر آپ مجھے تھوڑی سی برانڈی اور سوڈا منگا دیں تو بہت ممنون ہوں گا۔"
سکندرہ نہیں نہیں میرے گھر میں تمہیں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں دی جائیگی۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ میں باہر جانے کو تیار ہوں لیکن تم کہتے ہو کہ تم بھوکے ہو اس لئے میں تمہیں ــــــ"
سکندرہ نے چاہا کہ بیگ کھول کر اُسے کچھ دے کہ علم دین نے اُسے روکا اور سانس جو لیا تو اُس کے منہ سے شراب کی بو آئی لیڈی لال سمجھ گئی کہ وہ سرشار ہے۔
علم دین۔ اگر آپ مجھ سے ایسی ہی بیزار ہیں تو مجھے فوراً اظہار مطلب کرنا چاہیئے۔ آپ کو میں نے کئی بار سرلال کے ساتھ موٹر میں دیکھا تھا۔ واقعی آپ آگے سے زیادہ حسین ہیں۔ ہاں آپ حدسے زیادہ اور حدسے بڑھ کر صاحب ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر عالی وقار کو آپ سے محبت ہے لیکن۔ تو بتاؤ کہ آپ نے اُسے ہوٹل کے واقعہ سے بھی آگاہ کیا ہے یا نہیں؟"
سکندرہ (زرد ہو کر) "اس کی کیا ضرورت تھی؟"
علم دین۔ "بہت ضرورت تھی!"
سکندرہ کھڑی ہو گئی اور بولی۔ تم کیا چاہتے ہو۔ صاف صاف کہو؟"
علم دین "جب تم مجھے حکمہ دے کر چلی آئیں تو میں نے ہوٹل کے رجسٹر سے وہ ورق جس پر میرا اور تمہارا نام درج تھا پھاڑ لیا تھا اور وہ اس بٹوے میں موجود ہے اور اسی میں وہ خط بھی ہیں جو تم نے مجھے لکھے تھے۔ ان خطوط اور رجسٹر کے ورق کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے؟"
سکندرہ "میں جانتی تھی کہ تم بدکردار ہو لیکن اب معلوم ہوا کہ تم رذیل اور کمینے بھی ہو؟"
علم دین "ضرورت سے مجبور ہوں؟"

سکندرہ "میرے پاس ایک ہزار روپیہ نہیں ہے"
علم دین "ایا زیور بیچ کر منگا دو"
سکندرہ "اگر میں انکار کروں تو پھر"
علم دین "ان خطوط کو میں نہایت افسوس کے ساتھ اور جگہ استعمال کرونگا"
سکندرہ "کیا میرے خاوند کو دکھاؤ گے"
علم دین (سرد آہ بھر کر) "ہاں"
سکندرہ "اچھا تو کل اس وقت آنا"



علم دین ٹھیک مقررہ وقت پر آموجود ہوا۔ اُس کا چہرہ بشاش تھا کہ اب روپے ملنے کو ہیں۔ اسے افسوس تھا کہ صرف ایک ہزار روپے کیوں طلب کئے بڑی رقم کیوں نہ مانگی"
سکندرہ "تم وہ خط لے آئے"
علم دین "اس تھوڑے میں ہیں"
سکندرہ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے شادی سے پہلے اسے خاوند کو اس واقعہ سے آگاہ نہ کیا لیکن تم کو معلوم ہے کہ میرا قصور نہ تھا۔ تم نے فریب کیا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ اور جب مجھے تمہاری سرارت معلوم ہوئی تو میں دام فریب سے پاکدامن رہ کر نکل آئی"
علم دین (مسکرا کر) "ہاں تم بڑی ہوشیار نکلیں"
سکندرہ "کیا تم مانتے ہو کہ میں ہوشیار اور پاکدامن ہوں"
علم دین "میں مانتا تو ہوں لیکن اب اگر تم اسے خاوند سے کہو گی تو اس کو تمہاری بات کا یقین نہ آئیگا۔
سکندرہ "اس وقت میں نے اگر ایک ہزار روپے تم کو دیئے تو چند دن کے بعد پھر تم مجھے دق کروگے"
علم دین "قسم لیلو پھر کبھی نہیں آؤنگا"
سکندرہ "تمہارے جیسے پاجی کی بات کا کس کو اعتبار ہو سکتا ہے۔ میرے پاس تمہارے لئے ایک کوڑی بھی نہیں ہے"
علم دین کا چہرہ اس طرح بگڑ گیا جیسے تشنج کی حالت میں ہے۔

علم دین۔ "لو میں تمہارے خاوند کے پاس جاتا ہوں۔"

سکندرہ۔ "کچھ ضرورت نہیں ہے وہ یہیں آ جاتے ہیں۔"

لیڈی لال نے اٹھ کر پردہ ہٹا دیا اور سر ایس لال نمودار ہوئے وہیں پردہ کے پیچھے کھڑے سب کچھ سن رہے تھے۔

علم دین کا رنگ زرد ہو گیا۔

سکندرہ۔ اب تم ان سے فیصلہ کر لو میں جاتی ہوں۔

* * * * * * *

پانچ منٹ کے بعد علم دین جج صاحب کی کوٹھی سے لنگڑاتا ہوا نکلا۔ اُس کا منہ سوجا ہوا تھا دانتوں اور ناک سے خون بہ رہا تھا اور تمام جسم پر ٹھوکروں کے نشان تھے۔ اُس کے جانے کے بعد جج صاحب اپنی جانثار بیوی کے کمرے میں گئے۔ وہ آنکھوں پر رومال رکھے رو رہی تھی۔ سر ایس لال نے اُسے سینے سے لگا لیا اور کہا کہ وہ خطوط میں نے بغیر پڑھے انگیٹھی میں ڈال دیئے اور وہ جل کر راکھ ہو گئے لیکن پیاری نیک بیبیوں کو چاہیے کہ خاوند سے کوئی بات چھپی نہ رکھیں۔ اگر تم غلطی نہ کرتیں تو آج اسقدر تکلیف نہ ہوتی لیکن خیر۔

کہے دیتی ہیں کچھ منہ سے محبت میری ؛ لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت میری

حسب اڈیٹر (خان احمد حسین خاں)

سیر گنگا

(۱)

مہینہ چیت کا ہے جا رہی سرمائی آ رہی ہے ؛ فلک سے دھو کے لایا جام زریں صبح گنگا میں

سہمے ننگے پاؤں آنچل ہاتھ میں ہے شرح ہیں خاص ؛ ہے گھبرائی کہ کوئی دیکھ لے نہ صبح گنگا میں

(۲)

کوئی دوشیزہ چودہ سال کی جس طرح شرما گئی ہو ؛ ہر اک سے بدگماں اپنے سے بھی شرمائی جاتی ہے

اُسی صورت سے ساری پاؤں دبی آہستہ آہستہ ؛ قدم آہستہ اٹھا کر سطح پر گنگا کے رکھتی ہے

(۳)

کوئی شرمیلی دلہن جیسے ساجن کا کہ مکھڑا ہو ؛ ذرا سی سنک پہ جیسے رُخ پہ آنچل ڈال لیتی ہے
یہ چنچل چاندنی ویسے ہی ہر معمولی آہٹ پر ؛ رواں بادل کی ٹکڑا سے عارض کو چھپاتی ہے

(۴)

کسی سنسان بن میں جس طرح پہلوئے عاشق میں ؛ ہزاروں حسرتیں رہ رہ کے ہر لمحہ مچلتی ہیں
اسی صورت سے کرنیں چاند کی گنگا کے سینہ پر ؛ اہا ہا دیکھنا کس ناز و شوخی سے تڑپتی ہیں

(۵)

طلب کا آئینہ جس طرح اک نورانی صورت کو ؛ بٹھا کر اپنے دل میں آپ ہی حیران رہتا ہے
اسی صورت سے اس منظر پہ گنگا کا ہر قطرہ ؛ چمکتے چاند پر سو جان سے قربان رہتا ہے

شاہ افضال الرحمٰن سہیل - بی - اے -



تجدیدِ اُلفت

جن لوگوں کو گذشتہ سال میں بابا بٹی کارلو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اُنہوں نے ضرور کسی نہ کسی تھیٹر یا سرکس یا سیرگاہ میں اُسی عجیب و غریب جوڑے کو دیکھا ہوگا جسے بال اور راہِ مصر گوید یہاں سے آئے ہوئے عاشق و معشوق کہا کرتا ہے۔ حقیقتاً جس وقت میں نے اُنہیں پہلی بار دیکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے الف لیلیٰ کے کسی نیم فراموش شدہ قصہ کے افراد کی تصویریں رقص کرنے لگیں اور عجب کیسی مافوق الفطرت حد کی پُر رومان یادداشتیں تازہ ہوگئیں۔ عورت ابھی کم سن تھی اور دولتِ حسن سے مالا مال، لیکن اُس کا لاغر جسم، اُس کے رخساروں کی پژمردگی اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی زردی مصر سے دوست پال کے دیئے ہوئے نام کی صداقت ظاہر کر رہی تھیں۔ اُس کا خاوند بھی جوان تھا۔ مگر اس کی کمر کا خم، سر دل کی لرزش اور ایک ہی وقت نحیف اور نُرکے سر کا نرالا انداز اس اندرونی کمزوری کا پتہ دے رہا تھا جو اُسے قبل از وقت جوانی کی خوشگوار منزلوں سے پیری کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اُس کی دراز زلفیں سفید ہو چلی

کہیں لیکن وہ اس پر بھی خوش وضع معلوم ہوتا۔ اگر اس کی دائیں آنکھ پر ایک سیاہ پٹی نہ بندھی ہوتی جو باوجود خوبی
ہونے کے چہرے کے اُس بڑے اور بدنما داغ کو چھپانے کے لئے باندھی گئی جس نے اُس کے پورے
چہرے کو جھلسا کر بے مزہ کر دیا تھا۔ کھیل تماشوں کے وقت یہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔ اور عالم محویت
میں خاموش موسیقی کے دلنواز نغموں پر ہمہ تن گوش نظر آتے تھے۔ سبزۂ گلگشت کے وقت بھی یہ دونوں
دوش بدوش اور شانہ بشانہ دکھلائی دیتے تھے اور خواہ باغ کی نسیم عطر بیز سے لطف اندوز ہوں خواہ دُور
اُفق پر برساتی حصہ کے مناظر قدرت سے مسرور ان کی پُر سکون اور پُر خموش حرکات میں ماحول کی چہل پہل
کا کبھی کوئی اثر نہ پڑتا تھا کسی نے انہیں دوسروں کے ہمراہ بھی نہیں دیکھا۔ شاید یہ اپنی پُر سکون زندگی میں
دوسروں کو خلل انداز نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ہر ایک دوسرے کے لئے ایک ننھی سی دنیا تھا جس
میں اس کی دلبستگی کا پورا سامان موجود تھا۔ اس کے باہر لطف ڈھونڈنے کی خواہشات ان کے دلوں میں
مفقود تھیں۔ دن ڈھلے یہ لوگ خدا معلوم کہاں غائب ہو جاتے تھے کسی شخص کو ان کے قیام گاہ تک کا
علم نہ تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ایک خوبصورت قریہ میں ٹھیک میرے سامنے والے مکان میں
یہ عجیب ہستیاں اقامت پذیر تھیں۔ لوگ انہیں مسٹر اور مسز ہمسری کے نام سے یاد کرتے تھے ۔

مسری ملاقات ان لوگوں سے محض اس بنا پر ہوئی کہ حسن اتفاق سے میں ان کا ہمسایہ تھا۔

مسز ہمسری جنہیں پھولوں کی سنگت بھی ناپسند تھی کے اندر آنے سے چلی جایا کرتی تھیں میں اکثر تک
مسٹر ہمسری کے ساتھ سگریٹ نوش کیا کرتا تھا اور بسا اوقات ہم دونوں اس دلچسپ کش مکش میں مشغول ہو جایا
کرتے تھے جس کی ذمہ دار ماحول کی شاعرانہ وسعت اور مناظر قدرت کی کیفیت انگیزی اکثر ہو جایا کرتی ہے۔
اور ایک روز شام کو میری جانب سے بغیر کسی چھیڑ چھاڑ کے اُس نے مجھے اپنی درد انگیز داستان سنائی۔
اس شام کو ہوا معمول سے زیادہ سرد تھی اور خوشبودار پھولوں کی مہک سے معمور۔ اُوپر دُور فضائے بسیط میں
دہکتے ہوئے مشعل کی مانند پورا چاند معلق جھول رہا تھا اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں ہوا کی نغمہ ریز لہروں سے ملکر
کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں ہاں وہ ایک ایسی شام تھی جسکے بعد فطرت کی کرداری سرگوشیاں کرنے
کی تعلیم دی ہے جب سرد ہوا کی لطیف سرسراہٹ دل کے دروازے کھول دیتی ہے اور برسوں کے دبے
دبائے راز ہائے الفت کہہ ڈالنے پر مجبور کرتی ہے +

"ہم نے صرف خیال کیا ہوگا" مسٹر تھیری نے دار کے طور کہنا شروع کیا "کہ میرا اور لوسی کا ماضی کسی ڈراما کی قسمت انگریزیوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ آپ کا خیال درست ہے ایک نہایت معمولی اور روزمرہ صورت پذیر ہونے والا اوقیانوسی ڈرامہ اگر صرف اس کے واقعات ملحوظ رکھے جائیں ورنہ اسباب و نتائج کے لحاظ سے ایک انوکھا، محیر العقول اور عبرت خیز ڈراما"

میری عمر چالیس سال کی ہے۔ لوسی نے ابھی چھبیسواں لگا ہے۔ ہماری پہلی ملاقات کے وقت وہ صرف سترہ سال کی تھی۔ اپنی والدہ اور بڑی بہن کے ساتھ کہیں سے پیرس میں رہنے کے لئے آئی تھی۔ میں اسی مکان کی پہلی منزل میں رہتا تھا انہوں نے پانچویں منزل کرایہ پر لی تھی۔ ان تینوں عورتوں کی زندگی جیسا کہ متوسط طبقہ میں اکثر ہوتا ہے ایک بگڑے ہوئے سلسلے کے وہمی حالات اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہایت خستہ ہوگئی تھی۔ لوسی کو تھیٹر ڈرامیٹک سے ایک اٹل رغبت ہوگئی تھی اور چونکہ اس کی ضعیف والدہ اور عزیز بہن اُس کی ہر ضد پوری کرنے کو تیار تھیں، اس نے انہیں پیرس آنے پر مجبور کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ صرف پیرس کی شاعرانہ و لطافت آمیز فضا اُسے ایک زبردست ایکٹرس اور ہر دلعزیز بنا دینے کے لئے بس ہے۔

انہیں ایام میں قسمت کا مارا میں بھی یہاں آکر رہنے لگا۔ اس سے قبل میری زندگی فقط تعلیم و تدریس اور اپنے خاندان کی محبت پر مشتمل تھی۔ اپنی زمانہ دانی اور علم کی بنا پر میں ایک نوعمر عالم تھا۔ تنہا، تنہائی پسند اور اپنے معصوم دل پر قابض۔ پہلی ہی نظر میں میں لوسی پر فریفتہ ہوگیا۔ اس روز سے دوسری عورتوں کے حسن کی جلوہ ریزیاں اور ادائیں کی مستحسن حیرانیاں میرے لئے یکسر بے معنی ہوگئیں اور اب بھی نسائی حسن کی طرف سے میرے دل میں اس قدر بےحسی ہو رہی ہے کہ پیاری سے پیاری چیز میرے سامنے سے گزر جاتی ہے اور مجھے کوئی احساس نہیں ہوتا۔

لوسی کمسن تھی لیکن بلا کی فتنہ طراز۔ اُسے علم تھا کہ وہ اپنے حسن کی ضیا باریوں سے دوسروں پر کیا کیا ستم ڈھا سکتی ہے۔ اُن مخفی جذبات کو جو اُس نے میرے دل میں پیدا کر دیے تھے فوراً بھانپ گئی اور اُن سے فائدہ اُٹھا کر مجھے گرفتار کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ ہماری ملاقاتیں گاہے ماہے صرف سیڑھیوں پر ہوسکتی تھیں جبکہ وہ باہر سے اپنے گھر جایا کرتی تھی۔ میرے لئے ملاقات کے موقعے پیدا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مجھے اُس کے لئے سب دقتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اپنے کام دھندے چھوڑ کر روزانہ اس کی واپسی کا انتظار کرنا اور اس کی جستجو میں شریک رہنے والے انسانی سیلاب پر آنکھیں گاڑے رہنا میرا معمول ہوگیا۔ اور اُس پر نظر پڑ جانے کے بعد اوپر جانے

کا حملہ برداشت تھا اس سے بھی زیادہ دقت طلب تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ رفتہ رفتہ مجھ میں ایک کمزوری پیدا ہو رہی ہے جو مجھے فرائض کی انجام دہی سے روک رہی ہے اور جب میں واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کرتا تو خود پر لعنت کرنے لگتا۔ مگر دل میں کچھ اس قسم کی دیوانگی پیدا ہو گئی تھی کہ جب اس کی واپسی کا وقت قریب آتا تو میں اپنی سب منطقیں بھول جاتا اور غیر ارادی طور پر پھر باہر آ کر بیٹھ جاتا۔ مگر آہ۔ اس اضطراب اور انتظار کے بعد جب میں اُس کے پاس سے گذرتا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، میری زبان گنگ ہو جاتی اور میرے جذبات دل ہی دل میں فنا ہو کر رہ جاتے ۔۔ اس سے بھی بڑا قہر یہ تھا کہ وہ میری طرف ایک نگاہِ غلط انداز تک ڈالنا گوارا نہ کرتی اور یوں پاس سے نکل جاتی گویا اُسے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ یہی نہیں اگر کہیں مجھے دُور سے دیکھ پاتی تو قصداً کسی سکھی سہیلی کا ہاتھ پکڑ لیتی اور ایک بناوٹی اختلاط کے ساتھ اس سے باتیں کرتی ہوئی اُدھر چڑھ جاتی تاکہ مجھے وہ موقع نہ مل سکے جس کے لئے میں نے گھنٹوں انتظار کیا تھا۔ وہ بہترین جذبۂ انسانی محبت سے یکسر خالی نظر آتی تھی اور استغنا دیتی تھی کہ اُس کے عندیہ یا اُس کے دل کا پتہ لگانا میرے لئے غیر ممکن تھا۔ آہ وہ کس قدر سنگدل کیسی بڑی ظالم تھی ۔

اسے میری خوش قسمتی پر محمول کرنا چاہئے کہ اُس کی والدہ اور بہن پر بھی میرا اضطراب ظاہر ہو گیا جنہوں نے میری سفارش کا بیڑا اُٹھایا۔ اُن دونوں کی اُمیدیں صرف لوسی کی ذات سے وابستہ تھیں۔ زندگی میں اگر انہیں کوئی خواہش تھی تو یہ کہ اُن کی نورِ نظر کسی ایسے عالی نسب و متمول خاندان میں بیاہی جائے جہاں وہ اپنی زندگی آسائش و خوشحالی سے بسر کر سکے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے والدین کو اس شادی پر رضامند کرنے کے لئے کون کون سی دقتیں نہ اُٹھانی پڑی ہونگی۔ اور اس پر بھی وہ شوخ لڑکی مجھ سے ہرگز شادی کرنے پر رضامند ہوتی اگر اسٹیج پر اُسے متواتر ناکامیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ وہ منظر کی جانب سے ایک رومان لیکر بلند دماغ ضرور لیکر آئی تھی مگر ایکٹرس بننے کی صلاحیت اُس میں مطلق نہ تھی۔ ہر مقام سے جہاں وہ بڑی بڑی امیدیں لیکر گئی ناکام و نامراد واپس آئی۔ پس محض ان ناکامیوں کی شرم مٹانے کے لئے اور اپنی ہم پیشہ دیگر بہنوں کے سامنے اپنی شان قائم رکھنے کے لئے اس نے مجھے قبول کر لیا کیونکہ درحقیقت مجھ سے شادی کرنا اس کے لئے ضرور افتخار بخش تھا۔

اپنے خاندان سے لڑ جھگڑ کر میں نے لوسی سے شادی کر لی۔ اسکی والدہ اور بہن میرے ہی ساتھ رہنے لگیں۔

شادی سے قبل مجھے صرف اُن مصیبتوں اور تلخ کامیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جو ایک کس دو نمبرہ

کے رفقاء گروگیر میں پھنس کر ہر عاشق زار کے لئے لازمی ہے لیکن حقیقی معنوں میں میری ذلت و پشیمانی اُس وقت شروع ہوئی جبکہ میں اُسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لوسی نے خود کو میرے سپرد کر دینے سے انکار نہ کیا مگر علی الاعلان مجھ سے اس بات کا بھی اظہار کر دیا کہ میری مصاحبت گفتگو، میرا اختلاط اُسے بہت ناگوار گذرتا ہے۔ مگر وہ ان سب کو خاموشی سے برداشت کرتی ہے کیونکہ اُس نے خود کو میری دولت و ثروت اور میرے نام کے لئے فروخت کر دیا ہے اور جب اُس نے اس مبہم کا واضح جواب مجھے دیا تو میں نے ایک قلبی رنج کے ساتھ محسوس کیا کہ وہ حقیقت سے بعید نہیں ہے۔ اُسے مجھ سے شمہ برابر بھی اُلفت نہ تھی۔ لوسی کی نظروں میں میں فقط اُس خلا کو پُر کر رہا تھا جو اسٹیج کی ناکامیوں کی وجہ سے اُس کی زندگی میں واقع ہو گئی تھی۔ یہی نہیں۔ مجھے دیکھ کر اُسے ان ہوائی قلعوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جن کے بلند خیالوں نے اُسے پیرس آنے پر مجبور کیا تھا۔ اور جن کے منہدم ہو جانے پر اُس نے میرا سہارا ڈھونڈا تھا ۔



ہمارے احباب اور ملنے جلنے والے لوسی کے بنائے ہوئے پردۂ فریب میں ڈھکے ہوئے تھے لیکن اس فریب کا بار میرے لئے سخت اذیت دہ اور ناقابل برداشت ہو رہا تھا کیونکہ میں سچے دل سے اس کا دلدادہ تھا۔ آہ نفسانی خواہشات کا کمینہ پن۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا۔ اس کی سرد مہری، اس کی حقارت، اس کی کھلی توہین اُس وقت تک جب تک کہ اُس نے اپنا حسین جسم مجھے سپرد کر دینے سے دریغ نہ کیا۔ حسین جسم جس کی ملکیت میرے لئے اس قدر زیادہ عزیز تھی کہ مجھے ذلتیں گوارا کرنی پڑتی تھیں۔ میری محبت کا پیمانہ اُسی محبوب ترین ہستی کے ساتھ بڑھتا تھا اور روز اول سے صرف جاں نثاری اور بے غرض خدمت کے لئے بھرا تھا کئی حقیقی الفت اپنے دل کے ایک نہایت گوشہ میں اس امید کی پرورش کر رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ستمگر انسان بھی میری جاں نثاری میری ستائش کو سراہے گی اور اپنے دل میں جگہ دینے کا سزاوار تصور کرے گی ۔

مجھے اُس زندگی کی تفصیل میں جانا بے سُود ہے ایک سرِ لطف جاودہ کے اعلیٰ ترین جذبات کی بدترین تذلیل کی گئی اور میں نے برداشت کیا! آہ میں کس قدر کا انسان ہوں گا جس نے اپنی منکوحہ بیوی سے ایک روز یہ کہنے کی جرأت کی کہ "اب میری پیاری تم نہیں سہ سکتی ہو میں نے تمہیں چھوڑنے کا تہیہ کر لیا ہے یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اب تم سے عشق ہے۔ مگر میں تمہیں رسوا و ذلیل کرنا چاہتا ہوں"

اُس کا سانس پھولنے لگا۔ اُس نے اپنی داستان بند کر دی تب میں نے اپنی ردا سے سیاہی میں بہت کو ملفوف کر لیا تھا سکون تھا اور سکون کا خلل صرف دو لہروں کے ٹکرانے کی مدھم گونج اور گاؤں کی کھڑکیوں سے

پھوٹ کر نکلنے والی بربط کی تنہا مدہوش کن لے ہوا میں ایک سحر بھرا سما پیدا کئے ہوئے تھی۔ میرا مصاحب کہ دو برابر بربط کی آواز کو غور سے سن رہا تھا۔ یہاں سے اُس کی آواز میں آہ و بکا تھی بیتاب ٹوٹی ہوئی تھی اور دل کی آہ تھا۔ اگر انہوں سے اپنی ہوئی معلوم ہوتی تھی اُس نے گنگنانا :

"گوالوں کا گیت ڈوبتا جا رہا ہے۔"

ایک دراز خاموشی کے بعد جس میں اس کی اُنگلیاں ہوا کی لہروں کو چھیڑ کر نغمہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اُس نے پھر شروع کیا۔

شادی کے ایک سال بعد میری ساس دفنا گئیں۔ میری سالی کلیمنٹینا میرے ساتھ ہی رہی۔ وہ ایک ہستی تھی جس کی موجودگی میرے لئے باعث صبر و تسکین تھی۔ کوئی دوسرا شخص اس خستہ حالی میں مجھے اس قدر تسکین و طمانیت نہیں دے سکتا تھا جیسا کہ یہ غریب لڑکی جس نے اپنی زندگی اس ناکارہ ہستی کے لئے قربان کر دی تھی جو میری ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے غم کے شریک تھے۔ ایک دوسرے کے الم رسیدہ رازوں کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں گفت و شنید کی بھی ضرورت نہ تھی۔ ہماری غم آمیز خموشی ہمارے راز ہائے دل کو ظاہر کر دینے کیلئے سرِ انکلم سے زیادہ تھی۔ اُس روز جبکہ لوسی نے ناسدلوں کی آخری زنجیر کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا اور ایک ایسے شخص کیساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی جو بدترین حقارت کا مستحق تھا صرف کلیمنس کی ذات تھی جو مجھے خودکشی کے گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے روک سکی میں زندہ رہا موت نے مجھے پریشان رکھا۔ صرف کلیمنس میرے ساتھ تھی فرشتہ سیرت کلیمنس اور زندہ بشکل مردہ میں۔ بس اُس ویران اور پُر حسرت الاؤ کے تنہا مالک جو کبھی آباد تھا اور میری مسرتوں کا سرچشمہ — پس ہم دونوں ساتھ تھے اُن سن رسیدہ بوڑھوں کی طرح حوادث لختِ جگر کو پیوند خاک کر کے موت کی راہ دیکھ رہے ہوں!

دنیا نے یہ افواہ اُڑا لینے میں دیر نہ کی کہ ہم دونوں میں ناجائز محبت ہے۔ آہ کیا یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ یہ محض دنیا کی اتہام تراشی تھی اور یہ افواہ غلط۔ سراسر غلط تھی۔ ہم دونوں میں ایک قلبی لگاؤ تھا جو یقیناً محبت سے مشابہ تھا، مگر محبت جس میں کسی عنصر لطیف کا شائبہ نہ تھا۔ لیکن دنیا فطرت کے اس عمیق راز کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک نوجوان مرد اور ایک کمسن حسینہ آنسو بہانے کے لئے یکجا ہو سکتے ہیں۔ زمانے کے ادل بدل اور غیر قابل تنسیخ نکتہ چینیوں کی خبر ہم تک پہنچی۔ ہمیں یہ صلاحیں دی گئیں کہ ہم اس طرزِ زندگی کا جس کا کہ دنیا صرف ایک مفہوم سمجھ سکتی ہے خاتمہ کر دیں۔ مگر ہم نے کبھی ان خرافات پر کان نہ دیا۔ کم از کم ہم دونوں لوسی کے داغ دہرا سکتے تھے دنیا کی چہ میگوئیاں

کیا ہمیں کیا پرواہ ہوسکتی تھی؟ ہمیں دنیا سے اب کیا سروکار رہا تھا؟ کیا اب بھی ہمارے لیے اس میں کوئی دلچسپی باقی تھی؟



اس کے بعد اُس ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا، نہایت ہی مختصر سا ڈراما ہے، اور چند الفاظ میں ہی آپ کے گوش گذار کر دوں گا۔

لوسی کو یہ خبر ملے بغیر نہ رہی کہ کلیمس اور مجھ میں عشق ہے۔ یہ اب میری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ جب لوسی کو مجھ سے محبت نہ تھی اور وہ مجھے سر بازار رسوا کر چکی تھی تو وہ محض اس غلط افواہ سے کیوں بیچین ہو گئی اور کیوں اُس کے دل میں حسد کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ میرے خیال میں اس کے اضطراب کا یہ سبب تھا کہ وہ دو ہستیاں جنہیں اُسنے سخت ترین ایذائیں پہنچائی ہیں، ساتھ رہ کر ایک دوسرے کی دائمی تسکین و دلدہی کا باعث کیوں ہو رہی ہیں

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جبکہ گندھک کے تیزاب کے مہلک اثرات سے لوگ واقف ہو چکے تھے اور قتل کی حد تک عجیب عجیب ہوائیں گشت کر رہی تھیں، ایک روز شام کو جبکہ میں اور کلیمس اپنی عمر آمیز تفریح کے بعد آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے۔ میری نظر ناگاہ ایک نقاب پوش عورت پر پڑی جو دیوار کے ایک گوشہ میں بالکل تنہائی ساکت کھڑی تھی۔ میری نظر پڑتے ہی اُس نے اپنا نقاب پھینک دیا اور بجلی کی سُرعت سے حملہ آور ہو کر تیزاب سے ایک بھری ہوئی بوتل ہم لوگوں پر خالی کر دی۔ کلیمس کا چہرہ اور سینہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ غریب نے دوسرے دن صبح ہسپتال میں نہایت کرب اور اضطراب کی حالت میں جان دی۔ میری ایک آنکھ جاتی رہی اور داہنی کنپٹی جھلس کر کوئلہ بن گئی اور — اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں میں عمر بھر کے لئے بدصورت اور کریہہ المنظر ہو گیا۔

پھر وہ خاموش ہو گیا اور آہستہ آہستہ اپنی جلی ہوئی کنپٹی پر ہاتھ پھیرنے لگا گویا اس کے برسوں کے سوکھے ہوئے زخموں میں از سر نو سوزش شروع ہو گئی ہے۔ دیر تک وہ سہما سا اپنے زخم کے گڑھوں کی پیمائش کرتا رہا پھر یکلخت میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"کبھی آپ نے دیوانگی یا فطور العقلی کے ایسے واقعات سُنے ہیں جو سر میں کسی شدید ضرب، یا کسی اچانک دماغی صدمہ کی وجہ سے اچھے ہو گئے ہیں؟"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں۔ اس سے بالکل برعکس واقعات تو ہمیشہ سننے میں آئے ہیں مگر یہ الٹی منطق میرے لئے نئی بات تھی لیکن اُس نے مجھے جواب کی زحمت سے بچا لیا اور رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "بس لوسی میں اس قسم کا ایک انقلاب پیدا ہو گیا، مکمل انقلاب جو اس قسم کے واقعات سے خاص طور پر کیا جا

رکھتا ہے اسکی روح ایک صرف ایک گناہ کے بار سے بوجھل تھی اس گناہ کے ارتکاب کے ابتدا میں وہ ہمراکیا
سادہ دل اور بیباک طبیعت انسان بن گئی یعنی ظلمت، فساد، باطن پشیمان اور قابل رحم۔ اس گناہ کے بعد بدی
اسکے دل سے اسطرح غائب ہو گئی جیسے کسی عامل کے عمل سے ارواح خبیثہ نکل بھاگتی ہیں! اب پھر گئے
کو تو اس نے جھڑک دیا کہ ہم لوگوں کے گریبان ہی اب، خود کو ہمارے بڑے ہوئے جسموں پر سسک دیا اور
خود بعد ملامت کرتی ہوئی حالت جنون میں "مدد مدد" چلانے لگی اور اپنی آہ و بکا سے سلاسے سیدان کو تھرا
دیا۔ بعد جانے ہی بھی اس ڈر سے کہ کہیں خود کشی نہ کر لے اس پر سخت پہرہ رکھنے کی ضرورت تھی۔ اور جب میں نے
کو اور مرحومہ کی معصوم و مقدس یادگار کو گنہگار ثابت کر کے (مجھے امید ہے کہ آپ میری اس ... کو معاف
کر دینگی) اسے جیل خانہ سے رہا کرا لیا میں کامیاب ہوا تو اس نے اپنی صحت کا خطرہ ... ڈاکٹر ... اپنی
عدیم المثال خدمات اور تیمارداری سے مجھے اچھا کر لیا۔

میں نے ... حسرت ... داستان کو سن کر ... لی تھی ... اٹھا
کر مجھے دیکھا اور خدمت تک تکلیف ... مجھے گھور رہا۔ اس کے بعد ... سادگی سے جس میں سچ
کے آثار نمایاں طور پر مترشح تھے اس نے کہا۔

واقعات بہت پرانے ہیں۔ اگر اسوقت ... میری محبوبہ کے ... لے التجا ...
محبت میں کبھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اسوقت تک اس کی روح میری محبت کے لئے زیادہ ہو گئی اس کے
جسم میں محبت کی وارفتگیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی ... اب اس سے زیادہ میں
آپ کو اور کیا بتلاؤں ... اسی کے واقعات میں نے قصداً فراموش کر دیے ہیں۔ اب میں محبت کرتا
ہوں اور محبت کیا جاتا ہوں۔ اس میں میری ہستی کا کل راز مضمر ہے ... کے لیے میں بیکار و ناکارہ
ہو گیا ہوں۔ میرے اکثر رشتہ دار مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں ... دوستوں میں سے
بہتوں نے مجھے ... ترک کر دیا ... کا تصور کرتے ہیں ... ڈاکٹروں کا
کہنا ہے کہ میری عمر بہت کم ہوگی۔ ... کبھی کبھی ... درد
محسوس کرتا ہوں ... میری ... میری ... میری مسرت ...
... کا مرکز۔ آخرکار وہ میری ہے ... کے لیے ... بات کا ملال نہیں ہے۔
اب میں خوش ہوں اور مطمئن ... اور ... اپنی خوشی ... کوئی ... نہیں

جذبات کے اس طوفان کی تو ... کو ہانی ملتے کر دی۔ وہ خاموش ہوگا۔ اس کی کا شور و غوغا ختم ہو چکا تھا آگ بجھادی گئی تھی۔ بربط کی سامعہ نواز لے فضائے اسیری میں ایک تھرتھراہٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ صرف دور بے چین سکون نا آشنا لہروں کی ساحل سے ٹکرانے کی آواز اب بھی سکوت نیم شبی کو توڑ رہی تھی۔ لیلی قصری کی نظریں اوپر تھیں ... بحسرت [illegible] سے جلائے لسط تاک رہا تھا +

(رامپور) (سید ممتاز اشرف قادری)



لمعات اثر

لرز رہا تھا ابھی سنگ ندامت نوک مژگاں پر ؛ کہ بجلی رحمت حق کی گری جا کر عصیاں پر
خدارا اب نہ ہنس ظالم مرے حال پریشاں پر ؛ گریباں چاک ہوتے ہیں مرے چاک گریباں پر
طبیعت عشق کی مائل ہوئی جب شرح امکاں پر ؛ عقل کل بھی حیرت رہ گیا اوراق عرفاں پر
وداع حسرت دیدار کا ہنگام آپہنچا ؛ وہ دامن میں ہے اشک خوں کا جو قطرہ تھا مژگاں پر
ہو مجھ سا بھی یارب کوئی محروم شکیبائی ؛ فراواں شوق ہوتا ہے شکست عہد پیماں پر
یہ مسجد ہو کہ میخانہ ہو ... سر جھک جاتا تھا ؛ غرور توبہ سے ناموس آئی ایماں پر
زمانے قلب کے ... کدورت کی کثافت ہے ؛ یہاں تک گرد ہستی جم گئی آئینہ جاں پر
نظر پڑتی ہے جس کی پھر وہیں تک رہ نہیں جاتی ؛ کچھ ایسی بھی ہیں چھینٹیں خون کی دیوار زنداں پر
کدن بردوش ہیں غنچے کہ گل جی بردہ [illegible] ؛ شہادت گاہ کا دھوکا ہو کیوں کر گلستاں پر
تعافل ہے مرے اک دیدۂ لبریز گویا ؛ کبھی جو رحم دل بھی سامنے ... در مکداں پر
[illegible] حال ہے اور حسن زندگانی کی ؛ کہ جیسے نقش پائے رہرواں ریگ بیاباں پر
ملائے [illegible] مسجد میکدہ معلوم ہوتی تھی ؛ حباب بحر سے رطب اللساں جب عنواں پر
کبھی دیوانوں میں حسرت المسل بھی اسکی چالاکی ؛ وہ دست سل ہوا کہ کبھی رسا ہے گریباں پر
کہاں رنگینیاں دامن کے انداز تبسم کی ؛ صبا لے پھول بکھرائے تو کیا خاک بہاراں پر
[illegible] اعجاز ہے اک ... کا ؛ کہ اک ... ہے اک آئینہ حیرت ... پر

[illegible] علی خاں اثر

قعرِ دریا

اس عرصہ میں بار کی کشتی ہچکولے کھاکر یکدم اُلٹ جاتی ہے بظاہر تو یہ ان تینوں کی مرگ ناگہانی کا یقینی سبب بن گیا جن میں ایک حسین لباس عورت۔ دوسرا نوجوان مرد اور تیسرا ایک بچہ تھا جو ابھی ابھی اطمینان کے ساتھ مصروفِ سیر و تفریح تھے۔

کشتی اُلٹی کیونکر؟ مگر اس کا سبب تو کبھی بھی معلوم نہ ہو سکا۔ مگر ہاں اس کا خوب اندازہ تھا کہ اس کے اُلٹنے سے قبل ہوا میں ہوا کی مدد سے وہ کشتی کو ڈبونے والوں کا ساتھ مرے لیے کرتے رہا تھا کہ دفعتہً فضائے آسمانی پر ایک پُرہیبت سکون اور خاموشی طاری ہوگئی ہوا بالکل بند ہوگئی اور اس کی متقرکشتی بھی بالکل ساکت تھی!۔

وہ اپنے سامنے والی جیتنے کے فرانسیسی تیرہویں بُرجندہ رِن تھا جو اس وقت کے اہم ترین اقرار اور دلچسپ سیر میں خاطر سے لطف اندوز ہو کر رہا تھا۔ حالانکہ بچہ کی اس سے زیادہ اظہارِ مسرت کے لئے اہم کیسے رو جیز اور تخلیق جانیں میں پیدا ہو رہے تھے۔ اس حادثہ سے پیشتر دل ہی دل میں اس ولولہ انگیز نظارہ سے بھی مسرور ہو رہا تھا جو سمندر کے بازوؤں تک پہنچے سڈول ہاتھ ایک عجیب دلربا ادا کے ساتھ بچہ کو اپنی گود میں لئے ہمیں کر رہا تھا۔

کشتی اُلٹنے کی وجہ کہ وہ ان ساتھیوں کو کوئی فوری ہدایت بھی نہ کر سکا۔ اس لمحہ میں اسکو معلوم ہوا کہ کشتی کا ایک حصہ اس کو دھکیل رہا ہے مگر دوسرے ہی لمحہ ہوا کے تھپیڑوں نے ہوا ان کو تہ و بالا کرکے سطحِ آب پر دے پٹکا۔

غوطہ لگا کر اُبھرتے ہی اُس نے سوال کھینچ کر کسی کو لوری بوٹ کے ساتھ دھکیلا جیسے عورت اوپر آئی دکھائی دی جس کے گلے میں اس طرح چمٹا ہوا تھا۔ دم بھر دل میں دو ہاتھ مار کر وہ اُن تک پہنچ گیا۔ ایک ہاتھ کا عورت کو سہارا دیا۔ اور دوسرے سے ایک کلہ سے کی گرفت کو چھڑاتے ہوئے پانی سے پرے مقابلہ کرنے لگا۔ بچہ ایکسپریس عورتیں سمندر گر گیا تھا۔ اس کی نیم بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھوں سے ناقابل اظہار ... ٹھیک ہی جو مرکا اس کے ... تی طرح ... اور گرگئی اس کی معصوم ... اور تھوڑا ان نمایاں چہرہ پر اس بالا کی آنکھوں سے ... پانی پر کراہی گلو ملا ہی کی ... اس کی ...

دوسرے افراد جو دیکھنے والے کے دل کو بھی امداد کے لئے بے چین کر دیتی ہیں۔

عورت کو مناسب طریقہ پر مجبور کر کے سب سے پہلے اُس نے بچہ کے نازک ہاتھ اُس کے گلے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی حالانکہ بظاہر موجودہ صورت میں کوئی آسان کام نہ تھا مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح وہ اس میں کامیاب ہوا اور عورت کو ڈھارس دیتے ہوئے اُسے تسلی دی اور سمجھایا کہ اسے کس طرح اس کو مستعد طور پر کنارے پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہاں سے کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا وہ اس سے پہلے ہی کنارے سے کسی وقت دور نہ ہوئے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی تفریح کا سب سے اچھا حصہ ہی ٹیلوں کے دامن ہی تک محدود کر رکھا تھا۔

اس حادثے کے دوران میں بچہ کی ہستی دو بار اس پر صرف کیا تھا۔ حالانکہ گھبراہٹ کی حالت میں یہ موقع اس کے لیے بجائے کسی ہمت پیدا کرنے کے ایک وحشت میں مبتلا کر دینے والا ہو سکتا تھا کیونکہ وہ متانت پر ایک تھا لیکن وہ سراسیمہ ہو کر اس بوجھ کا بوجھ سنبھال کر اپنے تک ہو سکا اس کی ہمت اور استقلال کے لئے ایک سوال بن گیا تھا۔

عورت نادم ہو کر ہاتھوں کے اپنی بساط سے زیادہ صبر و استقلال سے کام لے رہی تھی۔ گو وہ تیراکی سے قطعی نابلد تھی تاہم اپنی ناک کو سطح کے ساتھ اسے ختم کر سادہ کر پانی کی سطح پر قائم کرتے ہوئے اس کو مدد پہنچا رہی تھی۔ بچہ کو ہلا جلا کر اس نے اس کے کندھوں پر بٹھا لیے میں کچھ دیر ضرور صرف ہوئی مگر یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی گیا۔ عورت کا ایک ہاتھ اپنے شانہ پر رکھ کر دوسرے سے پانی میں ہاتھ ہلانے کا انداز بتا کر پرکاش نے تاآخر ساحل تک پہنچنے کی کوشش شروع کر دی +

حالانکہ خوش قسمتی سے بہر طور پانی کے مسلسل تھپیڑوں کی زد سے ایک لمحہ کے لئے محفوظ نہ کر سکی تھی۔ لیکن بچہ کو اس طرف موجود رکھنے کے لئے اس سے بڑھ کر ہمیں کچھ نہیں کرنی رہی جو پرکاش کی اطمینان اور ہمت افزائی کا باعث ہوتی ہیں وہ جو سمجھا تھا کہ تارا ایک مضبوط اور قوی دل رکھنے والی ہے کیونکہ اس سے قبل ایک موقعہ پر اس کو تیرنے کا ڈھب سکھایا اور جب ہی اس کی فطری محبت شوق سے متبدل ہو گئی تھی۔ اس لئے اپنی ناک کی سیدھ پر تیرتے رہنے کی کوشش جاری رکھی تھی۔ پہاڑی دامن میں دریا کے اس حصہ سے تلچھٹ کی صورت اختیار کر رکھی تھی جہاں کا پانی جھوما نہ رہتا تھا اس کو اس خیال کے مطابق گو مسرت اور اطمینان بھی تھا کہ اس کی کوششیں حصول مقصد میں کارآمد ہو رہی ہیں۔ بچہ اس کی گردن سے اپنی پوری طاقت اور زور کے ساتھ چمٹا ہوا تھا کہ ایسی سختی اور ایک سختی سے اپنی گرفت کا الٹا ایک عجیب تقسی حل تھا۔ گویا ان کے ہلانے ہوئے ہاتھ ہلنے اور ناک کی ناس تک پالے پرکھی اپنی کی ان سے اب تک ایک دوسرے کا اکلاپے کے متعلق سال کے اساس سے پرکاش نے جسم [illegible]

مکمل تنہائی کے سبب پیدا کر دی کیونکہ ماں باپ دونوں نے اس کو بڑی دربدری اور جانفشانی کے بعد اسقدر بڑا کر پایا تھا۔ اسوقت اس کے دماغ میں اسی قسم کے حالات موجزن تھے اور یہی وجہ تھی کہ ابتک اس نے اپنی نظر تک اوپر اُٹھائی تھی۔ اس کی آنکھیں پانی کی سطح سے ایک ڈیڑھ انچ اونچی تھیں کیونکہ اس کو مجبوراً بہت بیچارہ کر تیرنا پڑ رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اس نے ایکبار نظر اُٹھائی تو اُس کے منہ سے دبی ہوئی ہچکیوں بیچ نکل گئی —— دریا کا کنارہ اس سے ابھی اتنا ہی دور تھا جتنا کہ اس کی کوششوں سے قبل۔

اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی ابھی تک وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور کسی مخصوص ترکیب یا کوشش کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔ اب اس نے اوپر اٹھے رہنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا۔ عورت دفعتاً وقتاً فوقتاً اس کی ... کرتی اور بچہ کو سہلاتی تھی —— مگر جانے معلوم کس ضرورت کی بنا پر ایکبار اس نے اپنی انگلیوں کو اس کے سامنے پھیر دیا۔ خاموش اشارہ بجلی بنکر بدن کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس کو اپنے جسم کے اندر ایک نئی طاقت کا احساس ہوا اور وہ نئے جوش و سرگرمی سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا —— مگر باوجود ہر امکانی کوشش کے نتیجہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ادھر دس بارہ منٹ تک وہ کنارہ پر نظر قائم کر کے ہاتھ پاؤں چلاتا رہا لیکن اب اس کو گویا ... معلوم ہوتا ... رہ گئی اس کی ہر ضرور کوشش کامیابی کے اسی حصہ پر محدود معلوم ہوتا تھا جہاں سے چلی تھی۔ باوجود اسقدر سرعت کی کشمکش کے وہ اسی مقام رہا جہاں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا

اس لئے اب اس نے گرد و پیش کے متعلق اسباب پر نظر ڈالنا شروع کی تاکہ ... سکوں۔ کنارے کی جانب ہوا کا رخ اور ... ان سے کوئی بھی مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا تھا مگر پھر بھی کوئی وجہ ایسی ضرور تھی۔ تمام سے اس کی کوششیں بے نتیجہ ثابت کر رہی تھیں ... وہ یہ کسی دوری ... یہ اس کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ کوئی ... کے پاؤں میں لپٹی ہوئی اس کو پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ایسے حالات کے ابتدائی مدارج میں اس کو یہی یقین ہو گیا ... گرفتار ہو گیا ہے۔ بچے اور عورت کا بوجھ اسکو پانی میں سنبھالے ... اس ... حال ... سے آزادی حاصل کرنا ایک امر محال بن گیا تھا

اسنے پیروں کو ایکبارگی ... سانس ... مزید کوشش کے لئے اسنے ... کو استادہ کیا اور اس ... اپنی طاقت کا ایک ایک ذرہ صرف کر دیا۔ اس کو ... اپنی طاقت کا اندازہ تھا کر ایک گونہ پُر غرور ... ہوتی ہے ... اپنی قوت کا اظہار دل بھی اس امر کی کہ اس کی جوانی ... طاقت ابھی تک ... قائم ہیں ... اس نے اپنے

خونی دشمن سے مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ قدم قدم پر اپنی طاقت صرف کرتے ہوئے وہ ملگجوں پانی میں بڑھا۔ اس کے رگ پٹھے اس پیہم کشمکش میں تن کر نیم جان ہو گئے۔ اس کی سانس پھولنے لگی اور اس کی باریک دھوتی اور ریشمی کوٹ اس کے لئے موجودہ صورت میں کافی وزنی بن گئے ____ مگر اب وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش کا حملہ اس کو انچ انچ کر کے کامیابی کی طرف لے جا رہا تھا۔

عورت حتی الامکان اس کو مدد پہنچا رہی تھی۔ اپنے آزاد ہاتھ سے اسنے اپنی لمبی تر بتر بھیگی ہوئی ساڑھی کو قابو میں کر کے اپنے کندھے پر رکھ لیا تھا جس سے رکاش نے وزن کی تخفیف کا احساس کیا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ہاتھ پاؤں مارنے کی بھی کوشش کی لیکن اس کی ناشناوری سے ناواقف حرکتوں نے بجائے کسی مدد کے کرنے کے لئے مزید تعب کا سامان بہم پہنچایا۔

چار چار انگل سرک کر وہ بڑھ رہا تھا۔ مگر افسوس کہ اب اس کی طاقت جواب دیتی نظر آتی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اور اس کے قویٰ دم لینے کے لئے ہڑتال کر رہے تھے لیکن پھر بھی اس کی ہمت و استقلال کو لغزش نہ تھی۔ ان عزیز جسموں کی زندگی کی محافظت میں اس کی ان تھک کوششیں اسی جوش و خروش سے جاری تھیں۔ لیکن [illegible] اب اس کو اپنے ہاتھوں کی رفتار میں قدرے سستی محسوس ہو رہی تھی۔

رکاش کے دماغ میں دفعتاً ایک حسرت اور اضمحلال بجلی کی طرح دوڑ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کی کوششیں ناکامیاب ثابت ہوں اس کو اس کا علم بھی نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے اس نے [illegible] جسم کو انتہائی کوشش سے پانی کی سطح پر اٹھا کر سامنے والے [illegible] کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اسکی زبان سے بے ساختہ نکلا "کاش میں اس آگے والے کنارے تک پہنچ جاتا" کچھ دیر تک وہ پھر خاموشی کے ساتھ جان توڑ کوشش کرتا رہا لیکن اب اس کو تشویش پیدا ہوئی کہ اس کی کوششیں [illegible] ثابت ہوں گی۔

اب اس کا [illegible] تھا [illegible] تھے اور قریب [illegible] ہی تھی۔ [illegible] سورج کی شعاعوں [illegible] رہی تھیں۔ ساحل دریا دس ہی گز کے فاصلہ پر تھا اس کی ناکام کوششوں [illegible] دنیا کی [illegible] اور اس [illegible] سایہ [illegible] اس کے [illegible] کی مردہ اداس [illegible] کوئی [illegible] کہ اس کی [illegible] کا

دوہرا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اسکو اپنی جان کا ذرا خوف نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی بخوشی قربان کرنے کے لیے تیار تھا لیکن کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی کہ وہ ان دو ہستیوں کو سلامتی سے کنارے لگا دیتا جنکو اس آفت ناگہانی میں پھنسانے کا وہی باعث ہوا

ایک سخت تھکن کوشش کے بعد اُس نے اپنا سر گھما کر تارا کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ اسکی خاموش اور پُر معنی نظریں اس سے دوچار ہوئیں جن کی گہرائیوں میں محبت۔ بیچارگی اور ہمدردی اسطرح مخلوط طور پر نمایاں نظر آئی کہ دفعتہً اس کی آنکھوں میں ناکامی کے آنسو ڈبڈبا آئے۔ "آہ پرماتما۔ رحم!" اس کے جسم کے ہر رگ و ریشے میں ایک فوق الفطرت جوش پیدا ہُوا۔ آخر کس گناہ کی پاداش میں کس جرم کی سزا میں مجھے میری زندگی کا آسرا۔ میرا مقصد حیات۔ یوں دم [illegible] میں ڈوب کیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی ___ درمیاں بحر دریا۔ اگر مجھ کو فقط اسقدر بوجھ سنبھالنا پڑتا "

اس کی سانس اُکھڑ گئی۔ ہاتھوں کی حرکت میں نقاہت پیدا ہو گئی اور پھر اس کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہُوا۔ ایسا ہیبتناک خیال جو شاید اسکو آئندہ زندگی میں سالہاسال چین نہ لینے دیتا۔ "ان میں سے ایک کو لیکر وہ کنارے پر آسانی پہنچ سکتا ہے ___ اگر ان میں سے ایک ہی کی انگلیاں اسکے جسم میں جونک کی طرح چمٹ کر اسکو بےبس کرنے کے لئے رہ جائیں۔ اگر ان میں سے ایک کا بوجھ ہلکا ہو جائے ___ مگر کس ایک کا؟" یہ کانپ کے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ "کیا اس کا فرض ہے کہ دو میں سے ایک ہی کی جان بچا لے۔ کیا اس کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر دو کو نہ بچا سکے تو دونوں کو قربان بھی کر دے لیکن اگر خدانخواستہ ان میں سے ایک کا بھی بال بیکا ہُوا تو پھر وہ زندہ نہ رہ سکے گا ___ غالباً اس کی ہمت و استقلال کا یہ امتحان تھا۔"

"لیکن کیا دونوں سے ہاتھ دھو لیا جائے؟۔ مگر جب وہ ایک کو بچا سکتا ہے تو اسے ایک کو ضرور بچانا چاہیئے۔ مگر ایسا کرنے میں ایک کو قربان کرنا بھی لازمی ہے لیکن کس ایک کو؟ ___ اس کو فوری فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اب اس میں زیادہ سکت باقی نہ تھی۔"

اس کی زندگی کا اہم ترین لمحہ تھا۔ ایک طرف تو اس کی بیوی۔ نوجوان طرار دل حسین اور خوش سلیقہ برخلاف اس کے دوسری طرف اس کا اکلوتا بچہ۔ ناتواں، ناسمجھ، معصوم۔ آہ خدایا۔ اسکو کیا کرنا چاہیئے۔

ایک ساعت کے لئے مایوس ہوکر اس نے گہری سانس لی تاکہ وہ ناگہاں اس [illegible]

ان میں کونسی ہستی زیادہ قابل وقعت تھی۔ کسکی عدم موجودگی اسکی [illegible] تر کردیتی۔ اس نے کوشش کی کہ بےلوث ہوکر اسکا فیصلہ کرے ___ تارا [illegible] تھی لیکن [illegible] کہ ابھی بہت کچھ کرنا تھا اس لئے اسکو [illegible] کسی طرح [illegible] اس لئے [illegible] مصیبت

تمام قائم ہوئی تھی اس لیے یہ ممکن تھا کہ کسی نازک سے نازک جھٹکے میں اس کا رشتہ حیات دو ٹکڑے ہو جائے۔ اگر بیوی نہ ہی وہ اس عالم ہے کہ محض اسکی عدم موجودگی اسکو پروان نہ چڑھنے دے اور وہ کسی وقت داغ مفارقت دے جائے اس حالت میں تو دوہرا نقصان متصور ہے۔

رفتہ رفتہ اُس نے اپنے معصوم دل میں کسی خاص مسئلہ پر پہنچنے کی کوشش کی اور متواتر اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ کہ اسکو کیا کرنا چاہیئے۔ بظاہر یہی مناسب معلوم ہوتا تھا کہ بچہ جسکی ہستی زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی قربان کر دیا جائے لیکن کا سارا معصوم بچہ جس کی پرورش میں اُسنے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا اور جسکی بھولی بھالی پیاری اداؤں نے اُس کے دلکو کافی گرویدہ کر رکھا تھا۔ ہرکاس نے پاس و ہراس کی کشمکش میں اسے واپس لیے۔ اس کے لیئے نہ شرعی عالم سے کم اہمیت نہ رکھتا تھا جس میں وہ بزدلی کے اظہار کا مرتکب ہی نہیں بلکہ واقعی بزدل ثابت ہوتا تھا۔ ورا وہم لیکر اُس نے بڑی دقت اور ایسے اُٹھا جبر کے ساتھ بہادر دل کر کے بچہ کو اپنے کندھے پر سے کھسکا دیا۔ لیکن فوراً ہی اس کے نازک ہاتھ خوف و دہشت کی وجہ سے اسکی گردن میں کھچ گئے۔ ہرکاس نے خوب اُن کو جھٹکے کے ساتھ علیحدہ کیا اسکے ساتھ آنسو نکل پڑے۔

بچہ ہلکا پھلکا سا معلوم ہو رہا تھا۔ ہرکاس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُسکو دور کر لیا۔ اس کو ایسا جسم کھو اُٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ سوار کی گرفت سے اب وہ آزاد ہو چکا تھا۔ اسنے ندی کی طرف سے منہ موڑا اسکو ایک طرف کرا دینا چاہا لیکن اُس نے اسے ہچکے ہچکے سے اس کے بازوؤں پر اگر دئے۔ ایک معمولی جھٹکے کی ضرورت تھی اور اس قصہ تمام تھا۔ اسے دریا کی گہرائی اور نیلگوں پانی پر نظر دوڑائی۔ اخیر میں دیس لیا ہے؟ اسکے دہنی ہکار تا ہے ہو رہے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ دیکھنے کی کوشش کی۔ "اس آخری بچہ جاتا چلا ہے کیوں نہیں؟" اس حال کا آنا تھا کہ باوجود ہراحتیاط کے اسکی نظر دفعۃً بچہ پر پڑ گئی۔ جو نہایت بال والا مسرا سے قریب تھا۔ اس کی میٹھی میٹھی آنکھوں سے نظر ملتے ہی خوف اور بیکسی کی نظریں تیر نشتر کی طرح اس کے دل کے پار ہو گئیں بچہ نے نظروں ہی نظروں میں سب کچھ کہہ دیا۔ حالانکہ زبان سے ایک حرف بھی نہ نکالا۔

اس کے ساتھ ہی ایک جوش میں بچہ پھر کندھے پر ہو لیا تھا۔ اس کا وہ حملہ ملتوی ہوا وہ آیا۔ ہارا ہے اُس نے اسکی خاموش نظروں کا سبب کیا۔ اس کے استقلال اور ہمت واقعی وہ در سے بڑھتی۔ اس کو ایک گذشتہ واقعہ اُسے یاد آگیا اور اخیر کچھ ایسے دیتے سمجھے اسے کندھے کو ایک طرف سے کی طرف جھٹکا دی کہ ماں کا ہاتھ پھسل گیا اور وہ اس سے جدا ہو گئی!

اب اس میں اتنی سکت باقی نہ تھی کہ پھر اس حال میں دوبارہ غور و فیصلہ کرتا ابھی بچہ کو کنارے تک پہونچانا تھا کہ آس کے اندھے سے ہاتھ کی گرفت چھوٹ کر تارا نے سر کے بل غوطہ کھایا اور ڈوب گئی۔

اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا —— یہی نہ دیکھا کہ اس کی محبوبہ کی آخری سانسیں اس کا دم توڑ لیے ہوئے اور انسانیت تمام کرنے کیلئے سطح آب پر کس جگہ حبابوں کے تخلیق اور تدفین میں مصروف ہیں۔ اس کا دل بیٹھ رہا تھا سامنے والے ٹیلے اسکو عفریت کی صورت میں رقصاں نظر آرہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد بچہ کو کنارے تک پہنچا کر دوبارہ عمیق دریا کی گہرائیوں میں جہاں اُس نے اپنی رفیق حیات کو موت کی آغوش میں دیدیا تھا پھاند پڑے اور سکون ابدی حاصل کرلے جہاں اپنے دل کی بھڑکتی آگ بجھا سکے۔ جہاں اپنے حلق کی خشکی اور کانٹوں کو دُور کرسکے اور جہاں اپنے دست و پا کی مردہ اور بے سکت حرکتوں کا خاتمہ کرسکے۔ بچہ کو کنارے تک پہنچانا اُس کی زندگی کے اختتام اور اس کی بے چینی کے قرار کا سبب بنتا۔ اس مقصد کے حصول میں اب بس۔ چار ہاتھوں کی اور کسر تھی۔ اس کی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں پانی کی موجیں اس کی ہمت اور دل بڑھانے کے لیے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں "ہاں شاباش۔ بس ایک ہاتھ اور! ۔ ایک ہی اور!!"

ایک آخری جان توڑ کوشش کے ساتھ وہ کنارے کے قریب پہنچ گیا۔ مگر اب بھی سامنے والا ٹیلہ ایک گز کے فاصلہ پر تھا۔ اب اس سے اتنا بھی آگے نہ بڑھا جاتا تھا عین اسی وقت پیچھے کسی نے اسکا نام لیکر پکارا —— یہ تارا کی آواز تھی جسکو ایسے حال میں قصداً دریا میں ڈبو دیا تھا۔ "پرکاش! جلدی کرو۔ جلدی!"

پرکاش محو ہوا اسی شخص کے مثل ہر کا اسکو اسکا مطلق احساس نہ تھا کہ وہ صدا اسکی گرفت سے آزاد ہو چکی ہے تارا کمر کمر پانی میں باطمینان ایک ٹیلے پر کھڑی ہوگئی اس نے ہمت افزا الفاظ میں کہا "گھبراتا نہیں۔ میں بحفاظت یہاں کھڑی ہوں۔ تم بچہ کو اطمینان سے کنارے تک پہنچا دو"۔

اب پرکاش کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ اُسے بمشکل تمام بچہ کو ریت میں پر لٹایا۔ اور خود آدھا پانی آدھا ریت پر گر کر بیہوش ہوگیا

تارا اسی ٹیلہ پر بڑھ آئی پانی اُس کے گھٹنوں تک آگیا۔ بچہ کو بدل عنقریب ہوئی وہ آسانی کنارے تک پہنچ گئی اور بچے کو ایک طرف لٹا کر دوسرے بڑے عزیز کا سر گود میں رکھ کر اس کو ہوش میں لانے کے لیے اسے حرارت جسم کی ہوائیں دینے لگی۔

دلوانہ (بریلوی)

غزل

غمِ فرقت نے جب سے گھیرا ہے
دل کی بستی میں ایک اندھیرا ہے

جلوہ دکھلاؤ گے قیامت میں
صاف کہہ دو ابھی سویرا ہے

میں ہوں کیا چیز میری ہستی کیا
جو خدائی میں ہے وہ تیرا ہے

اب نہ دل اُن کو دوں ارے توبہ
کہتے ہیں آشیانہ میرا ہے

اور کچھ ہوگا اب فریبِ ادا
ان سے دل لیکے مجھکو پھیرا ہے

قبر میں کس طرح بسر ہوگی
کس بلا کا یہاں اندھیرا ہے

دوست جس دن سے چھٹ گیا محشر
مجھ کو لاکھ آفتوں نے گھیرا ہے

لسان الملک محشر لکھنوی

مُردے کی موت

شاردا شنکر بابو رانی ہاٹ کے زمیندار تھے ان کے بھائی کی بیوہ بہو کے میکے میں کوئی نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے سب راہیِ ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ سسرال میں بھی کوئی نہ تھا جسے صحیح معنوں میں اپنا کہا جا سکتا نہ شوہر تھا اور نہ کوئی بیٹی بیٹا۔ اُس کے جیٹھ شاردا شنکر کا ایک بچہ تھا۔ اُسے وہ بے حد چاہتی تھی۔ اس لڑکے کے پیدا ہونے کے بعد اُس کی والدہ بہت دنوں تک بیمار رہی اس لیئے اس کی بیوہ چچی کادمبنی نے ہی پال پوس کر اُسے بڑا کیا۔ پرائے لڑکے کی پرورش اور پرداخت کر کے بڑا کرنے سے شاید اُس شخص کے لیئے دل میں زیادہ جگہ اور محبت ہو جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اُس پر کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ اُس پر کوئی سوشل دعوے نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک محبت کا دعوے ہوتا ہے لیکن محض کورہی محبت سوسائٹی کے آگے اپنا کوئی دعوے ثابت نہیں کر سکتی اور نہ کرنا ہی چاہتی ہے۔ وہ جسے اپنی بیش بہا دولت۔ اپنا سب کچھ سمجھتی ہے۔ اُسے دُگنے جوش کے ساتھ چاہنے لگ جاتی ہے۔

اُس چھوٹے سے بچے کو اپنے دل کی ساری محبت اور پیار دے چکی تو ایک روز ساون کی رات کو اچانک کامنی کی موت واقع ہوگئی۔ معلوم نہیں کیا باعث ہوا۔ یکایک اُس کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ ساری دنیا کے اور سب کام برابر جاری تھے۔ صرف اُسی محبت بھرے دل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی +

اس خیال سے کہ کہیں پولیس آکر خواہ مخواہ دق نہ کرے زمیندار نے زیادہ شور نہیں ہونے دیا اور اُس کے نوکر چاکر عزیز برہمن چپ چاپ لاش کو شمشان میں لے گئے +

رانی ہاٹ کا شمشان آبادی سے بہت فاصلہ پر واقع تھا۔ تالاب کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی اور اس کے پاس ہی ایک بڑا سا برگد کا درخت کھڑا تھا۔ اس لق و دق جنگل میں اور کچھ نہ تھا۔ پہلے وہاں ایک ندی بہتی تھی جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اسوقت وہ ندی خشک ہوگئی تھی۔ اُسی خشک ندی کے ایک حصہ کو کھود کر اُن دنوں شمشان کا تالاب بنایا گیا تھا اور لوگ اُس تالاب کو ہی ایک مقدس دریا خیال کرتے تھے +

چار آدمی لاش کو جھونپڑی کے اندر رکھکر چتا کیلئے لکڑیاں آنے کی انتظار میں بیٹھے رہے۔ جب بہت دیر ہوگئی اور لکڑیاں نہ آئیں تو ان میں سے دو آدمی یہ دیکھنے کے لئے چلے کہ لکڑیاں آنے میں اسقدر دیر کیوں ہوئی۔ باقی دو آدمی لاش کے پاس بیٹھے رہے +

ساون کا مہینہ۔ اندھیری رات۔ بادل چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ آسمان پر ایک بھی تارا نظر نہیں آتا تھا۔ تنگ و تاریک جھونپڑی میں دو شخص خاموش بیٹھے تھے۔ باہر بھی ہُو کا عالم تھا۔ ساتھ جو لالٹین آئی تھی۔ وہ تیل ختم ہوجانے کے باعث بجھ گئی۔ ایک شخص کی چادر میں موم بتی اور دیاسلائی بندھی ہوئی تھی مگر برسات کی وجہ سے دیاسلائی باوجود سخت کوشش کے بھی نہیں جلی +

بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد اُن میں سے ایک شخص بولا "اگر کچھ تمباکو پاس ہوتا تو بہت اچھا [illegible]

[illegible]

[illegible] بولا [illegible]

ابھی [illegible] دونوں [illegible] رہے۔ ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر ہوگیا۔ جو لوگ لکڑیاں لینے گئے تھے اُنہیں یہ دونوں آدمی دل میں خوب گالیاں دینے اور کوسنے لگے۔ ان دونوں کے دلوں میں شک آہستہ آہستہ یقین کی شکل اختیار کرنے لگا کہ وہ دونوں شخص کہیں آرام سے بیٹھے مزے سے تمباکو پیتے اور گپیں ہانکتے ہونگے +

کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی تھی صرف اس تالاب کے پاس مینڈکوں کی ٹرٹر اور جھینگروں کا شور سنائی دیتا تھا۔ بڑا خوفناک سماں تھا۔ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ لاش ہل رہی ہے۔ گویا مُردے نے کروٹ بدلی ہے۔ لاش کے دونوں محافظ کانپتے کانپتے بھگوان کا نام لینے لگے۔ یکایک اُس جھونپڑی میں ایک لمبی سانس سنائی دی۔ وہ دونوں اُسی لمحہ جھونپڑی کے اندر سے اُچھل کر باہر نکلے اور سیدھے گاؤں کی طرف بھاگے۔

جب قریب ڈیڑھ کوس فاصلہ طے کر چکے تو انہوں نے دیکھا کہ اُن کے دونوں ساتھی لالٹین ہاتھ میں لئے واپس چلے آرہے ہیں۔ وہ کہہ کر تو لکڑیوں کے لئے گئے تھے لیکن ان کا اصل مقصد تمباکو نوشی تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہہ دیا کہ لکڑیوں کے گدے چیرے جا رہے ہیں۔ دوکاندار مزدوروں کے ہاتھ ابھی بھیجتا ہے۔ اس پر ان دونوں آدمیوں نے جو جھونپڑی سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اُن سے مُردہ کے ہلنے جلنے اور لمبی سانس لینے کا حال بیان کیا۔ انہوں نے یقین نہ کیا اور اپنا کام چھوڑ کر شمشان سے بھاگ آنے پر اپنے ساتھیوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگے۔

اب وہ چاروں شخص پھر شمشان والی جھونپڑی میں پہنچے۔ جھونپڑی کے اندر جا کر دیکھا۔ لاش ندارد! کھٹیا خالی پڑی ہے۔ سب کے سب منہ تکنے لگے۔ ممکن ہے گیدڑ اس کو گھسیٹ لے گئے ہوں۔ لیکن لاش کے اُوپر کا کپڑا بھی تو نہیں ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے باہر آئے دیکھا کہ جھونپڑی کے دروازہ کے پاس گیلی زمین پر عورت کے چھوٹے چھوٹے پیروں کے نشان ہیں۔

زمیندار صاحب کوئی معمولی سیدھے سادے آدمی نہیں ہیں۔ اگر ان سے سچا سچا حال بیان کیا جائے تو وہ ہرگز یقین نہ کریں گے۔ وہ بھلا بھوتوں کے تماشہ کو کب سچ سمجھنے لگے؟ اس بات کو مدنظر رکھ کر اُن چاروں نے باہمی صلاح مشورہ کر کے رائے قائم کی کہ یہی خبر مناسب ہوگا کہ لاش جلا دی گئی۔

علی الصباح لوگ لکڑیاں لیکر آئے تو انہیں خبر ملی کہ چونکہ بہت دیر ہو رہی تھی اس لئے ان کے پیچھے سے مستری کا کام ختم کر دیا گیا ہے۔ جھونپڑی میں لکڑیاں رکھی تھیں۔ اس کے متعلق کسی کے دل میں شک نہ پیدا ہوا اور شک پیدا ہونے کی بات بھی نہ تھی۔ کیونکہ لاش کوئی ایسا قیمتی مال نہیں کہ کوئی دھوکہ دیکر چُرا لے جائے۔

(۲)

یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم ہے کہ جب زندگی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔ تو بھی اکثر تو سیدھا طور پر جسم میں زندگی کی طاقت قائم رہتی ہے اور وقت پر پھر اُبھر لیتا ہے مُردہ جسم میں زندگی کا عمل شروع ہو جاتا ہے کا ذہنی

بھی مری نہیں تھی۔ لیکن یکایک کوئی باعث ایسا ہوا کہ اُسکی زندگی کی طاقت سلب ہوگئی +

جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا دیکھا۔ اُسے اندھیرے میں بھی یہ معلوم ہوگیا کہ وہ اس کا مکان نہیں ہے کیونکہ جس مکان میں وہ اتنی مدت رہی تھی وہ اُسے اندھیرے میں بھی پہچان سکتی تھی۔ ایک دفعہ اُس نے اپنی جٹھانی کو "جی جی!" کہکر پکارا مگر اس تاریکی میں اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر وہ خوفزدہ ہوکر اُسی گھڑی اُٹھ بیٹھی۔ اُسی لمحہ اُسے اپنے بستر مرگ کی بات یاد آگئی۔ وہی یکایک سینہ کے پاس ایک تکلیف سانس کی آمد و رفت کا بند ہو جانا! اُسکی جٹھانی کمرہ میں ایک طرف بیٹھی دودھ گرم کر رہی تھی۔ تکلیف کے باعث کادمبنی سے کھڑا نہیں رہا گیا۔ وہ پچھاڑ کھاکر بستر پر گر پڑی تھی اور رُکی ہوئی آواز سے کہا تھا "جی جی! ذرا بچہ کو یہاں لے آؤ۔ میرے دل کی حالت معلوم نہیں کیسی ہو رہی ہے"!

اس کے بعد گویا چاروں طرف تاریکی چھاگئی۔ جیسے کسی لکھی ہوئی کاپی پر سیاہی کی دوات اُلٹ پڑی کادمبنی کے ہوش و حواس۔ دنیا کی کتاب کے سب حروف۔ لمحہ بھر میں مٹ مٹا گئے۔ اب کادمبنی کو یہ بھی یاد نہیں کہ اس وقت بچہ نے آکر اُسے محبت بھرے لہجہ میں "چاچی!" کہکر پکارا تھا یا نہیں +

پہلے کادمبنی کو محسوس ہوا کہ یمپوری شاید ایسی ہی سنسان اور تاریک ہے جہاں دیکھنے سننے کی کوئی چیز نہیں ہے اور نہ کرنے کے لئے کوئی کام کاج ہی ہے۔ صرف اسی طرح اُٹھ کر جاگتے بیٹھے رہنا پڑتا ہے +

اس کے بعد جب کھلے ہوئے کواڑوں میں سے یکایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور مینڈکوں کی ٹرٹر سنائی دی تو اُسے برسات کی یاد آئی۔ اُسوقت اُسے محسوس ہوا کہ میں تو شاید اسی دنیا میں ہوں۔ اتنے میں بجلی چمکی سامنے تالاب۔ برگد کا درخت۔ وسیع میدان اور دور درختوں کی قطار نظر آئی۔ اُسے یاد آگیا کہ میں پہلے کئی مرتبہ تیوہار کے دن اسی تالاب میں نہانے آچکی ہوں۔ اُس وقت اس میدان میں لاش دیکھکر موت کا نظارہ کیسا خوفناک نظر آیا کرتا تھا +

پہلے اُس نے سوچا کہ گھر واپس چلی چلوں۔ لیکن اُسی لمحہ پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ میں تو مر چکی ہوں۔ مجھے کوئی مکان میں کیوں رکھنے لگا؟ میرا وہاں جانا لوگ نحس خیال کرینگے عالم زندگی سے تو میں ہمیشہ کے لئے نکالی جا چکی ہوں۔ تو اب میں بھوت پریت ہوں! اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اس آدھی رات کے وقت بابو شاردا شنکر کے محفوظ اور پُر آسائش مکان سے اُس سنسان قبرستان میں کس طرح آ پہنچتی؟ اگر ابھی اُسے جلایا نہیں گیا تو جلانے کے لئے جو لوگ آئے تھے وہ کہاں گئے؟ شاردا شنکر کے روشن مکان میں اُسے اپنے مرنے کی آخری گھڑی یاد آگئی۔ اُس کے بعد ہی گاؤں سے بہت فاصلہ پر سنسان اور تاریک شمشان میں اپنے تئیں اکیلے دیکھ کر اُسے معلوم ہوگیا کہ اب اس جہان سے میرا

کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نہایت خوفناک اور منحوس بھوت ہوں!

یہ خیال دل میں پیدا ہوتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے چاروں طرف سے دنیا کے قواعد کی سب پابندیاں ہٹا دی گئی ہیں گویا اُسے عجیب و غریب طاقت اور بے حد آزادی حاصل ہوگئی ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ ایسا خیال اس کے دل میں پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نئے خیال کے آتے ہی وہ دیوانہ وار اُس جھونپڑی سے نکل کر اُسی اندھیرے میں چل پڑی۔ دل ذرہ بھی نہ ترسا۔ خوف اور فکر باقی نہ تھا۔

چلتے چلتے اُس کے پاؤں تھک گئے دل میں سکت نہ رہی۔ مگر وہ وسیع میدان کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا! راستہ میں کہیں کہیں دھان کے کھیت اور پانی کے گڑھے ملتے تھے۔ جب صبح کا اُجالا ہونے لگا تو قریب ہی آبادی کی علامت نظر آئی اور پرندوں کے چہچہے سنائی دیئے۔ اُس وقت اُسے کچھ ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ اُسے ذرا بھی علم نہ تھا کہ اس دنیا اور اس کے زندہ انسانوں کے ساتھ اس وقت اُس کا کیا تعلق ہے۔ جب تک وہ میدان میں تھی۔ قبرستان میں تھی۔ رات کی تاریکی میں تھی اُس وقت تک گویا وہ بےخوف و خطر تھی۔ گویا وہ اپنی سلطنت کے حدود کے اندر تھی۔ دن کے اُجالے میں انسانوں کی آبادی اُسے ایک نہایت خوفناک مقام معلوم ہونے لگا۔ انسان بھوت سے خوف کھاتا ہے اور بھوت بھی انسان سے ڈرتا ہے۔ دریائے اجل کے دونوں کناروں پر دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ایک اس کنارے اور دوسرا اس کنارے۔

(۳)

کادمبنی کے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو رہے تھے۔ عجیب و غریب خیالات کے جوش اور رات بھر جاگتے رہنے سے وہ باؤلی سی بن رہی تھی۔ اُس کا چہرہ دیکھ کر سچ مچ خوف آتا تھا۔ ممکن ہے کہ گاؤں کے لڑکے اُسے دیکھ لیتے تو چڑیل سمجھ کر اُس پر ڈھیلے پھینکنے لگ جاتے۔ مگر اس کی خوش قسمتی تھی کہ سب سے پہلے ایک راہ چلتے

ہوئی ہو۔ اس حالت میں اکیلی کہاں جا رہی ہو؟

کادمبنی نے پہلے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف اس کی طرف تاکنے لگی۔ [illegible] وہ کچھ نہیں سمجھ سکی۔ وہ اسی دنیا میں ہے۔ وہ کسی شریف گھرانے کی بہو بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ راہگیر اس سے سوال کرتا ہے۔ سب باتیں اُسے عالم خواب کی سی۔ سراسر بےبنیاد اور جھوٹ۔ معلوم ہوئیں۔

مسافر نے پھر کہا۔ "چلو بیٹی! میں تمہیں تمہارے مکان پر پہنچا دوں۔ تمہارا مکان کہاں ہے؟"

کادمبنی سوچنے لگی۔ سسرال میں تو جا ہی نہیں سکتی اور میکے میں کوئی ہے نہیں۔ اُسوقت اسے اپنے لڑکپن کی سب سے پیاری سہیلی کی یاد آئی۔

اگرچہ اپنی سہیلی یوگ مایا سے لڑکپن ہی میں بچھڑ چکی ہے۔ مگر اس دوران میں وہ کبھی کبھی کادمبنی کو چٹھیاں لکھا کرتی تھی اور کادمبنی بھی اُس کے پاس چٹھیاں بھیجا کرتی تھی۔ دونوں چٹھیوں کے ذریعہ محبت کی جنگ بھی ٹھنی تھی۔ کادمبنی یہ جتانا چاہتی تھی کہ وہ یوگ مایا کو بہت چاہتی ہے اور یوگ مایا یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ کادمبنی کو بہت پیار کرتی ہے۔ ان میں کسی کو ایک رتی بھر بھی شک نہیں تھا کہ جب کسی موقعہ پر کبھی ان دونوں کی ملاقات ہوگی تو ان میں سے کوئی بھی دوسری کو ایک گھڑی کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیگی۔

کادمبنی نے اس شریف آدمی سے کہا۔ "بیتدالور میں شری پتی چرن بابو کے مکان پر جاؤنگی۔"

وہ مسافر کلکتہ جا رہا تھا۔ بیتدالور اگرچہ نزدیک نہ تھا مگر اس کی راہ میں ہی پڑتا تھا۔ اُس بھلے آدمی نے خود سارا انتظام کر کے کادمبنی کو شری پتی چرن بابو کے ہاں پہنچا دیا۔

دونوں سہیلیاں بہت دنوں کے بعد ملیں۔ پہلے پہچاننے میں ذرا دیر لگی مگر پھر جھٹ پٹ دونوں نے ایک دوسری کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

یوگ مایا بولی۔ "آج ہماری خوش قسمتی کا کیا ٹھکانا؟ مجھے تو امید ہی نہ تھی کہ تمہارے درشن ہونگے مگر ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں آئیں کس طرح۔ کیا تمہیں تمہارے سسرال والوں نے چھوڑ دیا؟"

کادمبنی پہلے تو خاموش رہی۔ پھر کہا۔ "بہن! سسرال کی کوئی بات تم مجھ سے مت پوچھو۔ مجھے لونڈی کی طرح اپنے ہاں رہنے دو۔ میں تمہارا سب کام کر دونگی۔"

یوگ مایا نے کہا۔ "واہ جی! یہ کیا بات ہے؟ لونڈی بن کر کیوں رہوگی۔ تم میری سہیلی ہو۔ تم میری "۔ اسوقت شری پتی بابو بھی اندر آ گئے۔ کادمبنی دم بھر اُن کے چہرہ کی طرف گھور دیکھ کر آہستہ آہستہ وہاں سے دوسرے دالان میں چلی گئی۔ اُس نے نہ تو گھونگٹ نکالا اور نہ کسی قسم کا شرم و لحاظ ہی دکھایا۔

شری پتی بابو کے دل میں اُس کی پیاری سہیلی کی طرف سے کوئی برا خیال نہ بیٹھ جائے اس لئے یوگ مایا نے طرح طرح کی باتیں کہہ کر اُنہیں سمجھانا شروع کیا۔ لیکن اسقدر کم سمجھانا پڑا اور شری پتی بابو نے

اپنی تسلی سے ہی سب باتوں کو مان لیا کہ اُس سے لوگ مایا کے دل کو بہت خوشی حاصل نہیں ہوئی ؛

کاومی اپنی سہیلی کے ہاں آئی تو بہی مگر وہ اُس سے شیر وشکر نہیں ہو سکی - درمیان میں موت کا پردہ حائل تھا۔ اپنے متعلق بیروف ایک قسم کا شک اور خیال رہنے سے دوسرے کے ساتھ گھل مل جانا ناممکن ہو جاتا ہے کاومی لوگ مایا کے چہرہ کو تکتی ہے اور معلوم نہیں اسے دل میں کیا کیا سوجھی ہے - وہ تنہا بیٹھ خیال کرتی ہے کہ شوہر اور گھر بار کو لیکر لوگ مایا گویا بہت فاصلہ پر دوسری دنیا میں ہے - گویا وہ سب تعلقات اور دل لگی سے جکڑی ہوئی اس دنیا کی رہنے والی ہے اور کاومی صرف ایک خالی سایہ ہے - گویا لوگ مایا "ہستی" اور کاومی "نیستی" کی تصویر ہے +

ادھر لوگ مایا کو کاومی کا رہنا معلوم نہیں کیسا لگا - وہ خود بھی اس بات کو کچھ نہیں سمجھ سکی عورتوں کا خاصہ ہے کہ کسی بات کا چھپانا انہیں سخت ناگوار گذرتا ہے - کیونکہ "نا معلوم" کو لیکر نظمیں لکھی جا سکتی ہیں - بہادری دکھلائی جا سکتی ہے - علمیت کا ثبوت بہم پہنچایا جا سکتا ہے مگر خانہ داری کی گاڑی نہیں چلائی جا سکتی - یہی وجہ ہے کہ عورتیں جس چیز کو سمجھ نہیں سکتیں اُس کی ہستی کو معدوم کر کے یا تو اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتیں اور یا اُسے اپنے ہاتھ سے نئی شکل وصورت عطا کر کے اسے استعمال کے قابل چیز بنا لیتی ہیں - اگر اس میں ناکامیاب رہیں تو وہ جھنجھلا اُٹھتی ہیں +

کاومی جسقدر لوگ مایا کے لئے ایک معمہ سا ہونے لگی اسقدر لوگ مایا کی اُس پر جھنجھلاہٹ بھی بڑھنے لگی اُسے بار بار خیال آتا - کہیں لے نہ کیا بلا اپنے سر پر لے لی !

اس کے سوا ایک آفت یہ تھی کہ کاومی آپ ہی اپنے سے خوف کھاتی تھی - گویا وہ اپنے پاس سے آپ ہی بھاگ جانا چاہتی ہے - مگر بھاگ کر جا نہیں سکتی جو لوگ بھوتوں سے ڈرتے ہیں اُنہیں اپنے پیچھے خوف محسوس ہوتا ہے - جہاں نگاہ نہیں پہنچ سکتی وہیں تک ڈر محدود رہتا ہے - لیکن کاومی اپنے آپ سے ہی ڈرتی تھی - اُسے باہر سے کسی قسم کا خوف نہیں تھا +

چنانچہ کبھی کبھی دوپہر کے وقت وہ تنہا کوٹھڑی میں پڑی پڑی چلا اُٹھتی تھی اور شام ہونے کے بعد چراغ کی روشنی میں اپنا سایہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کرتے تھے ؛

اُس کے اس خوف وہراس کو دیکھ کر گھر کے آدمیوں کے دلوں میں بھی ایک وہم کا نور پیدا ہو گیا تھا - لوگ مایا اور نوکروں خدمتگاروں کو بھی ہر جگہ بھوت نظر آنے لگے

ایک روز کا ذکر ہے کہ کاومی آدھی رات کے وقت اپنی کوٹھڑی سے اُٹھ کر روتی ہوئی ایکدم

لوگ مایا کے کمرے کے دروازہ پر جا کھڑی ہوئی اور بولی "بہن! بہن! میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ اکیلے مجھ سے رہا نہیں جاتا"۔ لوگ مایا کو جیسے ڈر لگا ویسے ہی اُسے غصہ بھی چڑھ آیا۔ چاہا کہ اُسی گھڑی کادمبی کو اپنے گھر سے نکال دے۔ رحمدل سری پتی نے بہت سمجھا بجھا کر اُسے ٹھنڈا کیا اور اپنے کمرے کے پاس کی کوٹھڑی میں کادمبی کے رہنے کا انتظام کر دیا +

اگلے دن خلافِ معمول لے وقت ہی سری پتی بابو اندر بلائے گئے۔ اُن کے زنانخانہ میں قدم رکھتے ہی لوگ مایا نے لگاتار بکنا جھکنا شروع کر دیا۔ بولی "تم کیسے آدمی ہو! ایک عورت اپنے سُسرال سے نکل کر تمہارے مکان میں آ کر رہی ہے۔ مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا مگر پھر بھی وہ جانے کا نام نہیں لیتی اور تم ذرا بھی اعتراض نہیں کرتے۔ تمہارے دل میں کیا سمایا ہے؟ مرد کیا ایسے ہی ہوا کرتے ہیں؟"

مردوں کو فطرتاً عورتوں کی اندھا دھند طرفداری منظور ہوتی ہے اور اس کے لئے عورتیں ہی اُنہیں زیادہ قصوروار ٹھہراتی ہیں۔ شری پتی بابو اس بات کے خلاف لوگ مایا کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کے لئے تیار تھے کہ بیکس و بے پناہ اور ناسزا کادمبی پر ان کا رحم مناسب سے ذرا زیادہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کادمبی کے سُسرال والے سچ مچ اس اولاد سے محروم کمزور و ناتوان عورت پر بہت ظلم کرتے ہوں گے چونکہ کادمبی اُس سختی کو برداشت نہیں کر سکی اس لئے اُس نے میرے ہاں آ کر پناہ لی ہے۔ اُس کے ماں باپ کوئی نہیں ہے۔ تو پھر میں اسے کس طرح گھر سے نکال دوں؟ یہی وجہ تھی کہ اب تک نہ تو اُنہوں نے کادمبی کے سُسرال میں کوئی خبر بھیجی اور نہ اُس کے متعلق کسی بات کا پتہ لگایا۔ اُن کا دل یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ کادمبی سے ناخوشگوار سوال کر کے اس کے دل کو صدمہ پہنچائیں +

اب اُن کی بیوی اُن کے دل پر طرح طرح کی باتوں سے پے درپے چوٹیں لگا کر اُن کی فرض شناسی کے مادہ کے بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ سری پتی بابو کو معلوم ہو گیا کہ اگر خانہ جنگی منظور نہیں تو کادمبی کے سسرال میں خبر بھیجنا بہت ضروری ہے۔ آخرکار اُنہوں نے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اگر خبر معمولی طور پر اُن کے پاس چٹھی بھیجی گئی تو ممکن ہے اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں خود رانی ہاٹ جاؤں اور بعد تحقیقات یہ رائے قائم کروں کہ اب کیا کرنا مناسب ہے۔

اُدھر سری پتی رانی ہاٹ کو روانہ ہوئے اور اِدھر لوگ مایا نے آ کر کادمبی سے کہا "بہن! اب یہاں تمہارا رہنا ٹھیک نہیں۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے؟"

کادمنی نے سنجیدگی سے لوگ ماما کی طرف دیکھ کر کہا "لوگوں کیساتھ میرا تعلق ہی کیا ہے؟"

لوگ ماما یہ جواب سن کر سناٹے میں آگئی۔ ذرا جھنجھلا کر بولی ۔"تمہارا نہ ہو لیکن ہمارا تو ہے۔ ہم پرائے گھر کی بہو بیٹی کو کس طرح۔ کیا کہکر۔ اپنے گھر میں رکھ سکتے ہیں؟"

کادمنی نے پوچھا ۔"میری سسرال اب کہاں ہے؟"

لوگ ماما بول اٹھی ۔"اوئی ری! لو کہتی کیا ہے!"

کادمنی نے آہستہ آہستہ کہا۔"کیا میں لوگوں کی کچھ ہوں۔ کیا میں اب اس دنیا کا انسان ہوں! تم لوگ ہنستے ہو۔ روتے ہو۔ پیار کرتے ہو۔ سب اپنے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ آرام اور تکلیف بھوگتے ہو۔ میں صرف لوگوں کے چہرے تکتی رہتی ہوں۔ تم انسان ہو اور میں سایہ ہوں۔ کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے ایشور نے تمہاری اس دنیا میں کیوں رکھا ہے!"

کادمنی نے لوگ ماما کی طرف دیکھ کر۔ نہیں کچھ اس انداز سے کہیں کہ لوگ ماما کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی مگر اصل بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ جواب بھی نہیں دے سکی اور نہ دوبارہ کوئی سوال ہی پوچھ سکی۔ اس کے چہرہ پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہوگئے اور منہ پھلائے وہاں سے چلی گئی +

(۴)

رات کے دس بجتے بجتے سری پتی بالو رائی ہاٹ سے واپس آگئے۔ اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ تو بارش تھمے گی اور نہ رات ہی ختم ہوگی

لوگ ماما نے پوچھا ۔"کیا خبر لائے؟"

سری پتی نے جواب دیا "بہت سی باتیں ہیں۔ پھر سناؤنگا"

یہ کہکر انہوں نے کپڑے بدلے اور کھانا کھایا۔ پھر بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔ ان کے چہرہ پر گہرے فکر کے آثار جھلک رہے تھے۔ لوگ ماما بڑی دیر سے اپنے اشتیاق کو دبائے بیٹھی تھی۔ اب وہ صبر کی تاب نہ لا سکی اور پوچھا "کہو۔ کیا ہوا؟" سری پتی نے کہا "تم نے ضرور غلطی کی ہے" یہ سن کر لوگ ماما اپنے دل میں جھلا اٹھی۔ عورتیں کبھی غلطی نہیں کرتیں۔ اور اگر غلطی کریں بھی تو کسی عقلمند شخص کو ہرگز اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ مناسب یہی ہے کہ وہ غلطی اپنے سر لے لی جائے۔ لوگ ماما نے گرم ہو کر کہا "کیسی غلطی، ذرا میں بھی تو سنوں" سری پتی نے کہا "جس عورت کو تم نے اپنے ہاں رکھ چھوڑا ہے وہ تمہاری پہلی کادمنی نہیں ہے"

ایسی باتیں سن کر آسانی سے غصہ آسکتا ہے۔ جا سکر اپنے ہی شوہر کی زبان سے ایسی باتیں سُننا کس عورت کو ناگوار نہ گذرے گا؟

لوگ ماما نے کہا "کیا خوب! میں اپنی سہیلی کو نہیں پہچانتی۔ پہلے پہل تو میں ہی تو پہچانوں گی!"

سری نتی نے سمجھایا۔ کہ "میں یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی سہیلی کو نہیں پہچانتیں تو میں پہچانتا ہوں۔ مگر ثبوت پر تو یقین ہی کرنا پڑیگا۔ تمہاری سہیلی کادمبنی مرچکی ہے۔ اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔"

لوگ مایا بولی۔ "ذرا ان کی باتیں تو سُنو! تم ضرور غلطی کر آئے ہو۔ جہاں جانا چاہئے تھا وہاں نہیں گئے بلکہ اور کہیں پہنچ گئے اور یہ گپ سُن آئے۔ تم سے خود جانے کے لئے کہا کس نے تھا؟ ایک چھٹی لکھ کر بھیج دیتے اُس سے ہی سارا معاملہ صاف ہو جاتا۔"

جب سری نتی ناتھ نے دیکھا کہ میری بیوی کو میری قابلیت میں شک ہے تو وہ نہایت اُداس اور غمگین ہو کر سب ثبوت جو اُنھوں نے بہم پہنچائے تھے مفصل طور پر اُس کے رُوبرو پیش کرنے لگے لیکن نتیجہ کچھ بھی نکلا۔ دونو طرف سے ہاں نہیں ہوتے ہوتے آدھی رات گذر گئی۔

اگرچہ کادمبنی کو اُسی لمحہ گھر سے نکال دینے پر میاں بیوی دونو متفق الرائے تھے۔ کیونکہ سری نتی کو یقین تھا کہ وہ عورت کادمبنی بن کر یہاں رہتی ہے اور اس نے لوگ مایا کو دھوکا دیا ہے اور لوگ مایا کو یقین تھا کہ کادمبنی بدچلن ہو کر گھر سے چلی آئی ہے ——— مگر جو سوال سامنے پیش تھا اُس میں کوئی بھی ہار تسلیم نہیں کرتا تھا۔

سری نتی کہتے تھے کہ وہ کادمبنی نہیں ہے اور لوگ مایا کہتی تھی کہ وہ ضرور کادمبنی ہی ہے۔

دونو کی آواز رفتہ رفتہ اونچی ہو چلی۔ وہ یہ بھول گئے کہ پاس ہی کی کوٹھڑی میں کادمبنی سو رہی ہے۔

سری نتی نے کہا "بڑی مشکل در پیش ہے میں خود سن آیا ہوں کہ کادمبنی مرچکی ہے۔"

لوگ مایا بولی "میں کس طرح یقین کروں۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ جیتی جاگتی موجود ہے!!"

آخر کار لوگ مایا نے پوچھا۔ "اچھا کادمبنی کب مری تھی؟"

اُس نے دل میں خیال کیا کہ کادمبنی کی کسی چھٹی کی تاریخ کے ساتھ اس کے مرنے کی تاریخ کی عدم مطابقت دکھا کر میں اپنے شوہر کی غلطی کو ثابت کر دوں گی۔"

سری نتی نے کادمبنی کے مرنے کی جو تاریخ بتلائی اس کے موجب حساب لگا کر دونو نے دیکھا کہ جس روز شام کو کادمبنی اُن کے مکان پر آئی تھی اُس سے ٹھیک ایک دن پہلے اُس کے مرنے کی تاریخ تھی اسے سن

لوگ بابا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ سری پتی کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے

اسی لمحہ لوک بابا کے کمرہ کا دروازہ کھل گیا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اندر کا چراغ بجھ گیا۔ کمرہ میں چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ کادمبنی ایک دم کمرہ کے اندر آکر کھڑی ہو گئی۔ اُسوقت تقریباً ڈھائی پہر رات گذر چکی ہوگی۔ باہر خوب زور کی بارش ہو رہی تھی ✦

کادمبنی بولی۔ "بہن! میں تمہاری پہلی کادمبنی ہی ہوں مگر اب میں زندہ نہیں۔ مر چکی ہوں"

لوگ بابا ڈر کے مارے چلا اُٹھی۔ سری پتی کے منہ سے بھی کوئی بات نہیں نکلی ✦

کادمبنی نے پھر یوں کہنا شروع کیا۔ "لیکن سوائے اس کے کہ میں مر چکی ہوں میں نے تمہارا اور کیا قصور کیا ہے؟ میرے لئے اگر اس جہان اور دوسری دنیا (پرلوک) میں کہیں گنجائش نہیں ہے تو بتلاؤ میں کہاں جاؤں؟"

تیز آواز سے چلا کر گویا برسات کی رات میں سوئے ہوئے خالق کو جگا کر کادمبنی نے کہا۔ "تو بتلاؤ۔ میں کہاں جاؤں؟"

یہاں دونوں کو غش آگیا۔ کادمبنی اُنہیں اُسی حالت میں۔ اُسی تاریک کمرہ میں۔ چھوڑ کر کارزار دنیا میں اپنے لئے جگہ تلاش کرنے کے لیے چل کھڑی ہوئی ✦

(۵)

یہ بتلانا مشکل ہے کہ کادمبنی کس طرح رانی ہاٹ واپس پہنچ گئی۔ وہ رانی ہاٹ پہنچکر دن بھر بھوکی پیاسی گاؤں کے قریب ہی ایک مسمار شدہ و خستہ حال مندر میں جس کی مورتی تک زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی تھی، بیٹھی رہی ✦

برسات کی بوقت شام جب بہت گھٹا گھنی ہو گئی اور بارش آندھی کے جلد ہی آجانے کے ڈر سے گاؤں کے رہنے والے اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے تو کادمبنی اُس مندر سے نکلی۔ سسرال کے دروازہ پر پہنچتے ہی ایک بار اُس کا دل دھڑک اُٹھا لیکن لمبا گھونگھٹ نکال کر جب وہ مکان کے اندر گھسی تو گاؤں کی کوئی عورت خیال کر کے کسی نے اُس سے باز پرس نہ کی۔ وہ بلا روک ٹوک اندر چلی گئی۔ اسوقت موسلا دھار بارش برسنے لگی اور ہوا بھی خوب زور سے چلنے لگی ✦

اُسوقت گھر کی مالکہ۔ تارا سنکر ریسدار کی بیوی ۔ اپنی بیوہ نند کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں محو تھی۔

خادمہ اور روٹی نکالنے والی بہو بھی مارے چیخنے چلانے میں تھیں۔ بیمار بچے کا بخار اُتر گیا تھا اور وہ آرام سے سو رہا تھا۔ کادمبنی سب کی نگاہ بچا کر اُس کے پاس پہنچی۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ کر سسرال آئی تھی۔ یہ بات شاید اُسے خود بھی معلوم نہیں تھی۔ جس بچہ کی اُس نے پرورش اور پرداخت کی تھی شاید اسکو دیکھنے کی خواہش ہی اُسے یہاں گھسیٹ لائی تھی۔ اُس کے بعد کیا کرنا ہوگا۔ کہاں جانا ہوگا وغیرہ باتوں پر اُس نے ذرا بھی غور نہیں کیا تھا۔

چراغ کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ بیمار۔ کمزور بچہ پڑا سو رہا ہے۔ اُسے دیکھ کر گویا کادمبنی کے کانپتے ہوئے دل کو پیاس لگ گئی۔ کادمبنی سے اُسے ایک بار اُٹھا کر سینہ سے لگالیے اور پیار کئے بغیر رہا گیا۔

اس کے بعد کادمبنی کے دل میں خیال آیا "میں تو ہوں نہیں۔ اب اس بچہ کو دیکھنے والا۔ اسکی خبر لینے والا اور کون ہے؟ اس کی والدہ کو کھیل کود تماشہ اور گپ شپ کے سوائے اور کسی بات کی خبر نہیں۔ یہ بچہ مجھے سونپ کر وہ اس کی طرف سے بالکل بےفکر تھی۔ میں نے پال پوس کر اسے اتنا بڑا کیا ہے۔ اب کون اس کی دیکھ بھال کریگا؟"

اُسی وقت بچہ نے کروٹ بدلی اور نیم خوابی کی سی حالت میں پکار اُٹھا — "چاچی! پانی دے!"
کادمبنی نے دل میں کہا۔ میرا بچہ اب تک مجھے نہیں بھولا۔ پھر جلدی سے صراحی سے گلاس میں پانی ڈالا اور بچہ کو گود میں لیکر اُسے پانی پلایا۔

جب تک بچہ کا بخار تھا۔ اُسوقت تو حسب سابق چاچی کے ہاتھ سے پانی پینے میں بچہ کو کچھ تعجب نہ ہوا۔ مگر جب کادمبنی نے اُسے پھر پلنگ پر لٹا دیا۔ تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چاچی سے لپٹ کر بولا "چاچی! تو مرگئی تھی؟"

چاچی نے جواب دیا "ہاں بیٹا!"
بچہ بولا "اب تو پھر آگئی ہے۔ اب نہیں مریگی؟"

کادمبنی اس کا کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ گھر بھر میں شور مچ گیا۔ خادمہ ساگودانہ لاکر بچہ کو دینے آئی تھی وہ فوراً ساگودانہ ہاتھ سے پھینک "اُئی ری!" کہکر زمین پر گر پڑی۔
اُس کی چیخ پکار سن کر گھر کی مالکہ شطرنج چھوڑ کر وہاں دوڑی آئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جو منظر پیش تھا اُسے دیکھ کر وہ سوکھے ٹھنڈ کی مانند کھڑی رہ گئی۔ نہ بھاگ سکی اور نہ کچھ کہہ سکی۔
یہ دیکھ کر بچہ کے دل پر بھی خوف طاری ہوگیا۔ اُس نے رو کر کہا "چاچی! تو جا!"

کادمبنی کو بہت دنوں کے بعد یہ احساس ہوا کہ وہ مری نہیں ہے۔ زندہ ہے۔ وہی پہلا مکان ہے وہی بچہ ہے وہی محبت اور پیار ہے۔ وہی سب باتیں ہیں۔ اُس کے لئے سب چیزیں زندہ اور متحرک ہیں اُس کے اور ان سب چیزوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے کسی قسم کی رکاوٹ درپیش نہیں ہے سہیلی کے گھر جاکر اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ مرگئی ہے۔ بچے کے گھر آکر اُس نے دیکھا اور سمجھا کہ وہ مری نہیں ہے۔ زندہ ہے۔ کادمبنی مضطرب ہو اور اپنی جیٹھانی کو مخاطب کرکے بولی "جی جی (بہن)! مجھے دیکھ کر تم ڈر کیوں رہی ہو؟ میں تو وہی جیتی جاگتی کادمبنی ہوں"۔

تارا شنکر کی بیوی کھڑی نہ رہ سکی۔ غش کھاکر گر پڑی۔ بچہ نے جاکر سارا ماجرا تارا شنکر کو سنایا۔ وہ سنتے ہی خود زنانخانہ میں آموجود ہوئے۔ اُنہوں نے ہاتھ جوڑ کر کادمبنی سے کہا "بہو! کیا تمہیں ایسا ہی کام کرنا مناسب ہے؟ صرف یہی ایک بچہ ہمارے خاندان کا چراغ ہے۔ اس پر تمہاری نظر کیوں ہے؟ ہم کیا تمہارے کوئی غیر ہیں؟ تمہاری موت کے بعد سے وہ دن بدن سوکھتا جارہا ہے۔ اُس کا مرض رفع ہونے میں نہیں آتا۔ وہ دن رات "چاچی! چاچی!" کرتا رہتا ہے۔ جب تم اس دنیا سے چلی گئی تو تمہیں دنیا کا پیار اور لگاؤ بھی چھوڑ ہی دینا چاہیئے۔ ہم تمہاری گیا کرا دیں گے ـــــ"

اب کادمبنی سے رہا نہ گیا۔ اُس نے سر اور زوردار لہجہ میں کہا "میں مری نہیں ہوں۔ جیتی جاگتی ہوں۔ میں تم کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں مری نہیں ہوں۔ دیکھو ـــــ"

اتنا کہکر اُس نے ایک لوٹا اٹھاکر اپنے سر پر دے مارا۔ سر پھٹ گیا اور خون نکلنے لگا۔

پھر اس نے کہا "دیکھو میں زندہ ہوں"۔

تارا شنکر دم بخود کھڑا رہ گیا۔ بچہ سہم گیا اور "دادا! دادا!" کہکر باپ کو پکارنے لگا۔ دو نو عورتیں بیہوش زمین پر پڑی تھیں*

جب ہوش آیا تو کادمبنی "میں مری نہیں۔ میں مری نہیں"۔ کہکر چلاتی ہوئی گھر سے نکلی اور باہر سامنے ہی جو تالاب تھا اُس میں پھاند پڑی۔ تارا شنکر کو اندر سے اس کے گرنے کا دھماکا سنائی دیا۔

یوں مری ہوئی کادمبنی نے دوبارہ مرکر یہ ثابت کردیا کہ وہ مری نہیں تھی (ٹیگور)

(انڈیٹر رام سروپ کوشل)۔

ع؎ ہندوؤں کے ہاں مرنے کی نجات کے لئے گیا جی میں اُس کے پنڈدان کراتے ہیں + مترجم

کلام محمود

پریشاں سب ہیں تیری چشمِ حیراں دیکھنے والے ؛ ارے کچھ تو بتا رنگِ گلستاں دیکھنے والے
نہیں معلوم خونِ سر سے کیا وحشی نے لکھا ہے ؛ کہ سر ٹکراتے ہیں دیوارِ زنداں دیکھنے والے
یہ تجھ کو ہو گیا کیا۔ کس لئے آنسو نہیں تھمتے ؛ ارے کچھ تو بتا۔ گورِ غریباں دیکھنے والے
بظاہر تو دکھائی دے رہا ہے خوں کا قطرہ ؛ مگر ہیں مضطرب سب نوکِ مژگاں دیکھنے والے
شعاعِ حسن سے ہر ایک ذرہ جگمگا اُٹھا ؛ کہاں ہیں آئیں تو اب بزمِ امکاں دیکھنے والے
قفس میں جوش سے بلبل نے وہ گلکاریاں کی ہیں ؛ پھڑک اُٹھتے ہیں سب رنگِ گلستاں دیکھنے والے
ہوا کیا دل کو پھر سے کیوں لگے ملتے ہی چونک اُٹھا ؛ ذرا سمجھ تو تبسم ہائے پنہاں دیکھنے والے
کہیں ایسا نہ ہو پھر آتشِ فرقت بھڑک اُٹھے ؛ نگہ کو بند کر گل ہائے خنداں دیکھنے والے
نہیں معلوم اے اللہ اب کیا ہونے والا ہے ؛ ہیں گریاں چہرۂ بیمارِ ہجراں دیکھنے والے
ہے مضطر کائناتِ دہر کیوں سب خلق لرزاں ہے ؛ ارے کچھ تو بتا رعبِ پریشاں دیکھنے والے
زباں تاب لا سکتا نہیں سرِ فنا کی ؛ زباں کو بند کر اے بزمِ عرفاں دیکھنے والے
سکونِ دل کے خواہاں آئے تھے محفل میں لیکن ؛ کھڑے ہیں مضطرب اب روئے جاناں دیکھنے والے
یہی وہ ہیں کہ دم بھرتے تھے جو میری رفاقت کا ؛ وہی اب ہنس رہے ہیں مجھ کو گریاں دیکھنے والے
نہیں معلوم اے محمود کیا اُن کو نظر آیا ؛ کھڑے ہیں سرنگوں جانِ شہیداں دیکھنے والے

(جناب صاحب محمود علیخاں عرف آغا علیخاں خلف ...)

"عجیب و غریب ڈھول"

(بچوں کی کہانی)

ملتان میں ایک مزدور رہتا تھا ایک دن وہ کام پر جاتے ہوئے ایک چراگاہ سے جو گذرا تو ایک سیدھا ... اُسکے

پاؤں کے نیچے آگئی۔ اگر وہ اُچھل کر ایک طرف نہ ہو جاتا تو وہ پس گئی تھی۔ ایک آواز آئی اور ایک خوبصورت دوشیزہ بولی ۔ "ایلیان! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"او حسن کی ملکہ! میری قسمت میں شادی کہاں؟ میں تو ایک بیوا ہوں۔ بھلا مجھے کون پسند کریگا!"

"تو اچھا! مجھ سے شادی کر لو"

لڑکی خوبصورت تو تھی ہی۔ ایلیان کی باچھیں کھل گئیں اور بولا۔ "سر آنکھوں سے۔ مگر رہیں گے کہاں؟"

لڑکی ۔ "رہائش کی فکر معلوم۔ البتہ ہمت کے آگے سب فرست ہے۔ کوشش شرط ہے۔ آدمی بھوکا تو مر ہی نہیں سکتا"

ایلیان ۔ "تو پھر اچھا۔ آؤ شادی کریں۔ مگر کہاں چلیں؟"

لڑکی "شہر میں اور کہاں"

دونوں شہر کو گئے۔ شہر کے باہر ایک چھوٹی سی کٹیا میں شادی کا انتظام کیا گیا۔ اور خوشی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

(۲)

ایک دن بادشاہ ایلیان کی کٹیا کے پاس سے گذرا۔ اور ان کی بیوی کو دیکھ کر تصویرِ حیرت بن گیا گاڑی کو ٹھیرالیا۔ اور پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں ایلیان کی بیوی ہوں"۔

"وہ کون ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟"

"وہ محض ایک مزدور ہے"

"مزدور! تو تم ایک مزدور کے پلے کیونکر پڑ گئیں۔ تم تو حسن کی دیوی ہو۔ ملکہ بننے کے لائق ہو۔ یہ جھونپڑی تمہارے شایانِ شان نہیں۔ تمہیں تو محل چاہیے"

"درست آپ کی مہربانی۔ مگر میں اسی پر شاکر ہوں"

بادشاہ کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ مگر پھر چل دیا۔ محل میں پہنچا تو آرام کہاں تھا۔ ایلیان کی بیوی کا خیال دل میں گھر کیے ہوئے تھا۔ ساری رات چین نہ آیا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ آخر کار درباریوں کو بلایا۔ اور حکم دیا کہ کوئی طریقہ سوچو جس سے یہ پری میرے ہاتھ آ جائے ۔

درباری بولے "حضور بادشاہ سلامت! املیان کو حکم دیا جائے کہ وہ یہاں آکر مزدوری کیا کرے۔ ہم اُسے اتنا کام دینگے کہ وہ کام کرتا کرتا مر رہیگا۔ عورت بیوہ ہو جائیگی۔ میدان صاف ہو جائیگا۔"

بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اُسنے حکم دیا کہ املیان کل سے محل میں آکر کام کرے اور بیوی اُس کے ساتھ رہے۔

یہ بات سنتے ہی املیان بیوی سے پوچھنے لگا۔ "تو اب کیا کیا جائے؟"

"گھبراتے کیوں ہو۔ جاؤ۔ دن بھر وہاں کام کرو۔ مگر دیکھو! رات کو واپس آجانا۔"

املیان جب محل میں گیا تو ملازمان شاہی نے پوچھا "تم اکیلے آئے ہو۔ بیوی کیوں نہیں لائے؟"

"کیا اس کا آنا بھی لازمی تھا۔ وہ گھر پر ہے اور اپنے کام میں مصروف ہے۔"

املیان کو کام دیا گیا مگر اتنا کہ شاید ہی دو آدمی ختم کر سکیں۔ سوچنے لگا "یہ تو ناممکن سی بات ہے کہ آج ختم کر لوں"۔ مگر نہیں جب شام ہوئی۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ کام ختم ہو گیا۔

درباریوں نے دیکھا کہ املیان نے تو کام ختم کر لیا۔ دوسرے روز پہلے سے دوگنا کام اُسے دیا۔

املیان گھر آیا۔ سب چیزیں قرینے سے چُنی تھیں۔ چولھا گرم تھا۔ کھانا تیار ہو رہا تھا۔ اور بیوی بیٹھی سی رہی تھی اور شوق سے انتظار کر رہی تھی۔ دسترخوان بچھایا۔ اور دن کی کیفیت پوچھنے لگی۔

"کیا بتاؤں۔ مجھے کام اتنا دیا کہ میری طاقت سے باہر تھا۔ اگر یہی حالت رہی تو میں یقیناً زندہ درگور ہو جاؤنگا۔"

بیوی بولی "کام کرتے وقت یہ خیال کبھی دل میں نہ لایا کرو۔ کہ کتنا ہو چکا ہے اور کتنا رہتا ہے کام کرتے جاؤ۔ کرتے جاؤ۔ اور معاملہ سدھ ہو جائیگا۔"

املیان سو گیا۔ دوسرے روز پھر کام پر گیا۔ بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے کام ختم ہونے لگا۔ یونہی ہر روز ہوتا رہا۔ الغرض وہ کام بڑھاتے گئے۔ مگر املیان بھی کچھ کم نہ تھا۔ وقت پر کام ختم کر لیتا۔ اور شام کو گھر لوٹ آتا۔

پورا ہفتہ گذر گیا۔ درباریوں نے جب دیکھا کہ اس طرح سے تو کوئی کامیابی کی صورت دکھائی نہیں دیتی تو کئی جتن کیے۔ مگر کچھ بن نہ آئی۔ حتیٰ کہ دوسرا ہفتہ بھی بیتنے کو آیا۔

ایک دن بادشاہ نے پھر درباریوں کو بلایا اور کہا "تم کیا کر رہے ہو؟ ہفتے دو [illegible]

تو پورے سولہ دن گذر گئے ہیں۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہم تو کہتے تھے کہ سخت کام سے اس کا کچومر نکل جائیگا مگر میں تو ہر شام اُسے خوشی خوشی گاتا واپس گھر جاتے دیکھتا ہوں۔ تمہارے ہونے سے مجھے کیا فائدہ ؟"

درباری بولے "حضور! ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی مگر حیرانی کی بات ہے کہ جس کام پر لگاتے ہیں۔ جو کام دیتے ہیں۔ دن ڈوبتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اب بھلا ہم بیچاروں کا کیا قصور ہے ہمارا تو اُس نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اب گذارش ہے کہ آپ اُسے حکم دیں کہ محل کے سامنے ایک دن میں گرجا تیار کروا دے اگر ایسا نہ کر سکے تو اُس کا سر اُڑا دیا جائے"۔

بادشاہ نے الماس کو بلایا اور حکم سنا دیا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر ایک گرجا تیار کروا دو انعام پاؤ ورنہ جان کی خیر نہیں۔

الماس یہ سن کر گھر کو ہو لیا۔ دل میں سوچا کہ اب تو جان گئی۔ آتے ہی بیوی سے بولا "پیاری جان اب تو یہاں سے بچ نکلنے کی کوئی صورت ڈھونڈنی چاہیئے"۔

"مگر ایسے ڈرنے کی کوئی وجہ ؟"

"میری جان! میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔ بادشاہ کہتا ہے۔ کہ ایک دن میں گرجا تیار کرو۔ ورنہ سر قلم کیا جائیگا مجھے تو بھاگ جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں سوجھتا"۔

بیوی بولی۔ تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم جان بچا کر بھاگ نکلو گے۔ ہرگز نہیں۔ بادشاہ کے سپاہی نہیں چھوڑ سکتے"۔

"تو میں کیسے گرجا بناؤں۔ جب مجھ میں اِس قدر طاقت ہی نہیں اور پھر ایک دن کے اندر"۔

"تم ذرا غور سے سنو! گھبراؤ نہیں۔ کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔ اِتنا کرنا آج ذرا سویرے جاگنا۔ خدا کارساز ہے۔ تمہاری مراد بر آئیگی"۔

صبح صادق خاوند کو جگایا۔ اور کہا "ذرا جلدی جاؤ یہ کیلیں ہیں اور یہ ایک ہتھوڑا ہے۔ جا کر گرجا تیار کرو۔ ایک دن بہت کافی ہے"۔

الماس کی حیرانی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ جب وہاں پہنچتے ہی دیکھا کہ گرجا قریباً تیار ہے صرف کچھ کام باقی تھا وہ شام تک وہ بھی پورا ہو گیا۔

بادشاہ نے کھڑکی سے دیکھا گرجا بالکل تیار ہے جونہی تو کیا دیکھا غصہ سے لال پیلا ہو گیا

درباریوں کو دوبارہ بلایا اور کہنے لگا۔ "تو اُس نے تو یہ بھی کر ڈالا۔ سزا دیں تو کس قصور پر؟"

"اچھا حضور! اُس کو حکم دیں۔ کہ ایک دن کے اندر پانی کی نہر کھود دے۔ جو محل کے پاس سے گذرے اور جس پر جہاز بھی چل رہے ہوں۔"

ان کے الماس کے ہوش اُڑ گئے۔ جُوں توں گھر پہنچا۔

بیوی کہنے لگی ―― "یہ کیوں؟ آخر کون سا کام ہے؟ گرجے سے بھی مشکل ہے؟"

"پیاری بیوی! بھاگو یہاں سے اب خیر نہیں ہے۔"

"اوہو! فکر نہ کرو۔ اطمینان رکھو۔ کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔"

بیوی نے تڑکے خاوند کو جگایا اور کہنے لگی۔ "جاؤ۔ سب کچھ تیار ہے۔ صرف نہر کے کنارے ہموار کر دینا۔"

الماس نے دیکھا کہ محل کے چاروں طرف صاف شفاف پانی کی ندی بہہ رہی ہے۔

اب تو بادشاہ کی حسرت کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ حسبِ معمول درباریوں کو بلایا اور کہنے لگا۔ "اس حالت میں تو میں اس کی بیوی نہیں چھین سکتا۔ کوئی اور تجویز سوچو۔"

درباری بہت دیر تک سوچنے کے بعد بولے ―― "حضور اُسے حکم دیں کہ وہاں جائے جہاں کا اُسے پتہ نہ ہو اور وہ خبر لائے جس کا اس کو بھی علم نہ ہو۔ بس تو اُس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ جونہی واپس آئے۔ کہہ دیجئے کہ نہیں۔ غلط جگہ گیا اور غلط خبر لایا۔"

بادشاہ نے فوراً کہا۔ "ہاں۔ ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔"

الماس کو بلایا گیا اور اُسے حکم سنایا گیا۔

الماس گھر واپس آیا اور بیوی کو سارا حال کہہ سنایا۔

بیوی بولی ―― "ہاں اب ذرا سوچ سمجھ سے کام لینا چاہئے۔ اچھا۔ ایک بات ہے۔ تمہیں دریا کے پار جانا پڑے گا۔ اس جگہ میری دادی جان رہتی ہیں اب اُن کی مدد درکار ہے۔ وہ تمہیں کچھ دیں گی وہ مل جائے لانا۔ میں وہاں موجود ہوں گی۔ اب میں اُن کے ساتھ نہیں رہ سکتی وہ مجھے خبر آ لے جائیں گے۔ اگر تم میری دادی کے لئے رہے تو جلد مجھے بلا لو گے۔"

الماس نے سفر کے لئے توشہ باندھا سنبھالا۔ بیوی نے ایک تیر بلور سالی دی اور کہنے

گئی ـــ "یہ میری اماں جان کو دے دینا۔ اور وہ خود سمجھ جائینگی۔ کہ تم میرے جاور ہو۔"

چلتے چلتے وہ ایک جنگل میں پہنچا۔ جہاں کہ ایک جھونپڑی میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی رو رہی تھی۔ جونہی املیاں کو دیکھا۔ کہنے لگی ـــ "کون بیٹا! کیسے آئے؟"

املیاں نے شروع سے لیکر آخر تک سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اور تب بڑھیا بولی ـــ "تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ اچھا ذرا آرام کرو۔ کچھ کھاؤ۔ سو۔"

املیاں کھانا کھا رہا تھا کہ بڑھیا پھر یوں مخاطب ہوئی:- "دیکھو بیٹا۔ یہ ایک دھاگے کی گیند ہے۔ جدھر یہ گیند جائے۔ اُدھر تم بھی جانا۔ یہ تمہیں سمندر کے کنارے ایک بڑے شہر میں لے جائیگی وہاں تم آخری گھر میں رات کاٹنا۔ اور وہاں تم ایک چیز دیکھو گے جس کو لوگ ماں باپ سے بڑھ کر مانتے ہیں۔ وہ لے لینا اور بادشاہ کے پاس لے جانا۔ اگر بادشاہ کہے کہ ٹھیک نہیں تو کہنا ـــ "اچھا ٹھیک نہیں تو اسے توڑ دینا چاہیئے"۔ اور تب اُسے بجانا اور پھر توڑ کر دریا میں پھینک دینا۔ تم کو بیوی مل جائیگی"

املیاں بڑھیا کو الوداع کہکر روانہ ہوا اور گیند کے پیچھے پیچھے سمندر کے کنارے ایک شہر میں پہنچا۔ جہاں اُسے دیکھا کہ باپ بیٹے سے اُٹھنے کو کہتا ہے۔ لڑکا نہیں مانتا۔ ماں بھی بہتیرا کہتی ہے مگر اُس کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اتنے میں کوئی نقارچی نقارے بجاتا گذرتا ہے۔ لڑکا رضائی پھینک کر اُس کے پیچھے اُٹھ دوڑتا ہے۔ املیاں سمجھ گیا۔ کہ یہی چیز ہے۔ نقارچی سے وہ چیز مانگی۔ یہ ایک چھوٹا سا ڈھول تھا۔ مگر نقارچی نے دینے سے انکار کیا۔ اس پر املیاں ڈھول چُرا کر بھاگا۔ اور گھر آیا۔ وہاں بیوی کو نہ پایا۔ شہر محل کی طرف روانہ ہوا۔

بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ وہ مطلوبہ چیز حاضر ہے۔ بادشاہ نے کہا "اُسے حکم دو کہ کل حاضر ہو"۔

"نہیں۔ نہیں، بادشاہ سے کہو۔ کہ میں آج واپس آ گیا ہوں۔ یا تو وہ مجھے ملے یا میں خود وہاں حاضر ہونگا"۔

آخر کار بادشاہ آیا۔ اور پوچھا۔ "تم کہاں سے آئے ہو"

املیاں ـــ "میں نہیں جانتا"۔

بادشاہ ـــ "تو اچھا کیا لائے؟"

املیاں نے ڈھول حاضر خدمت کیا۔ بادشاہ نے دیکھنے سے انکار کیا اور کہنے لگا "یہ وہ چیز نہیں"۔

املیاں نے کہا "اگر یہ وہ چیز نہیں تو اسے توڑ دینا چاہیئے"۔

الیاں محل سے باہر نکلا اور ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ جونہی ایسا کیا۔ بادشاہ کی ساری فوج اُسے سلام کرتی ہوئی اُس کے پیچھے ہو لی۔

بادشاہ بہرا اچھا۔ بہرا رہا۔ مگر ڈھول نے ایک نہ سُنی۔ جب بادشاہ نے یہ حالت دیکھی تو فوراً حکم دیا کہ الیان کی بیوی کو رہا کر دو اور الیان سے کہا گیا کہ ڈھول بادشاہ کی نذر کرے۔ مگر الیان بولا "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں ضرور اسے دریا میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہا دوں گا۔" اور اس نے ویسا ہی کیا۔

دلوراج چودھری۔ بی۔ اے (آنرز)

شعاعِ مہر

تھا کوئی بیہوش رعبِ حسن سے کوئی خموش ؛ کون کرتا حشر میں فریاد کس کو ہوش تھا
بزمِ ظالم میں مرا کب یاد کرتا ذکرِ غیر ؛ مختصر یہ ہے کہ واں جو تھا کفن بر دوش تھا
آئینہ خانہ میں کل پہنچا جو وہ محوِ جمال ؛ تھے در و دیوار حیراں اور وہ خود مدہوش تھا
کروٹیں لیتا رہا ظالم رات بھر بستر پہ کیوں ؛ نالہ تھا ایسا کہ اک ہنگامۂ پُرجوش تھا
یہ نگاہِ مستِ ساقی کا اثر تھا بزم میں ؛ میکدہ میں کوئی بیخود تھا کوئی خاموش تھا
خلق میں تھا جو گنہگاروں کا ستارِ عیوب ؛ حشر کے دن بھی وہی عاصی کا پردہ پوش تھا
جل نہ اُٹھتا طور کیونکر اک نگاہِ غیظ سے ؛ لطفِ دیدار اسکو تھا حاصل اور کوئی بیہوش تھا

پہنچے یوں اے مہر ہم رنداں کو سرِ حشر میں
لب پہ ساقی کی ثنا الحمد کا دل میں جوش تھا

مہر جالبی سکریٹری انجمن حیدری جالس

جذباتِ عاصی

یہ مزاجِ عاشقی ہے اے شرابِ زندگی ؛ چار دن کی چاندنی ہے آب و تابِ زندگی
تیرے رہنے میں کسی انس کی ہر اک صورت بہار ؛ یعنی کھل جائیگا بارش سے سحابِ زندگی
جوڑ لے تارِ نفس کو آنسوؤں کے تار سے ؛ اور بنائے سوز سے پردے ربابِ زندگی
ہے تلاطم خیز امواج سے بحرِ وجود ؛ ہاں ہوا ہو جائیگا دم میں حبابِ زندگی
تھا کبھی یہ دل سبق آموز اربابِ عقول ؛ اب ہے بار بہ کتابِ انتخابِ زندگی
ہم کو کچھ جانے ہو موت ہے اُسکا شمار ؛ عرف میں کہتے ہیں ہم جسکو شتابِ زندگی
ہر جوانی لیکن جواں دل ہے کسی کی یاد میں ؛ ہو گئی میرے لیئے پیری شبابِ زندگی

دیکھ رحمت کس کا عالم - تو سراپا رحمتی -
بارِ عصیاں سہہ کر عاصی سسد عذابِ زندگی

شیخ حیدر علی عاصی ہیڈ کلرک

سان فرانسسکو

سان فرانسسکو جس کے کچھ حالات شباب اُردو میں درج کیے جاتے ہیں۔ امریکہ کے صوبہ متحدہ میں کیلیفورنیا کا دارالخلافہ ہے۔ یہ شہر ۱۸۴۷ء میں آباد ہوا اور صرف ۱۸۷۰ء تک اس کی آبادی بارہ لاکھ ساٹھ ہزار ہو گئی۔ اب اس کے عالیشان مکانات اور بندرگاہ مشہور ہیں۔ قریب سے اٹھے ہوئے ہیں شمالی اور جنوبی علاقے جہاز رانی میں مشہور ہیں اور یہاں کی ... کہ اس سے اس ... میں بیشمار سونے کی کانیں ہیں جسے صرف چالیس سال کے عرصہ میں ایک ارب ڈالر کا سونا برآمد کیا گیا تھا۔ ۱۸۳۵ء سے پہلے یہاں ایک مکان بھی نہ تھا۔ صرف چند جھونپڑے تھے جنہیں ایک چھوٹے سے گاؤں کے نام پر یربا بوینا کہتے تھے۔ ایک بن کا

ذکر ہے کہ ایک شخص کو جس کا نام مارسل تھا اس جگہ کو لوا مقام پر کچھ سونا ملا۔ پھر کیا تھا چاروں طرف سے لوگ جوق جوق آنے لگے اور ایک عظیم الشان شہر آباد ہوگیا۔ اب سونے کا حصّہ تو کم ہوگیا لیکن لوگ زراعت اور تجارت سے بے شمار دولت جمع کر رہے ہیں۔ لاکھوں ایکڑ زمین ہیں درختوں کے گھنے بن اور انگوروں کے سرسبز باغ ہیں۔ اور آب وہوا کا یہ حال ہے کہ صبح سے شام تک کام کر کے بھی انسان نہیں تھکتا۔

شہر کا رقبہ گیارہ مربع میل سے کچھ زیادہ ہوگا۔ یہ شہر بھی پہاڑیوں پر آباد ہے جو درجہ بدرجہ اونچی ہوتی چلی گئی ہیں اور اگر سمندر کے جہازوں سے دیکھو تو یہ شہر ایک منظر دکھائی دیتا ہے۔

سب سے بڑا بازار مارکیٹ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ بازار کرنی اور منٹگمری خصوصیت کے ساتھ قابل سیر ہیں جہاں خوردہ فروشوں کی دوکانیں اچھی سجی ہوئی ہیں۔ نامی اور کیلی فورنیا بازاروں میں بڑے بڑے ساہوکاروں۔ دلالوں اور بیمے کی کمپنیوں کی کوٹھیاں ہیں کیلی فورنیا اسٹریٹ ہل بازار میں شرفا اور ذی عزت لوگ رہتے ہیں۔ کئی بازاروں میں چینی لوگ آباد ہیں۔ شہر کے ٹریم وے گاڑیاں آہنی زنجیر و تکے ذریعے کھینچی جاتی ہیں۔ جو بازاروں میں فرش کے نیچے لگی ہوئی ہیں۔۔ ہر وقت چلتی ہیں۔ گھوڑے گاڑی کا بہت کم رواج ہے اور ٹیکسیوں کا کرایہ اس قدر کہ بہت کم اسکو استعمال کرتے ہیں۔

بازاروں میں اکثر منگولین نسل کے لوگ نظر آتے ہیں چینی لوگ پرلے درجہ کے غلیظ ہیں۔ ان کے مکانات متعفن۔ خوراک مکروہ اور عادتیں گھناؤنی ہیں۔ ان کی تنگ گلیوں سے جب مجبوراً گذرنا پڑتا ہے۔ تو جان عذاب میں آجاتی ہے۔ شہر کے کوئی بیس تیس بازار اور گلی کوچوں میں ان کی آبادی ہے۔ ان کے گھروں میں اندر جائیں تو اول ایک گلا سڑا اسباب نظر آتا ہے۔ پھر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی آتی ہے۔ راستے کے دونوں طرف ان لوگوں کے سونے کے لیے چھوٹی چھوٹی ٹانڈیں بنی ہوئی ہیں۔ راستے میں چراغ جلا کر یا کوئلوں کی آگ پر یہ اپنے مکروہ چیزوں کے کباب بناتے نظر آتے ہیں۔ ٹانڈوں پر چٹائیوں کے ٹکڑے بچھے رہتے ہیں جن پر گھر والے پڑے سوتے یا گندے بازاری سیتے دکھائی دیتے ہیں بعض تمباکو یا افیون یا چانڈو اڑاتے رہتے ہیں ان مکانوں میں تازہ ہوا کی آمد مطلق نہیں ہے۔ حیرت یہ ہے کہ یہ کیسے زندہ اور تندرست رہتے ہیں۔ ان کے تنگ اور تاریک تہ خانے یا بعض اوقات بیس بیس فٹ تک زمین کے نیچے چلے جاتے ہیں۔

جو لوگ پکے چانڈو باز ہیں۔ ان کے لئے علیحدہ چانڈو خانے موجود ہیں۔ ہر کوٹھڑی میں تازہ ہوا کو مطلق دخل نہیں۔ اوپر تلے ٹانڈوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ اور ہر کوٹھڑی میں دس بارہ آدمیوں کی

گنجائش ہوتی ہے۔ چانڈو باز ٹانڈے پر لیٹ جاتا ہے۔ خدمتگار اس کے پاس ایک چانڈو کی ڈبیا۔ چھوٹی سی پیتل کی سیخ اور ایک بانس کی نالی جس میں دھات کی چھوٹی سی چلم لگی ہوتی ہے لا رکھتا ہے۔ ایک چھوٹا سا چراغ جس سے دھواں نکلتا رہتا ہے جلا دیتا ہے۔ چانڈو باز آرام سے ٹانڈے پر لیٹے لکڑی کا تکیہ لگائے ڈبیا میں سے سیخ سے ذرا سا چانڈو لیکر اس کی گولی بناتا ہے اور چراغ کی لو پر گرم کرتا ہے۔ گولی سے بلبلے اٹھنے لگتے ہیں اور پھول کر خشک سی ہو جاتی ہے جیسے وہ چلم میں بھر کر چسکیاں لگاتا اور دھواں ناک کے راستے نکالتا ہے اور اسی طرح بار بار کرتا ہے حتےٰ کہ رفتہ رفتہ آنکھوں کی پتلی پھیل جاتی ہے اور چانڈو باز تمام دنیا اور اس کے تفکرات بھول جاتا ہے اور عالم سرور میں وہی نظارے اُسے دکھائی دیتے ہیں۔

میں ان لوگوں کی بیماریوں۔ دوا فروشوں اور حلوائیوں کی دکانوں میں گئی۔ بدبو سے میرا دماغ پریشان ہوگیا۔ قوت شامہ بے حس ہوگئی اور بھوک جاتی رہی۔ چینی قصابوں کی دوکانوں پر میں نے سوروں کی لاشیں لٹکتی دیکھیں۔ جو تمام بقص ان پر خون جما ہوا تھا اور جس پر نمک لگا ہوا تھا۔ اس پر سرخ چربی چمکتی سی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جانور ذبح نہیں کئے گئے بلکہ کسی بری طرح سے مارے گئے ہیں ان کی انتڑیوں کی چینی دیکھ کر میرا جی متلانے لگا۔ ایک مرتبان میں سڑا ہوا جھینگے کا اچار تھا۔ دوسرے میں چوہوں کی دمیں۔ تیسرے میں مچھلیوں کی آنکھیں۔ چوتھے میں پیاز کا مربا۔ پانچویں میں گھونگوں کا مربا اور چھٹے میں سوکھی ہوئی خشک چھپکلیاں۔

ایک چینی عطار کو دیکھا وہ مندرجہ ذیل نسخہ ایک مریض کے لئے تیار کر رہا تھا۔

(۱) سوسن کی جڑ (۲) سانپ کا سفوف (۳) ہڈی کا برادہ (۴) سرخ مرچ (۵) بید مجنوں کی چھال۔
(۶) چمگادڑ کی بیٹ۔ اس کو میں کر اور مل ملا کر مریض کو تین گھنٹے بعد کھلا دیا جائے۔

میں نے ایک دن وہاں کا تھیٹر بھی دیکھا۔ سٹیج پر لڑکے زنانہ لباس پہنکر ناچتے گاتے اور شور وغل کر رہے تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا اور چینی زرد اور میلے لباس پہنے خوش ہو رہے تھے۔ چینی ایک بانس کے چھوٹے سے چمچے سے اٹھا اٹھا کر کھانا کھاتے ہیں اور نہایت پھرتی سے کھاتے ہیں ضیافت کے وقت تمام مہمان ایک ہی برتن میں ملکر کھانا کھاتے ہیں۔ ہر ایک آدمی اسی ایک چمچے کو منہ کے اندر لیجاتا اور نکال کر طشتری میں ڈالتا ہے اور اُسے کھنگولنے لگتا ہے۔

سان فرانسسکو کی سیرگاہ سے جسے پارک کہتے ہیں گذر کر کالج میں جاتے ہیں جو بجائے خود

ایک سیرگاہ ہے۔ یہاں سے بحر الکاہل کا نظارہ قابل دید ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر ایک قطب سے دوسرے قطب تک پھیلا ہوا ہے۔ پارک سے بحر الکاہل کا سنہری پھاٹک نظر آتا ہے جہاں پہلے ریگستان تھا اور اب کیکر۔ کھجور۔ املوا۔ صنوبر۔ اور مرچ کے درختوں کے جھنڈ لہلہا رہے ہیں اور پھولوں کے تختوں کا تو کیا کہنا۔ ساحل کے نیچے سمندری دو پہاڑیاں ہیں جن میں بے شمار سیل لیے دریائی بچھڑے رہتے ہیں سرکاری حکم سے انہیں کوئی چھیڑ نہیں سکتا۔ یہ سیاہ۔ خاکی اور سفید رنگ دریائی بچھڑے بے خوف و خطر پہاڑی کناروں پر چڑھ جاتے ہیں اور انسان سے ذرا نہیں ڈر سکتے

سنزہ بیگم

ارتقائے حیوانی

انسان اپنی موجودہ حالت پر بے شمار چکروں کے بعد پہنچا ہے۔ پہلے وہ آغاز حیات کے ابتدائی مرحلوں سے گذرا۔ پھر ماحول کی موزوں کیفیت سے بے جان مادی ذرات کے اجتماع سے اول ہی اول مادۂ حیاتی بنا۔ پھر نباتات سے جدا ہوا۔ پھر چھوٹے چھوٹے بسیط آبی کیڑوں کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ پھر ایسے مقام پر پہنچا جہاں ریڑھ کی ہڈی نہ رکھنے والے جانوروں سے ریڑھ دار جانوروں کا آغاز ہوتا ہے۔

ریڑھ دار جانوروں نے سب سے پہلے بذریعہ ارتقا پانی میں رہنے والی مچھلیوں کی صورت اختیار کی پھر خشکی کا حصہ آباد کر کے کوسیڈک کی قسم کے خشکی اور تری دونوں میں رہنے والے جانور پیدا ہو گئے۔ پھر صرف خشکی پر رہنے والے جانور جنہیں رینگنے والے جانور کہتے ہیں پیدا ہوئے۔ ان کے بعد اڑنے والے جانوروں کی باری آئی تاکہ تری اور خشکی کے بعد کرۂ ہوا محروم نہ رہے۔ پھر ایسے جانور پیدا ہوئے جو پر رکھتے تھے لیکن اڑتے نہیں تھے بلکہ رینگ کر چلتے تھے۔ ان کی چونچ مثل پرندوں کے ہوتی تھی لیکن اس میں دانت ہوتے تھے۔ یہ ناکارہ ثابت ہو کر فنا ہو گئے۔ اڑنے والے جانوروں اور دودھ پلانے والے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ اڑنے والے انڈے دیتے ہیں اور انہیں سے بچے نکال اسے غذا کھلاتے ہیں اور دودھ پلانے والے بچے دیکر اسے دودھ پلاتے ہیں لیکن ابھی تک اس قسم کے جانور موجود ہیں جو اڑنے والوں اور دودھ دینے والوں

کیسہ میں ہیں مثلاً کنگرو اور اپاسم جو بچہ کو تھیلی میں ڈال کر پرورش کرتے ہیں۔ آسٹریلیا کا ڈک مول جو پانی کے بیچ رہتا ہے انڈے دیتا ہے اور انہیں سے کر بچے نکالتا ہے لیکن دانہ کھلانے کی جگہ اپنے بچے کو دودھ پلاتا ہے۔

انسان سے اتر کر دوسرے درجہ پر دودھ پلانے والے جانوروں کی جماعت میں بندر اور لنگور آتے ہیں جو انسان سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ یوں تو ہندوستان کے بندر بھی انسان سے ملتے ہیں لیکن اورنگ اوٹان۔ گوریلا، گبن اور چمپانزی میں تو مشکل فرق نظر آتا ہے۔ انسان کے جسم کی ہڈی ان میں مانسوں میں موجود ہے۔ اور بس تھوڑا فرق ہے۔ گوریلا انسان کی طرح سیدھا چلتا ہے۔ اور بیوی بچوں کے ساتھ گھر بنا کر رہتا ہے۔ وحشی انسانوں کی طرح رنج اور خوشی کا اظہار کرتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ بندر اور انسان ایک ہی خاندان کی دو شاخیں ہیں۔ اور ایک ہی مورث اعلیٰ کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔

بعض جھیلوں کی تہوں کے نیچے سے انسانی اوزار اور پتھر کے بنے ہوئے پائے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اب جھیل ہے۔ وہاں پہلے جنگل تھی اور انسان بستے تھے۔ غرض نوع آدم کو دنیا میں بستے ہوئے لاکھوں سال گزر گئے ہیں۔ عام خیال انجیل کی رو سے یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں آباد ہوئے صرف چھ ہزار برس گزرے ہیں لیکن یہ غلط ہے۔ ثابت ہو گیا ہے کہ آج سے چھ ہزار سال پہلے مصر کی تہذیب اوج کمال پر تھی۔

انسانی ڈھانچے کے فاسل جو کھودے جا رہے ہیں گواہ ہیں کہ آج سے کئی لاکھ برس پہلے انسان اس قسم کے موجود تھے جن کا کاسہ سر بہت چھوٹا ہوتا تھا اور جن کے چہرے کی بناوٹ بندروں سے ملتی جلتی تھی۔

انسان کا دیگر حیوانوں سے امتیاز اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے باقی سب انگلیوں کے مقابل آ سکتے ہیں جس سے بے حد قوت گرفت حاصل ہوتی ہے اور ہم لکھ سکتے ہیں۔ بندر قلم پکڑ کر لکھ نہیں سکتے۔ دوسری امتیازی صفت نطق یا گویائی ہے۔ تیسری امتیازی صفت دماغی قوت اور ترقی ہے۔ جس کی رو سے یہ کمزور ہستی قدرت کی وسیع طاقتوں کو تابع فرمان کر سکتی ہے۔ ان صفات کی بدولت انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔

مادی تہذیب کی ترقی ذہنی ترقی کے مطابق ہے۔ شروع شروع میں انسان نے اپنی حفاظت اور خدمت کے لئے جانوروں کو اپنے ساتھ مانوس کیا اور ان کو مطیع کیا۔ اس کام کے ...

اُسے اوزاروں کی ضرورت ہوئی۔ پہلے لکڑی کے ہتھیار بنائے اور درختوں کی ٹہنیوں سے یہ کام لیا۔ پھر عہد حجری کی ابتدا ہوئی اور پتھر کے ہتھیار تیار ہوئے۔ پھر جب آگ پر قابو پالیا تو دھات کے اوزار بننے لگے۔ رفتہ رفتہ لوہے کا زمانہ آیا اور ساتھ ہی سونے چاندی کے سامان تیار ہونے لگے اور لوہے کے بعد فولاد کا عام استعمال ہو گیا۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ موجودہ حالت کا انحصار معدنی کوئلہ پر ہے۔ بجلی کی روشنی۔ دخانی انجن وغیرہ سب کا انحصار معدنی کوئلہ پر ہے۔ عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ ریڈیم کے ذریعہ ایک عظیم انقلاب رونما ہوگا۔ کیونکہ کوئلہ تھوڑی دیر میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے اور ریڈیم اصلی رفتار سے سینکڑوں سال تک سرچشمہ حرارت بنی رہتی ہے اور اس کے حجم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ؛

زیتون

نمکدانِ ظرافت

بیوی ۔ "کیا تم بھول گئے کہ آج میری سالگرہ ہے۔ واہ میاں تمہاری بھی اچھی یادداشت ہے"۔
میاں (کچھ سوچ کر) "اوہو واقعی میں بھول گیا لیکن بیوی جیسی تم پچھلے سال تھیں ویسی ہی اب بھی ہو ایک دن کا بھی تو فرق معلوم نہیں ہوتا۔ تو پھر کیسے مجھے یقین آئے کہ ایک سال بیت گیا"۔

ماں ۔ "دیکھو بیٹا تمہاری یہ عادت ٹھیک نہیں ہے تم کوئی چیز بھی خوش ہو کر نہیں کھا لیتے۔ تمہارے دادا جان کا خدا انہیں غریق رحمت کرے یہ حال تھا کہ جو چیز بھی سامنے آئے بڑے شوق سے چٹ کر جاتے تھے"۔
بیٹا ۔ "تو کیا اماں تم ان کے سامنے کبھی نہیں گئی تھیں؟"
ماں ۔ "کیوں نہیں"۔
بیٹا ۔ "تو تمہیں انہوں نے کیوں نہ کھا لیا؟"

ماسٹر ۔ "حمید لفظ 'عزم راسخ' کو جملے میں استعمال کرو"

لڑکا ۔ "مجھے عزم راسخ کے معنے نہیں آتے"

ماسٹر ۔ "اُلو کہیں کا ۔ اس کے معنے ہیں پکا ارادہ"

لڑکا ۔ "جناب یہ تو مجھے معلوم ہے ۔ آپ نہیں سمجھے ۔ مجھے عزم راسخ کے معنے نہیں آتے ۔ یہ بھی تو ایک جملہ ہے ۔ جس میں عزم راسخ کا لفظ آگیا ہے"

صاحب ۔ "ویل ۔ بیرا یہ کون رو رہا ہے کیوں (باورچی خانہ میں)"

بیرا ۔ "صاحب جب سے ٹائیگر کتا مرا ہے ۔ باورچی کے آنسو نہیں تھمتے"

صاحب ۔ "ویل ۔ بلاؤ باورچی کو"

باورچی ۔ (رو کر) "حضور ۔ اُوں ۔ اُوں ۔ اُوں"

صاحب ۔ "ویل ۔ باورچی ہم جانتا ہے تم کو ٹائیگر کتے سے بہت محبت تھا (تھی)"

باورچی ۔ "صاحب رونا تو اس بات کا ہے کہ ٹائیگر تو مر گیا ۔ اب برتن کون چاٹ کر صاف کرے گا ۔ اب برتن مجھے دھونے پڑینگے"

لڑکی ۔ (بھائی سے) "میرے رومال کا بھی یہی رنگ تھا ۔ مگر اُس کے کونے پر چڑیا بنی ہوئی تھی"

لڑکا ۔ "آپا! یہ تمہارا ہی رومال ہے ۔ بھلا چڑیا بھی کوئی بسانی ہے ۔ وہ اُڑ گئی ہوگی"

میاں ۔ (کڑک کر) "تم اُلو کی دُم ہو ۔ کہ دس روپے سٹ پر صرف کر دیئے"

بیوی ۔ "اور تم گدھے کے سُم ہو کہ بیس روپے کے سگرٹ پی گئے"

مالک ۔ "کیا تمہیں پتہ ہے کہ میرے ہاتھ میں کیا چیز ہے"

نوکرا ۔ "ہاں پتہ کیوں نہیں ۔ یہ وہ چیز ہے جس کا مجھے علم نہیں"

اسسٹنٹ اڈیٹر (رشیدہ سلطانہ)

عجیب کلاک

میں وکیل ہوں۔ وکیل ہوں مگر فاقہ مست وکیل نہیں۔ میں دلالوں کا دست نگر نہیں۔ میں حکام کی خوشامد کو ذلت سمجھتا ہوں۔ میری دوکان چلی ہوئی۔ دولت مجھ پر عاشق ہے۔ بحساب اوسط میری آمدن تین ہزار روپیہ ماہوار۔ حال ہی میں میری شادی ہوئی ہے۔ میری دلہن بیوی پڑھی لکھی۔ پنجاب یونیورسٹی کی ڈگری یافتہ خوبصورت حسین۔ جمیل۔ گلبدن۔ بڑے گھرانے کی خاتون ہے۔ وہ مصطفےٰ کمال اور امیر امان اللہ کی ہم خیال ہے۔ وہ پردے کو بدعت سمجھتی اور بے نقاب میرے ساتھ موٹر میں سیر کے لئے نکلتی ہے۔

ہمیں اپنی کوٹھی کے گول کمرے کے لئے ایک خوبصورت کلاک کی ضرورت تھی ہم مسٹر غلام محمدؐ گھڑی ساز کی دوکان پر گئے جو انار کلی میں ہے ہم نے وہاں ایک عالیشان آبنوسی کلاک دیکھا۔ جو اس قدر بڑا تھا کہ اُس میں ایک پانچ سال کا بچہ بآسانی سما سکتا تھا اور اس کا لنگر جرطوم ڈھل کے برابر تھا۔ ہم نے اس کی قیمت پوچھی۔ دوکان کے منیجر نے کہا کہ یہ بیچنے کے لئے نہیں۔ مجھے بُرا معلوم ہُوا۔ میں نے کہا کہ اگر اسے فروخت نہیں کرنا تو یہاں سے ہٹا دو۔ اس اثناء میں مالک دوکان بھی آگیا۔ وُہ مجھے جانتا تھا۔ اور میری شہرت سے واقف۔ وُہ مجھے اور میری اہلیہ کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ چائے اور ولایتی مٹھائی سے ہماری خاطر کی۔ جب میرا غصہ ٹھنڈا ہُوا۔ تو اس نے ہمیں اس پُراسرار کلاک کے حالات سنائے۔

(۲)

مسٹر غلام محمدؐ نے کہا کہ جناب میرا دادا گھڑی ساز تھا۔ میرا باپ گھڑی ساز تھا۔ اور میں خود گھڑی ساز ہوں میرا بیٹا جو اس وقت یورپ میں گھڑی سازی سیکھ رہا ہے میرے بعد گھڑی ساز ہوگا۔ یہ کلاک جسے آپ نے پسند فرمایا ہے میرے دادا کے وقت کا ہے۔ میری والدہ کے دو خالہ زاد بھائی تھے۔ دونوں کی مائیں علیحدہ تھیں۔ ایک کا نام علی احمد اور دوسرے کا نام شیر محمدؐ تھا۔ دونوں چاہتے تھے کہ میری والدہ کا نکاح اُن سے ہو۔ علی احمد بہت دولتمند تھا اور میرا والد شیر محمدؐ اس وقت معمولی گھڑی ساز۔ میرے نانا نانی جو دولت کو سب کا معبود اور تمام احتیاجات سمجھتے تھے چاہتے تھے کہ

میری والدہ کی شادی علی احمد سے ہو۔ مگر میری والدہ جو عاقلہ۔ بالغہ اور تعلیم یافتہ تھی رضامند نہ تھی۔ وہ بچپن سے میرے والد کے ساتھ رہی تھی اور دونوں میں کمال درجہ کی محبت تھی۔ جب میری والدہ کو معلوم ہوا کہ اُس کی شادی ماں باپ علی احمد سے کر دینگے اور اس کی بات نہیں سُننے تو وہ بیمار ہو گئی۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ ڈاکٹروں نے اُسے دیکھا اور کہا کہ اگر اس پر جبر کیا جائیگا تو دیوانی ہو جائیگی۔ دماغ چل جائیگا اور کسی کام کی نہ رہیگی۔ یہ سُن کر میرے ماں باپ مجبور ہو گئے۔ اور میری والدہ کی شادی میرے والد بشیر محمد سے ہو گئی +

(۳)

جب علی احمد کی امید بر نہ آئی تو وہ میرے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ بھائی یہ قسمت کی بات ہے مجھے تمہاری طرف سے کوئی رنج نہیں ہے۔ خدا تمہیں یہ رشتہ مبارک کرے۔ بیشک تمہارا رقیب تھا مگر آخر تمہارا بھائی ہوں اور تمہاری منسوبہ میری بہن ہے۔ میں اپنی صاف دلی کا ثبوت دینا چاہتا ہوں۔ یہ زیورات کا صندوقچہ جس میں پانچہزار کا زیور ہے تمہاری دولہن کی نذر ہے اور ولیمہ کی دعوت کا تمام خرچ میرے ذمہ ہے۔ میرے والد نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور صفائی ہو گئی۔ شادی کے بعد علی احمد ہر روز آتا تھا اور میری والدہ خدا اُسے غریق رحمت کرے۔ اُسے اپنا محسن بھائی سمجھتی تھی۔ میرے والد کے دل میں بھی علی احمد کی بڑی عزت تھی اور کاروبار تجارت میں ہمیشہ صلاح مشورہ لیا کرتا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد میرے دادا جان بیمار ہو گئے اور جب زندگی سے مایوس ہوئے تو کلاک اپنے بیٹے اور بہو کے سپرد کیا اور کہا کہ یہ بہت نایاب تحفہ ہے۔ اسے حفاظت سے رکھنا اور کبھی فروخت نہ کرنا یہ کلاک ہمارے لئے باعث یمن و برکت ہے اور ہمارا خاندانی ورثہ ہے۔ چند دن کے بعد اُنہوں نے وفات کی +

(۴)

دو سال کے بعد میں پیدا ہوا۔ میری والدہ کو اپنے شوہر سے کمال محبت تھی۔ وہ اُسے دیکھ کر جیتی تھی۔ اگر وہ کہیں باہر جائے تو بیتاب ہو جاتی تھی۔ یہ کلاک ہمیشہ میری والدہ کے کمرے میں رہتا تھا۔ خاوند کی عدم موجودگی میں اس کی ٹک ٹک اُس کے لئے تسکین اضطراب ہو جاتی تھی۔ میں چھ ماہ کا تھا کہ میرا والد امرتسر گیا اُس نے کسی کو روپے قرض دیئے ہوئے تھے وہ وصول کرنے گئے تھے اُس کی روانگی کے وقت میری والدہ کا دل خود بخود دھڑکنے لگا اور ایک عجیب سم کی بیچینی اُس نے محسوس کی۔ اُس

نے کہا کہ غلام محمد کے ابا! ہماری زندگی بھی زندگی ہے۔ غم ہمارے قریب نہیں آیا۔ دن عید ہے۔ رات شب برات ہے۔ اس جہان فانی میں اس قسم کی حالت ہمیشہ نہیں رہ سکتی میرا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ کوئی آفت آنے والی ہے تم ادھر بسر نہ جاؤ۔ میرے والد نے ہنس کر کہا کہ تمہیں وہم ہے اور وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی ؛

(۵)

میرا والد صرف ایک دن کے لئے گیا تھا۔ نو بجے کی گاڑی سے اُس نے واپس آنا تھا۔ نو بج گئے اور وہ نہ آیا اور میری والدہ کی بے چینی بڑھنے لگی۔ ساڑھے نو بجے تک یہ کلاک معمولی رفتار سے چلتا رہا۔ ساڑھے نو بجے یکا یک اُس کے لنگر کی حرکت سُست ہوگئی اور پھر بہت تیز ہوگئی۔ پانچ منٹ کے بعد لنگر ساکت ہوگیا اور کلاک بند۔ میری والدہ گھبرا گئی اور بارہ بجے مسٹر علی احمد کے گھر آدمی بھیجا۔ وہ چند آدمی لے کر تلاش میں نکلا تو سلطان کی سرائے کے پاس میرے والد کی نعش وسباب ہوئی۔ علی احمد کو سخت صدمہ ہوا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور اشتہار دیا کہ جو کوئی قاتل کا پتہ دیگا اُسے ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا ؛

(۶)

پولیس سرگرمی سے تحقیقات کر رہی تھی اور شہر کے دو بدمعاش شبہ میں زیر حراست بھی کر لئے تھے یقین تھا کہ ان میں سے ایک اقبال جرم کرلیگا۔ میری والدہ کا یہ حال تھا کہ نہ زندہ تھی۔ نہ مُردہ۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ ضرور خودکشی کر لیتی۔ ایک رات وہ روتے روتے بیحال ہوگئی ناگاہ اس کی نظر کلاک پر جا پڑی۔ تو دیکھا کہ گھڑی کی ٹک ٹک بدل کر انسانی آواز ہوگئی ہے اور فرش دفعۃً پردہ سے معدوم ہو کر ایک انسانی چہرہ نمودار ہے۔ میری والدہ کانپنے لگی کیونکہ وہ چہرہ علی احمد کا چہرہ تھا اور اس وقت اُس سے تمام قسم کا غصہ۔ کینہ۔ بغض اور حسد مترشح تھا۔ میری والدہ نے چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ پھر جو اُسے ہوش آیا تو فوراً مجھے گود میں اُٹھا کر علی احمد کے مکان پر گئی اور کہا کہ تو میرے خاوند کا قاتل ہے اور جن لوگوں کو پولیس نے پکڑا ہوا ہے وہ بےگناہ ہیں۔ ظالم۔ یہ تیری کارستانی ہے کہ تو نے بیگناہ پکڑوا دیئے ہیں تو نے دوستی کر کے دشمنی کی ہے۔ صبح ہو لینے دے میں سرِ بازار تیرے برخلاف شہادت دونگی۔ یہ سن کر علی احمد کا یہ حال ہوا جیسے کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ میری والدہ تو یہ کہکر آ گئی لیکن علی الصبح جو سب جاگے۔ تو معلوم ہوا کہ

علی احمد نے خودکشی کرلی اور مرنے سے پہلے اپنے سرہانے ایک کاغذ پر یہ لکھ کر رکھ دیا کہ جوش رقابت میں اس لئے ایسا کیا ہے ۔

چیف اوڈیٹر (خان احمد حسن خان)

غزل

میں ہوں اک خانہ ادۂ الفت رخِ پر نور کا　　گل نہ ہوں بربت نہ میری بلکہ ہے قصر طور کا

میں بھی لکھوں وصف حال چہرۂ پر نور کا　　تھوڑا سا کاجل ہاتھ آئے گر چراغ طور کا

مجھ سے بس لیجے سراپا اس سراپا نور کا　　ہر رگِ تن جسم میں رشتہ ہے شمعِ طور کا

دل کے اندر جمع ہیں پیکاں کسی کے تیر کے　　کیا خدا کے گھر میں بھی گھر بن گیا زنبور کا

بادۂ انگور ہے ہر قطرۂ خوں جسم میں　　اس قدر مست تصور ہوں کسی مخمور کا

خود مقام خاک پر ۔ پر فکر ہے افلاک پر　　آدمی بھی کیا تصور ہے کسی مغرور کا

چپ ہو اے شور قیامت تو کہاں اور ہم کہاں　　ہم میں آہنگِ حجازی تجھ میں نالہ صور کا

کس قدر میرا دہان زخم ہے آتش فشاں　　نام ہی سن کر فقط رنگ اڑ گیا کافور کا

نام رکھا زاہدو تم نے ہے جس کا آفتاب　　ایک چھلکا ہے وہ میرے زخم کے انگور کا

دل مرے پہلو میں ہے اور اس قدر بیگانہ وش　　رابطہ ہے دوریوں میں نہایت دور کا

ہم ہیں محروم شہادت ناتوانی کے سبب　　بن گیا تن نال جسم جوہر سا طور کا

عشق کی باتیں اٹھانے آپ ہیں کیا تاب ہے　　کیا برا کس نے دیا کام آپ کو مزدور کا

میرے انداز میں پردہ بھی ہو جاتے ہیں عکس　　دل کے جلنے نے اڑایا رنگ شمع طور کا

شوق میں اور ذوق میں بس رسم محب شرط ہے　　ہے بجا زاہد سے کھچنا بادۂ انگور کا

بندہ پرور ہیں وہی ہوں آپ کہتے تھے جسے
دل نہ توڑیگے کبھی ہم احمد رنجور کا

چیف اوڈیٹر (خان احمد حسین خان)

حکیم بغلول

حکیم بغلول کو لاہور میں کون نہیں جانتا۔ نام نوبلیغ الملک ہے مگر لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ سب حکیم بغلول کہہ کر پکارتے ہیں۔ آپ پہلے عطار تھے پھر حکیم نادر شاہ سے طبابت پڑھنے لگے۔ ایک دن استاد نادر شاہ جو کسی مریض کو دیکھنے گئے تو آپ ساتھ تھے۔ حکیم صاحب نے مریض کی نبض دیکھی تو بہت خفا ہوئے اور کہا کہ ہم جو تاکید کر گئے تھے کہ گرم چیز استعمال نہ کرنا تم نے اخروٹ کیوں کھائے۔ مریض نے معافی مانگی اور قصور کا اعتراف کر کے کہا کہ آئندہ کبھی حکم عدولی نہ ہوگی۔ راہ میں حکیم بغلول نے متعجب ہو کر کہا کہ یا استاد نبض دیکھ کر آپ نے کیسے معلوم کر لیا کہ مریض نے اخروٹ کھائے ہیں۔ کیا آپ کو الہام ہوتا ہے؟ حکیم نادر شاہ نے ہنس کر کہا کہ میاں نبض میں علم زیادہ ہے عقل زیادہ۔ میں نے مریض کے کمرے کے باہر اخروٹ کے چھلکے دیکھے تھے اس لئے کہہ دیا کہ آپ نے اخروٹ کھائے ہیں۔ حکیم بغلول نے سمجھ لیا کہ حکمت بہت آسان ہے۔ اس دن سے استاد کے ہاں جانا چھوڑ دیا اور اپنا مطب علیحدہ کھول کر لگے طبابت کرنے۔ اتفاق سے زبردست خاں افغان کی طبیعت علیل ہوگئی اور حکیم بغلول علاج کے لئے بلائے گئے۔ سردی کا موسم تھا اور خاں صاحب پلنگ پر کمبل اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ اتفاق سے کہیں داڑھی میں گدھے کا بال اٹکا ہوا تھا۔ حکیم بغلول نے نبض دیکھ کر کہا کہ خاں صاحب آپ نے بہت بدپرہیزی کی کہ گدھا کھا لیا۔ میں آپ کو جلاب دوں گا۔ انشاء اللہ کل تک اچھے ہو جاؤ گے۔ خاں صاحب ہر چند کہ طبیعت بدمزہ تھی کھل کھلا کر ہنس پڑے اور حکیم بغلول خوش ہو کر بڑبڑانے لگے۔ اس پر خاں صاحب کو غصہ آگیا اور حکیم جی کی خوب ہی دھوب کی۔ اگر وہاں سے فوراً نہ بھاگتے تو چندیا پر بال نہ رہتا۔

مثل مشہور ہے کہ کتے کی دُم بارہ برس گاڑا پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہی [illegible] حکیم بغلول نے مطب [illegible] آپ نے گولیاں ایجاد کیں جن کی نسبت اشتہار دیا تھا کہ جملہ امراض کا حکمی علاج ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ گولی [illegible] اثر ہوتا تھا اور گولی [illegible] گولی کو بھی [illegible] ایک [illegible] مریض کا ہمیشہ کے لئے چھٹکارا ہو جاتا۔ ایک دن [illegible] ایک غریب مزدور کے لڑکے کے علاج کے لئے جس کو [illegible] کا عارضہ تھا بلائے گئے [illegible] اور کہا کہ دیکھ لینا کل تک [illegible] اور غریب مزدور نے کہا [illegible]

عطار کی دوکان سے لے آؤ۔ مزدور نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حکیم لعلول صاحب میرے پاس تو صرف ایک چونی ہے۔ جو آپ کو نذر دی جائیگی۔ اب میں شربت کہاں سے لاؤں۔ بہتر ہوگا کہ دوائی پانی کے ساتھ پلادیں۔ حکیم جی نے غرّا کر کہا کہ اُلّو کے پٹھے اگر میرا علاج کرنا ہے تو جیسے کہوں ویسے کرو۔ مزدور پیالہ لیکر بازار گیا اور واپس آکر کہنے لگا کہ عطار کہتا ہے اُس کے پاس بنفشہ کا شربت نہیں ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ اگر شربت بنفشہ درکار ہو تو موجود ہے حکیم لعلول کڑک کر بولے کہ وہ مردود نعلیم جاہل کیا جانے کیا وہ بقراط زماں ہے ہماری برابری کرتا ہے بنفشہ عربی لفظ ہے اور شعیر ترکی بنفشہ کو ترکی میں شعیر کہتے ہیں جلد لاؤ پانی۔ وہ شربت پانی لے آیا اور آپ نے معاً مریض کو گولی کھلادی اور کہا کہ صبح خبر دینا۔ دوسرے دن صبح سویرے مزدور گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ حضور جلد چلئے مریض کا تو عجیب حال ہے۔ حکیم صاحب اُس کے ساتھ ہو لئے اور جب آکر دیکھا تو گولی کی تاثیر سے مریض اور مرض دونوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ کڑک کر بولے کہ او گدھے گنوار اور کیا چاہتا ہے ہمارا وعدہ تھا کہ دھڑکن نہ رہیگی اب بتا کہاں ہے دھڑکن۔ اے بابا کیسی باتیں ہیں مردود۔ دکھلا مجھے وہ دھڑکن کہاں ہے۔ اب خاموش کیوں ہے کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بتا۔ کیا اب بھی دل دھڑک رہا ہے۔ مزدور نے مریض کو ٹٹول کر کہا کہ ہاں دل تو نہیں دھڑکتا۔ حکیم صاحب بولے کہ اور کیا چاہتا ہے رٹا کھیرو۔ بس دھڑکن دور ہو گئی اور مریض آرام سے سو گیا۔ اتنے میں دو اور مزدور جو ساتھ کی کوٹھڑی میں رہتے تھے آ گئے اور انہوں نے دیکھا تو مریض کی دھڑکن کے ساتھ اُس کی جان بھی ہوا ہو چکی تھی۔ مریض کا باپ تو بیچارہ سادہ لوح تھا مگر اُس کے رفیق چھٹے ہوئے گرگے تھے اُنہوں نے کہا کہ حکیم لعلول صاحب یہ تو مر گیا آپ اگر خیریت چاہتے ہو تو ٹھہرے رہو۔ ہم صرف تین ہیں اور ہمیں چوتھے کی ضرورت ہے تاکہ مردے کو اُٹھا کر قبرستان لے چلیں۔ آخر تین تو چارپائی اُٹھانے سے رہے۔ اگر یہاں سے قدم اُٹھایا تو یاد رکھو ہم کر دینگے خیر عشو۔ ہاں اجی جتا کر چھوڑیں گے۔ مار کے آگے بھوت بھی ناچتا ہے جب حکیم لعلول نے دیکھا کہ ان مزدوروں کی نیت فاسد ہے تو طوعاً وکرہاً ٹھہر گئے اور میت اُٹھا کر قبرستان گئے اور جب مردے کو دفن کر کے واپس آئے تو سر سے درد کر رہا تھا۔ اُس دن سے آپ آپ کا دستور ہے کہ اگر کوئی مریض علاج کے لئے بلائے تو پہلے تحقیق کر لیتے ہیں کہ وہاں چار آدمی میت اُٹھانے کو موجود ہیں۔ اگر چار سے کم ہوں تو ہرگز نہیں جاتے ۔

حضرت ایڈیٹر (احمد حسن خان)

نئے سال کا رعایتی اعلان

اٹھارہ ۱۸ روپیہ کی تین ۳ گھڑیوں کا سیٹ بارہ ۱۲ روپیہ میں

معمولی ڈاک خرچ اور آپ کا نام سنہری حروف میں

گھڑیوں و ٹائم پیس کے ڈیل پر مفت چھاپ دیا جاویگا

نئے سال کی خوشی میں ولایت سے پہلے تارے کے اعلان کی بدولت

گھڑیاں بہت بڑی رعایت کے ساتھ فروخت ہو رہی ہیں

ان گھڑیوں میں سے ایک ہی قسم کی یا مختلف قسم کی تین یا

۴ گھڑیاں اور ایک ٹائم پیس ایک ساتھ خرید فرمائیں تو

ان کو صرف بارہ روپیہ (۱۲) میں بھیجی جائیں گی۔

یہ رعایت محض مال کی نکاسی اور فرم کی شہرت کی وجہ سے ہے

اور یہ رعایت اسی وقت تک رہیگی جب تک گھڑیاں اسٹاک میں

رہینگی اسکے بعد ہم اصل کے ذمہ دار ہونگے آپ فوراً ہی آرڈر بھیجیں

ایسا نہ ہو کہ اسٹاک ختم ہو جائے اور آپ کی فرمائش کی تعمیل نہ ہو سکے۔

نوٹ: ایک یا دو گھڑی کے خریدار سے پوری قیمت لی جاویگی۔

المشتہر

منیجر جان سن واچ ہاؤس صدر بازار میرٹھ (یو۔پی)

اصلی اعلیٰ قسم کی ریلوے واچیز

اپنی مضبوطی اور وقت کی پابندی میں

ہزاروں سندیں حاصل کر چکی ہیں

ہماری ریلوے گھڑیاں اصلی

آخر تک کام دیتی ہیں

نمبر ۱ — گارنٹی

نمبر ۲ — قیمت چھ روپیہ — گارنٹی ۵ سال

نمبر ۳ — قیمت چار روپیہ — گارنٹی ۵ سال

نمبر ۴ — قیمت سات روپیہ — گارنٹی ۵ سال — چمکدار ڈائل

نیوفیشن گولڈن رسٹ واچیز

نئی آئی ہوئی کی ہوائی دار بکس کرنٹ گولڈ

بالکل صحیح اور مضبوطی اور صحیح وقت بتانے

میں مشہور ہیں

اس طرح کم

ایک ماہ اسپرنگ نہ ٹوٹے گا

نمبر ۶ — قیمت چھ روپیہ — چمکدار ڈائل — گارنٹی ۵ سال

نمبر ۷ — قیمت چھ روپیہ — گارنٹی ۵ سال

نمبر ۸ — قیمت پانچ روپیہ — گارنٹی ۵ سال

نمبر ۹ — قیمت چھ روپیہ

مشہور عالم

ڈبل الارم ٹائم پیس

نمبر ۵

اسکی دونوں گھنٹیاں ایک دم بجتی ہیں

بہت بلند آواز

گہری نیند سونے والا

بھی جاگ اٹھتا ہے

تھیٹر گدار دل روزہ داروں کے لئے

قیمت چھ روپیہ

گارنٹی ۵ سال

نرخنامہ اشتہارات

اسوار	ٹائیٹل کے صفحے	معمولی صفحے
سال بھر کے لئے	[illegible]	[illegible]
چھ ماہ کے لئے	[illegible]	[illegible]
تین ماہ کے لئے	[illegible]	[illegible]
ایک بار کے لئے	[illegible]	[illegible]

نوٹ: نصف صفحہ سے کم کا اشتہار نہیں لیا جائیگا۔ خلاف تہذیب اشتہار کسی قیمت پر شائع نہ ہونگے

منیجر شباب اردو لاہور

حضرت سیدی مولائی خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ کا ارشاد عالی

روزنامچہ مندرجہ رسالہ [illegible] دہلی مجریہ یکم اکتوبر و ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ تشہیر و رواج کمپنی صدر بازار میرٹھ نے ایک ٹائم پیس بھیجا ہے [illegible] خوبصورت ہے [illegible] کی گھڑی کا ہے اور اس میں ایک ہے قسم کی الارم کی گھنٹی لگی ہوئی ہے [illegible] سامنے رکھی ہے [illegible] [illegible] علاوہ ازیں [illegible] ان ٹائم پیس کی [illegible] [illegible] کرتے ہیں [illegible] [illegible]

تبلیغی الارم ٹائم پیس

[illegible] ہوتی کہ [illegible] ختم ہو جانے کی وجہ سے [illegible] [illegible] ہماری [illegible]

صرف دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

[illegible]

[illegible] اگر [illegible] [illegible] رمضان المبارک کی [illegible]

مزید رعایت [illegible]

ملنے کا پتہ — ایڈورٹائزنگ منیجر تشہیر و رواج کمپنی صدر بازار 31 میرٹھ یو پی

کتابیں مفت!

جو اصحاب ایجنسی ہذا سے آج سے اپنے کم از کم دو روپیہ کی کتابیں منگائیں گے ان کو حسب پسند ہر دو کی کتابیں [illegible] خریدار کو ایک روپیہ کی دس روپیہ کے خریدار کو دو روپیہ کی کتابیں مفت [illegible] ہوگی مفصل فہرست [illegible]

مجموعہ رسائل شبلی ہمارے محققانہ اور علمی مضامین کا قابل قدر مجموعہ [illegible] قیمت [illegible] علم الہی ۱۸ر

البرامکہ یعنی خلیفہ ہارون رشید کے نامور وزرا یحییٰ افضل جعفر برمکی کی مفصل سوانح مکمل ۲ حصہ [illegible]

مجاہدین مراقش معہ عکسی فوٹو یعنی مرقع سرزمین مراقش میں یورپی سیاسی [illegible] مشرق وسطیٰ میں عربی سیاسیات [illegible] روئداد ہندوستان کے سیاسی اقتصادی [illegible] تغیرات کی دلچسپ کیفیت اور [illegible] امکانات کا صحیح جائزہ [illegible] انڈیا کا اردو ترجمہ

فضائل النبی صلعم ہر مسلمان عورت و مرد اور واعظان اسلام کے لئے از بس ضروری ہے ۱۲ر

الایمان جس میں ایمان و کفر کی تمام شرائط و اسباب کا مفصل ذکر محقق آیات قرآن سے [illegible] ۱۲ر

رباعیات حکیم عمر خیام [illegible] حکیم مرحوم مکمل [illegible]

سوانح مولانا روم مکمل از مولانا شبلی [illegible]

سوانح حیدر علی سلطان یعنی ۱۸ ویں صدی کے مشہور فاتح میسور کے مفصل [illegible]

ٹیپو سلطان [illegible] واقعات و [illegible]

[illegible]

حلیات احمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ وہ کتاب ہے جس کو سید مرحوم نے لندن میں بیٹھ کر [illegible] انگریز علما کے مقابلہ میں لکھا اور عیسائی [illegible] کے بیجا اعتراضات کے [illegible] محققانہ جواب ہیں قیمت [illegible]

اسرار الادویہ [illegible] برٹش میڈیکل [illegible] کی کتاب سیکرٹ ریمیڈیز کا اردو ترجمہ ہے جس میں یورپ کی قریباً تمام ولایتی پیٹنٹ ادویہ کے اصل نسخے انگریزی [illegible] ہماری [illegible] ہیں [illegible] ڈاکٹری [illegible] ۱۲ر

اخلاقی کہانیاں بچوں کے لئے نصیحت آموز [illegible]

موتیوں کا جزیرہ کل چار جلد [illegible] فلورا فلورنڈا [illegible] فردوس [illegible] ۱۲ر

[illegible] کی کرتوت [illegible] دیوان ذوق ۱۲ر دیوان داغ [illegible]

تحریرات حفظ صحت [illegible]

القانون علاج معالجہ کے قانون اور صحت کے [illegible] کی ہدایات [illegible] کثیر [illegible]

[illegible] التراث [illegible] جوانی [illegible] تحفہ لقمان ۱۲ر

[illegible] تعویذات [illegible] اس کتاب میں [illegible]

[illegible]

ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ: منیجر مسلم جنرل ایجنسی [illegible]

بس حد ہو لئی

ڈاکٹروں سے دانت نکلوانے بند کر دو الوری منجن کے استعمال ہی کی صعوبت حاصل کی ہے۔

اگر آپکے دانتوں میں گوشت خورہ لگ گیا ہے تو الوری منجن استعمال کریں

اگر آپکے دانتوں سے خون آتا ہے تو الوری منجن استعمال کریں

اگر آپکے دانتوں سے پیپ بہتی ہے۔ تو الوری منجن استعمال کریں

اگر آپکے دانتوں میں کیڑا لگ گیا ہے تو الوری منجن استعمال کریں

اگر آپکے دانت ہلتے ہیں۔ تو الوری منجن استعمال کریں

اگر آپکے دانت درد کرتے ہیں تو الوری منجن استعمال کریں

اگر آپ چاہیں کہ آپکے دانت موتی کی طرح صاف ہوں تو الوری منجن استعمال کریں

اگر آپکے دانت زرد اور میلے ہیں تو الوری منجن استعمال کریں

آپکو الوری منجن کے استعمال سے دانتوں کے جملہ امراض سے نجات حاصل ہو جائیگی اس منجن کو ہندو مسلم استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ اسمیں کوئی چیز خلاف مذہب نہیں ہے قیمت فی شیشی (۸) علاوہ محصول ڈاک ڈھائی شیشی کے خریدار اگر نصف قیمت منی آرڈر ارسال کریں تو محصول معاف

جوانی کا واپسی ٹکٹ

بڑھاپے کو مات کرنے کا معاد ہی لوشن الوری خضاب تجلی مارکہ کے استعمال سے آپکے سفید بال جیسے سفید بالوں کو قدرتی رنگ دینا یا سیاہ کرنا ہے اگر آپ نے ابھی تک استعمال نہیں کیا تو ایک دفعہ ضرور آزمائیے اگر بال سیاہ نہ کرے تو خط آنے پر قیمت واپس کر دیجائیگی قیمت فی بکس چھ آنے علاوہ محصول ڈاک۔ چار بکس کے خریدار سے ۱۵ آنے اور بارہ بکس کے خریدار اگر نصف قیمت منی آرڈر ارسال کریں تو محصول بیک معاف ہوگا ہر ایک شہر میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے ایجنٹ صاحبان کمیشن کے بارے میں ایجنسی سے خط و کتابت کریں

تازہ شہادتیں

میں نے آپکا ایجاد کردہ الوری منجن استعمال کیا اور بہت مفید ثابت ہوا میں نے اسکو بہت مریضوں پر بھی استعمال کیا وہ تمام مریض کو جو کہ عام لوگوں کو دانتوں کی پرواہ نہ ہونے سے ہو جاتے ہیں ازحد مفید ثابت ہوا اسلئے چند شیشیاں تمام مریضوں کیلئے ارسال کریں تحریر کرونگا براہ کرم چند عدد شیشی بذریعہ وی پی ارسال فرمائیے

بیرہ ڈاکٹر عطا محمد ساہل ایل ایس ایم ایف بی میڈیکل گوجرانوالہ

جناب منیجر صاحب السلام علیکم

آپ کا الوری منجن ملا میں نے اس کو دانتوں کی کل بیماریوں کے لیئے مفید پایا اور چند ایک مریضوں پر بھی استعمال کرایا بہت مفید ثابت ہوا اسی مہربانی کرکے دس شیشی الوری منجن وی پی ارسال فرما کر مہربانی ہوگی

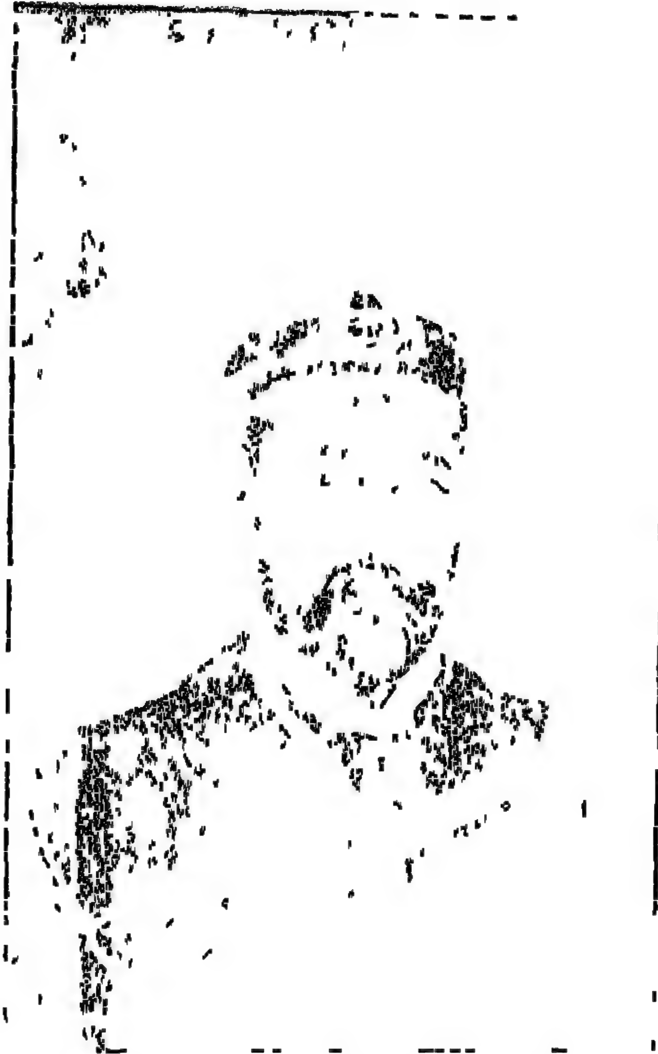
حکیم دوست محمد کلہ کرار ضلع شہر

ملنے کا پتہ

دی الوری جنرل سپلائنگ ایجنسی قطب بلڈنگ لاہور

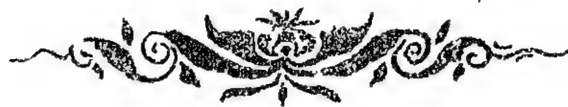


سر سید



ہمارے بادشاہ کو صحت مبارک

جلد ۱۷ - نمبر ۶ - بابت ماہ مارچ ۱۹۲۹ء



شذرات

ہم حضرت ابوالبرکات جناب سید محمد فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلال پور شریف کے ممنون احسان ہیں کہ آپ نے ازراہ کرم ہمیں اپنی بے نظیر کتاب "حزب اللہ" کا ایک نسخہ بغرض ریویو ارسال فرمایا ہے۔ حضرت صاحب کی فضیلت اور منصب اظہر من الشمس اور ابین من الامس ہے۔ اور آپ کا وجود اس زمانہ میں ذریعہ حصول مرادات و دافع بلیات سمجھا جاتا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ آپ صاحب کشف و کرامات ہیں۔ یہ کتاب آپ نے فلاح قوم کی خاطر لکھی ہے اور الفقار للاصلاح کے مسئلہ کو نظر انداز [illegible] ثابت کیا ہے۔ کتاب کیا ہے ایک نور میں سحر و جادو [illegible] ہے۔ ارباب دانش جانتے ہیں کہ "تنازع للبقا" و "جہد للحیات" کا سلسلہ ابتدا سے چلا آتا ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا بقول [illegible] موصوف اس ناموس الٰہی اس [illegible] قدرت اور ان قواعد فطرت کے برابر اپنے تحفظ و بقا کے لئے ایک طویل اور مسلسل جدوجہد میں مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ ایک کوہ پیکر ہاتھی سے لے کر ایک ننھی چیونٹی تک سب ذی روح حیوانات اپنی اپنی استعداد کے مطابق حفاظت خود اختیاری کے تمام اسباب و ذرائع سوچتے اور ان پر کاربند ہونے میں منہمک ہیں لیکن جن میں صلاحیت کا فقدان ہے وہ اپنے آپ کو صرصر حوادث اور دست برد روزگار سے نہیں بچا سکتے اور اپنی نوعی حیات کے ایام بسر کرنے سے پہلے فنا ہو چکے ہیں۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جس قوم نے بھی آسانی سے کام لیا اور غفلت و جمود میں [illegible] وہی تباہ اور برباد ہوئی اور اگر اس کے افراد برائے نام زندہ رہے مگر غلامی اور [illegible] کی ذلت [illegible] سے دو چار ہو گئے۔ عروج اور سربلندی۔ گمنامی اور پستی ہمارے اپنے سعی یا غلط طرز عمل کا نتیجہ ہے۔ [illegible] نے اس [illegible] پر [illegible] اور [illegible] کے [illegible] بحث کر کے طرز عمل [illegible] ایسا [illegible] ہے جس کو [illegible] رکھ کر اور اسے استعمال میں لا کر [illegible] کامیابی یقینی ہے اور دنیا میں کامرانی اور آخرت میں سرخروئی نصیب ہوگی۔ ہم [illegible] کہ [illegible] ہماری [illegible] کتاب سے [illegible] ہو سکتی ہے۔ [illegible] اللہ [illegible] کر کے [illegible] ہیں۔

(منصب ایڈیٹر [illegible])

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شباب اردو



(ا)

صبح کا وقت تھا۔ آغاز بہار تھا۔ اور لاہور کے کوچہ و بازار میں مسرت برس رہی تھی۔ سیر گاہ آسمان پر حسینان بہار گیسو کھولے مصروف گلباری ہے۔ ان میں سورج دیوتا اس طرح سرگرم خرام تھا جیسے گوپیوں میں کانھ اور دم رفتار ایسا سونا مٹھیاں بھر بھر کر نثار رہا تھا۔ ایسے خوشگوار موسم میں ایک شخص سیر کے لئے گھر سے نکلا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی مگر آنکھیں عینک کی محتاج نہ تھیں۔ بینائی ارباب فضیلت کی طرح بلند و بالا تھی۔ قد ابھی تک سرو نما تھا۔ یہ شخص ڈاکٹر حمزہ تھا جو مدت تک طبی کالج میں علم جراحی کا پروفیسر رہا مگر اب پنشن لے کر خانہ نشیں تھا۔ اس وقت اس کا مطب عام و خاص کے لئے وقف تھا۔ جس میں فیض عام کی گنگا ہمیشہ بہتی رہتی تھی۔۔ ان طلسموں سے نہ تھا جو حکیم کہلاتے ہیں مگر فی الحقیقت طلسم اسم کا ادعا ہیں

جن کی آنکھیں طمع، حرص اور لالچ نے سی دی ہیں جو فیس لئے بغیر سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور فیس لیکر بھی فرعون بنے رہتے ہیں جو صرف صبح اور شام مریضوں کو نصف بار دیدار دکھاتے ہیں پھر کبوتر اڑاتے اور بٹیر لڑاتے رہتے ہیں اور اگر درمیان میں کوئی زیر علاج مریض آجائے تو سفی القلب اُسے نہیں دیکھتے جن کے دماغ میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ طبیب کے لئے نیک چلن ہونا فرض ہے کیونکہ وہ ابنائے جنس کی بہو بیٹیوں میں نامحرم نہیں سمجھا جاتا ؛

(۲)

ڈاکٹر حمزہ کا گذر اس سڑک پر ہوا جو نیلے گنبد سے آتی ہے اور انارکلی سے گذرتی ہوئی کچہری کو جاتی ہے۔ یہاں بھیڑ کی وجہ سے وہ ایک دوکان کے سامنے رک گیا جس میں کئی پنجرے لوہے اور تیلیوں کے لٹک رہے تھے اور تو خالی تھے مگر ایک میں ایک پرندہ تھا یہاں اُسے مجبوراً ٹھہرنا۔ دیکھنا اور سننا پڑا۔ پرند کی حالت اور درد ناک آواز نے اُسے بیتاب کردیا۔ دوکاندار اور راہرو اور ہمسائے سمجھتے ہونگے کہ جانور گا رہا ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ رو رہا تھا۔ بظاہر ان کی نگاہوں میں جن کی آنکھیں ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے وہ خوبصورت تھا مگر اصلیت کے دیکھنے والے دیکھ سکتے تھے کہ پریشانی نے اس کی صورت بگاڑ دی ہے۔ شاید وہ کبھی موٹا تازہ ہو اس وقت صرف پوست پر اور پوست استخواں تھا۔ قفس کے جھولے پر کبھی چڑھتا تھا کبھی اُترتا تھا بار بار پر پھڑپھڑاتا اور قفس میں چکر لگاتا اور اس کی دیواروں سے سر ٹکراتا تھا۔ اس تنگ پنجرے میں اسقدر جگہ نہ تھی کہ وہ اپنے بازو اچھی طرح سے پھیلا سکے لیکن شوق آزادی کے ہزاروں ارمان اور لاکھوں تمنائیں اُس کی دو چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں میں جن سے وہ بقصد التجا راستہ چلنے والوں کی طرف تکتا تھا دیکھ رہی تھیں۔ پنجرے سے نکلنے کی جدوجہد ناکام میں وہ تھکا ہوا اور درماندہ ہو رہا تھا۔

(۳)

اُس کی پرحسرت آنکھوں نے ڈاکٹر حمزہ کو دیکھا اور اپنا پیغام مصیبت نگاہوں کی مخصوص برقی طاقت سے سمجھایا کہ میری حالت زار دیکھو میں فضائے آسمان میں اُڑنے۔ سیر گلشن اور زندگی کے لئے بیتاب ہوں میں فردوس نما کی آزادی کے لئے بیقرار ہوں۔ ڈاکٹر نے اُسے

دیکھا اور اس کے دل میں درد اُٹھا۔ اُسے مصیبت زدہ مرد اور عورتیں یاد آگئیں جو حالات کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہیں جو کمزوری میں اسیر ہیں جو حوصلے اور مزاج کی زنجیروں میں پابجولاں ہیں اور ہمیشہ متمنی رہتی ہیں کہ آزادی مل جائے مگر یہ مرد اور یہ عورتیں نہیں جانتیں کہ کس طرح آزاد ہوں کیونکہ اُن کی آرزوئیں بہت چھوٹی ہیں۔ ان کی قوت ارادی بیجان ہے اور ان کی روحیں ناتوان ہیں اور جو جسم کے قفس مصیبت میں محصور ہیں اور جو صرف موت کی بدولت آزاد ہو سکتے ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ ان خیالات نے ڈاکٹر کے دل پر اس قسم کا تسلط کیا کہ وہ دوکاندار کے پاس گیا اور پرند کی قیمت پوچھی دوکاندار نے جو فی الحقیقت صیاد تھا جواب دیا کہ میں اس جانور کو جس کی آواز دلکش ہے اور جس کے پر نہایت خوبصورت ہیں دو روپیہ میں فروخت کر دونگا اور اگر پنجرہ بھی لوگے تو قیمت تین روپے ہے۔ ڈاکٹر نے قیمت دیدی اور پنجرا اُٹھا لیا ؛

(۴)

ڈاکٹر حمزہ کی طبیعت فطرتاً وہمی تھی۔ اُس نے قفس اُٹھانے کو اُٹھا تو لیا مگر جب لوگ اُس کی عمر اور حیثیت کے انسان کے ہاتھ میں قفس دیکھ کر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ کسی جرم کا مجرم سمجھا جا رہا ہے پس دامن میں اس نے چھپا لیا اور قدم برداشتہ گول باغ کی طرف چلا گیا۔ باغ میں ایک دراز قد۔ مضبوط قامت پولیس کا سپاہی کھڑا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ کو معلوم ہوا کہ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُس کے دامن قبا کو جو اس وقت غلاف قفس کا کام دے رہا تھا دیکھ رہا ہے گویا اُسکے دامن کے نیچے قفس نہیں ہے بلکہ مسروقہ صندوقچی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو سپاہی کا اس طرح دیکھنا بہت ناگوار گذرا وہ بہت جلد ایک طرف ہو گئے اور درختوں کے جھنڈ میں جا کر قفس کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی مُرغ اسیر دیوانہ وار باہر نکلا۔ پھر ہوا میں اُڑ کر اُس نے چکر لگایا غوطہ مارا اور ہنگام پرواز صرف ایک بار ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر چہچہاتا ہوا نگاہوں سے غائب ہو گیا ؛

(۵)

قیدی آزاد ہو گیا۔ اسیر رہا ہو گیا۔ ایک منٹ تک ڈاکٹر صاحب خاموش کھڑے رہے۔ اُنہیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اُن کے کندھوں پر بوجھ تھا وہ اُتر گیا ہے اور ان کا جسم ہلکا ہو رہا

ہے۔ پرند کے پروں کی آواز اور اُس کی مسرت آمیز پرواز، اور ساتھ ہی نگاہِ شکریہ انداز نے جادو کا کام کیا اور ڈاکٹر صاحب کی روح نے اسوقت ایک عجیب و غریب فرحت محسوس کی وہ فرحت جو اسی تمام عمر میں اس سے پہلے انہیں کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ وہ خالی قفس ہاتھ میں لئے ہوئے درختوں کے جھنڈ سے نکلے اور پھر اسی دلاور سپاہی سے دوچار ہوئے اس محافظِ قانون کی نیلی وردی میں خدا جانے کیا تاثیر تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی فرحت کرکری ہوگئی مگر کانسٹیبل کچھ نہ بولا وہ لب بستہ وہاں سے چلا گیا اور ڈاکٹر صاحب بھی چپ چاپ گھر آکر نبض دیکھنے اور نسخہ لکھنے اور بازار مروت گرم کرنے لگے۔

(۶)

مرغِ اسیر کو رہا ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مکان کے چوبارے میں جو اُن کا مخصوص کمرہ تھا پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اسوقت انہیں بخار تھا۔ اُن کے سرہانے تپائی پڑی تھی۔ تپائی پر تھرمامیٹر اور دوا کی شیشی دھری تھی۔ چوبارے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ان کھڑکیوں میں سے دریا اور شہر اور مندروں کے کلس اور مسجدوں کے گنبد نظر آرہے تھے اور بلند مکانوں کی چمنیوں سے دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا اور مائی جنتو آئی۔ ڈاکٹر صاحب لاولد تھے۔ بیوی آرام سے آغوشِ لحد میں سو رہی تھی۔ وہ تنہا اسی مکان میں رہتے تھے۔ مائی جنتو ان کا کھانا پکاتی تھی اور گھر کا انتظام کرتی تھی۔ مائی جنتو کا خاوند بڈھے خان بیس سال ڈاکٹر صاحب کا خدمتگار رہ کر انہیں کے گھر میں جاں بحق تسلیم ہوا۔ اس لئے مائی جنتو صحیح معنوں میں ڈاکٹر صاحب کی ہاؤس کیپر یعنی گھر کی محافظ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کروٹ بدل کر مائی جنتو کی طرف دیکھا اور کہا کیوں خیر ہے؟

(۷)

مائی جنتو نے کہا کہ میاں نہیں کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔ آتا ہے کہہ کر وہ جھجکی۔ ڈاکٹر صاحب نے بیماری کی وجہ سے کھسیانا ہو کر کہا کہ اسوقت کیوں آیا ہے کیا کوئی مریض ہے۔ مائی جنتو نے جواب دیا کہ نہیں میاں مریض تو نہیں ہے وہ تو موا سپاہی معلوم ہوتا ہے۔ سپاہی کا نام سنکر ڈاکٹر صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ سپاہی عموماً بدمزاج اور حیلہ جو ہوتے ہیں گو سب تو نہیں مگر ڈاکٹر

صاحب کے خیال میں اگر ان لئے وہ ان فرقوں کی اہمیت کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر کہا کہ میں سپاہی سپاہی کا مصرف گھر میں اس وقت کیا کام؟ سپاہی ہی انہیں وہ مسافر کانسٹبل یاد آگیا جسے انہوں نے گول باغ میں دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا جواب دیں کہ دروازہ پھر کھلا اور سپاہی بلا انتظار جواب خود بخود اندر آموجود ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی سپاہی ہے جسے انہوں نے گول باغ میں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بیمار تھے۔ انکو روزانہ کا بخار رہتا۔ بخار جوانوں کے اکثر چڑھ جایا کرتا ہے وہ ساٹھ سال کے بڈھے تھے۔ وہ نقاہت کی وجہ سے اٹھ کر بیٹھ نہ سکے۔ لیٹے لیٹے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میں نے تمہیں ایک ہفتہ ہوا گول باغ میں دیکھا تھا۔ شاید تم کو معلوم نہیں کہ میں بیمار ہوں اور مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ اٹھ کر کسی کو ٹھیک طور سے دیکھ سکوں۔ تمہارا اس طرح سے اٹھالے چلے آنا ——— ڈاکٹر صاحب فقرہ ختم کرنے نہ پائے تھے کہ سپاہی نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ بیمار ہیں لیکن میں اجنبی نہیں ہوں مجھے میرا فرض منصبی یہاں لایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے متعجب ہو کر کہا کہ اس وقت؟ سپاہی نے جواب دیا کہ ہمارے لئے وقت اور جگہ کی تخصیص نہیں۔ اس وقت اس سپاہی کے چہرے پر اس قسم کا جلال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو گمان گذرا کہ یہ سپاہی نہیں ہے شاید کوئی پولیس کا بڑا عہدہ دار ہے۔ وہ کچھ تامل کے بعد بولے کہ بیٹھ جائیے۔ مجھے بہت ضعف ہے اور گلے میں درد ہے مختصر الفاظ میں اپنا مطلب بیان کیجئے مجھ میں باتیں کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ تم کس محکمہ سے آئے ہو؟

(۸)

کانسٹبل ولایتی صورت آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ بہتر ہوگا کہ آپ پھر کسی وقت چند دن کے بعد آئیں۔ کانسٹبل نے جواب دیا کہ میں پھر نہیں آسکتا۔ میرا وقت یہی ہے۔ پھر اس نے جیب سے ایک کتاب نکالی اور کہا کہ آپ کا نام نمبرہ ہے۔ ڈاکٹر نے سر ہلا دیا۔

کانسٹبل۔ سب سے پہلے آپ کو ایک مرتبہ [illegible] ہوا تھا۔

ڈاکٹر۔ ہاں ہوا تھا۔

کانسٹبل۔ دوسرا [illegible] میعادی تھا۔

ڈاکٹر۔ [illegible]۔

کانسٹیبل: "آپ نے اُس کی قیمت تین روپے دی مگر دراصل یہ روپیہ سے بہت زیادہ قیمت دی گئی یعنی آپ نے اپنا دل دے دیا پھر آپ اُسے گول باغ لے گئے اور وہاں درختوں کے جھنڈ میں آزاد کر دیا۔ اور یہ کام آپ نے خلوص دل سے محض مروت کے لئے کیا۔"

ڈاکٹر: "آپ سچ کہہ رہے ہیں مگر ——"

کانسٹیبل: "اس صورت میں آپ کے واسطے میں آیا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب سخت حیران تھے جب کانسٹیبل اُن سے باتیں کر رہا تھا تو اُس کا چہرہ منور ہوتا جاتا اور اُس کا رعب اور جلال بڑھتا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرعوب ہو گئے اور کہا کہ آپ کون ہیں کیا آپ واقعی سپاہی ہیں۔ کانسٹیبل نے کہا کہ ہاں میں تمام جہان کا سپاہی ہوں سراغ رساں بھی ہوں مگر زیادہ تر محافظ ۔ مجھے تمہاری طبیعت کے انسانوں کی تلاش رہتی ہے۔ ڈاکٹر حمزہ نے کہا کہ ان باتوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ کانسٹیبل نے کہا کہ تعلق یہ ہے کہ میں نے تمہارا نام لکھ لیا ہے تاکہ جب وقت آئے تو تم کو قفس سے نہایت آسانی کے ساتھ نہایت آرام کے ساتھ بلا کسی قسم کی تکلیف کے رہائی دوں۔ یہ اس مہربانی کا معاوضہ ہے جو تم نے ایک جانور پر کی ہے تمہیں صرف اسوقت معلوم ہوگا جب تم قفس سے آزاد ہو جاؤ گے۔ تم میں اور مرغ اسیر میں کچھ فرق نہیں ہے مرغ اسیر کو معلوم نہ تھا کہ کیا تکلیف ہے وہ صرف مضطر تھا۔ یہی حال تمہارا جسم کے قفس میں ہے تم بھی وہ تھا۔ آزادی اور نجات کے طالب ہو۔ کیا تم اُڑنا نہیں چاہتے؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ کانسٹیبل نے ہنس کر کہا کہ اچھا تو تمہیں اس آزادی کا ابتدائی مزہ چکھا دینا چاہیئے۔

(۹)

سپاہی نے ڈاکٹر صاحب کو جو بیماری کی وجہ سے بہت کمزور اور نحیف تھے کھلونے کی طرح اٹھا کر شانوں پر بٹھا لیا۔ جونہی کمرے کی چار دیواری پست ہوگئی وہ سپاہی ہوا میں اُڑنے لگا۔ صرف ایک لمحہ کے لئے پرواز میں ڈاکٹر صاحب کو کمرے کا سامان لیمپ میز تام بڑا اپنا ضعیف جسم بستر پر دکھائی دیا اور پھر وہ دونوں آسمان پر تارا ہوگئے۔ پھر اُس نے بعد ازاں بلندی پر جا کر ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ اب تم میرے شانوں سے کود جاؤ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب اس کے شانوں سے اس طرح جدا ہو گئے جیسے بندوق سے گولی اور پھر ہوائی جہاز کی طرح بلندی کی طرف صعود ہونے لگا

اب بخار، ضعف اور نقاہت کا نام و نشان نہ تھا۔ اُن کا جسم ہوا کی طرح ہلکا اور بجلی کی طرح سبک خیز ہو گیا۔ اُنہوں نے عجب راحت اور مسرت محسوس کی۔ اُنہیں جنگل۔ پہاڑ۔ دریا۔ صحرا۔ سمندر۔ ریگستان۔ آثار۔ شہر اور قصبے دکھائی دینے لگے۔ اُفق چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتے تھے۔ وہ ستاروں میں گئے اُنہوں نے سیاروں کی سیر کی۔ کبھی وہ اہرام مصر میں تھے تو کبھی آگرہ کے تاج میں کبھی فلسطین کی بستیوں میں تھے تو کبھی دشتِ کربلا میں۔ کبھی مشتری میں تھے تو کبھی زحل میں۔ یکایک وہ بلندی سے پستی کی طرف اُترنے لگے۔ محافظ عالم سپاہی تحلیل ہو کر ہوا میں مل گیا اور ڈاکٹر صاحب نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر موجود ہیں۔ سرہانے نرس ہے اور میز پر لیمپ اور اس کے ساتھ تھرمامیٹر۔

(۱۰)

ڈاکٹر حمزہ رفتہ رفتہ تندرست ہو گیا۔ کچھ دن کمزوری رہی پھر وہ بھی رفع ہو گئی۔ چند ہفتوں کے وقفہ کے بعد اب پھر تو وہ اپنے شریفانہ شغل میں مصروف ہونے لگا۔ انسانی دکھ کو گھٹانا اور جسمانی درد کو مٹانا واقعی اشرف پیشہ ہے۔ اگر اس میں غرور۔ تکبر۔ حرص اور بدکاری کی آلائش نہ ہو۔ تندرست ہو کر ڈاکٹر حمزہ نے طبابت کے ساتھ ریاضت کا سلسلہ بھی قائم کر دیا۔ وہ ہر روز اسیر طیور اور مرغان [illegible] خرید کر لاتا تھا اور انہیں اپنے ہاتھ سے آزاد کر رہا تھا۔ اس کام میں اُسے رُوحانی فرحت حاصل ہوتی تھی رات کو اکثر خواب میں کبوتر۔ تیتر۔ بٹیر۔ بلبل۔ مینا۔ طوطے۔ لال۔ چمولے اور اس قسم کے کئی جانور جنہیں وہ رہا کر رہا تھا آتے تھے اور اس کے قدموں سے سر اور چونچ ملتے تھے وہ اکثر رات کو خوش الحان پرندوں کے راگ سنتا تھا۔ اس طرح بیس سال گذر گئے۔ پھر ایک رات اُن جانوروں کے ساتھ وہی پاسبان عالم سپاہی آیا اور کہنے لگا کہ میں اپنے وعدہ پر آیا ہوں تاکہ تمہیں [illegible] آرام اور لطف سے قفس سے آزاد کروں۔ صبح جب لوگ جاگے تو دیکھا کہ ڈاکٹر حمزہ اس [illegible] جس سے آج تک کوئی نہیں جاگا بستر مرگ پر لیٹے ہیں اور چہرے پر [illegible] ہوا ہے وہ قلب کی کیفیت [illegible] معلوم ہوتا ہے۔

(حسب الحکم [illegible])



لمعاتِ اثر

سراتناب ییر سے حرم کا خواب ہوا　　　اک آفتاب تھا جو محوِ انساب ہوا
ظہورِ عشق ہوا پردۂ حقیقت سے　　　جو جلوہ ہی تھا وہ محفل میں باریاب ہوا
نگاہِ شوق سے سرکا ہے مرا پردہ　　　نگاہِ شوق کا پردہ مرا حجاب ہوا
محبت‌ستاں سے آئی بہار نہ سہی　　　شمیمِ گل سے مجھے نشۂ شراب ہوا
غرورِ بندگیِ عشق کیا کہوں زاہد　　　وہ سجدۂ سنگِ جبیں ہے جو مستجاب ہوا
تمام نشۂ وحدت تمام بے خبری　　　ذرا جو ہوش میں آیا وہی خراب ہوا
میں ایسا لائق کہاں تھے لیے نوالِ کرم　　　کہ دل کو شرمِ معاصی سے آب آب ہوا
ہزار برق کے پردے ہٹا کے نکلا تھا　　　وہ جلوہ جو دلِ عارف میں بے نقاب ہوا
نہ پوچھ شورشِ ہنگامۂ فراق اثر　　　نفس نفس میں بپا دورِ انقلاب ہوا

جعفر علی خاں اثر بی اے



ما سلف میں دنیا و سب کے زمرد رنگ دیوتاؤں کو قوتِ گویائی عطا فرمائی تھی کسی صحرا کے قلب میں ایک صاف و شفاف چشمہ پتھریلی چٹانوں اور ناہموار میدانوں کے درمیان پیچ و خم کھاتا ہوا بہا کرتا تھا نو آفریدہ انسان کی ننھی ننھی شعاعیں دور و دراز کی مسافتیں طے کرتی ہوئی آتیں اور چشمہ کے آبِ شیریں میں جذب ہو کر سلسلے پانی کو ادا کر کے نذرانہ سا دیتیں ——

پہاڑی راستوں پر وہ عجب انداز سے شور و غل مچاتا اُچھلتا کودتا تھرکتا اتراتا اور پانی کی ہلکی ہلکی پھواریں ادھر ادھر بکھیرتا بہا کرتا تھا لیکن آگے چل کر صاف میدان میں اس کا بہاؤ اس قدر

آہستہ اور خاموش ہوجاتا تھا گویا کوئی چھوٹا سا بچہ دن بھر کی شرارت اور کھیل کود سے تھک کر اپنے کھلونے سرہانے رکھے ہوئے گہری نیند میں سو گیا ہے، اور اُسے اس محویت میں سرسبز و شاداب سبزہ کے دلفریب تصرف کی بھی خبر نہیں جو آہستہ آہستہ ہولے ہولے پاؤں بڑھا کر لب آب تک پہونچ گیا ہے۔

ایک دفعہ ایک شاہزادہ کہیں سے شکار کرتے کرتے اس جنگل میں آنکلا۔ اور چونکہ وہ اپنے ہمراہیوں کے لئے جن میں وہ شکار کی دُھن میں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ [illegible] دوڑتا رہا تھا پھولوں کے جھرمٹ میں دیکھا اُس کی نگاہ اس چشمہ شمس پر پڑی۔ شہزادہ شکار کی تکان سے چُور چُور ہو رہا تھا [illegible] پیاس سے بیتاب [illegible] [illegible] لگا اور جُوں جُوں اس کے [illegible] ہوتا گیا چشمہ کی دلکش قلقل ریزی سے اس کے مضطرب دل کو ایک تبسم کا سکون حاصل ہو گیا۔

اسی بیتابی اور جستک لبوں کو تر کرنے کے لئے شہزادہ [illegible] [illegible] پانی کے شفاف آئینہ میں اُسے ایسا ہی عکس نظر آیا جسے دیکھ کر وہ [illegible] [illegible] ہو گیا۔

اُس کے حیرت زدہ دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ ضرور کوئی [illegible] کی دیوی ہے جو اس چشمہ کے اندر اقامت پذیر ہے اور وہ اپنی اس نورانی شکل کے دیکھنے میں [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] سب کچھ بھول گیا۔

عکس کی روشن آنکھیں اس کی پتلیوں کا بکھرنا ہوئی [illegible] لعل اور لبہائے لعلیں کی ہلکی سُرخی پہلی ہی نظر میں اُس کے دل کو لوٹ لیگئیں۔ آہ اُس کا معصوم دل کیا جانتا تھا کہ وہ پانی میں اپنے ہی عکس جمیل کا نظارہ کر رہا ہے اور خود اپنے ہی حسن لطیف کا شیدائی ہے!!

عالم محویت میں کھڑا وہ اُسے دیکھتا رہا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی دلکشی افزوں ہوتی جاتی تھی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین معلوم ہونے لگی۔

شہزادے نے اپنی آغوش اشتیاق واکردی اور محبوبہ کو [illegible] [illegible] پانی میں ڈال دیں لیکن [illegible] پانی کی سطح متحرک ہوگئی اور تبسم [illegible] [illegible] آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کی [illegible] ہوئی امیدیں یاس و ناکامی سے بدل گئیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر چہار طرف دیکھنے لگا۔ آہ کیا وہ نورانی ہستی [illegible] [illegible] ہو گئی [illegible] [illegible] کھلاتی ہوئی اس نے رحمت آمیز لہجہ میں کہا۔ مگر اس کی گریہ زاری بے سود۔ اس کی [illegible] [illegible] تھی [illegible] [illegible] افسردہ دل چشمہ پر واپس آیا۔ پانی کی سطح اس [illegible]

میں ہموار ہو چکی تھی اور اس نے پھر ایک مرتبہ اُسی حسن صبا مانوس کی وحدت سے آنکھیں سینکیں جس کی ایک نظر کے لئے وہ سب کچھ قربان کر سکتا تھا۔

فرطِ مسرت سے اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھرک کر نکل گئی اور اُسی آن پر اُس کی محبوبہ کے لبہائے نازک پر بھی ایک دلاویز تبسم لرزاں ہو گیا۔ بھرّائی ہوئی آواز میں اُس کی زبان سے چند کلمات محبت نکلے اور اُس نے دیکھا کہ اُسی انداز میں نازنین نے بھی گفتگو کے لئے لبوں کو جنبش دی مگر اس کی آواز اس قدر نازک تھی کہ پانی کے قلقل میں جذب ہو کر رہ گئی اور شہزادہ کے کانوں تک نہ آ سکی اور کیونکر آتی جبکہ وہ ایک تصویر کی آواز تھی۔

”آہ میں تجھے کس قدر محبت کرتا ہوں“۔ اس نے کہا۔ ”اے رشکِ ماہ پانی سے باہر آ میری جان و دل سب تجھ پر قربان ہیں۔ آ“

متبسم تصویر کے ہونٹ کانپے اور اس نے اپنی آغوش وا کر دی لیکن شہزادے کے کان اس کے شیریں آواز کے ترنم سے لذت اندوز نہ ہو سکے۔

شہزادہ برابر اپنی داستانِ محبت کہتا گیا اور اپنی محبت کی پذیرائی میں ایک ننھا سا لفظ سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا۔ مگر اس کی امیدیں بر نہ آنا تھیں نہ آئیں۔

اس ناکامی نے اُسے اس قدر ہراساں کر دیا کہ وہ زار و قطار رونے لگا۔ آنسوؤں کے چند قطرات سطحِ آب پر گرے۔ دلربا کی ابروئے پُرخم بھی شکن آلود ہو گئی اور اُس کی پلکوں پر بھی آنسوؤں کی بوندیں رقص کرنے لگیں۔ سطحِ آب پھر متحرک ہو گئی اور شہزادے کو معلوم ہوا کہ جل پری پھر جانا ہی چاہتی ہے۔

”اے نازک اندام نہ جا“ شہزادے نے ساقی سے کہا۔ ”خدارا مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ اگر میرے چھونے سے تو ملول خاطر ہوتی ہے تو میں نہ چھوؤں گا۔ اگر میرا ہاتھ لگانا تجھے ناگوار گذرتا ہے تو مجھ سے یہ حرکت کبھی سرزد نہ ہو گی۔ مگر للہ ٹھہر۔ اے حسین ہستی ٹھہر۔ کیونکہ بغیر تیرے دیکھے اب میری زندگی محال ہے۔

بس وہ خمیدہ ہو کر سطحِ آب کو گھورنے لگا اور سوائے اس بے نظیر عورت کے جو اُس کی آنکھوں میں اُتر آئی تھی اور جس کی روشنی اُس کے حریمِ دل کو روشن کئے ہوئے تھی۔ اُس نے دنیا کی کل کائنات کو فراموش کر دیا۔

آفتاب ڈھل کر روپوش ہوگیا۔ فلک اخضری پر ملکہ شب کی حکومت شروع ہوگئی مگر شہزادے نے نظریں نہ اُٹھائیں۔ اور یوں ہی دن پر دن اور رات پر رات گذرتی گئیں یہاں تک کہ وہ صرف ایک گوشت پوست کا ڈھانچہ رہ گیا۔ اور آخر ایک روز صبح فرشتہ اجل نے ترس کھا کر اُسے اس لطف آگیں تکلیف سے نجات دیدی۔

اُس کے احباب اُسے ڈھونڈتے ہوئے چشمہ کے کنارے پر آئے اور شہزادہ کی لاش دیکھ کر اپنی آہ و بکا سے سارے جنگل کو تھرا دیا لیکن جب غم کی تلخی قدرے کم ہوئی تو انہیں اس کے تجہیز و تکفین کی فکر ہوئی۔ مگر یہ کیا؟ شہزادے کی لاش کا کہیں پتہ نہیں! البتہ اُس مقام پر جہاں اُنہوں نے چند ساعت پہلے اپنے رفیق دیرینہ کی لاش بیجان دیکھی تھی ایک ننھا سا سر سبز پودا اُگا ہوا تھا جس پر ایک نہایت خوبصورت اور شاداب پھول چشم اشتیاق وا کئے ہوئے چشمہ کو عجیب دلکش انداز سے گھور رہا تھا! ہاں قدرت نے اس لافانی محبت کی یادگار قائم رکھنے کے لئے اُسے مجسم گل محبت بنا دیا تھا!

اور چونکہ شاہزادہ کا نام نرگس تھا لوگوں نے اس پھول کو اس کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ یہی پھول آج بھی نرگس کہلاتا ہے اور دیدہ شوق وا کئے محو خیال نظر آتا ہے۔

(ماخوذ)　　　"سید ممتاز اشرف قادری"

جذبات پدر

(از پروفیسر بدر قریشی ایم۔ اے۔ الف۔ آر۔ ایس۔ اے ایس (لنڈن) گورنمنٹ کالج جھنگ)

اگر از سوز نہانی کشم گہ تیرہ رنگ آہے　　　بفلک سایدش نیرنگی دا اکنم را ہے
پریشاں بکنم ہم خواب از گریہ و زاری　　　بر آگندہ کنم روشن دلیل آہ سحرگاہے
رسیدہ چوں حرامِ من نگارے شہسوار آمد　　　چو نقش پائے او تنہا و ہم فتادہ بر سر راہے
مرا با دوست روز وصل (مانند ہم کجا امید)　　　کہ ماہے نور دہ آید شبی بر سر لہے
گر ایجادی کنند چوں آں حریف کار تا سحر　　　نہ ہم داستان جانان شہرزاد راز کاہے

تو چشم نیم وا سے گر کہ در جوانی و بیخوابی ۔ دارو قصد مل میں جو تا ایں ناز کو ما ہے
نوائے تلخ مسکوئی دلے اے بد نصیب ایم
حلاوت خود نگہ در ہر کہ ماست دم وا نگاہ ہے

شانِ استقلال

"میں تمہیں دنیا اور عقبےٰ میں بھی کبھی ناراض کرنے کی دلیری نہیں کر سکتا۔" حکم نے اپنے بازو اپنی محبوبہ کے گرد حائل کرتے ہوئے کہا۔ آہستہ آہستہ اُس کی گرفت سے آزاد ہو کر مونیکا نہایت انکساری سے بولی "میں تمہارے غیر معمولی احسانوں کی شکرگذار اور تمہاری موجودگی میں جو راحت کی گھڑیاں گذری ہیں اُن کی ممنون ہوں لیکن پیارے میں ابھی تمہاری اس درخواست کو قبول نہیں کر سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کم ایک مرتبہ میاں بیوی بن کر دنیا کی لذتوں سے ہمیشہ کے لیے بہرہ رہیں گے جو صرف افسردوں کو نصیب ہیں۔ ہمیں ابھی اس حال کو قائم رکھنا چاہیئے اور علیحدہ علیحدہ زندگی کے اعلےٰ معراج پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

نوجوان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اُس کے سب ہوائی قلعے مسمار ہو گئے تمناؤں کے سرسبز گلشن پر بجلی گر گئی اور اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ایک سرد آہ بھر کر اُس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کچھ کہا جسے مونیکا انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہ سمجھ سکی۔ آخیر کچھ دیر خاموش رہ کر اُس نے بڑی کوشش سے کہا "مونیکا میں تمہیں محبت کرتا ہوں۔ اور میں انتظار کروں گا خواہ میری ساری عمر انتظار میں گذر جائے مگر کم از کم اب سے مجھے اپنا ایک دوست خیال کرو بس میری عمر بھر یہی ایک آرزو ہے۔ یہی آرزو" کہتے ہوئے حکم کا جی بھر آیا۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

مونیکا کو لنڈن میں وار[illegible] آئے ابھی صرف چھ ہفتے ہی ہوئے تھے اس لئے اسکی واقفیت محدود تھی۔ وہ اور حکم ایک دفتر میں کام کرتے تھے۔ گو انہیں دفتر میں اسٹینو کی دوکان پر کام کرتے صرف ایک ہی ماہ ہوا تھا لیکن اس قلیل عرصے میں ہی جان و دل کی محبت ہو گئی تھی۔

میں گو شہری نمائشی خوبصورتی نہ تھی مگر دیہاتی خوبصورتی کوٹ کوٹ کر بھری تھی طبیعت نہایت سادہ اور چہرہ معصوم بچوں کی طرح بھولا بھالا تھا۔ افسوس جس مقصد کو لیے وہ آئی تھی وہ پورا نہ ہوا۔ وہ حصول زر کے لیے ہی اسے گاؤں سے لنڈن میں آئی تھی۔ والدین کے لیے روپیہ جمع کرنا تو درکنار اس کی اپنی گزران بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ اُس شام مونیکا دفتر سے اکیلی آئی اور آتے ہی چارپائی پر گر پڑی۔ اُس نے سونے کی کوشش کی لیکن حرمان نصیب کی آنکھوں سے نیند رخصت ہو چکی تھی ـــــ آنکھوں کے آگے جم کی تصویر پھرنے لگی۔ اُس کی صبح کی گفتگو یاد آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی پریشانی اور آنکھوں کی سماجت بار بار مونیکا کے دل کو تڑپانے لگی۔ آخر اُس نے بہت حوصلہ کیا اور سوچا کہ وہ اپنے ارادے کو پورا کر کے چھوڑے گی۔ جب اور عورتیں لنڈن میں آ کر بیجا صرفی کرتی ہیں تو اُس کے واسطے کیا مشکل ہے ۔

ٹھیک تین دن بعد شام کے وقت ہوٹل ڈی ویس کے دروازے پر ایک براؤن رنگ کی موٹر آ کر رکی جس میں سے ایک خوبصورت نازنین معشوقانہ انداز سے اتری اور کرایہ ادا کر کے بصد ناز و انداز جا کر ایک کمرے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نووارد نازنین کا لباس بڑا قیمتی اور فوق البھڑک تھا اس کے رخساروں پر سرخی تھی۔ یہ مونیکا ہی تھی جس نے اپنا اندوختہ آج کی شام کامیاب بنانے میں صرف کر دیا تھا وہ اس سے تجربہ حاصل کرنا چاہتی تھی کہ شاید اس طرح ہی وہ کچھ پا سکے۔ اُس کے بیٹھتے ہی امرا اور حاضرین کی نگاہیں اس میں گڑ گئیں مونیکا کو بھی اس کا احساس تھا مگر بہادری کے ساتھ ان کی نگاہوں کا مقابلہ کرتی رہی اور ساتھ ہی انداز سے چاء کی پیالی پیتی رہی اور اس خیال میں غرق تھی کہ اگر یہاں کسی کو معلوم ہو گیا کہ وہ ایک معمولی ٹائپسٹ ہے تو اسے کس قدر نادم ہونا پڑے گا مگر اس کا خوف بے بنیاد تھا۔ اس ہوٹل میں صرف امیر طبقہ کے آدمی ہی آتے تھے۔

عین اس وقت جب وہ خیالات کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی اچانک ایک خوبصورت اور امیر عورت اس کے پاس والے صوفے پر آ بیٹھی اور جب جانے لگی تو غلطی سے اپنا بٹوہ وہاں ہی بھول گئی اور اس کے جاتے ہی ایک اور عورت جو وضع قطع سے ایک ملکہ معلوم ہوتی تھی آئی اور آتے ہی اپنا اوور کوٹ اُتار کر صوفے پر پھینک دیا لیکن پھر کچھ یاد آتے ہی کوٹ اٹھایا۔ اور چلدی۔ مونیکا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی فوراً اُٹھی اور اس عورت کے پاس جا کر سر نیاز انداز سے بولی۔ ' آپ کے

اور کوٹ کے ہمراہ کسی اور کا بٹوا آگیا ہے۔

"اُف کیسی بڑی غلطی ہوگئی" کہتی ہوئی وہ عورت کوٹ کو جھاڑنے لگی۔ بٹوا وہیں پر گر گیا۔ اُس عورت نے بٹوا اُٹھا کر مونیکا کے ہاتھ میں دیدیا اور کہا کہ میں معافی مانگتی ہوں مجھ سے غلطی ہوگئی یہ کہتی ہوئی۔ وہ عورت کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس دوران میں پہلی عورت اپنے دوستوں سے ملکر واپس آگئی مونیکا کو سخت دیکھ کر کہنے لگی خیر تو ہے۔ مونیکا نے اُس کا بٹوا اس کے حوالے کرکے سارا ماجرا اُس کے گوش گذار کردیا۔ وہ عورت اپنا بٹوا پا کر جس میں اُس کے ہزاروں روپوں کے جواہرات تھے بہت خوش ہوئی اور مونیکا کا شکریہ ادا کرکے بولی کہ آج شام کا کھانا آپ کو میرے ساتھ کھانا ہوگا۔ مونیکا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ گھبراہٹ میں پڑگئی اور جانا ہی چاہتی تھی کہ مسز فیلڈ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور متعجب ہوکر پوچھا کہ آپ سچ سچ بتائیں کہ آپ بالکل ابھی اُداس اور پریشان کیوں ہوئیں اور اپنی جلدی مجھ سے جدا کیوں ہونا چاہتی ہو۔ مونیکا نے اپنی سرگذشت سنائی۔ مسز فیلڈ کو بڑا رحم آیا اور بولی کہ میں آپ کی صاف گوئی سے بہت خوش ہوئی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ رہیں۔ اس لیئے اپنا میری سکریٹری ہونا منظور کریں۔ اُمید ہے آپ میری درخواست کو رد نہ کروگی اور میں آپ کو ہر طرح خوش رکھوں گی +

مونیکا کو مسز فیلڈ کی سکریٹری بنے ابھی تین ماہ ہوئے تھے مگر اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تین سال سے وہاں کام کرتی ہے۔ گو اُسے وہاں کام زیادہ کرنا پڑتا تھا مگر امیرانہ زندگی اور لذیذ کھانے اُسے اب نصیب ہوئے۔ اسے تانگاں اور موٹر پر سواری کو ملتی تھیں۔ عالیشان کمرے رہائش کے لیئے اور کئی نوکر خدمت کے واسطے مامور تھے۔ ایک دن جبکہ وہ بازار سے کچھ خرید کر واپس آرہی تھی تو اُسے وہی اسٹریٹ (?) [illegible] دکھائی دیا۔ خوشی سے مونیکا نے اُس کا بازو آکر پکڑ لیا۔ جم۔ لیئے دیکھیے [illegible]

مونیکا۔ [illegible]

جم۔ [illegible]

میں نے سوچا کہ آپ کو لکھنا اب فضول ہے کیونکہ ہماری طرز معاشرت میں بہت فرق پڑ گیا ہے۔

مونیکا۔ خیر آپ کو خط کا جواب ضرور دینا چاہیئے تھا۔ کیا ابھی آپ بدستور اپنی پرانی نوکری پر ہی مطمئن ہیں؟"

جم نے سر ہلا دیا۔

مونیکا۔ میں اپنے آقا کے پاس آپ کی سفارش کرونگی شاید وہ آپ کی مدد کر سکے۔ جم کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر یکدم یوں کہنے لگا۔ آپ ہرگز میری خاطر کچھ نہ کریں۔ میں آپ کا مشکور ہونگا۔ مونیکا کے دل کو اس سے صدمہ ہوا اور دریافت کرنے لگی کہ کیوں؟ جم نے کہا کہ میں آپ کا زیر بار احسان ہونا نہیں چاہتا۔ وہ اور کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر دل کی کشمکش سے مجبور ہو گیا اور جلدی سلام کہہ کر رخصت ہوا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد مونیکا کچھ دیر وہاں کھڑی رہی مگر پھر جم کی خاطر افسوس کرتی ہوئی گھر کو واپس چلی گئی اور کئی دن تک اُسے جم کے خواب آتے رہے ✝

ولیم مسٹر فیلڈ کا حقیقی بھتیجا تھا۔ وہ دور دراز ملکوں میں بغرض حصول علم گیا ہوا تھا۔ اور اب واپس آکر اپنے چچا کے ہاں مقیم تھا۔ اُس نے اپنی چچی کی سکرٹری کا حال سُنا تھا لیکن زیادہ توجہ نہ دی تھی کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ وہ کوئی غریب لڑکی ہوگی۔ مگر جب مونیکا کو دیکھا تو مثل آئینہ کے حیران رہ گیا اور اُسے سب سے زیادہ تعجب اس وقت ہوا جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ اُس کی کچھ پرواہ نہیں کرتی ولیم نے کوشش جاری رکھی اور اپنی چچی سے بھی ذکر کیا۔ وہ بھی اس بات سے بہت خوش ہوئی لیکن دونوں کی باہمی کوشش سے بھی اُمید کی جھلک دکھائی نہ دی۔ ولیم بالکل مایوس نہ ہوا۔

ایک دن مسٹر فیلڈ نے اپنے احباب کو دعوت دی جس میں پندرہ اشخاص شریک ہوئے اُن میں سے ایک تحصیل سرمایہ دار بھی تھا۔ جو ہر ایک سے مفت کام کروالیا کرتا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اُس نے مونیکا سے ایک چٹھی کو ٹائپ کرنے کے لئے کہا۔ مونیکا نے عدیم الفرصتی کی مجبوری پیش کی بخیل بھلا یہ کہاں برداشت کر سکتا تھا کہ اُسے ایک دوست کی ملازمہ ٹکا سا جواب دیدے اُس نے طنزاً کہا تم یہاں کام کرنے کے لئے ہو یا صورت دکھانے کے لئے۔ ولیم جو قریب تھا اپنی معشوقہ کی اس طرح ہتک نہ سن سکا۔ فوراً اس نے اُسے گردن سے پکڑ لیا اور کہا کہ مونیکا سے معافی مانگو بخیل عموماً بزدل ہوتے ہیں اُس نے معافی اُسی وقت مانگ لی۔ اور مونیکا کچھ آزردہ ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ولیم نے یہ موقعہ شادی کی درخواست کا خوب مناسب سمجھا اور وہ بھی کمرے میں اُس کے پیچھے چلا گیا۔ اور جاتے ہی کہا۔ مونیکا میں تمہیں مدت سے محبت کرتا ہوں تم میرے ساتھ شادی کر لو مونیکا نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ میں محبت کا مادہ ہی نہیں رہا اور نہ میرے پاس محبت کیلئے وقت ہے

ولیم جو ابھی تک مونیکا کی بے سماعتی کا اقرار کر رہا تھا بگڑ کر کہنے لگا۔ اے بے وقوف عورت تو کس گھمنڈ میں ہے میرے ساتھ شادی کرنے سے تیری قسمت جاگ پڑیگی اور اگر انکار جاری رہا تو تجھے نوکری سے فوراً علیحدہ ہونا پڑیگا مونیکا نے اُس کا جواب اپنی قہر آلودہ نگاہوں سے دیا اور اُٹھکر کمرے سے چلی گئی اور کھانے کے کمرے کی طرف جانے لگی کہ اچانک جم دروازے کے باہر کھڑا اُسی کی انتظار میں دکھائی دیا۔ وہ اُسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ چونکہ اس کی آج حالت وہ پہلے سے غریب کلرک کی نہ تھی۔ آج وہ ایک امیر آدمی کی طرح کپڑے پہنے ہوئے اور صاف ستھرا تھا۔ زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہ تھا اس لئے دونوں کھانے کے کمرے میں چلے گئے ٭

کھانا بہت پُرتکلف تھا اور مختلف اقسام کے کھانوں کی پلیٹوں سے میز بھری جاتی تھی مہمان مزے لے لے کر نفیس چیزیں چکھ رہے تھے۔ اور تجارت اور اپنے اپنے کاروبار کے تذکرے کر رہے تھے۔ مگر سب لوگ زیادہ تر جم کی طرف متوجہ تھے۔ جوں جوں سیر ہوتی تھی مونیکا بے تاب ہوتی جاتی تھی اُسے یہ دو گھنٹے دو سال سے زیادہ معلوم ہوئے۔ خدا خدا کرکے کھانا ختم ہُوا اور مونیکا جوش ہوش جم کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد جم نے اُسے بتایا کہ اب وہ بہت زیادہ دولتمند ہے کبھی کبھی دوران گفتگو میں سالہائے ایام کے واقعات کا ذکر آجاتا تھا جس کی یاد مونیکا کے واسطے زہر ہلاہل تھی۔ شام کے بعد جم اپنی محبوبہ سے رخصت ہُوا۔ دوسرے دن صبح پھر وہ مونیکا سے ملنے آیا اور خوش قسمتی سے وہ اُسے اکیلی لائبریری میں مل گئی۔ مونیکا نے چاہا کہ وہ کچھ بہانہ کرکے چلی جاوے مگر جم اس طرح ٹلنے والا نہ تھا اُس نے مونیکا کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ میں تمہیں ڈھونڈتا ہُوا یہاں آیا ہوں اور تم مجھ سے بھاگنا چاہتی ہو۔ کیا میری موجودگی تمہیں ایسی ناگوار ہے ٭

مونیکا۔ (جلدی سے) نہیں نہیں صاحب نہیں تو آپ کے آنے سے خوشی ہے آؤ۔ پُرانی داستان پھر سناؤ۔

جم۔ (تھامس اوپن سے ہوتے ہوئے بڑھ گیا) اور کہا۔ مونیکا آپ کے انکار نے مجھ میں ایسی طاقت پیدا کر دی کہ میں مالا مال ہو گیا۔ یہ کہکر جم نے مونیکا کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ہاں اب آپ کا چہرہ کیوں زرد ہو رہا ہے ٭

موبکا نے ہنسکر کہا کہ نہیں یہ آپ سے خبر ہے پھر جلدی سے کمرے میں سے چلی گئی اور جم بھی خاموش اپنے ہوٹل کو واپس ہوا۔

گردش افلاک نے مسٹر فیلڈ کی تمام جائداد نذر شکست کر دی اور بحالت مجبوری موبکا کو اُن کی نوکری چھوڑنی پڑی۔ اُس نے دوران ملازمت میں جسقدر روپیہ جمع کیا تھا وہ لیکر ایک معمولی ہوٹل میں رہنے لگی۔ اور نئی روزی کی تلاش کرنے لگی۔ مگر نوکری نہ ملی جم ہولٹ اسوقت امریکہ میں تھا جسوقت مسٹر فیلڈ کا دوالہ نکلا تھا۔ ابھی مصروفیتوں سے فراغت پاکر وہ چند دنوں کو لنڈن میں واپس آگیا۔ موبکا کی یاد ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی اور وہ اس کی محبت میں سرشار تھا اُسے ابھی اس نے کسی امر کا [illegible] کبھی ہنسی آتی تھی اور کبھی غصہ۔ مگر موبکا کسی طرح اُسے نہ بھولی تھی لنڈن میں وارد ہوتے ہی اُس نے مسٹر فیلڈ سے موبکا کا پتہ پوچھا اور ٹیکسی لے وہاں جا پہنچا۔ دروازے پر پہنچتے اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ موبکا اسوقت ایک کتاب پڑھ رہی تھی جم کو دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور کرسی پیش کرکے کہا آپ نے یہاں آنے کی بہت تکلیف اُٹھائی اور بغیر جواب سُنے ہی مسٹر فیلڈ کی ساری ہسٹری بیان کرنی شروع کر دی۔ خدا جانے وہ کب تک بیان کرتی جاتی کہ جم نے اُسے روکا اور کہا کہ میں ان کی کہانی سننے نہیں آیا بلکہ آپ کو دیکھنے حاضر ہوا ہوں۔ موبکا رُکی اور چند منٹ خاموشی کے بعد یوں گویا ہوئی۔ کہ میں بھی آجکل بے روزگار ہوں اور نوکری کی تلاش میں ہوں۔ مگر وہ آگے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ جم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بہت جلدی کہہ ڈالا "کیا تم اب مجھ سے شادی کر سکتی ہو"

"شادی کر سکتی ہو" ——— موبکا نے ان الفاظ کو [illegible] ہوش [illegible]۔

جم نے آگے بڑھ کر اس سے بغلگیر ہونا چاہا مگر وہ ایک طرف کو ہٹ گئی اور کہنے لگی کہ آپ شاید میری بے کسی اور بے روزگاری سے متاثر ہو کر مجھ سے شادی کی درخواست کرتے ہیں۔

جم نے فوراً اپنی غلطی محسوس کی اور جلدی سے کہا۔ ہرگز نہیں [illegible] میں ابتدا سے تمہاری محبت کا غلام ہوں اور تمام عمر تک رہوں گا۔

موبکا۔ نہیں شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک لڑکی صرف گھر کی خاطر شادی نہیں کرتی۔ رحم یا ہمدردی

ہرگز اچھی شادی کی بنیاد ثابت نہیں ہوتی۔

جم۔ یہ آپ کا وہم وگمان ہے۔ میں آپ سے سچی محبت کرتا ہوں۔

مگر مونیکا کے جواب میں ایک بے رخی تھی جس سے انکار صاف عیاں تھا۔

جم کے چلے جانے کے بعد اُسے نہایت زور سے محسوس ہونے لگا کہ اُس نے کس طرح ایک وفادار آدمی کی محبت کو ٹھکرایا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو خودبخود رواں ہوگئے اور بولی پیارے جم اگر اس وقت میں آپ سے شادی کر لیتی تو آپ میری عزت نہ کرتے ——— اُس نے سوچا۔ کہ اب رونے دھونے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اب روٹی کی فکر ہونی چاہیئے +

اُس روز سے جم نے مونیکا کے ہاں جانا بالکل ترک کردیا۔ کیونکہ اُس کی طرزِ گفتگو سے صاف عیاں ہوگیا تھا کہ وہ اُس کی بالکل پرواہ نہیں کرتی۔ اس لیئے اُس نے اپنی تمام توجہ روپے کمانے میں صرف کردی ادھر مونیکا کا خیال تھا کہ وہ ازراہِ رحم شادی کی درخواست کرتا تھا۔ اگر اسے سچی محبت ہوتی تو آنا جانا ترک نہ کرتا اس کے چند دن بعد مسٹر فیلڈ کی مہربانی سے مونیکا کو ایک عورت مس مینر کے ہاں ملازمت مل گئی۔

یہ عورت بڑی خوبصورت اور چالاک تھی اور اخباروں میں مضمون نویسی کرکے زندگی بسر کرتی تھی اُس نے مونیکا کو اپنا سیکرٹری مقرر کیا۔ مونیکا کو وہاں پر آئے بہت دن نہ ہونے تھے کہ ایک دن جب کہ وہ حسبِ معمول کام کررہی تھی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے رسیور لگا کر مخاطب کا نام پوچھا۔ جواب آیا "جم"۔ مونیکا نے حیران ہوکر رسیور اپنی مالکہ کے ہاتھ میں دے دیا اور وہ خود گوش بر آواز ہوگئی۔ مس مینر بولی کہ یہ نصیب کہ آپ نے ٹیلیفون پر یاد کیا۔ میرے والد بھی آپ کی ملاقات کے لیئے بہت مشتاق ہیں کیا آپ آج شام کو ہماری دعوت قبول کرسکتے ہیں۔ اس کے بعد مس مینر نے ہنستے ہوئے رسیور کو رکھ دیا۔

مونیکا کا وہ دن اور شام بڑے اضطراب میں بسر ہوئے۔ اب اُسے سخت یقین ہوگیا کہ جم مس مینر سے شادی کرلیگا۔ دوسرے دن وہ بدستور اپنا کام کرتی رہی اور دل میں عہد کرلیا کہ اب وہ جم کو بالکل یاد نہ کریگی وہ ایسے حالات میں غرق تھی کہ اُسے یاد آگیا کہ لائبریری سے چند کاغذات لانے ہیں اس لیئے وہ وہاں گئی اور کاغذات نکالنے لگی کہ اچانک اُس کی نگاہ ایک الماری پر پڑی جس پر جم کی تصویر پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب پہنچی اور کچھ دیر اُس کی طرف پُرنم آنکھوں سے دیکھتی رہی

پھر اس نے تصویر کو اتارا اور اپنے منہ کے قریب لے گئی ——— اسے بوسہ دیا ——— اور ——— اور ایک آہ سرد بھری۔

میں اسوقت لائبریری کا دروازہ کھلا اور اس کی مالکہ کھڑی دکھائی دی۔ کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کو حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ پھر مس میسر نے آگے بڑھ کر مونیکا کے ہاتھ سے تصویر چھین لی اور چلا کر کہا "یہ کیا"؟

مونیکا خاموش رہی۔

"کیا تم مسٹر جم کو چاہتی ہو"؟

"ہاں۔ میں بھی اُسے چاہتی تھی"۔ مونیکا نے سر نیچے کر کے کہا۔

مس میسر کچھ دیر خاموش رہ کر کھلکھلا کر ہنسی اور بولی میرا خیال ہے کہ شاید آپ سمجھتی ہو کہ جم کو آپ سے محبت ہے۔ مونیکا نے کچھ جواب نہ دیا لب بستہ مثل تصویر کھڑی رہی ✦

مونیکا بمشکل اُس دن اپنے گھر واپس آئی۔ اور دل ہی دل میں پشیمان اور ہراساں تھی کہ اس کے راز کی ایک اور واقفکار ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا راز افشا نہ ہو۔ بار بار اُسے دن کے وہ واقعات یاد آ رہے تھے جنہیں وہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی فراموش نہ کر سکی جم کی تصویر۔ اس کی مالکہ کا آنا اور گفتگو یہ سب باتیں ہزاروں تیروں کی طرح اُس کے سینے سے دل کو چھلنی کر رہے تھے۔ وہ ابھی انہیں حالات میں تھی کہ مس میسر کا خط آیا جس میں صرف دو حروف لکھے تھے کہ تم کو نوکری سے برخاست کیا جاتا ہے۔ مونیکا اس خط کی منتظر تھی اس دن سے وہ پھر نوکری ڈھونڈنے لگی اگر جہاں جاتی وہ پچھلا سارٹیفکیٹ مانگتے تھے اس لئے نوکری نہ ملی رفتہ رفتہ وہ بہت تنگدست ہو گئی اور لباس بھی بہت خراب ہو گیا۔ ایک دن نوکری کی بہت تلاش کے بعد جبکہ وہ تھک کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ تو اُس کی والدہ کا خط ملا جس میں لکھا تھا۔ کہ اُس کا والد اب بوجہ بڑھاپے کے زیادہ کام کرنے کے نااہل ہے۔ اس واسطے وہ اپنے گاؤں میں واپس آ جائے مونیکا فوراً دوسرے دن اپنے گاؤں کو روانہ ہو گئی

مسٹر وسٹن مونیکا کے گاؤں میں ایک معمولی وکیل تھا اُسے مونیکا کو جو کہ لنڈن سے بڑے شہر میں رہ

کہ بہت شہرت حاصل کر چکی تھی نوکر رکھ لیا۔ اُسے اپنے گاؤں میں آئے ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے۔ کہ ایک دن مسٹر جم مسٹر ویسٹن کے دفتر میں اچانک آنکلا۔ مونیکا اپنے خیال میں ٹائپ کر رہی تھی۔ اُس نے سوچا مسٹر ویسٹن ہونگے مگر یونہی سرسری نظر اُٹھانے پر معلوم ہوا کہ اس کا پرانا رفیق جم محوِ حیرت سا کھڑا ہوا ہے۔ مونیکا دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اے خدا کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں جم نے اتنے آپ کو پہلے سنبھالا اور جرأت کر کے مونیکا سے پوچھا۔ "کہ آپ یہاں کیسے آگئیں" مونیکا نے مختصراً اپنے آنے کا حال بیان کیا اور جم کے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

جم۔ میں سکاٹ لینڈ سے لنڈن کو واپس جا رہا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ مسٹر ویسٹن سے ملاقات کرتا جاؤں۔ چونکہ میں نے اس گاؤں کو خریدنے کا قصد کیا ہوا ہے۔ اس لئے مشورہ بھی کرنا تھا۔

مونیکا متحیر رہ گئی

مونیکا۔ تو کیا پھر یہاں قیام رکھنے کا خیال کرتے ہو ؟

جم۔ ہاں۔ کچھ کچھ۔ مگر میں ایک جگہ زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔

مونیکا۔ "کیوں"۔ یہ لفظ اُس کی زبان سے اُس کی مرضی کے خلاف نکل گیا۔

جم نے مسکرا کر کہا خواہ آپ مجھے بیوقوف ہی تصور کرتی ہو۔ مگر میں اپنی ہر کوشش سے بھی آپ کو فراموش نہیں کر سکا۔ میں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید تبدیلی مکانات سے میں آپ کو بھول جاؤں مگر بے سود۔ اس کے بعد میں نے ایک اور کوشش کی کہ محبت نہ کروں مگر وہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ حیران باتوں سے کیا فائدہ پیاری مجھے صرف اتنا بتا دو "کیا آپ کو میرا یہاں رہنا گوارا تو نہ گزریگا۔ میرا خیال ہے البتہ نہ ہوگا بلکہ مجھے یہاں رہنے سے ایسی خوشی حاصل ہوگی کیونکہ میں ہر وقت آپ کی مدد کر سکونگا اور ــــــ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مونیکا نے سر ہلا کر اپنا سر نیچا کر لیا۔ جم نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور ایک الماس نگار انگوٹھی مونیکا کے ہاتھ میں پہنا دی۔ مونیکا کے والدین کو جب معلوم ہوا کہ ان کی بیٹی ان کے گاؤں کی مالک ہوگی تو ان کی مسرت کی انتہا نہ رہی ؟

(ترجمہ) پیارے لعل چوپڑہ



انار کلی

(۱)

شہنشاہ اکبر کے شاہی محل کی کنیز کی لڑکی نادرہ 'انار کلی' کے نام سے مشہور تھی۔ ایک مرتبہ اکبر نے ہنسی میں اُس کو اس نام سے پکارا تھا۔ اُس وقت سے اُس کا یہی نام پڑ گیا تھا۔

انار کلی ایک نہایت خوبصورت اور معصوم لڑکی تھی۔ درحقیقت وہ انار کے غنچہ کے مانند ہی نرم و نازک اور خوشنما تھی۔ شاہی محل میں رہنے والی سب عورتیں اُسے نہایت عزیز رکھتی تھیں۔ شاہی محل میں چاروں طرف وہ اسی طرح ہنستی کھیلتی دوڑتی پھرتی تھی جیسے ایک خوش رنگ تتلی پھولوں کے کنج (مرغزار) میں۔

مگر ایک کلی کب تک بے کھلی رہ سکتی ہے؟ آفتاب کی سنہری شعاعیں اُس کے حسن اور خوشبو کو آہستہ آہستہ چاروں طرف پھیلا دیتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال اُس وقت انار کلی کا تھا۔

عالمِ شباب کی آمد نے اُس کے حسن میں ایک دلآویزی اور ملاحت پیدا کر دی تھی اور اُسے لڑکی سے ایک نوجوان عورت کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔ کیا ہی حیرت انگیز تبدیلی تھی! اُس کے بچپن کے کھیل کود کا زمانہ گذر گیا۔ اُس کی سادہ مسکراہٹ میں حیرت انگیز جادو تھا۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ چمکدار آنکھوں میں ایک عجیب دلکش رعنائی تھی۔ شباب کا جوش اُسے سجیلا ہی بنائے دیتا تھا۔ ہر لمحہ نئی ادا دیکھنے میں آتی تھی۔

شاہی محلات کی سب عورتیں انار کلی کو دیکھ کر سرد آہیں بھرا کرتی تھیں کیونکہ اُس کو دیکھ کر انہیں اپنے شباب کا زمانہ یاد آ جاتا تھا۔ جب اُس کی ہمجولیاں اُسے چھیڑتیں اور کہتیں —— "آہا! اب تو کلی کھلنے لگی"۔ تو وہ جھٹ ادا سے مسکرا کر جواب دیتی — "کیوں نہ کھلیگی؟"

حیرت سے نوجوان اور لڑکی سے انار کلی ایک معصوم عورت ہو گئی۔ شاہی محلوں میں پردے کی کوئی قید نہ تھی۔ انار کلی کے حسنِ دلاویز اور جادو بھرے شباب پر سب سے پہلے جس کی نظر پڑی وہ اکبر کا بیٹا اور جانشین شاہزادہ جہانگیر تھا۔

(۲)

انار کلی کی ادائیں اس قدر دلکش ہوتی تھیں کہ اس کو صرف ایک نظر بھر کر دیکھ لینا ہی اُسکی محبت

کو اپنے دل میں جگہ دے بیٹھا تھا۔ اُس کی خوبصورتی نے سلیم کے نازک دل کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ اور وہ اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لئے مناسب موقعہ کا منتظر تھا۔

ایک روز شام کا خوشگوار وقت تھا مینہ کی جھڑی لگ کر کچھ کھُل گئی تھی۔ چمن کی کیاریاں دُھل دُھلا کر صاف ہو گئی تھیں موتیا کے شگفتہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ مل رہی تھی پتوں سے بارش کی بوندوں کے ٹپ ٹپ گرنے سے سُریلے گانے کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ آسمان نکھرتا جاتا تھا۔ چاند کا اُجالا درختوں کی آڑ میں سے چھن چھن کر زمین پر گر رہا تھا۔ انارکلی سنگ مرمر کی پٹڑی پر اپنے پالتو ہرن کے بچہ کی تلاش میں آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھی۔ "آرا! آرا!"

یہ الفاظ اُس نے ہرن کے بچے کو پکارنے کے لئے ایسی شیریں اور سُریلی آواز میں کہے اس کے جواب میں سونے کے گھنگروؤں کی ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"آرا! آرا!"

پھر وہی جھنکار سنائی دینے لگی۔ مگر وہ بہت دبی ہوئی تھی۔ کبھی تو وہ بہت دور سُنائی دیتی تھی اور بعض اوقات بالکل نزدیک۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہرنوٹا نے اُس کی آواز سُن ضرور لی ہے وہ اس کی آواز کا جواب کیوں کر دے رہا تھا لیکن وہ تھا کہاں؟ اگر کہیں آزاد ہوتا تو ایک ہی آواز کے ساتھ چوکڑیاں بھرتا ہُوا اُس کے پاس پہنچ جاتا۔ انارکلی نے پھر پکارنا شروع کیا پھر وہی جھنکار کانوں میں پڑی۔ آخر کار اُس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ اُس طرف کو چل دی جہاں سے آواز آ رہی تھی جب ہرنوٹا کہیں نظر نہ آیا۔ تو وہ باغ کے ایک سنسان کونہ میں پہنچ کر نہایت تھکی ہوئی اور دردمند آواز سے پکارنے لگی۔ "آرا! تو کہاں ہے بدبخت؟"

اتنے میں وہ ہرن کا بچہ ایک درخت کے پیچھے سے چھلانگیں مارتا ہُوا نکلا اور مسرت آمیز الھڑپن کے ساتھ چوکڑیاں بھرتا ہُوا انارکلی کے پاس آ پہنچا۔ شام کا وقت تھا۔ چاروں طرف خاموشی کا عالم تھا۔ اُس کے گلے اور پاؤں میں پڑے ہُوئے چھوٹے چھوٹے گھنگروؤں کی جھنکار سے سماں اور بھی دلفریب ہو رہا تھا۔ انارکلی اُسے پچکار کر پیار کرنے لگی اور اپنے نرم اور نازک ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال کر پیار سے کہنے لگی۔ "ارے نواب تک کہاں تھا؟ تجھے کس نے پکڑ رکھا تھا؟"

"میں نے"

انارکلی خوفزدہ اور متحیر ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پیچھے سے ایک نوجوان آہستہ آہستہ مسکراتا ہوا بولا۔ "میں نے تمہارے ہرن کو پکڑ رکھا تھا"۔

انارکلی کا چہرہ مارے شرم وحیا کے سُرخ سُرخ ہو گیا اُس کے رخساروں پر گلابی رنگ دوڑ گیا۔ مُنہ کو نقاب میں چھپا لیا۔ اور جُھک کر آداب بجا لائی۔

"میں آپ سے معافی کی ملتجی ہوں"۔ انارکلی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ ..."

انارکلی کی بات ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ سلیم مسکراتا ہوا بول اُٹھا "نہیں۔ بلکہ مجھے چاہیئے کہ تم سے معافی مانگوں۔ میں نے ایک تمہارے ہرنوٹے کو روک کر اتنی دیر تک تمہیں ناحق تنگ کیا۔ تمہیں معلوم ہے۔ کہ میں نے تمہارے ہرن کو کس لئے روک رکھا تھا؟"
پھر خود ہی مسکراتے مسکراتے ذرا آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "محض اس لئے کہ اُس کی آنکھیں بھی تمہارے ہی جیسی ہیں"۔

انارکلی چپ چاپ کھڑی سی رہی۔ اُس نے پہلے بھی یہ سُن رکھا تھا کہ شہزادہ اُس پر فریفتہ ہے۔ اب سلیم کے الفاظ سُن کر شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔

انارکلی ایک غیر معلوم جوش کے باعث خاموش کھڑی تھی سلیم بھی اُس کے قریب ہی کھڑا تھا انارکلی نے آنکھیں اُوپر کو اُٹھا کر سلیم کو دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں سلیم اب بھی کھڑا مسکرا رہا تھا اور اشتیاق بھری نگاہوں سے اُس کی طرف تک رہا تھا۔

سلیم کی مسکراہٹ نے انارکلی کے لبِ لعلیں پر بھی شرم آلودہ تبسّم کی لہریں پیدا کر دیں
سلیم نے آہستہ سے اپنے ہاتھ انارکلی کی گردن کے گرد ڈال دئے اور اُسے اپنی طرف کھینچا۔
سلیم جوش سے بول اُٹھا۔ "انارکلی! تو میری ہے اور صرف میری ہے!"
اس کے ساتھ ہی آہستہ سے دونوں کے لب ایک دوسرے سے مل گئے۔ انارکلی ذرا لڑکھڑائی
سلیم کی باہیں اُس کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک طرف کو کھسک گئی۔
وہ ہرنوٹا اچانک چونک پڑا۔ جیسے کوئی شخص کسی بُرے خواب سے چونک اُٹھا ہو۔ جوں ہی
اُس نے اُوپر کو نظر کی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو بڑے بڑے سلیم نے ...

کی چمکدار روشنی میں موتیوں کے مانند چمکنے نظر آئے ۔

(۱۳)

اُس رات انارکلی سونہ سکی۔ ملاسہ اُس کا سخت مادم ہُوا۔ شام کے واقعات نے اُسے بیدار رکھا سلیم کے اس عجیب و غریب غیر متوقع اور کھلم کھلا اظہار عشق نے اُس کے جسم میں ایک ناقابل بیان عشق کی لہر سی پیدا کردی۔ وہ سخر خیالات میں غوطہ زن تھی۔ حیرت انگیز جذبات مسرت سے اُس کا سینہ لبریز تھا آنکھیں بند کئے وہ اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی مگر جاگ رہی تھی۔ اُسوقت اُس کے دماغ میں صرف گذشتہ شام کے واقعات کی تصویر تھی۔ وہ کل شام کی ذرا ذرا سی باتوں پر از سر نو غور کر رہی تھی سلیم نے اُسے کس طرح پکارا تھا؟ اس کی آواز میں کیسی حلاوت تھی؟ اُس نے اپنے چہرہ پر سُرخی کا دوڑ جانا کس طرح محسوس کیا تھا؟

سلیم کے بوسہ لینے اور بغلگیر ہونے سے وہ کس طرح لڑکھڑا کر دراپرے ہٹ گئی؟ کس طرح دونو کی نگاہیں چار ہوئی تھیں؟ سلیم کی نگاہوں میں کس قدر اشتیاق اور شوق بھرا ہوا تھا؟ اُس کی آنکھوں سے کیسا مست ساحت اور معانی کی التجا کے جذبہ کا اظہار ہو رہا تھا؟

ہائے! پھر کیا ہوا؟ آہ! وُہ پُر مسرت گھڑی جب دونو کے لب عالم بیخودی میں خود بخود مل گئے تھے۔ اس کی یاد سے اُس کے نازک رخسار گلاب کے پھول سے نظر آنے لگتے تھے ہی ایک جذبہ تھا جو اس کے جسم میں پوشیدہ طور پر کام کر رہا تھا۔ بار بار اُسے اس امر کا احساس ہوتا تھا کہ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اُس کے بعد پھر وہی دلخوش کُن فتح و نصرت کا جذبہ دل پر قابو پالیتا تھا۔ انہی خیالات نے اُس کے دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ پھر بھلا وہ کس طرح سو سکتی تھی؟

"محبت! آہ یہی اور صرف یہی!"

شہزادہ نے اُس پر اپنی محبت اپنے عشق کا اظہار کر دیا کیسی حیرت انگیز بات ہے!! وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکی کہ مندرجہ بالا واقعہ پیش کس طرح آیا۔

کیا میں درحقیقت حسین ہوں! اور نہایت حسین؟

ہاں اُسے یقین ہوگیا کہ میں صرف حسین ہوں۔ اس دلخوش کُن خیال اور اپنے حسن و جمال کے تاثر نے اُسے دیوانہ سا دیا۔

عشق اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا ——— کیسا دلچسپ خیال تھا! ایک لمحہ کے لئے تمنا، پیار اور کامیاب مستقبل کی تصویر اُس کی آنکھوں کے آگے پھر گئی۔

سلیم مجھے اپنے دل کی رانی بنائیگا اور یہ عشق کا جادو ہم دونو کو عیش و عشرت کی طرف لیجائیگا۔

"آہا! اے مبارک گھڑی! ارے خدا آ اور جلد آ!"

انارکلی یونہی سحر خیالات میں غوطہ زن تھی۔ اُس سمندر میں سے مسرت کا طوفان اُٹھا۔ اور اُس کے دماغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ ہر لمحہ بار بار اپنی باتوں پر غور کر رہی تھی اور ہر بار اُسے ایک نئی خوشی کا احساس ہوتا۔ اور وہ مارے خوشی کے پھولی نہیں سماتی تھی۔

سلیم نے بھی اسی طرح نہایت اضطراب و پریشانی کی حالت میں رات گذاری۔ ابھی اُس کی اُٹھتی جوانی تھی۔ ابھی عالم شباب کی آمد آمد ہی تھی مگر اُس سے زیادہ اور کون عشق و محبت کر سکتا ہے جس کے سینہ میں سوئے ہوئے ارمانوں کے ساتھ جوشِ جوانی بھی ہو۔ اس عمر میں جو عشق کیا جاتا ہے وہ پاکیزہ اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔ منزلِ عشق میں قدم رکھنے کا سلیم کے لئے پہلا ہی موقعہ تھا۔ صرف انارکلی سے ہی وہ دوچار ہوا تھا اس سے پہلے اُس کا دل کسی اور پر نہ آیا تھا۔

سلیم انارکلی کی خوبصورت آنکھوں کی دلاویزی۔ اُس کی آواز کی سادگی اور سُرخ سُرخ رخساروں اور ان سب باتوں کے ساتھ اپنے عشق کے تخیل میں مستغرق تھا۔ اسی حالت میں وہ بے خبری کی نیند سو گیا۔

(۴)

تھوڑے ہی دنوں کے بعد شاہی محل کے دربار میں ایک [illegible] سرو و گرم ہوئی۔ شہنشاہ اکبر [illegible] سال [illegible] تمام وقت اکبر کا [illegible] آ رہا تھا [illegible] [illegible] آنکھوں میں [illegible] [illegible] حالی تھی [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

سلامت جلوہ افروز تھے۔ سب بیگمات غالیچوں پر بچھائی ہوئی خوب آراستہ و پیراستہ مسندوں پر بیٹھی محل کی رونق کو دوبالا کر رہی تھیں۔

گانا بجانا شروع ہو چکا تھا۔ کئی عورتوں کا گانا بھی ختم ہو گیا تھا مگر انارکلی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُس کے گانے کی باری تھی۔ وہ ناز و ادا کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی مجلس میں آ موجود ہوئی۔ شہنشاہ کی تعظیم کے لئے جھکی اور چُپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

آج انارکلی نے اناری رنگ کے سنہری کام کے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ بال بال میں موتی پرویا ہوا تھا۔ صُراحی کے مانند گردن اور اُبھرے ہوئے سینوں پر موتی ہی موتی جھلک رہے تھے۔ آج تک اُسے کسی نے ایسے زرق برق لباس میں اس ناز و انداز کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اگرچہ اُس کے حُسن دلفریب کو کسی قسم کے بناؤ سنگار کی ضرورت نہ تھی مگر اُس روز شام کو اُس کے جواہرات اور نہایت خوشنما لباس اُس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔

اکبر نے آنکھ اُٹھا کر انارکلی کی طرف دیکھا اور مُسکرا دیا۔ اُس نے کہا۔ "ماہ کامل کو چھوٹے چھوٹے چمکدار تاروں سے زیب پانے کے لئے ہالہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تو پھر اے خوبصورت لڑکی! یہ زرق برق لباس کس لئے؟"

انارکلی کے چہرہ پر شرم و حیا کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔

وہ ان سب باتوں کو جو اُس کے دل میں تھیں کس طرح ظاہر کر سکتی تھی؟ سلیم وہاں موجود تھا۔ پھر وہ کیونکر اسے بتاتی کہ وہ بھاری زیورات اور کپڑوں سے سج کر آئی۔

سارنگی نے جب سُروں سے محل میں ایک سماں باندھ رکھا تھا۔ انارکلی کھڑی سُن رہی تھی۔ اُس نے سازندوں کی طرف سر ہلا کر تیار ہو جانے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھ کر اپنے پاؤں آہستہ سے زمین پر رکھے۔ جھم جھم کی دلکش آواز پیدا ہوئی اور سارنگی کے سُر میں مل گئی۔ اس نے رباب دھیمے اور نازک راگ میں گانا شروع کیا۔ دھیمی مگر نہایت سُریلی آواز تانوں میں گھُل مل گئی۔ انارکلی کی آواز بعض اوقات اسقدر دھیمی ہو جاتی تھی کہ صرف اس کے ہلتے ہوئے لبوں کو دیکھنے سے ہی یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ گا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ آواز صاف ہوتی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خوش گلو پرند چاندنی رات میں درد کے پیدا کرنے والا راگ الاپ رہا ہے۔

اس روز شام کو گاتے وقت انارکلی کے دل میں ایک خاص مسرت کا جذبہ لہریں مار رہا تھا۔ اس کو معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے درحقیقت یہ سب عشق ہی تھا جو اس کی رگ رگ میں سرایت کر رہا تھا۔ اس لئے اسنے چاروں طرف ایک بارنگاہ دوڑائی ۔

سلیم سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے اشتیاق ٹپکا پڑتا تھا پوشیدہ ملاقاتوں کی یاد انارکلی کے دل میں تازہ ہوگئی اس کی آنکھوں اور چہرہ پر انتہا مسرت برس رہی تھی۔ اور سلیم؟ اس کی آنکھوں میں انارکلی کے حسن و جمال کی تصویر تھی وہ سوچنے لگا۔ انارکلی کی آنکھوں میں کیسا حسن اور عشق بھرا ہوا ہے"

انارکلی گانے لگی :-

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

گانے کے۔ الفاظ انارکلی کے کسی ایسے جذبہ کا اظہار کر رہے تھے جس کو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا جس میں خود دیں اپنے عاشق کے روبرو گانا اور پھر ان آنسوؤں کا گانا جیسے جذبات و خیالات اُس کے دل میں سمائے ہوئے تھے ———— وہ سب کچھ بھول گئی۔ اُسے اس امر کا خیال ہی نہ رہا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے سامنے گا رہی ہے۔ اُسے صرف ایک بات کا علم تھا۔ اُسے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں صرف دو ہی متنفس موجود ہیں۔ ایک تو وہ خود اور دوسرا اس کا عاشق ۔

وہ ناچ رہی تھی لیکن آنکھیں سلیم کی آنکھوں سے ہی ملا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کا جذبہ عشق اُس کے حسن کی آگ کو مشتعل کر رہا تھا۔ عین اُسی وقت ایک زور کی آواز سنائی دی۔ یہ اکبر کی آواز تھی جس نے گانا ناچنا سب یکلخت بند کرا دیا۔ چاروں طرف خوف اور خاموشی چھا گئی ۔

اکبر کا جسم غصہ سے کانپ گیا۔ اُس کے کمان ابرو تن گئے۔ مارے غصہ کے آنکھیں سرخ انگارا ہوگئیں وہ کسی بھی پہلو سے عکس میں نور جہاں (عشق) کے اُن سربستہ پیاموں کو جو سلیم کی طرف سے انارکلی تک اس اور انارکلی کی طرف سے سلیم کے پاس جا رہے تھے دیکھ رہا تھا اور دوسرے ہی دونوں کے خیالات بڑھتے گئے کو کسی نے دیکھ لیا دونوں کا آنکھیں لڑانا کا عکس بتا بھاگا اور... کے دلی جذبات اکبر پر روشن ہو رہے تھے ملاحظہ کہ اُن دونوں میں ایک قسم کا امر عشق تھا

جس سے اکبر ایک ناواقف شادہ (لگاتار) غور سے دونوں کو تاڑ رہا تھا۔ نگاہ کا ہر ایک تیر اُس کے شک کو بڑھا رہا تھا جب اُس نے انارکلی کو مسکراتے دیکھا اور اس تبسم کا جواب شہزادہ سلیم کی طرف سے بھی دیا گیا تو اُس کے دل میں یقین ہو گیا کہ انارکلی سلیم کو اپنے حُسن و جمال کے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے ؛

اگرچہ اکبر نہایت سعید طبیعت کا آدمی تھا اور نہایت متحمل مزاج تھا۔ مگر اس وقت اُسکا مزاج بھی بگڑ گیا۔ وہ مارے غصہ کے آپے سے باہر ہو گیا۔ کیا سلیم اُس کا بیٹا اور اُس کے بعد تخت و تاج کا جائز وارث ہو کر بھی ایک کنیز کی لڑکی سے محبت کریگا ؟ ایک اُونچی آواز سے خواجہ سراؤں کے داروغہ کو سامنے طلب کیا اور اپنی انگلی کو جھٹکا کر انارکلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس عورت کو یہاں سے لیجاؤ اور محلات کے قید خانہ میں بند کر دو تاکہ اس سے نیچ ذات کی عورتوں کو جو بلاوجہ اور لے محل اس قسم کا شادو سدگار کیا کرتی ہیں آئندہ کے لئے نصیحت اور عبرت حاصل ہو ؛

اکبر کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ شاہی محل کی ہوا (کرۂ ہوائی) میں گونج رہے تھے اور محل میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ؛

انارکلی اکبر کے چہرہ کو متحیر نگاہوں سے تک رہی تھی لیکن جب اُس نے اکبر کی اُنگلیاں اپنی طرف اُٹھتی دیکھیں تو اُس کے بدن میں مارے خوف کے بجلی سی دوڑ گئی ؛ شہنشاہ کے حکم کا مطلب ؟ اُسنے اپنے دل سے سوال کیا ۔ کیا میرے لئے ہی یہ احکام صادر ہوئے ہیں ؟ وہ کس سے دریافت کرے ؟ اُس نے ایک خوفناک آواز سُنی۔ اُس کا سر جھک گیا اُسکی آنکھوں کی چمک جاتی رہی جو کچھ اُس نے سنا تھا۔ اُس کا مطلب نہیں سمجھ سکی ؛

اچانک اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے ہاتھ کو کسی نے چھوا۔ یہ ایک جوہر تھا جو اُسے قید خانہ کی طرف لے جانے کے لئے آیا تھا اُس کے چہرہ اور آنکھوں سے [illegible] اضطراب ٹپک رہا تھا [illegible] اُس نے اپنے [illegible] آنکھوں سے [illegible] دست بستہ ہوئے [illegible] گر پڑی ؛

(۵)

[illegible]

ایسی خاموشی جس میں پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تک سنائی نہیں دیتی! نہایت خوفناک اور دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ چراغ بجھ گیا تھا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ اُس سنسان تاریکی میں انارکلی کو ہوش آیا ۔

اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا اور خیالات کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئی۔ اُسے دنیا جہان۔ غرضیکہ ہر شے تاریک نظر آتی تھی۔ اچانک پھر وہی خون کو منجمد کر دینے والی یاد اُس کے دماغ میں آگئی۔ آہ! کیسے خوف کا سامنا تھا! انارکلی ایک قیدی کی حالت میں۔ فرشتۂ اجل کے مہمان کی شکل میں۔ پتھر کے فرش پر لیٹی ہوئی تھی ۔

اُس کا دل بیٹھ گیا جب اُسے اُس موت کا خیال آیا جس سے وہ اگلی صبح ہمکنار ہونے والی تھی۔ صرف چند گھنٹے اور زندہ رہنے کے بعد اُسکی پُرمسرت زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ موت!
ہر ایک چیز کو فنا کر دینے والی موت ہر لمحہ اُس کے قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی اور نہایت مایوسی کی حالت میں ہاتھ مل رہی تھی۔ آہ! ظالم اور بیدرد موت! نہایت سنگدل اور خوفناک موت انارکلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ موت کا انتظار کرنا اور موت آنے کے لمحوں کو شمار کرنا خود موت سے ہزار گنا زیادہ تکلیف دہ ہے ۔

انارکلی کہنے کو بیٹھی تھی مگر اُس کے سر میں چکر آ رہے تھے وہ ناہموار فرش پر کسی گھائل کے مانند سر کے بل گر پڑی۔ دل کے گھاؤ اور درد سے رونے لگی وہاں کوئی نہ تھا جو دستگیری کرتا جو اُسے بچاتا۔ ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا۔ سلیم جس کے لئے اس عورت کو ایسی خوفناک موت کا سامنا کرنا پڑا کہاں تھا؟ سلیم کا خیال آتے ہی ایک سرد آہ اُس کے دل سے نکلی اور وہ اسقدر روئی کہ اس سے زیادہ رونا ممکن نہ تھا۔ جب اُس کی ہچکیاں بند ہوگئیں اور ہوش و حواس بحال ہوئے تو اُس نے تباہی سے سوچنا شروع کیا۔ اُس کا دل اُس کو گمراہی واقعات کی طرف لے چلا جو اُس کی موت کا باعث ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگی اُس نے ایسا کون سا کام کیا تھا جس کے لئے وہ اس سزا کی مستوجب ٹھہرائی گئی۔ اُس نے صرف شہزادہ سے عشق کیا تھا۔ لیکن کیا وہ کوئی معیوب فعل ہے؟ کوئی گناہ ہے؟ اُسے اس بات کا یقین۔ آسکا کہ درحقیقت اُس سے کسی بُرے کام کا ارتکاب ہُوا ہے ۔

یا خدا! تو نے اُمید کیوں پیدا کی تھی جبکہ اُسے پورا ہونا ہی نہیں تھا۔ آہ! پھر کس لیئے؟ کس لیئے؟"

کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اُسے اطمینان یا سکون قلب بخش سکتی۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اُس کے خوف و ہراس کو دُور کر سکتی۔ اُس کی توجہ سلیم کی طرف گئی۔ پھر ایک خیال اُس کے دل میں آیا۔ کیا شاہزادہ کو واقعی اُس سے عشق و محبت ہے؟ یا شاہزادہ کی محبت صرف اُن معمولی جذبات کے مانند تھی جنہیں انسان ہر لمحہ فراموش کرتا رہتا ہے۔ یہ خیال موت کے خیال سے بھی زیادہ باعث تکلیف تھا۔ اس شک میں کہ سلیم اُسے سچے دل سے نہیں چاہتا موت کی سی تلخی تھی۔ اُسی وقت اُسے کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنی۔ دروازہ کھلا اور ایک پہریدار ہاتھ میں مشعل لیئے انارکلی کی کوٹھری میں داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی بھی آیا۔ یہ سلیم تھا۔

انارکلی نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو سلیم کو اپنے پاس کھڑا پایا۔ فوراً اُس کے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ایک لمحہ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ پہریدار مشعل کو اس کوٹھری میں کھڑا کر کے چل دیا۔

انارکلی اور سلیم دونوں نہائیں روئے اور آنسو بہاتے رہے۔ بہت دیر کے بعد دونوں کی طبیعت ٹھکانے آئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ گفتگو کر سکیں۔

سلیم نے آہستگی سے کہا۔ "میری اچھی انارکلی! میں تجھے بچا سکتا ہوں۔ میرے ساتھ چلی آ۔"

انارکلی نے استعجاب نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھنے لگی۔

سلیم بولا۔ "میں نے سواری کے لئے دو گھوڑوں کا انتظام کر لیا ہے۔ نور کا رٹ کا ہوتے ہی ہم کئی میل نکل جائیںگے۔ ہم ایسا بھیس بدل لیںگے کہ کوئی بھی ہمیں نہ پہچان سکیگا۔"

انارکلی نے درد بھرے لہجہ میں کہا۔ "شاہزادہ ہمارا تعاقب کیا جائیگا اور ہم پکڑے لیئے جائیںگے۔ میرے لئے تم اپنی جان کیوں خواہ مخواہ جوکھوں میں ڈالتے ہو؟"

"میری محبوبہ! میرے رفیق ایسے ہیں جو ہمارا تعاقب کرنے والوں کو اُلٹا راستہ بتائیںگے اُنہیں اُلٹی راہ پر ڈال دینگے ہمارے گھوڑوں کے سُموں پر ایسی نمدیں لپٹی ہوئی ہیں کہ اگر ہم نہ تو بھی بھاگیں تو

بھی اُن کی آواز نہیں سنائی دیگی! اچھی انارکلی! ایک ایک لمحہ اسوقت نہایت بیش قیمت ہے اور وقت مالوں ہاتوں میں فضول جا رہا ہے"۔

انارکلی کشمکش میں پڑگئی۔ وہ سوچنے لگی کہ سلیم کی جان کو خطرے میں ڈالنے کا اُس کو کیا حق حاصل ہے؟ اُس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا "پیارے سلیم! بلاشبہ میری موت آ رہی ہے۔ خدا نے وہ جہاں اور شہنشاہ سلامت کی جب یہی مرضی ہے تو میں کیونکر زندہ رہ سکتی ہوں؟ میں اس تنگ و تاریک کوٹھڑی کو ہرگز نہیں چھوڑونگی جب تک کہ موت سے بغل گیر ہونے کے لئے یہاں سے نہ نکالی جاؤں"۔

سلیم متحیر ہو کر بولا "ان یہ کیا کہتی ہو! میں تجھے ایک ظالم اور سنگدل آدمی کے ہاتھ سے گتے کی موت مرنے کے لئے یہاں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا"۔

سلیم نے انارکلی کو زبردستی باہر نکالنے کے لئے اپنی طرف کھینچا مگر اُس نے دیوار کے ساتھ اپنے تئیں جکڑ لیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میرے سارے! میری عمر کا پیمانہ پُر ہو چکا ہے! اجل کے سامنے کسی کی پیش نہیں جاتی۔ اب زندہ رہنے کی کوشش کرنا بے سُود ہے۔ شاہ سلامت خواہ کچھ بھی ہوں آخر ہمارے آقا ہیں اُن کی زبان سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ قانون سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ تم میرے ہمراہ کیوں جانے ہو حکمہ؟ امر یقینی ہے کہ ہمارا تعاقب ضرور کیا جائیگا۔ تاہم یہ اُن سب باتوں پر جو ہمارے بگڑے جانے کا باعث ہو سکتی ہیں خوب اچھی طرح سے غور کیا ہے"؟

سلیم نے بے چین ہو کر جلدی سے جواب دیا "اسوقت میں ان باتوں کی تشریح نہیں کر سکتا! یہ وقت عورتوں کے تشریح کرنے کا نہیں ہے۔ میرا والد بڑا سنگدل اور بے درد ہے۔ میں اُس کے ظالمانہ احکام کی تعمیل نہیں کر سکتا وہ تجھے میرے سپرد کرنے پر تیار نہیں ہے تاکہ اسے فرمان کے تابع رکھا جا سکے۔ ہمیشہ کے لئے کوئی بھی دلّی کے تاج و تخت کو اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔ میں بھی آج یا کچھ دیر بعد اُس کا مالک ہونگا"۔

انارکلی چُپ چاپ سلیم کی باتیں سنتی رہی۔ سلیم نہ سمجھ سکا کہ انارکلی کی اس آمادگی کا کیا مطلب ہے۔ وہ کس لئے قید خانہ سے رہائی پانے کے لئے اپنی ناآمادگی کا اظہار کر رہی ہے اور کیوں وہ تیر اجل کا انتظار کر رہی ہے۔

یہ دیکھ کر کہ بیش قیمت وقت فضول ضائع ہو رہا ہے سلیم نے اس بات پر ... کو چھوڑتے ہیے

اور اُس کے ساتھ چلنے کے لئے بار بار درخواست کی۔ مگر انارکلی یہ خیال کر کے کہ شہنشاہ اکبر کی خفگی سلیم کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیگی ہر بار اپنی نارضامندی کا اظہار کرتی رہی ۔

آخر کار سلیم سے نہ رہا گیا۔ وہ جوش میں آکر بول اُٹھا ۔ "انارکلی! یہ نارضامندی کس لئے؟ تیرے بغیر میں کس طرح زندہ رہ سکونگا؟ اگر تو مرنے کی خواہشمند ہے تو میں بھی مرنے کے لئے تیار ہوں۔ تو جب تک میرے ساتھ نہ ہولیگی میں ہرگز یہاں سے نہیں ٹلونگا"۔

انارکلی کے خیالات میں یکایک تبدیلی واقع ہوگئی۔ وہ گھبرا کر بول اُٹھی ۔ "تو کیا ابھی دیر نہیں ہوئی؟ کیا اب بھی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں؟"

سلیم نے اُسے یہ کہکر یقین دلایا کہ "کسی قسم کا ڈر نہیں ہے۔ ابھی وقت ہے"۔

یہ کہکر وہ انارکلی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے قیدخانہ سے باہر لیجانے کے لئے تیار ہوگیا۔

اُسی لمحہ دروازے کے کواڑوں کے کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی اور فوراً دروازہ کھل گیا۔ ایک آدمی نہایت تیزی سے اُس کوٹھڑی میں گھس آیا اور چڑھے ہوئے دم کو روک کر جلدی جلدی بولا ——

"شہزادہ صاحب! جہاں پناہ اسطرف آرہے ہیں"۔

سلیم بول اُٹھا ۔ "اب کیا ہوگا؟"

نووارد نے جواب دیا "آپ وقت ضائع نہ کریں اور فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ جب شہنشاہ سلامت چلے جاویں اُسوقت پھر واپس آجائیے گا"۔

سلیم نے اُس شخص سے کہا "باہر ٹھہرو۔ رحیم خان! میں ابھی آتا ہوں"۔

یہ کہکر اُس نے ایک محافظ کی وردی جو کہ وہ آنے وقت احتیاطاً اپنے ساتھ لیتا آیا تھا پہن لی۔ ایک لمحہ خاموش کھڑے رہنے کے بعد اُس نے انارکلی کو سینہ سے لگا کر کہا "انارکلی پیاری! میں ابھی تھوڑی ہی دیر میں واپس آتا ہوں۔ تیار رہنا"۔

انارکلی نے مایوسانہ نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا مگر اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔
سلیم نے اُس کا سر ذرا اوپر کو اُٹھایا اور جھک کر ایک بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد مشعل کو بجھا کر وہاں سے چل دیا۔

انارکلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکی ۔ زبان سے ہی کوئی لفظ نکال سکی وہ بوسہ کا جواب تک نہ دے سکی۔
سلیم کے چلے جانے کے بعد ہی اُسے اب سمجھنے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ انارکلی نے پھر وہی بیہانی

اور یاس کا خوفناک منظر سامنے پیش کردیا ۔

(۶)

کوئی بھی نہیں آیا۔ رحیم خاں نے جھوٹ موٹ ہی کہدیا تھا۔ نہ بادشاہ اکبر اور نہ کوئی اور شخص ہی انارکلی کے اس تنگ و تاریک تہ خانہ کی طرف آرہا تھا ۔

شاہزادہ سلیم نے ابھی ایک پارٹی علحدہ بنا رکھی تھی اُس کی آزاد طبیعت نے اس کے دل میں اپنے والد کے عین حیات میں آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کا خیال پیدا کردیا تھا۔ حرم سرائے کی چھوٹی سی حوالات کا داروغہ رحیم خاں بھی سلیم کی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ اُسی کی مدد سے سلیم اس رات حوالات میں انارکلی سے مل سکا تھا۔ رحیم خاں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ شاہزادہ صرف انارکلی کو آخری مرتبہ دیکھنے اور اُسے الوداع کہنے کو آیا ہے اُس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ انارکلی کو ساتھ لیکر بھاگ جانے کی تیاری کر رہا ہے ۔

جب سلیم انارکلی کے پاس آیا تھا اور اندر اُس سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُسوقت رحیم خاں کمرے میں دروازہ کے باہر کھڑا دونوں کی باتیں سن رہا تھا جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ شہزادہ اُس کی سپردگی میں رکھے ہوئے قیدی کو یہاں سے نکال لے جانا چاہتا ہے تو اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ اُسے خوب معلوم تھا کہ اگر بادشاہ کو اس امر کا پتہ لگ گیا تو اُس کی جان کے لالے پڑ جائینگے۔ ساتھ ہی سلیم کو روکنا بھی مناسب نہیں خیال کرتا تھا کیونکہ یہ امر طے شدہ تھا کہ شہنشاہ اکبر بوڑھے ہوگئے ہیں اور اُن کے تخت پر سلیم ایک نہ ایک دن ضرور بیٹھیگا سانپ مرے او لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس ضرب المثل کو مد نظر رکھ اُس نے ایک تدبیر سوچی جس کے ذریعہ وہ سلیم کو ناراض کئے بغیر ہی وہاں سے ہٹادینے میں کامیاب ہوگیا ۔

جونہی سلیم اندر سے نکلا رحیم خاں نے اُسکو کچھ فاصلہ پر دو لالٹینیں دکھلائیں جو خود اُس کے آدمیوں نے روشن کردی تھیں۔ مگر چونکہ شہزادہ نے اُن کی طرف نگاہ نہیں کی کیونکہ باپ کے خوف سے اُسکی آنکھیں چندھیا گئی تھیں اُسکی ہمت نے ساتھ نہ دیا کہ اُسوقت وہ اپنے باپ کے سامنے ظاہر ہوکر کھلم کھلا مخالفت کرے

اُسی حالت میں رحیم خاں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر محلات کے پیچ در پیچ راستوں سے ہوتے ہوئے اُسکے کمرہ میں پہنچادیا ۔ تھوڑی دیر بعد سلیم نے پوچھا "کیا تم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہو کہ بادشاہ سلامت ہی تھے؟" رحیم خاں نے یقین دلاتے ہوئے کہا "ہاں حضور" سلیم نے بڑی بے صبری سے دریافت کیا "آخر یہاں آنے کا کوئی مقصد ؟" رحیم خاں بولا "حضور کو معلوم ہی ہوگا کہ شہنشاہ اکبر اکثر رات کے وقت اچانک یہاں آکر

واسطہ کیا کرتے ہیں۔ آج بھی اُس کے نہ آنے کا یہی سبب ہو سکتا ہے" سلیم نے ہنسکر کہا۔ "ہاں اصبح جب وہ یہاں آئیگا تو اُسے معلوم ہو جائیگا"۔

کئی منٹ گذر گئے۔ رحیم خاں کا فکر اور بھی بڑھ گیا کیونکہ اُسے شہزادہ کی باتوں سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ابھی انارکلی کو یہاں سے لیکر بھاگ جائیگا۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ اگر یہ کاروائی عمل میں آئی تو پھر صبح اُس کی جان کی خیر نہیں ہے لیکن اُس نے جھٹ پٹ ایک آسان ترکیب سوچ لی۔

رحیم خاں نے عرض کی "حضور انکان رفع کرنے کی غرض سے شراب کے دو ایک پیالے پی لیجئے"۔ تکان سے سلیم کے گلے کی رگیں خشک ہو رہی تھیں چنانچہ اُس نے کہا "ہاں۔ شیرازی شراب کا ایک پیالہ لے آؤ"۔ رحیم خاں شراب لانے کے لئے پاس کے کمرہ میں چلا گیا۔ اُس نے صُراحی لیکر چپکے سے اپنے کمر بند میں سے ایک پڑیہ نکالی اور ایک سفید رنگ کا سفوف اس میں گھول دیا۔ سلیم اس کا انتظار کر رہا تھا جب رحیم خاں شراب لایا وہ فوراً غٹ غٹ چڑھا گیا اور دوسرا پیالہ مانگا۔ رحیم خاں نے دوسرا پیالہ بھر کر پیش کیا جسے شہزادہ نہایت اشتیاق کے ساتھ نوش کر گیا۔ کچھ دیر بعد سلیم سُرور میں آ کر بولا۔ "رحیم خاں مجھے انارکلی کے پاس لے چل"۔

"میں تو شہزادۂ عالم کی خدمت کے لئے حاضر ہوں مگر ——"

"مگر کیا؟"

"مگر بادشاہ سلامت ابھی تک وہیں ہونگے"۔

"ارے بھائی بادشاہ سلامت کو تو کسی چوکیدار کے گھر میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جاؤ۔ ذرا دیکھو تو۔ ابھی وہیں ہے یا ٹل گیا"۔

"جو حکم" رحیم خاں جھک کر آداب بجا لایا اور وہاں سے چل دیا۔ اُسے اس بات کا اطمینان تھا کہ دوا اپنا اثر دکھلا رہی ہے اور اب سلیم صبح تک کیا اُٹھ سکتا ہے؟

(۷)

انارکلی سلیم کے واپس آنے کی بڑی بیتابی سے راہ دیکھ رہی تھی مگر وہ اب تک نہیں آیا۔ انارکلی کے اضطراب و پریشانی کی کوئی حد نہ تھی لیکن ابھی وہ بالکل نااُمید نہیں ہوئی تھی۔ اُمید کی شعاع کی ایک ہلکی سی جھلک دکھلا رہی تھی کہ شاید اب بھی سلیم آ جائے اور اُس کو یہاں سے چھڑا لے جائے۔

صبح صادق کے نور نے آہستہ آہستہ اس تاریک قید خانہ کی تاریکی کو جس میں انارکلی قید تھی دُور کر دیا اُس کی ہلکی سی روشنی میں اُس کو اپنے سامنے کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ اُسے جھٹ یاد آ گیا کہ اُس انگوٹھی کے ہیرے کی چمک ہے جو اس کی والدہ نے اُسے مرتے وقت دی تھی۔ انارکلی کی والدہ نے یہ انگوٹھی انارکلی کی انگلی میں پہناتے ہوئے کہا تھا۔ "تجھے اس کی کبھی ضرورت نہ پڑے گی لیکن پھر بھی اگر اس دنیا جہان میں تجھے عصمت بچانے کو کوئی جگہ نہ رہے تو اس وقت اس نگینہ کو چوس لینا"۔ انارکلی کو اپنی ماں کی آخری وصیت یاد آ گئی۔ اُس نے جھٹ پٹ انگوٹھی میں سے ہیرے کو نکال کر منہ میں رکھ لیا۔ چمن کا نظارہ اور اپنی ماں کی یاد اس کے دماغ میں چکر لگانے لگی۔ اس کے بعد اس کے دل میں سلیم کے عشق کی تکلیف دہ یاد از سر نو تازہ ہو گئی۔ انہی خیالات میں اس کی حسرتناک زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ سر کے نیچے اپنے نازک ہاتھ کا تکیہ لگائے ٹھنڈے سخت اور ناہموار پتھر کے فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرہ پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ لب ذرا سے کھلے ہوئے تھے۔ آنکھیں بھی کچھ کھلی کچھ بند تھیں۔

جب شاہی اہلکار بادشاہ سلامت کی طرف سے انارکلی کے لئے سزائے موت کا فرمان لیکر آئے اور ایک لمحہ کچھ سوچنے کے بعد دروازہ کھول دیا تو صبح کے آفتاب کی شعاعیں کمرہ میں داخل ہو رہی تھیں اور انارکلی کے جسد بے جان کے مکھڑے کے گرد ہالہ معلوم ہوتی تھیں۔

اب وہ اس بادشاہوں کے بادشاہ کے دربار میں پہنچ چکی تھی جس کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے تاجدار بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

(۸)

خاندان تیموریہ کے سب سے بڑے اور مشہور فرمانروا اکبر کو خدا کے دربار سے بلاوا آ چکا تھا اور اب بجائے اُس کے سلیم نور الدین محمد جہانگیر دلی کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔

انارکلی کی دردناک موت کی یاد انارکلی کے عاشق سلیم نے دل سے فراموش کر دی تھی۔ اب وہ ایک دوسرے پھول کے گرد بھونرا بن کر منڈلا رہا تھا۔ اب اُس نے مہر النساء کو دیکھ لیا تھا۔ انارکلی کی یاد اس کے دل سے یوں مٹ گئی تھی جیسے کہ آفتاب کی روشنی میں ستارے اپنی چمک دمک کھو بیٹھتے ہیں اب اُسے ہر وقت سوتے جاگتے مہر النساء عرف نورجہاں کا ہی خیال رہتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے شام کا وقت تھا۔ جہانگیر شاہی محل کے پاس باغ میں ٹہل رہا تھا اور

نورجہاں کے ساتھ اس کے عشق اور اس کی بیوفائی کے متعلق گفتگو کر رہا تھا کہ کلیوں (غنچوں) سے لدے ہوئے ایک انار کے درخت کے سایہ میں ایک چھوٹی سی سفید سنگمرمری پر اس کی نظر پڑی۔ ایک قبر تھی اس سے پیشتر اس نے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ یہاں کون دفنایا گیا ہوگا۔

ایک بوڑھا باغباں تھوڑی دور پرے پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا۔ جہانگیر نے اس کو اپنے پاس بلا کر پوچھا ”یہ کس کی قبر ہے؟“

باغباں نے پہلے قبر کی طرف دیکھا اور پھر جہانگیر کی طرف دیکھنے لگا لیکن کچھ جواب نہ دے سکا وہ خوفزدہ سا معلوم ہوتا تھا۔ جہانگیر نے دوبارہ سوال کیا ”یہاں کون سو رہا ہے؟“ باغباں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب دیا ”انار کلی بیگم“۔

انار کلی! عہد گزشتہ کی یاد نے سلیم کو پھر جذبات میں مستغرق کر دیا۔ اس نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ شام کی تاریکی میں اسے مغرب کی طرف ایک ستارہ چمکتا دکھائی دیا۔ اس چمکتے ہوئے تارے کے ساتھ انار کلی کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ مہر النسا کو بھول گیا۔ انار کلی کی یاد پھر اس کے دل میں ویسی ہی تازہ ہو گئی جیسی کہ کئی سال پہلے تھی۔ وہ اس کی المناک زندگی کے ایک ایک واقعہ کو یاد کرنے لگا۔ اسے انار کلی کا وہ ادا سے مسکرانا یاد آگیا جس کے لئے وہ اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ قید خانہ میں انار کلی سے ملاقات۔ رحم خاں کی سنگدلی اور دھوکہ بازی۔ تمام واقعات ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ جہانگیر اپنی خیالات میں مستغرق خراماں خراماں اپنے محل کو واپس چلا گیا۔

اگلے روز صبح ہی شاہی معمار کو حکم ہوا کہ انار کلی بیگم کی گمنام قبر پر ایک خوبصورت اور عالیشان مقبرہ تیار کروایا جائے اور جواہرات سے مرصع پتھر کی ایک تختی لگا کر اس پر مندرجہ ذیل شعر کندہ کروا دیا جائے۔

تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را	آہ اگر من باز بینم روئے یار خویش را

لیڈ ہیڈ رام سروپ کوسل

ناول نویسی

اردو علم ادب میں ناول نویسی کی ابتدا کب ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ یہ ایک بیحد پیچیدہ مسئلہ ہے

کہ جس کا حل کرنا کچھ آسان امر نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے اول رابنسن کروسو اور سینڈفورڈ مرٹن یا پلگرمز پراگریس وغیرہ کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا گیا تھا اور اسی سے ہندوستان میں ناول نویسی کا احساس پیدا ہوا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مغربی افسانوں کے مترجم ہی جبکہ صحیح معنوں میں ناول نویس نہیں تھے۔ تو پھر ناول نگاری اس ملک میں کیونکر پیدا ہو سکتی تھی۔ تاہم ناول نویسی کے لئے جیسا کہ ایک قادر الکلام مصنف کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ایسے لوگوں میں غدر سے دس بارہ سال پہلے فقط دو شخص اردو نویسی میں کما حقہٗ دستگاہ رکھتے تھے یعنی مسلمانوں میں سر سید اور ہندوؤں میں راجہ شیو پرشاد صاحب، بہادر سی۔ آئی۔ ای۔ اب سر سید نے تو ناول یا ڈرامہ کو چھوا تک بھی نہیں البتہ راجہ شیو پرشاد نے ۵۳-۱۸۵۲ء کے درمیان ونالن اور قسنرینہ کے نام سے ایک ناول اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا اور انہی کے ہمعصر ہندو مصنفین نے بعض اور اردو ناول بھی جو انگریزی سے ترجمہ شدہ تھے چھپوا کر رائج کئے تھے مثلاً سمپل سوسن جو مس ایجورتھ کا ناول تھا۔ اس کا ترجمہ سارن میں کالی ناتھ بسواس نے ۱۸۵۵ء سے کچھ پیشتر کیا تھا اور پھر اسی زمانے میں مندرجہ ذیل اردو ناول اضلاع متحدہ آگرہ میں طبع ہوئے تھے۔

(۱) کلیرا موٹ کے افسانے زبان اردو میں (۲) ینگ مرچنٹ یعنی نوعمر سوداگر کی کہانی۔
(۳) ڈسٹینٹ ہل (دور سے دکھائی دینے والے پہاڑ)۔ (۴) لٹل ہنری اور اس کا بہرا
(۵) گلیور صاحب کا سفرنامہ۔

اب مندرجہ بالا قدیم ناولوں پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جوں جوں انگریزی تعلیم بنگال سے نکلکر اول اول بنارس الہ آباد اور آگرہ میں پھیلی اُس کے ساتھ ساتھ ہی ناول کا وجود بھی بنگالہ سے آکر آخر الذکر شہروں میں قائم ہوا اور پھر اس کا قدم شمالی ہندوستان کی طرف اُٹھا۔ گویا ۱۸۴۷ء سے لیکر ۱۸۵۲ء تک اردو داں احباب بتدریج انگریزی ناول کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے تھے لیکن ۱۸۵۷ء میں کم بخت غدر برپا ہو گیا اور ناول نویسی جو ایک آسودہ زمانے کی چیز ہے۔ کی ترقی بالکل رک گئی تاہم ۱۸۶۰ء کے بعد عوام کو پھر اس کی طرف توجہ ہوئی۔ اور اب کے اردو علم ادب میں روسی زمیندار کا قصہ اور رسوم ہند وغیرہ ایسی کتابیں شائع ہوئیں۔ جنہوں نے اردو کے بعض قدیم دلچسپ افسانوں مثلاً باغ و بہار اور قصہ گل بکاؤلی وغیرہ پر فوقیت حاصل کر لیا اور رسوم ہند جیسے افسانے دہلی۔ لکھنؤ اور لاہور کی یونیورسٹیوں کی طرف سے منظور ہو کر بہت مقبول ہونے لگے ادھر

عربی بھی تعلیم ہوگئی اور اول ہند میں پہلے پہل بالکل ایسے قصے کہانیاں جو ہماری معاشرت سے تعلق رکھتی تھیں عام طور
پر رواج پکڑنے لگیں گویا اردو مکمل ناول یک لخت ہی ملک میں نہیں لکھا گیا۔ اس سے قبل بعض ایسے قصے جو ہماری
معاشرت پر کچھ روشنی ڈال سکتے تھے معرض وجود میں آئے اور پھر اردو زبان کا سب سے پہلا ناول غالباً ۱۸۶۲ء
اور ۱۸۷۲ء کے درمیان مضافات دہلی یا اہل دہلی کے قلم سے لکھنؤ و دہلی میں کہیں نہ کہیں قلمبند ہوا۔

اور یہ بات ہم اس قیاس پر لکھتے ہیں کہ غدر سے چند سال بعد اہل دہلی تمام اطراف ملک میں منتشر
ہوگئے تھے۔ اور یہ ضروری ہے کہ انہوں نے پہلا اردو ناول لکھا ہوگا۔

بعد ازاں صوبہ بہار میں جو اودھ اور بنگال کے بیچ میں واقع ہے۔ شاد عظیم آبادی اور اضلاع متحدہ
میں رتن ناتھ سرشار نے اردو میں بالکل اوریجنل ناول پر سبقت دی۔ یہ واقعہ ۱۸۷۶ء سے تعلق رکھتا ہے
پھر ان ناول نویسوں کے بعد ہندوستان کے بعض دوسرے صوبوں میں بھی ناول نویسی کی نے ترقی کی لکھنؤ۔ کانپور
آگرہ اور ہردوئی وغیرہ وغیرہ شہروں میں متعدد ناول شائع کئے گئے۔ گویا ۱۸۷۵ء تک عوام ہند ناول کی حقیقت
سے بالکل آگاہ ہو چکے تھے۔ اور پھر یہ شوق یہاں تک عام ہوگیا تھا کہ اول اول شیکسپیر کے ڈرامے اور قصے
کہانیاں وغیرہ یکے بعد دیگرے ترجمہ ہوئیں اور پھر شیکسپیر کے بعد گولڈ اسمتھ۔ جانسن۔ اڈیسن اور دانیال سویفٹ
صاحب کے ناول اردو میں ترجمہ کئے گئے اور بتدریج یہ نوبت پہنچی کہ رینالڈ جیسے معمولی مصنف کے
بھی بیسیوں ناولوں کو اردو کا لباس پہنایا گیا اور ایک عرصہ تک اردو داں پبلک رینالڈ صاحب کے
ہی ناول پڑھ پڑھ کر اپنا جی بہلاتی رہی ادھر رتن ناتھ سرشار۔ عبدالحلیم شرر اور مرزا سجاد حسین اور حکیم محمد علی
طبیب امروہی وغیرہ نے بھی ناول پر ناول لکھنا شروع کیا۔ ادھر ۱۸۸۵ء تک اردو ناول کا لکھنا جیسا
عام ہوا اس کا پڑھنا بھی سارے ملک میں ایک فیشن بن گیا اور آخر یہ نوبت ہوئی ۱۹۲۰ء تک رائیڈر ہیگرڈ۔
کانن ڈائل اور مسٹر میری کوریلی جیسے نامور چوٹی کے انگریز مصنفوں تک کے ناول بھی اردو میں ترجمہ کئے
گئے۔ اور اب ان کو ملک میں بڑے شوق کے ساتھ مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ ناول کو اردو لٹریچر کا ایک خاص
رکن قرار دیا گیا ہے۔ یہ ہے اردو ناول نویسی کی مجمل تاریخ۔ اس کے بعد اب ہم سطور ذیل میں وہ اصول مختصراً
قلمبند کرتے ہیں کہ جن کے زیر غور رکھنے سے ہم جس زبان میں چاہیں۔ ایک اوریجنل ناول لکھنے کے قابل ہو
سکتے ہیں + سوال یہ کہ۔ "ہم ایک ناول کیونکر لکھیں"؟

دراصل یہ ایک نہایت ہی دلچسپ زمانہ حال کا سوال ہے کہ جس کا جواب عموماً مندرجہ ذیل کیا جاتا ہے۔

ایک دوست کو تفصیل کسی واقعہ کی بابت خط لکھے یا کوئی کہانی ایسے طریق سے بیان کرے کہ جس سے مخاطب مذکور اس کہانی کے کل حلیہ وما علیہ بخوبی سمجھ سکے یا جو شخص اپنی یا دوسروں کی سرگذشت کو بے کم وکاست مؤثر الفاظ میں حوالۂ قلم کر سکے ایک ایسے شخص کو "ناول" لکھنے میں چنداں دقت واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے لئے صرف ذہن ذاتی تجربہ اور زیادہ تر ایمیجینیشن (Imagination) یعنی خیال وقیاس سے ہی کام لینے کی ضرورت ہوگی پس ایک ایسے شخص کو اس فن کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل ہدایات ایسے ہی اشخاص کے لئے حوالۂ قلم کی گئی ہیں۔

ایک ناول کا مواد کس طرح جمع کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اس امر پر غور کرو کہ تم کس واقعہ کے متعلق اپنا ناول یعنی فسانہ سپرد قلم کیا چاہتے ہو اس کے "ارکان" یا وہ اشخاص اور اجرائے واقعات کیا ہیں کہ جنہوں نے تمہاری طبیعت پر اتنا اثر کیا ہے کہ تم اُن کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہو۔ پس جب یہ بات طے ہو جائے۔ تو پھر اس بات کا فیصلہ کرو کہ غایت مقصود اُس قصے کا کیا ہوگا۔ آیا عشق ومحبت۔ امیر سے غریب ہو جانا۔ یا غریب سے دولتمند بن جانا یا کوئی فریب یا صداقت یا بہادری یا بزدلی یا کوئی اور انسانی کمزوری مدنظر ہے۔ پھر جب یہ امر بھی قرار دے لو۔ تو ہمیشہ یاد رکھو کہ اپنے ناول کے ہر ایک فقرے میں۔ غایت مقصود ہمیشہ پیش نظر رہے۔ اور تم اپنے ناول کو لکھنا شروع کر دو۔

اردو زبان میں اسی فی صدی کے قریب انگریزی ناولوں کے ہی ترجمے ہیں لیکن پہلے تم اُن کو نظر انداز کر دو۔ اور صرف اُن لوگوں کے تصنیف کردہ ناول مطالعہ کرو کہ جنہوں نے اسی ملک میں رہ کر ہندوستان ہی کی سرزمین کے ایسے قصے کہانیوں کا مواد جمع کیا ہے۔ مثلاً مولوی نذیر احمد خاں اور راشد الخیری وغیرہ نے اسلامی معاشرت اور مسلمان عورتوں کے حالات زندگی کے متعلق متعدد ناول تحریر کئے ہیں۔ تم ان کو ایک نظر دیکھ جاؤ اور معلوم کرو کہ ابن الوقت [illegible] میں سے کسی ایک ناول میں کون کون سے اشخاص کا قصہ کہا گیا ہے بس وہی کیریکٹر ہیں۔ پھر دیکھو کہ کون کون سی باتیں اُن کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔ یہ گویا مواد ناول ہے اب جو مصنف سب سے پہلے اس قسم کی مشق بہم پہنچا لیتے ہیں۔ وہ عموماً شروع ہی سے بہت اچھا لکھنے لگتے ہیں۔ ورنہ ناول نویسی یا قصہ گوئی کبھی سکھلانے سے نہیں آیا کرتی۔ شاعری اور نقاشی کی طرح یہ بھی آیاتی ملکہ ہے۔ لہٰذا اس کے قواعد ایک سلیم الطبع آدمی کو خود ہی محسوس ہو جاتے ہیں پس اول اول تم کسی مروجہ ناول کو اپنے ہی الفاظ میں لکھو اس کی ابتدا۔ انتہا۔ طرز بیان اور ارکان قصہ یا کیریکٹروں کے افعال واقوال اور۔

زبان کا تسلسل ایسا قائم کرو کہ تمہارا بیان کردہ قصّہ بھی کسی مروجہ ناول کے لگ بھگ ہو تو تم سمجھ لو کہ عملیہ ناول نویسی اسی کا نام ہے۔ جیسے جیسے "واقعات و حالاتِ زمانہ" کا مطالعہ کروگے تم میں وسعتِ بیان اور قادرالکلامی کا مادہ بھی پیدا ہوتا جائیگا۔

سیکڑوں ناول نویسوں نے ایک معمولی سے واقعہ کو چن کر اس سے ایک قصّہ گھڑ لیا ہے۔ اور اکثر تو ایسا ہوا ہے کہ اخبارات میں جو عدالتی مقدمات کی مفصل کیفیتیں چھپا کرتی ہیں انہی میں سے ایک آدھ کو اپنے ناول کا مواد فرض کر کے کوئی افسانہ لکھ دیا جاتا ہے۔ غرض ایک ناول کا مواد کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے۔ ہمیشہ میسر اور آمادہ ہے۔ صرف اس پر توجہ کر لینے اور اپنے خیالات کو اس کے متعلق انتہا درجے تک وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

اقسامِ ناول

یوں تو ناول کوئی سائنس کی چیز نہیں ہے کہ اصول ریاضی کے مطابق اس کے خاص خاص اقسام ہمیشہ کے لئے وضع کر دیئے جائیں تاہم ناولسٹوں نے اس کی بڑی بڑی قسمیں یہ قرار دی ہیں۔

اول۔ تاریخی ناول۔ مثلاً اردو میں منصور موہنا اور حسن و انجلینا وغیرہ تاریخی ناول ہیں جو مولوی عبدالحلیم شرر کے قلم سے نکلے ہیں۔ ایک ایسے ناول کے لئے جس تاریخی واقعہ یا تاریخی شخص کو معرضِ بیان میں لانا ہو۔ اس کے متعلق اصل تاریخیں سب سے پہلے نہایت غور سے مطالعہ کرو پھر اس پر قلم اٹھاؤ۔ اس قسم کے ناول کے لئے اس زمانے کی رسوم۔ عوام کی طرزِ معاشرت قطع و وضع۔ لباس زبان اور بادشاہت یا حکومت کے طریق کے علاوہ جس قوم کا وہ ہیرو ہو۔ اس قوم کے سیاسی خصائل وغیرہ کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے۔ پھر جب معلوم ہو جائے تو ایک ایسے تاریخی ناول کا لکھنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔

دوئم۔ ناولِ واقعات۔ یعنی ایک [illegible] کسی خاص حادثہ کو اس قصے کی بنیاد ٹھہرا کر وہ ناول لکھا گیا ہو۔ مثلاً ایک واقعہ ہوا ہے ایک ہندو عورت کو چند مسلمان عید کے دن [illegible] لے گئے ہیں۔ وہ عورت کسی مندر میں داخل ہو کر پناہ مانگتی ہے۔ ادھر ہندو [illegible] مسلمانوں کا سوال بنا کر مسلمانوں سے لڑ پڑتے ہیں۔ پولیس بلائی جاتی ہے لیکن علاوہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ [illegible] اس فساد کو روک لینے میں ناکام رہتی ہے [illegible] کا ایک [illegible] ہو جاتا ہے اور [illegible] کیا جاتا ہے [illegible] جو بالکل جعلی سی معلوم ہوتی ہیں ان ہی کو بس [illegible] سرشار نے ایک ناول [illegible] کا نام طوفانِ بے تمیزی سے ترتیب دے کر

ایک ناول تصنیف کیا تھا "پنجاب میں پارسل لا" ایک اتفاقیہ واقعہ تھا مگر افسوس ہے کہ اس کو کسی مشہور ناولسٹ نے کچھ نہیں لکھا ورنہ یہ ایک اسی قسم کا اچھا ناول ہوتا ۔

سوئم۔ ناول رسم و رسوم۔ اردو زبان میں چند ہیں۔ قومی وضع قطع اور خصائل زمانہ کے اثر سے طرز معاشرت میں جو تغیر و تبدل واقع ہوا کرتے ہیں۔ ان کے تعلق سے مولوی نذیر احمد خاں نے ابن الوقت اور مولانا راشد الخیری نے "بنت الوقت" بہترین ناول لکھے ہیں۔ گو ان کے مصنفوں نے زمانہ کی رَو کو روکنے کی کوشش کی ہے اور وہ بے سود ہے تاہم سوسائٹی ناول کا۔ دونوں کامل بہترین نمونہ ہیں ۔

چہارم۔ ناول حقائق و تحقیقات۔ ہمارے مشہور آنریبل ناولسٹ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے لکھنؤ کے نوابوں کے خصوصی خصائل۔ چنڈو خانوں کی اندرونی زندگی اور اہل لکھنؤ کی طرز معاشرت کے متعلق جس قدر تحقیق بہم پہنچائی ہے۔ ان سب کو افسانۂ آزاد میں جمع کر دیا ہے۔ اسی طرح سیر کہسار میں پہاڑی زندگی اور وہاں کے حالات بالتحقیق قلمبند کر کے ان کو شائع کر دیا ہے۔ اس قسم کے ناولوں میں ایک ناولسٹ جس قدر چھوٹی چھوٹی باتیں خود دیکھ بھال کر سلیقہ سے لکھ دیتا ہے۔ وہی قصّہ کا لطف بڑھا دیتے ہیں چونکہ پنڈت صاحب موصوف کی نظر سے غالباً کوئی بات بھی نہیں بچی کہ جس کو انھوں نے صاف صاف نہ لکھا ہو۔ اس لئے ان کے ناول اردو زبان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے اور یہ ناول حقائق ہیں جن کو انگریزی زبان میں اینالسٹک ناول کہا جاتا ہے ۔

پنجم۔ ڈرامائک ناول۔ آج کل ڈرامہ سے عوام بھی بخوبی واقف ہیں کہ ایک ناٹک کا انجام کبھی خوشی پر ہوا کرتا ہے اور کبھی غم پس جس ناول میں مثلاً اثر سے عبرت ہو جاتا۔ یا عبرت کا اثر ہو جاتا۔ اس طرح بیان کیا جائے کہ تسلسلِ واقعات حسب سے کچھ دور نہ ہو۔ اور اس قصے میں جن لوگوں سے کام لیا گیا ہو ان کے خیالات۔ افعال و اعمال اور طریق کار سب خود بخود دل پر نقش ہونے والے ہوں تو ایک ایسا ناول ڈرامیٹک کہلاتا ہے۔ مثلاً راشد الخیری کا حال ہی کا ایک ناول "نجمہ کا لڑکی" جس میں ایک نافرمان بیٹے کے خصائل کو ناول کیا گیا ہے بہت درد انگیز ہے۔ اس قسم کے ناول عموماً انسانی جذبات کو تحریک میں لایا کرتے ہیں۔ اور ڈرامیٹک کہلاتے ہیں ۔

ششم۔ رومانس۔ اردو میں اس قسم کے ناول کثرت سے ہیں حقائق و موجودات کچھ دور سے کسی قدر واقعات کو جمع کر کے کوئی ناول لکھا جائے۔ "دلو افسانے" کہلاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں وہم و افسانے مثلاً گل بکاولی کا

قصہ یا باغ و بہار وغیرہ تو ایسے ناول ہیں کہ ان کو حال کی معاشرت سے چنداں تعلق نہیں ہے۔ البتہ مولانا راشد الخیری نے سات روحوں کے اعمال نامے ایک اسی قسم کا رومانس لکھ دیا ہے۔ اہل قلم اسی کو نمونہ ٹھہرا کر اور بھی رومانس زبان اردو میں لکھ سکتے ہیں۔

جب مبتدی نے ناول کی ان پانچوں قسموں کو ذہن نشین کر لیا ہو اور ہر قسم کے دو دو تین تین ناول خواہ انگریزی زبان سے یا اردو سے پڑھ لئے ہوں۔ تو پھر اس کو مندرجہ ذیل امور پر توجہ دینا چاہیے اور اس وقت ناول نویسی کا فن اختیار کرنا چاہیے۔

۱۔ کیریکٹر۔ ایک ناول جن مردوں یا عورتوں کے افعال یا اعمال کا آئینہ ہو۔ ان کو اس ناول کے کیریکٹر کہا جاتا ہے۔ پس تم جس ناول کو لکھنا چاہو۔ پہلے اس کے ہیرو یا ہیروائن (بالفاظ دیگر کیریکٹروں) کو علیحدہ علیحدہ طور پر دیکھ بھال لو۔ کہ وہ کیسے کچھ ہیں اور ان سے کس قسم کے اعمال سرزد کئے جائینگے۔ اور وہ ان اعمال کو کس تسلسل کے ساتھ معرض ظہور میں لائینگے۔ اب جن لوگوں کا کام ناول نویسی ہی ٹھہر چکا ہے۔ ان کا یہ خاصہ طبیعت ہوتا ہے کہ وہ عموماً ہر ایک قسم کے فرد قوم کے خاص خاص حالات پر وقتاً فوقتاً غور کیا کرتے ہیں۔ اور جب کبھی ان افراد سے کسی ناول میں سابقہ پڑتا ہے تو وہ اسی یاد سے فوراً وہ حالات لکھ دیا کرتے ہیں۔ لہذا ایک ناولسٹ کا حافظہ اور اس کی نظر بہت تیز ہونی چاہیے۔ ایک ناول میں جس قدر کیریکٹر لائے جائیں انہی میں سے جس کیریکٹر کو ابتدائے قصہ سے انتہائے قصہ تک تعلق ہو۔ اور وہ ناول عموماً اسی کی ایک سوانح عمری دکھائی دے تو وہ کیریکٹر اس ناول کا ہیرو ہوتا ہے۔ اس ہیرو (مرد ہو یا عورت) کو اس قصہ سے الگ تھلگ اپنے ذہن نشین کر کے گویا اسی کے اعمال و اقوال کا نقش اور افراد قوم و ملک کے ساتھ ایک کچا چٹھا بیان کر دینا۔ ناول مذکور کا ڈھانچہ تیار کر دیتا ہے۔ پھر اسی ڈھانچے پر گوشت پوست چڑھانا یعنی قصہ کی تکمیل کرنا ایک اور مسلسل ناول کی تصنیف ہے۔

۲۔ پلاٹ۔ ایک ناول یا قصہ ہمیشہ کسی خاص مقصد سے لکھا جاتا ہے بلکہ ہم ایک چھوٹی سے چھوٹی کہانی بھی کسی دوست سے بیان کرو تو وہ اس تمہاری کہانی پر غور کر کے کچھ نہ کچھ نتیجہ نکالیگا۔ کہ جس پر اگر وہ ظریفانہ ہوگی تو ہنس دیگا ورنہ کوئی علمی نکتہ حاصل کریگا۔ یا نصیحت پکڑیگا۔ گویا وہ نکتہ یا نصیحت یا کوئی اور بات ہی تو وہ چیز ہے کہ جو اس کہانی کا اصل مقصد ہوتا ہے لیکن یہ مقصد جب تک اس کہانی کے ارکان خاص خاص طور پر عمل نہ کریں عہدہ برآ نہیں ہوتا۔ پس اسی طرح ایک ناول کے تمام کیریکٹر جس جس طرح شروع

سے آخر تک اپنے اپنے افعال و اقوال کا اظہار کرتے ہیں یہی مسلسل حالات و واقعات پلاٹ کہلاتا ہے عام طور پر ناول کسی پلاٹ ہی کی خوبی پر اچھا یا بُرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے پلاٹ کو تجویز کر لو اور پھر اُسی "پلاٹ" کے لحاظ سے اس ناول کے ارکانِ اربعہ یعنی کیریکٹر مقرر کرنے چاہئیں۔

۳۔ جائے وقوعہ۔ ہر ایک ناول سے کسی خاص جگہ کا بھی ضرور تعلق ہُوا کرتا ہے۔ لہٰذا یہ جگہ جہاں انتخاب کی گئی ہو۔ اُسی کے مطابق حالاتِ موسم اور نیچرل سینری یا وہاں کے باشندوں کی رہائش اور طور و طریق کا ایک ناول نویس کو ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے۔ مثلاً دہلی میں آندھیاں موسم گرما میں آیا کرتی ہیں۔ برسات میں پانی برستا ہے۔ اگر ایک ناول میں آندھیاں آنے اور برسات واقع ہو جانے کا کہیں ذکر ہو تو ظاہر ہے کہ موسم گرمی کا ہوگا۔ جس میں پنکھے جھلتے ہیں اور لوگ برفاب پیتے ہیں اور عموماً بہت محنت و مشقت نہیں کر سکتے لہٰذا اگر ایسے ناول میں کہیں یہ لکھا جائے کہ اس ناول کا ہیرو صبح سے شام تک کام کیا کرتا اور اس سے تھکتا نہیں تھا تو یہ ایک ناممکن بات ہوگی غرض جو مقام کسی ناول کے وقوعہ سے متعلق ہو پہلے اُسی کے متعلق ہر قسم کی واقفیت رکھنی چاہیئے۔ بلکہ ہر ایک مشہور افسانہ نویس ہمیشہ کسی خاص مقام ہی کا ناولسٹ ہُوا کرتا ہے۔ جو وہیں سے اپنے کیریکٹر چنا کرتا ہے گویا وہیں کے لوگوں کے حالات قلمبند کیا کرتا ہے۔ تم بھی اگر ناولسٹ بننا چاہو تو کسی ایسے مقام۔ شہر، صوبہ یا حصہ ملک اور وہاں کے باشندوں کو ہمیشہ زیرِ مطالعہ رکھا کرو اور وہیں کے قدرتی سین وغیرہ اور مقامی حالات سے اپنے افسانوں میں استفادہ کرتے رہا کرو۔

۴۔ مکالمہ۔ ایک ناول میں مثلاً قیل و قال بحث و مباحثہ اور باہمی گفتگو کی جب ضرورت پڑے۔ تو اس کو درج کرنے سے اس ناول کے حسن تاثر میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں یہ ضرورت آ پڑے۔ اسے ناول کے کیریکٹروں کی زبان۔ لب و لہجہ اور ان کے خیالات کا ویسے ہی اظہار کرو جیسے کہ حقیقی طور پر ہُوا کرتا ہے۔ مثلاً ایک دیہاتی اور شہری کے حالات اور لب و لہجہ میں زمین و آسمان کا فرق ہُوا کرتا ہے لہٰذا ناول نویسی میں ان امور کا خاص طور سے لحاظ کرنا چاہیئے۔

۵۔ جنرل نالج یعنی بعض عام مضامین کی کماحقہٗ واقفیت ہونا۔ ایک ناولسٹ کو اپنے ملک کی تاریخ۔ جغرافیہ نامی آدمیوں کی سوانح عمریاں۔ مختلف رائج الوقت مذاہب اور اقوام کے سرسری حالات ولسانی زبانیں۔ ملک کی شاعری اور قومی جذبات اور حالاتِ تجارت و صنعت و حرفت وغیرہ سے بخوبی واقف ہونا

بہت ضروری ہے۔ بلکہ اگر یہ حسن مالح عوام سے کچھ زیادہ نہ ہوگا تو اردو میں کوئی اوریجنل ناول لکھنے میں جگہ جگہ پر ٹھوکریں کھانی پڑینگی۔ اور اپنے قلم کو بار بار روک دینا پڑیگا۔ لہذا ناول نویسی کے ساتھ اپنے حسن مالح میں بذریعہ مکالمہ اضافہ کرتے رہنا از حد ضروری ہے۔ اس کے لئے بعض انگریز ناولسٹ تو اپنی جیب میں ایک نوٹ بک لئے لئے پھرا کرتے ہیں۔ یہی عادت ہمارے ملکی ناولسٹوں میں بھی ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ ترجمہ کرنے کے بجائے زیادہ تر اپنے ملک ہی کی کہاوتیں اپنے ناول میں درج کر سکیں۔

۶۔ اصول انشاپردازی ایک سنائی ناول نویس کو جو اردو میں ناول لکھنا چاہیے۔ اوّل اردو انشاپردازی کے جملہ اصولوں سے کماحقہٗ وقوف حاصل کرنا چاہیئے جس کے لئے وہ اردو قواعد کے حصۂ نحو کو بار بار غور کر کر پڑھے۔ اور فصاحت بلاغت کے رسالوں کو بھی ضرور ایک نظر دیکھ لے پھر جو اردو تصانیف مضمون نویسی میں اس کو کچھ مدد دے سکیں ان کو ایک ایک کرکے پڑھے۔ مثلاً سرسید کے لٹریری مضامین۔ مولانا حالی کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں۔ شبلی کی تاریخی تالیفات۔ آزاد کی تصنیفات۔ مولوی نذیر احمد خاں کے ناول و لیکچر اور غالب کی اردوئے معلّے وعود ہندی وغیرہ۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ اردو انشاپردازی کیا چیز ہے۔ اور اس کے حسن و قبح میں کیونکر فرق کیا جا سکتا ہے تو پھر ناول نگاری کا دعویٰ کرنا چاہیئے ؎

۷۔ مقدار تالیف و تصنیف۔ عام طور پر ہندی ناولسٹ کسی ناول کو صرف چند یوم ہی میں لکھ کر اُس سے فارغ ہونے کا تہیہ کر لیا کرتے ہیں۔ حالانکہ لٹریچر کا یہ شعبہ بہت ہی صبر طلب اور مشکل ہے اور ایک عمدہ ناول مہینوں میں کیا برسوں میں بھی پوری طرح نہیں لکھا جاتا۔ لہذا میری یہ آخری گزارش ہے کہ ایک اردو ناول نویس کو روزانہ بہت کم لکھنا چاہیئے اور اپنے اس لکھے کو بار بار نظر ثانی کرکے برس چھ مہینے میں صرف ایک ہی افسانہ مرتب کرنا چاہیئے۔ جو کہ اوریجنل ہو۔ اور اگرچہ کلیہ صحیح نہ ہو (کیونکہ کسی افسانہ کا بیسی ہونا اکثر اس کی دلچسپی کو بڑھا دیا کرتا ہے) یہ لازمی ہے کہ وہ حقیقت نما ہو اور بقول حالی۔ ایک ناولسٹ کا بھی یہی مقولہ ہونا چاہیئے کہ ؎

کچھ کذب و افترا ہے۔ کچھ کذب حق نما ہے ۔ ہے یہ بضاعت اپنی اور یہ ہی دفتر اپنا

(اسیر جوش)



"مخمور کلیاں"

(۱)

سہانا وقت ہے، باد صبا اترا کے چلتی ہے ؛ سیاہی شب کی رخصت ہو رہی ہے صبح خنداں سے
ہنس رہیں سبزۂ گلشن پہ ہر گہر قطرۂ شبنم ؛ گرے ہیں ٹوٹ کر انمول موتی گل کے داماں سے

(۲)

ہوا چلتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی، تارے جھلملاتے ہیں ؛ چلی آتی ہیں کرنیں ناچتی مہر درخشاں کی
کھلے ہیں پھول، بھونرے ناچتے ہیں، سنتے ہیں کوئل ؛ حکومت چل رہی ہے صحن گل پہ صبح خنداں کی

(۳)

مگر ایسے بھلے بھولے ہوئے گلشن میں آ کر کل ؛ جھکی ہیں گردنیں کیوں آج ان رنجور کلیوں کی
نسیم صبح نے چھیڑا ہے شاید خواب میں ان کو ؛ نہیں کھلتی ہیں آنکھیں آج کیوں مخمور کلیوں کی

(۴)

یہی ننھی کلیاں پھوٹ کر روتی ہیں کیا باعث ؛ خزاں کا خوف ہے یا اور کوئی غم ستاتا ہے
خیال فرقت گلشن میں یہ آنسو بہاتی ہیں ؛ اسی غم سے کلیجہ ان کا منہ تک آتا ہے

(۵)

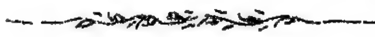
میں اس معصومیت کے سوگ کے قرباں ذرا ٹھہرو ؛ شکستہ دل ہوں میں بھی ساتھ غم میری وہ آئی ہے!
تمہارے ساتھ میں بھی چھوڑتا ہوں اب وطن اپنا ؛ عجب یا رفتہ کی! مجھے، کہو ملاتی ہے!!

شاہ افضال الرحمان بی۔ اے۔

قسمت کے کھیل

بچارے حشمت علی درزی نے کوچہ مائی سیواں امرتسر میں ایک چھوٹا سا تنگ و تاریک مکان ساڑھے روپے ماہوار کرایہ پر لے رکھا تھا اس مکان کے ارد گرد تین طرف تو اونچے اونچے مینار نما چھ چھ منزلہ مکان پہاڑ کی طرح کھڑے تھے صرف شمال کی جانب کا مکان دو منزلہ تھا جہاں سے اس یک منزلہ مکان کے اندر روشنی تو نہیں البتہ شعاعوں کا عکس ضرور پڑتا تھا۔ مکان میں ایک دالان تھا اور اس کی بغل میں ایک ایک چھوٹی کوٹھڑی۔ مشرقی کوٹھڑی میں صرف ایک ہی دروازہ دالان میں کھلتا تھا اس لئے اس میں غایت درجہ کی تاریکی تھی جہاں کہ روشنی کے پرتو کا عکس بھی نہ پڑتا تھا اس کو حشمت علی بطور مال گودام کے استعمال کرتا تھا ہر ایک پرانی اور گلی سڑی چیز اس میں پھینک دیا۔ لکڑیاں اور اُپلے بھی اسی میں رکھے جاتے۔ حشمت کو اس مکان میں رہتے گیارہ سال گزر گئے لیکن اس نے اس عرصہ میں ایک دفعہ بھی تو اس میں جھاڑو نہ دلوایا اسی وجہ سے ظالم چوہوں نے اس کو اپنی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ چوہے ایسے موٹے تازے ہو گئے تھے۔ کہ شاید ہی ایک ایک کا وزن آدھ آدھ سیر سے کم نہ ہوگا۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اس کوٹھڑی کے ساتھ ایک ساہوکار کے مکان کی کوٹھڑی لگی تھی جس میں اُس نے اناج بھر رکھا تھا۔ ان موذیوں نے اس میں نقب لگا رکھی تھی۔ اپنی کوٹھڑی میں اناج گھسیٹ لیتے اور گلچھرے اُڑاتے تھے۔

مغربی کوٹھڑی کو حشمت دوکان کے طور پر استعمال کرتا تھا جس میں گاہکوں کے مخمل کمخواب اور ریشمی کپڑے بکھرے پڑے رہتے تھے یہاں سے چوہے کپڑوں کے کٹے ہوئے ٹکڑے اُٹھاتے اور اپنے بلوں میں جا کر بچھاتے اور خوب گرم ہو کر اور سے لگا کر آرام کیا کرتے لیکن اکثر اوقات ظالم اس کے سے سلے سلائے کپڑے اسی کھیل کود اور دوڑ دھوپ میں برباد کر دیتے۔



ایک دفعہ ان چوہوں نے بچارے کا نہایت محنت سے تیار کیا ہوا ریشم کا کوٹ جو کہ ایک امیر نے اس کو سینے کے لئے دیا تھا چھلنی کر دیا۔ حشمت نے جب دیکھا تو سر پیٹ لیا بہت پچھتایا۔ غریب سارا دن کام کر کے بمشکل روٹی کا منہ دیکھتا تھا۔ شہر امرتسر میں رہائش۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں اور میاں بیوی کل

۹ آنے ملنے والے۔ ان بیچاروں کا گذارہ ہی مشکل سے چلتا تھا اور سر پر ۵ ماہ کا کرایہ بھی چڑھ گیا تھا۔ اب وہ بے اس خسارے کی تلافی کس طرح کرتا۔ بیوی کے پاس صرف وہ لونگ تھی جو کہ وہ اپنے جہیز میں لائی تھی۔ ایک چھلا اور ایک کنٹھی۔ بیوی نے حامد کو کہا کہ اب رونے دھونے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ تم جا کر یہ کنٹھی بیچ لو اور اس کو رہن نہ کراؤ۔ حامد کے دل کو ڈھارس بندھی۔ کنٹھی لے جا کر پچاس روپے کو فروخت کی۔ دو گرے کوٹ رفو کرایا جس پر دو اس نے لئے۔ واپسی پر جب اپنے گھر کی طرف آرہا تھا کہ راستہ میں لاٹری کے متعلق بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے دیکھے۔ وہ دوڑا دوڑا گھر آیا اور بیوی سے لاٹری کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ تم کمانے کو بس بہت ہیں اور تو لاٹری کا خیال لئے پھرتا ہے۔ حامد نے کہا کہ قسمت آزمائی کرنے میں کیا حرج ہے؟ بیوی نے جواب دیا کہ ہماری قسمت میں تو سکھ لکھا ہی نہیں۔ کیوں مفت میں روپے ضائع کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اوّل انعام تو پورے دو لاکھ کا ہے اور صرف دس روپے ٹکٹ ہے۔ اور صرف آج کا دن ٹکٹ خریدنے کا باقی ہے کیوں نہ قسمت آزمائی کریں۔ دو لاکھ کا نام سن کر بیوی کی رال ٹپکنے لگی اور بولی۔ اگر لاٹری تمہارے نام نکلے تو سب سے پہلے اس ظالم چوہدری کی خبر لینا اور کوئی اور مکان۔ مگر یار کنٹھی بھی مجھ کو کھو دیا۔ حامد نے کہا اری کمبخت دو لاکھ روپے اگر مجھے مل جاویں تو پھر ہم مکان کرایہ پر ہی لیتے پھریں گے۔ ہم اپنے لئے ایک عالیشان کوٹھی بنوائیں گے اور ایک ... کیا تجھ کو موتیوں اور سب جواہرات سے لاد دوں گا۔ بیوی ہنسنے لگی اور بولی کہ ابھی جا کر ٹکٹ لاؤ۔ حامد اسی وقت گیا اور ٹکٹ لے آیا۔ اور بحفاظت تمام کوٹ کی جیب میں جو کہ کھونٹی پر لٹک رہا تھا رکھ دیا ۔

حامد کو ہر وقت یہی خیال رہتا کہ اب ... ہاتھ آگئے ہیں اور سرکار ہی میں ہوگا۔ ایک عالیشان کوٹھی خریدوں گا۔ موٹر رکھوں گا۔ موٹر گاڑی خرید کر شام کو سیر کو نکلا کریں گے۔ بیش قیمتی کپڑے اب امیر ... رئیسوں کے بیٹے آتے ہیں ... ایسا ... کروں گا۔ ادھر اس کی بیوی دن رات لاٹری کے خواب دیکھا کرتی تھی ۔

ایک دن حامد نے قند سیاہ کا شیرہ بنا کر ... ڈالنے کو تیار کیا اور ایک کونے میں رکھ دیا تا کہ ٹھنڈا ہو جائے۔ ... کام کرنے لگا۔ اتنے میں ایک بڈھا سا چوہا آیا اور شیرہ چاٹنے لگا۔ حامد آگ بگولا ہو گیا۔ فوراً ڈنڈا لیکر اس پر جھپٹا اور زور سے رسید کیا۔ اگر وہ چوہے کو لگ جاتا تو بیچارا آدھ سیر کا چوہا دھجی دھجی ...

ہی نیم مانگر پھر سیڑھیوں کے کنارے پر لگی۔ جب سے اس نے قدموں سے جست کی اور کوٹ کی جیب میں جا گرا۔ وہاں سے چلا مگر ابھی لومہ ٹکٹ جو سرہ کی وجہ سے پہلو میں جھک گیا تھا وہاں میں تھا۔ جیب نے ایک اور ضرب لگائی ۱۰ بجے کی سیٹی بج گئی۔ یہاں بیوی نے خوب اڑائی ہوئی اور چوہا بھاگ کر کوٹھڑی میں علاگ لیا۔ جسکے دکڑے لوں۔ کہ اس سے گیدڑ رہا تھا ٹکٹ ایک الماری سے اٹک کر زمین پر گر گیا اور چوہا بل میں داخل ہو گیا ؛

جناب اگر کئی دو ماہ گزر گئے ری کا اشتیاق اور اضطراب حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا ہر لمحہ اسی کا خیال تھا۔ میاں بیوی دالان میں بیٹھے لاٹری کے متعلق ہی گفتگو کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگر لاٹری ہمارے نام نکلی تو ترج ہی مار آ جائے گا ورنہ سمجھو کہ ہمارے پچیس روپے اکارت گئے۔ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لپک کر دیکھا تو تار والا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ کیا تمہارا نام ہی جمن ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں میں ہی تو جمن ہوں۔ پھر پوچھا کہ کیا تم درزی کا کام کرتے۔ جواب دیا کہ درزی کا کام نہیں کرتا تو میں اور کیا کر رہا ہوں۔ تار والے نے تار اُس کے خوشی سے کانپتے ہوئے ہاتھ میں دے دیا۔ پڑھا تو ناچنے لگا اور چلانے لگا کہ "لاٹری نکل آئی۔ لاٹری نکل آئی"۔ بیوی بھی سن کر دوڑی آئی اور خاوند کے ساتھ ناچ میں شامل ہو گئی اور پیسے دلانے کہ کسی گاہک کا کوٹ تار والے کو انعام میں دے دیا ؛

تار میں لکھا تھا۔ تم کو مبارک ہو۔ اپنا ٹکٹ نمبری 16955 B صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دکھلا کر امپریل بنک سے دو لاکھ روپیہ دس دن کے اندر اندر وصول کر لو۔ ورنہ بعد گزرنے معیاد کے روپیہ بحق سرکار ضبط ہو جائیگا۔ جمن نے لپک کر جو کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ خالی تھی۔ دوسری جیب دیکھی تو وہ بھی صفاچٹ میدان۔ اندر کی جیب دیکھی وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ بیچارہ یہ شعر پڑھ کر

قسمت کو دیکھئے کہاں ٹوٹی جا کمند   دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

بیہوش ہو گیا۔ اور سر کے بال یکدم سفید ہو گئے۔ اس کی بیوی کا شور و بکا سن کر ہمسائے آ گئے۔ کسی نے بازو سہلائے کسی نے پانی کے چھینٹے دئے۔ آخر بڑی کوشش کے بعد کہیں جا کر بیچارے کو ہوش آیا۔ لوگوں نے بڑی تسلی دی اور کہا کہ گھبراؤ نہیں۔ تلاش کرو۔ ٹکٹ یہیں ہو گا ؛

نو دن گزر گئے صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ اس اثنا میں میاں بیوی نے ہر ایک جگہ کو

اُلٹ پلٹ کر دیکھا لیکن حسین غصّہ میں آ کر لوٹ دیں لیکن ٹکٹ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر تنگ ہو کے کہا کہ اچھا اگر قسمت میں دو لاکھ ہیں۔ تو ایک کوڑی بھی کم نہ ملیگا ٹکٹ مل ہی جائیگا لیکن عجب تو یہ ہے کہ سُسروں نے میعاد صرف دس یوم کی رکھی ہے اس کے اندر روپیہ کسی کا ہو گا ۔

مکان میں حشمت رہتا تھا اس کا کرایہ پانچ ماہ سے اُس نے مالک مکان کو ادا نہ کیا تھا۔ مالک مکان نے سوچا کہ میاں بیوی کو ٹکٹ کے گم ہونے کا سخت صدمہ ہے ایسا نہ ہو کہ وہ غم میں گُھل گُھل کر مر جاویں اور میرے پینتیس روپے مفت میں غتر بود ہوں۔ لگا تقاضا کرنے ایک دن تو اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مجھے کل روپے نہ ملے تو دعوی کر کے سب مال و اسباب قرق کرا لونگا۔ بیچارے کو مصیبت کا سامنا ہو رہا تھا۔ آخر بیوی کو کہا کہ اب اپنے سہاگ کی نشانی "نتھ" نکالو کہ اُس کو بیچ کر مکان والے سے جان بچاؤں ورنہ مجھے پکڑا جائیگا۔ بیوی پہلے تو جھجکی پھر سمجھ آئی۔ غریب درزی کے ہاتھ غم و غصّہ سے کانپ رہے تھے نتھ گر پڑی جب اُٹھانے لگا۔ ایک بڑا موٹا چوہا جو کہیں پاس بیٹھا ہوا تاک میں تھا اُسے کھانے کی کوئی چیز سمجھ اُٹھا کر کوٹھڑی کی طرف لے بھاگا۔ اور درزی اُس کے پیچھے اندھا دھند دوڑا۔ چوہا تو کوٹھڑی کے سمت دروازہ سے نکل گیا اور حشمت کو اندھیرے میں دہلیز کی ٹھوکر لگی۔ دھڑام سے کوٹھڑی کے اندر سٹ کے بل گرا۔ پرانی لکڑیوں کے ڈھیر سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ درزی کا ایک ہاتھ بھاگتے ہوئے چوہے کے سر پر پڑا اور نتھ مل گئی۔ چوہا بھاگ کر بل میں گھس گیا۔ پھر پیشانی پر جو درد کر رہی تھی اس حال سے کہ کہیں خون تو نہیں بہ رہا ہاتھ پھیر کر جو دیکھا لاٹری کا ٹکٹ خون میں بھرا ہوا ہاتھ میں تھا۔

اب سیٹھ حشمت علی صاحب ایک عالیشان زرخرید کوٹھی میں رہتے ہیں اور عظیم الشان الموینیم فیکٹری کے پروپرائیٹر ہیں ۔

نورالٰہی نور صدیقی لاہور۔

فریبِ نظر

آزادی سے یاں نہ پرسیاں نہ کرے مجھے کرتا ہے ساری عمر قفس میں بسر مجھے

روک آنسوؤں کو ضبط سے اے چشمِ تر مجھے | للہ بزمِ حسن میں رسوا نہ کر مجھے
جلووں میں گم ہوا ہوں یہ ہے خبر مجھے | اب کس طرح سے ڈھونڈھے گی میری نظر مجھے
دل کو نگاہِ حسن بنانا ستم ہوا | برباد کر رہی ہے جو اپنی نظر مجھے
آئے ستم دریدہ کی تصویر کھینچ لے | شاید نہ بیٹھنے دیں سرِ رہ گزر مجھے
کوئی حجاب رخ سے جلوہ نما ہوا | یا دھوکے دے رہی ہے یہ میری نظر مجھے
وابستہ قدرِ حسن ہے عاشق کی ذات سے | دیکھ اے جمالِ دوست نہ برباد کر مجھے
وہ سامنے ہیں تاکہ خیالات کی کسک | اب تو نہ دے فریب، فریبِ نظر مجھے
اب کیا سناؤں کلفتِ دنیا کے واقعات | خود اپنے حال کی نہیں نانک خبر مجھے

نانک چند نانک لکھنوی

گوبند اور اُس کا چیلہ

دُور نیچے صاف اور سرسبز گھاٹی تھی اور اُوپر بڑھتا ہوا کنارہ پہاڑی چڑھائی لئے ہوئے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ پہاڑیاں جنگلوں کی وجہ سے کالی کالی اور لہروں سے داغدار تھیں اُسے گھیرے ہوئے تھیں۔

گوبند سکھوں کا گورو چٹان پر بیٹھ کر گرنتھ پڑھ رہا تھا کہ اُس کا چیلہ رگھوناتھ جسے اپنی دولت کا گھمنڈ تھا آیا اور جھک کر بولا "میں ایسا ناچیز تحفہ لایا ہوں جو اس قابل نہیں ہے کہ آپ اُسے قبول فرمائیں"۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک جوڑی کڑوں کی پیش کی جس پر قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے گورو نے ایک کڑا ہاتھ میں لے لیا اور انگلی پر گھمایا۔ تو اُس میں سے چمک دمک کے تیر برسنے لگے۔

یکایک کڑا گورو کے ہاتھ سے پھسل کر کنارے سے لڑھکتا ہوا پانی میں گر گیا رگھوناتھ نے چیخ کر کہا۔ "افسوس!" اور وہ بھی دریا میں اُس کے پیچھے کود پڑا گورو کی آنکھیں گرنتھ میں غرق تھیں اور دریا اس کڑے کو لے کر لہروں سے اوجھل ہو گیا۔

سورج موسم وقت کو تھا کہ رگھوناتھ واپس آیا اُس کا سانس پھولا ہوا اور اس کا لباس تر تھا تھکا ہوا تھا اس کی آواز نکلی اور بولا "اگر آپ مجھے بتا دیں کہ کڑا کہاں گرا ہے تو میں اسے ڈھونڈ لاؤں"
گورو نے دوسرا کڑا اُٹھا کر پانی میں پھینک دیا اور کہا "وہاں گرا تھا"۔

۱ — تم کیا موم نہیں دیکھتے۔ جو تم دیکھتے ہو وہ تمہارا سایہ ہے۔

۲ — پرندے کی خواہش ہے کہ وہ بادل ہو۔ بادل چاہتا ہے کہ وہ پرندہ ہو۔

۳ — غروب ہوتے ہوئے سورج نے کہا کہ کون ہے جو میرا کام سنبھالے؟ مٹی کا دیا بولا "میرے آقا جو کچھ مجھ سے ہو سکا کروں گا"۔

(ٹیگور) ہردلوی

نپولین کا وعدہ

سو سال سے زیادہ عرصہ گذرا کہ ایک لڑکا جس کا نام نپولین بونا پارٹ تھا۔ فرانس کے فوجی مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا۔ بچے عموماً پھلوں کے بہت شائق ہوتے ہیں نپولین بھی ایک غریب عورت سے جو قصبہ میں پھل بیچا کرتی تھی میوے خرید لیا کرتا تھا۔ نپولین کبھی کبھی ادھار پھل لیا کرتا اور جب روپے ہاتھ میں آتے تھے تو فوراً قیمت ادا کر دیا کرتا تھا۔

ابھی اس عورت کا قرضہ کچھ باقی تھا کہ نپولین کا فرانس سے روانگی کا وقت آگیا۔ وقت رخصت وہ عورت کے پاس گیا اور کہا میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں لیکن میں تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔ عورت کو اس پر اعتبار تھا بولی کہ کچھ مضائقہ نہیں۔ آپ پروا نہ کریں۔

کئی سال گذر گئے۔ اب نپولین فرانس کا شہنشاہ تھا۔ وہ بھیس بدل کر فرانس گیا اور بازاروں میں گشت لگا رہا تھا کہ اُسے میوہ فروش عورت اور اپنا وعدہ یاد آیا۔ وہ فوراً ایک خادم کے ہمراہ اس عورت کے مکان پر پہنچا وہ ایک غریبانہ مگر صاف ستھرے مکان میں رہتی تھی۔ عورت اب بڑھیا تھی اُس نے نپولین کو نہ پہچانا۔ شہنشاہ نے اُس سے چند میوے خریدے۔ پھر پوچھا کہ تمہیں یاد ہے یہاں ایک لڑکا نپولین بونا پارٹ آیا کرتا تھا جو تم سے پھل لیا کرتا تھا۔ بڑھیا نے کہا ہاں یاد ہے۔ نپولین نے پھر کہا کہ وہ ایماندار گاہک تھا اگر ادھار لیتا تھا تو پھر قیمت ادا کرتا تھا۔ بڑھیا نے کہا کہ ہاں برابر قیمت دیدیا کرتا تھا۔ نپولین نے کہا کہ نہیں یا تو تمہیں یاد نہیں رہا یا تم اُس کی رعایت کر رہی ہو۔ اُس نے ابھی تک کچھ پیسے تمہارے دینے ہیں۔ غور سے دیکھو وہ تمہارا مقروض میں ہوں۔ بڑھیا نے شہنشاہ کو پہچان لیا اور اپنا سر اُس کے قدموں پر رکھ دیا۔ نپولین نے اُس کا سر اُٹھایا اور کہا کہ میں آج اپنا وعدہ ایفا کرتا ہوں۔ یہ کہکر اُس نے عورت کو بہت سا روپیہ دیدیا۔ اُس کے لیے ایک پختہ مکان بنوایا اور مکان کا نام نپولین رکھا۔ پھر اس بڑھیا کی بیٹی کی شادی خوب دھوم دھام سے اچھی جگہ کر دی۔ اُس کے بیٹے کو ایک مدرسہ میں جہاں وہ

جو تعلیم پایا تھا سیکھا اور اُسے تعلیم دلائی ۔

بولس میں عیب بھی تھے مگر وہ ہمت وعدے کا پکا تھا ۔

(ترجمہ) (زہرہ)

دستانوں کے دو جوڑے

۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی میں سخت جنگ ہوئی۔ جو لعنت اور رنج فرانس کی طرف سے جرمنی کی آنکھ تھی۔ جرمنی کی فوج بڑی طاقت ور تھی اور وہاں مدت سے اندر ہی اندر تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فرانس کو جنگ کا شان و گمان تک نہ تھا۔ اہل فرانس بالکل بے خبر تھے کہ جرمن ٹڈی دل سا لشکر لیکر ان پر چڑھ آئے۔ اور فرانس کے دار السلطنت پیرس کا محاصرہ کر لیا۔

۲۷ نومبر ۱۸۷۰ء کو پیرس میں کہرے نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ تمام شہر میں ماتم ہو رہا تھا۔ بھوک اور جاڑا ہر گھر پر نازل تھے۔ توپوں کی گرج سے کانوں کے پردے پھٹے پڑتے تھے۔ بڑے بڑے ٹکڑے برف کے آسمان سے گر رہے تھے اور راہ رو جائے پناہ کی تلاش میں دوڑ رہے تھے۔ اسوقت ایک شخص فوجی لبادہ اوڑھے آہستہ آہستہ خیالات میں غرق جا رہا تھا یہ ایک فوجی افسر تھا جو گرینڈ ہوٹل کی طرف کہ جہاں اس کا ایک جرمن دوست نازک حالت میں تھا جا رہا تھا۔

اس افسر کا گذر ایک گلی میں ہوا اور اُس نے دیکھا کہ ایک بڑھیا جس کا لباس صاف ستھرا ہے راہ پر پرانی دری بچھائے بیٹھی ہے۔ بڑھیا نے اپنی ٹوکری سے دستانے نکالے اور دری پر رکھ دیئے اور آگ سینکنے لگی جو اس کے قریب ایک انگیٹھی میں رکھی تھی دستانے کھادی کے تھے اور کچھ چمڑے اور سمور کے۔

اسوقت دو نو عمر فرانسیسی سپاہی جن میں سے ایک کا نام لوئیس اور دوسرے کا پیئر تھا وہاں سے گذرے اور ٹھہر کر نگاہ حسرت سے دستانوں کو دیکھنے لگے۔ دونوں کی عمر بیس سال سے کم تھی انہوں نے پہلے کبھی ایسے دستانے نہ دیکھے تھے اور اس وقت سردی سے بے حال ہو رہے تھے۔ آنکھوں سے پانی جاری تھا ہونٹ کانپ رہے تھے اور گال سرخ تھے۔ ان کا لباس ہلکا اس قسم کا تھا کہ اس سردی میں وہ گرم نہ رہ سکتے تھے۔ لوئیس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ اماں جان! اور ہم یہ دستانے خریدو۔

دیکھو تو یہی کیسے آرام دہ ہیں۔ ایک نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا کہ باقی ہمارے پاس دام نہیں ہیں۔ دوسرا بولا کہ ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔ سردی سے ہم شل ہوئے جاتے ہیں اور چوکی پر نکس نہیں کہ آگ جلا سکیں۔ اس موقعہ پر وہ افسر جس کا ذکر اوپر آچکا ہے وہاں آپہنچا اور دونوں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا "میاں میں تمہارا جرنیل ہوں۔ تم دستانے پسند کر کے لے لو بائی اچھے سے جوڑے دکھاؤ"۔

دونوں حیران ہو کر بولے کہ صاحب ہم سپاہی ہیں اور سپاہیوں کو جائز نہیں کہ ایسی چیز مول لیں کہ جس کی قیمت وہ ادا نہیں کر سکیں۔ افسر نے کہا کہ تو میں بھی سپاہی ہوں کوئی غیر نہیں ہوں۔ چونکہ میں تمہارا رئیس ہوں اس لئے تمہیں میرا کہنا ماننا پڑے گا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھا اور شرما کر دستانے لے لئے اور پہن لئے۔ ان میں جو عمر میں چھوٹا تھا بولا "صاحب خدا آپ کا بھلا کرے اور اس مروت کا عوض دے۔" ان خوبصورت نوجوانوں کے ہاتھوں میں دستانے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی بادشاہ کے بدن پر جواہر نگار زیور۔ دستانے لیکر وہ اپنی چوکی کی اور افسر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن ۲۸ نومبر کو سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ سپہ سالار میدان جنگ میں بنفس نفیس موجود اور اپنے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ لوئیس اور جیمس کی رجمنٹ بھی موجود تھی۔ میدان جنگ میں دونوں نے اس افسر کو دیکھا کہ جس نے انہیں دستانے لیکر دیئے تھے۔ لوئیس نے کہا "تو کرنل ہے"۔ جیمس نے جواب دیا کہ نہیں وردی نہیں دیکھتے۔ تو جرنل ہے۔ پھر دونوں نے مکرر ہو کر کہا کہ یہ شخص نیک نہاد ہے اس لئے جرنیل سے بھی بالاتر ہے۔ جو لوگ اس وقت وہاں تھے انہیں وہ خونخوار دن تمام عمر یاد رہا۔ [illegible] میں ہزاروں زخمی شل ہو کر ہلاک ہوئے۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو لوئیس اور جیمس نے اس افسر کی تلاش کی مگر وہ انہیں نظر نہ آیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ جس وقت توپ کا گولہ گر کر پھٹا تو ایک گولی جرنل صاحب کو لگی اور وہ میدان جنگ میں مرے پڑے ہیں۔ دن [illegible]۔ رات کو جو بہت تاریک تھی دونوں نوجوان لالٹین لیکر میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ کپتان نے انہیں منع کیا اور کہا کہ کیوں موت کے منہ میں جاتے ہو۔ واقعی اس وقت دشمن کے کیمپ سے گولیاں برس رہی تھیں اور برف گر رہی تھی لیکن انہوں نے نہ مانا اور کہا کہ ہم جرنل صاحب کی لاش لانے جاتے ہیں۔ دو گھنٹے کی تکلیف دہ تلاش کے بعد انہیں جرنل کی لاش مل گئی لیکن دوران تلاش میں لوئیس کے پاؤں پر گولی لگی۔ بڑی سخت برف گر رہی تھی [illegible] مصیبت کا سامنا تھا۔ لوئیس نے رومال سے زخم باندھ لیا اور دونوں نے جرنیل کی لاش مقام [illegible] پر

لے گئے۔ وہاں زخمی ڈاکٹروں نے نعش کا معائنہ کیا لوئس میں جان باقی تھی مگر گھنٹے گھنٹے اس کی حالت ہو رہا
آخر صبح کاذب کے وقت ریل نے آنکھ کھولی اور سامنے اور متحیر نگاہ سے آس پاس دیکھا اُس وقت اُنہیں
دستانوں سے جو مجروح اسے لوئس اور جین کو جو کہ گردن سے اس کے پست اور معلوم دل پر پالس ہو رہی
تھی۔ اُس نے دستانے پہچان لیے اور لگا دیا۔ اس حادثہ کے سلسلہ میں جین اور لوئس کو گھنٹوں اور حطاب دیے
گئے۔ اس واقعہ کے بیس سال بعد لوئس اور جین اپنے گھروں کو واپس آئے تو جرمنی سے رخصت ہو کر لوئس نے ربعد
ساڑھے نے کارخانہ کھولا۔ دونوں کے پاس وہ دستانے اب تک موجود تھے۔ لوئس جب جین کو ملتا تو مسکرا کر کہا
کرتا تھا کہ بھائی تمہارے دستانے پالس کے وقت کچھ دریدہ ہو گئے تھے اور مجھے اس بات کا رشک ہے کہ
کیوں میرے دستانے اس کام نہ آئے لیکن اتنی تسلی ہے کہ تمہارے دستانے کو میری ٹانگ سے رہی ہوئی۔ ریل
صاحب دوبارہ زندہ ہو کر بہت تک جیتے اور جب تک زندہ رہے ہر صبح و شام ان کے الفاظ صاحب
نے آپ کا کھایا ہے اور اس مروت کا عوض ہے ان کے کانوں میں گونجا کئے۔ (رسول)

جہاں پناہ کا خط

احمد علی نے پرندوں کی طرح ایک غریب سا جھونپڑی میں رہتا تھا۔ یہ جھونپڑی سرخ مٹی کی تھی اور اس کی
چھت چٹائی کی۔ احمد علی کی کچھ زمین بھی اور جھونپڑی میں اور اس پر گذارہ تھا اور وہ عالم شباب ہی میں فوج میں
ملازم ہوا اس سال سرکار کی خدمت کی ۱۸۵۷ء کے غدر میں نمایاں کام کیا اور تمغا اور انعام پایا۔ اب اس
کی عمر اسی سال کی تھی اور اسے چھوٹے سے گاؤں میں عزت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ گاؤں کے نوجوان اپنے
اس کی سرگذشت سنتے اور خوش ہوتے تھے۔ سرگذشت کا خاتمہ ہمیشہ ان الفاظ پر ہوتا تھا۔ "یہ تمغہ جرنیل صاحب نے
اپنے ہاتھ سے میرے سینے پر لگایا تھا"۔ غرض گاؤں والوں کو احمد علی پر فخر اور ناز تھا۔

احمد علی کا چھوٹا سا گاؤں جنوبی ہندوستان کے ایک ضلع میں واقع تھا جہاں سردی دنیا کی سرگرمیاں
بہت کم آتی تھیں۔ البتہ دو بار صاحب ضلع دورہ کرتے ہوئے گذر گئے تھے اور یہ موقعہ اس
گاؤں کا میلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس گاؤں میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو انگریزوں کو یہاں لانے کی کشش رکھتی۔

کے پاس سے ایک مشہور مندر کو راستہ جاتا تھا کبھی کبھی سُرخ چشم جٹا دھاری اور لنگوٹی پوش سادھو یہاں آ جاتے اور گاؤں والوں کو ڈرا دھمکا کر اُن سے چاول اور دال پیسے اینٹھ لے جاتے تھے جب ملکہ وکٹوریہ نے رحلت کی اور ان کی وفات کی خبر احمد علی نے سُنی تو وہ بہت رویا اور رو رو کر کہنے لگا میں نے ملکہ کا نمک کھایا ہے ان کی تصویر میرے تمغہ پر ہے۔ میں ان کا سپاہی رہا ہوں اور اُن کے دشمنوں سے لڑا ہوں آہ اب میں کیا کروں وہ پُرانے زمانہ کا صاف دل نمک حلال انسان تھا اُس نے سچے دل سے ملکہ کا ماتم کیا اور کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ضلع ان ایام میں وہاں آ گئے۔ وہ غدر کی خدمات کی وجہ سے احمد علی کی بہت عزت کرتے تھے جب اُنہوں نے سُنا کہ اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے تو خود اُس کے مکان پر گئے اور سمجھایا اور کہا۔ دیکھو احمد علی ملکہ معظمہ مر گیا (مر گئی) لیکن اُس کا فرزند اب ہمارا (ہمارا) بادشاہ ہے تم (تم) اس کی اطاعت (اطاعت) اختیار (اختیار) کرو۔ وہ اب قیصر ہند (ہند) ہے۔ اور ہمارا تمہارا (ہمارا) بادشاہ ہے جی۔ بڑے حاکم صاحب کے سمجھانے سے احمد علی کی تسلّی ہوئی اُس نے کھانا کھایا اور پانی پیا اور ملکہ کی تصویر صاحب سے لے کر اپنے گھر میں لٹکا لی۔

ایک دن ڈاکیا احمد علی کے مکان پر نیلا لفافہ جس پر لکھا تھا "بکار سرکار" لیکر آیا۔ یہ خبر آگ کی طرح تمام گاؤں میں پھیل گئی کہ جہاں پناہ شاہ انگلستان نے احمد علی کو خط لکھا ہے۔ پھر کیا تھا اُس کے دروازہ پر میلہ لگ گیا۔ سرگوشیاں ہونے لگیں سوالات ہونے لگے تمام گاؤں کا ناک میں دم آ گیا۔ احمد علی [illegible] میں کوئی انگریزی پڑھا ہوا تھا آخر فیصلہ یہ ہوا کہ [illegible]

[illegible]

کسی نے بھی رو کر کہا کہ ابا جان دہلی، جاؤ وہ بہت دور ہے۔ تم بوڑھے اور کمزور ہو۔ راہ میں تم کو بہت تکلیف ہوگی
احمد علی نے مسکرا کر جواب دیا کہ لڑکی مجھے کیا خبر ہے کچھ تکلیف نہ ہوگی۔ خط میں لکھا ہے کہ کرایہ۔ کھانا۔ لباس
سب کچھ سرکار سے ملیگا جہاں پناہ نے جو بلایا ہے میں کیسے نہ جاؤں۔ آخر احمد علی کی روانگی کا دن آگیا گاؤں
کے لوگ جمع تھے۔ سب اس کی طرف نگاہِ رشک اور حسد سے دیکھ رہے تھے۔ عورتیں چشم پُرآب تھیں اور
اُس کی بیٹی کا دل جاتا رہا۔ ہوگیا تھا ڈولے ڈولے اس کی ہچکی بندھ گئی اور اس کے منہ سے بے ساختہ یہ کلمہ نکلا
"ابا کا آخری دیدار ہے!"

خود احمد علی کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔
اور طبیعت ختم ہو رہی تھی لیکن تعمیل حکم کا شوق اُسے کشاں کشاں لیجا رہا تھا اور وہ بار بار کہے جاتا تھا کہ
جہاں پناہ نے مجھے بلایا ہے۔ میرا جانا میرا فرض ہے۔

دہلی میں سخت کی سردی پڑ رہی تھی سرد ہوا چھری کی طرح جسم کو کاٹتی تھی اور گرد و غبار سے دم بند
ہو رہا تھا۔ لمبا سفر تھا۔ بڑی عمر اور ضعف و نقاہت سے احمد علی کو بہت تکلیف ہوئی وہ اس قدر دُبلا
ہوگیا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ سبب یہ ہوا کہ اسٹیشن پلیٹ فارم پر اُسے گاڑی کے انتظار میں رات بھر بیٹھنا پڑا جس سے زکام
ہوگیا اور زکام کے ساتھ سخت کھانسی۔ دہلی میں پہنچ کر جب وہ اُن منتظم کے روبرو جس کے متعلق بہادرانِ غدر
کی رہائش اور دعوت کا اہتمام تھا پیش ہوا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ افسر موصوف نے اُسے کہا کہ
جناب کو ہسپتال میں داخل ہو جانا چاہیے لیکن احمد علی نے کہا کہ نہیں نہیں اب میں اچھا ہوں کچھ ضرورت نہیں
ہے۔ کہنے کو تو اُس نے کہہ دیا کہ میں اچھا ہوں مگر اسکی حالت نہایت ابتر تھی بڑی مشکل سے وہ دربار کے
میدان کی طرف جانے کو گاڑی میں بیٹھا۔ دربار کے دن مطلع صاف تھا۔ آفتاب چمک رہا تھا۔ باجے بج
رہے تھے۔ فوجیں طرح طرح کی وردیوں میں صف باندھے کھڑی تھیں اس نظارے سے اُسے کسی قدر
فرحت ہوئی اور وہ ایک بار پھر اُسی طرح اکڑ کر چلنے لگا کہ جس طرح خط آنے پر چلا تھا۔ احمد علی نے دیکھا کہ
سب بوڑھے اور خم کمر بہادرانِ غدر کو جو اس نے دیکھا تو ۱۸۵۷ء کا زمانہ یاد کر کے آنسو بہانے اور بعضوں نے
ان کی طرف رومال ہلائے گئے اور لوگوں نے دعا دی جس میں الفاظ آمین پھر اُس نے وردیوں کی چمک
دمک دیکھی بینڈ سے فرمایا اور بستر لیں اور انگریزی باجوں کا شور سنا۔ وہ بہت آگے بڑھا لیکن تعمیل حکم یاد تھا
وہ اس طرح ذوق کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا۔ یکایک اس کا سر چکرانے لگا۔ اُس کے پاؤں سو گئے

اور جب اُس کے ہمراہی شہر سے لوٹ کر آ رہا تھا ایک بیچ پر جا رہا تھا۔ ایک نوجوان جو وہاں کھڑا تھا بولا کہ بیچارہ بےہوش ہو گیا لیکن احمد علی کی بےہوشی دوامی تھی اُس کا مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکا تھا ✦

مرسلہ

نمکدانِ ظرافت

۱۔ ساہوکار۔ تم ہزار روپیہ قرض مانگتے ہو کس ضمانت پر؟

سائل۔ (سینے پر ہاتھ مار کر) میری ذات ضامن ہے۔

ساہوکار (صندوق کھول کر) بہت خوب آپ اس صندوق میں بیٹھ جائیں میں کفالت نامہ اسی میں رکھتا ہوں ✦

۲۔ راحت۔ بہن نزہت آپا اگر کوئی زیور پہنا نہیں کرتیں تو کم از کم کانوں میں بالیاں تو ضرور پہنا کریں

نزہت۔ آپا میں ہمیشہ سے آزادی پسند ہوں۔ اس لئے حلقہ بگوش ہونا نہیں چاہتی ✦

۳۔ ماں۔ بیٹا دیکھو۔ لڑکا جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے یتیم ہے اس کا نہ باپ ہے نہ ماں نہ دادی نہ دادا۔ اس کو کچھ دینا چاہئے

چھوٹا لڑکا۔ تو اماں۔ ابا ہیں بہت بُرے ہیں وہ ہمیں بھی جھڑکتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے کسی کام کے نہیں۔ اُسے ابا دے دو ✦

۴۔ صفدر۔ بیٹی زہرہ۔ کونسی کتاب پڑھ رہی ہو؟

زہرہ۔ چچا جان "نکومت"۔

صفدر۔ (تیش میں آ کر) اسکول کی تعلیم سے تم بہت ہی بگڑ گئی ہو کہ بزرگوں کے ساتھ ایسی بد زبانی سے پیش آتی ہو۔

زہرہ (کتاب کا سرورق دکھا کر) چچا جان غلطی معاف۔ کتاب کا نام ہی "نکومت" ہے ✦

۵۔ بیوی۔ بات کیا ہے کہ جب میں گاتی ہوں۔ تو تم کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑے ہو جاتے ہو۔

خاوند۔ تاکہ ہمسائے جان جائیں کہ میں تمہیں زدوکوب نہیں کر رہا

۶۔ ذکیہ۔ بہن سنا ہے تم بھی کہ بھائی جان امتحان میں کامیاب ہوئے تو بجلی کے تار سے سندیسہ بھیجو گی۔

صفیہ۔ بہن وہ کس لئے لوگ تو ترقی کے واسطے سر ڈالنے کی سعی کرتے ہیں اور ہم لے ملے بھیجیں آپ ... ؟

ذکیہ۔ جی ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر ان دنوں ہر جگہ بجلی لگی ہوئی ہے تو کیوں نہ ... کی بجائے بجلی سے بھیجی جائے؟

۷۔ طالب علم۔ آج مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ مجھے اچھا نہیں ...

عینک فروش۔ کیا غلطی ہے کسی اور کو دے دیا ...

طالب علم۔ نہیں جی کالی مرچ کو سر سمجھ کر ہاتھ میں لے لیا

۸۔ بیوی۔ ماما جی! چینی کے برتنوں کا سیٹ تو سنبھال لیا ہے نا؟
ماما۔ ہاں بیوی سنبھال لیا۔
بیوی۔ بھلا ٹوکری میں کتنے عدد تھے؟
ماما۔ گنے تو نہیں مگر ہوں گے کوئی دس ٹکڑے۔
بیوی۔ ارے کیا چکنا چور کر دیئے؟
ماما۔ نہیں صرف سالن دان اور چائے دانی ٹوٹی ہے۔

زبیدہ سلطانہ (اسسٹنٹ ایڈیٹر)

جذبات ٹیگور

تمہاری محبت آنکھوں سے ٹپکتی ہے۔ وہ میری حقیقت سے ماہر ہونے کیلئے بیقرار ہیں۔
جس طرح چاند سمندر کی گہرائی کا اندازہ لگاتا ہے۔

میں نے اپنی ساری زندگی بلا تامل تمہارے سامنے رکھ دی ہے اور کوئی راز نہیں چھپایا۔ یہی وجہ ہے کہ تم مجھے نہیں سمجھتے ہو۔

اگر میرا دل ایک موتی ہوتا تو میں سینکڑوں ٹکڑے کر ڈالتا اور تمہارے گلے میں ڈالنے کے لئے ایک ہار پرو دیتا۔
یا اگر یہ ایک دلکش چھوٹا سا خوبصورت پھول ہوتا تو میں اسے تمہاری زلفوں میں پرونے کو ٹہنی سے توڑ لیتا۔
مگر پیاری! یہ دل ہے اس کا کنارہ اور تہ کہاں۔
تم اس ملک کی حدود سے بے خبر ہو۔ مگر پھر بھی اس کی ملکہ ہو۔

اگر یہ صرف خوشی کا ایک لمحہ ہوتا تو ایک ہلکی سی تبسم کی صورت میں عیاں ہو جاتا اور تم اسے دیکھ لیتیں اور لحظہ بھر میں اس کا مطالعہ کر ڈالتیں۔

اگر یہ درد ہی ہوتا تو صاف اور شفاف آنسوؤں میں پھوٹ کر نکلتا۔ اور بغیر کہے اندرونی سے اندرونی راز اس طرح ظاہر کر دیتا۔
لیکن پیاری! یہ محبت ہے۔
اس کے رنج و راحت بے شمار ہیں اس کی ضروریات و دولت بھی لاانتہا ہے۔ یہ تمہارے اتنا ہی نزدیک ہے جتنی تمہاری زندگی۔ پھر بھی تم اسے ہرگز ہرگز مکمل طور پر جان نہیں سکتیں۔

اُن میں اور مجھ میں کوئی بھید نہیں

کوئی تُلسی داس۔ خیالات کے سمندر میں محو۔ گنگا کے کنارے اُن مسان جگہ گھوم رہے ہیں۔ جہاں مُردے جلائے جاتے ہیں۔

اُنہوں نے دیکھا کہ ایک نئی نویلی دُلہن اپنی خوبصورت پوشاک پہنے اپنے پتی کی لاش کے چرنوں میں بیٹھی ہے۔

جونہی اُس عورت نے اُنہیں دیکھا۔ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پرنام ادا کیا اور کہنے لگی "مہاراج مجھے آشیرباد کے ساتھ آگیا دیجئے کہ میں اپنے پتی کے پاس سورگ دھام کو چلی جاؤں"۔

سوامی جی نے کہا "بیٹی اتنی جلدی کیوں؟ کیا پرھو گی اُسی آنکھ پر جاتی ہو جسے سورگ بنایا"۔

"مجھے سورگ کی کوئی اِچھا نہیں۔ اپنے پتی کی آرزو ہے"۔

پنڈت جی مسکرائے اور بولے "بیٹی جا گھر چلی جا۔ اس ماہ کے اختتام سے پیشتر تو اپنے پتی کو پالیگی"۔

وہ عورت خوشی خوشی گھر آگئی۔ تلسی داس جی بعد آئے اور اپنے حالات کا اندازہ کر جاتے۔ آج اس کا دل پرماتما کی محبت سے لبریز ہوگیا۔

ابھی مہینہ ختم ہونے بھی نہ پایا تھا کہ اُس کے ہمسائے اُس کے پاس آئے اور پوچھنے لگے "کیوں مائی! پتی کو پالیا؟"

عورت نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ جواب دیا "ہاں پالیا"۔

وہ حیرت سے پوچھنے لگے "تو پھر کہاں ہیں؟"

"وہ میرے من میں براجمان ہیں اور اُن میں اور مجھ میں کوئی بھید نہیں"۔

دلوراج چوہدری ایم۔ اے۔ اسٹوڈنٹ

بیدرد شکاری

اسلم ایک معمولی اچھوت خاندان کا چراغ تھا۔ وہ خوبصورت تھا۔ جامہ زیب تھا مگر اس کے ظاہر جسم میں پتھر کا دل تھا۔ خدا کی شان اُس کی موت کا گلہ بھی جو ... کو احمد راد روداد کی بری تھی۔ وہ ہر چند کہ سنگدل اور بے رحم تھا مگر بیوی سے اُسے کمال محبت تھی وہ اُسے دیکھ کر جیتا تھا۔ آجکل کے امیرزادوں کی طرح

اسلم شکار کا شیدا تھا۔ اُس کے گھر میں کئی باز اور چرغے تھے اور اُس کے اصطبل میں چار پانچ گھوڑے اور بہت سے شکاری کُتّے۔ کہتے ہیں کہ ایک ایک کُتا اُس نے پانچ پانچ سو کو خریدا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ اسلم تن تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے شکار کے لئے نکلا اور جنگل میں بہت دُور نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ ایک جھیل کے کنارے پہنچا جہاں کئی مرغابیاں گردشِ روزگار سے بےخبر پانی میں نہا ہی رہی تھیں۔ اُسے دیکھ کر سب اُڑ گئیں صرف دو رہ گئیں۔ اسلم نے فوراً بندوق سر کی جو نر کے لگی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ بےرحم شکاری جب قریب گیا معلوم ہوا کہ اُس کی ٹانگ اور بازو ٹوٹ گئے ہیں۔ اسلم نے چھری نکالی اور اُسے ذبح کرنے لگا۔ ناگاہ اُسے کوں کوں کی آواز آئی۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو مادہ بڑے اضطراب میں اُس کے سر پر چکر لگا رہی تھی۔ بےچارہ نر بھی عالمِ یاس میں مادہ کی طرف دیکھ رہا اور جان دے رہا تھا۔ بےدرد اسلم نے مادہ کے اضطراب کی مطلق پرواہ نہ کی اور کاردِ تیز بےرحم بسمل نر کے گلے پر پھیر دی۔ یکایک مادہ بیتاب ہو کر لہو خون آلودہ بےجان نر کے پاس گری اور اپنی چونچ سے اُسے ٹٹولنے لگی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ بےجان ہے تو اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ظالم اسلم کا دل اب بھی نہ پسیجا۔ بندوق کی آواز ہوئی اور مادہ بھی نر کی طرح سرد ہو گئی۔

اسلم نے ان مظلوم جانوروں کو اُٹھا کر جھولی میں رکھا اور گھر کی طرف لوٹا۔ راہ میں آسمان کا چہرہ دیکھتے دیکھتے مکدّر ہو گیا۔ سیاہ بادل مغرب سے اُٹھا اور طرفۃ العین میں تمام جنگل پر چھا گیا اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج برس کر پھر نہ برسے گا۔ بےرحم نوجوان شکاری کے کپڑے شرابور ہو گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا مگر کہیں کوئی جائے پناہ دکھائی نہ دی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ بادل زور سے گرجا اور بجلی کڑک کر ایک درخت پر گری جس سے وہ [illegible] کی طرح جلنے لگا۔ یہ حال دیکھ کر اسلم کا گھوڑا بھڑکا اور پھر بےقابو ہو کر بےتحاشا بھاگا۔ اُس نے ہر چند روکا مگر اُسے تو پر لگ گئے تھے وہ کسی طرح نہ تھما۔ اس اثناء میں گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور اس طرح گرا کہ سوار نیچے تھا اور وہ اُوپر۔ پھر اُٹھ کر سرپٹ دوڑا اور اپنے سوار کو وہیں کیچڑ میں لت پت چھوڑ کر نظر سے غائب ہو گیا۔ اب بےدرد شکاری کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ چاہتا تھا کہ اُٹھے مگر کس طرح اُٹھتا اُس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے تھے اور ٹخنے میں اس قسم کی ضرب آئی تھی کہ پاؤں کا ہلانا محال تھا۔ اسلم نے ہر چند شور مچایا مگر اس جنگل بیابان میں کوئی اس کی فریاد کو نہ پہنچا۔ درد سے اُس کی حالت غیر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی تار دار اور تیز آری لے کر چیر رہا ہے [illegible] ہو گئی اور ابھی [illegible] جاری رہی چلاتے چلاتے اُس کا گلا بیٹھ گیا اور جب پہلا پہر ہوا تو اس پر بےہوشی طاری ہو گئی۔ اسی عالمِ غفلت میں اُسے ایک [illegible] ڈراؤنی سی روح دکھائی دی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ [illegible] اس کی [illegible]

بیوی ہاتھ پھیلائے اسکے قریب کھڑی ہی ہے۔ حالت دیکھ کر وہ بیہوش مطلق ہو گیا اور پھر تن سے سر و پا کی مطلق خبر نہ رہی۔

تین دن کے بعد جب اُسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا اُس کے یار دوست اور رشتہ داروں اور بچے پر بیٹھا ہفتہ اور سرہانے بیٹھی تھی۔ سید روزگاری ایک ماہ صاحب فراش رہا اور جب لنگڑا کر چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اُسے اطلاع دی گئی کہ تمہاری بیوی وہ حال سے تھی جب اُس نے تمہیں اس حال میں دیکھا اور ڈاکٹر کی زبانی سُنا کہ تم نازک حالت میں ہو۔ زندگی کی امید کم ہے تو اُسے سخت صدمہ ہوا۔ شدت غم و الم سے اسقاط ہو گیا اور اسقاط کیسا تھ بخار سے ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ آغوش لحد میں جا سوئی۔ اسلم زندہ ہے مگر اب اس کی حالت سڑی دیوانوں کی سی ہے۔ یادداشت اصلی حالت میں نہیں آئے۔ کوئی ورقی چیز پڑھ نہیں سکتا اور ٹانگ کا یہ حال ہے کہ لاٹھی کے بغیر چلنا دشوار ہے۔ اگر بھولے سے سنگار کا نام سُن لے تو بچوں کی طرح رونے لگتا ہے۔

(مقبول الٰہی صدیقی)

کیا کہتے ہیں؟

ایک دن حسرتِ احمد سے کسی نے پوچھا　　آپ بھی وضع کے پابند ہیں کیا کہتے ہیں
آپ ہی کہئے محبت کی حقیقت کیا ہے　　کیا سمجھتے ہیں جو اسے عشق نما کہتے ہیں
بوالہوس کہتے ہیں اکثر ہے دنیا میں یہی　　زندگی کے مشتاق اسے ظلِ ہما کہتے ہیں
جو خط و خال کے شیدا ہیں وہ اپنی دُھن پر　　نار کہتے ہیں اسے اور ادا کہتے ہیں
جسم فتاں کی شرارت وہ سمجھتے ہیں اسے　　دستِ نازک پہ اسے رنگِ حنا کہتے ہیں
نازِ حسن کو ہے زمانہ میں مسیحائی پر　　وہ محبت کو سدا جانِ شفا کہتے ہیں
نام مشہور ہے دنیا میں کہ سالک اسکو　　طالبِ وحدہ میں راہِ خدا کہتے ہیں
محملِ حال میں جو لیلیٰ سرا ہیں ان کو　　وہ سمجھتے قال کی دلچسپ نوا کہتے ہیں
اور وہ جن کی نگاہوں میں ہے ٹھنڈک اس سے　　روح پرور وہ اسے بادِ صبا کہتے ہیں
زہد و تقوے کے جو سجادہ نشیں ہیں اسکو　　مسجدِ صدق کو محرابِ صفا کہتے ہیں
جو سرشار ہیں عصمت کے وہ عصمت کہکر　　پیکرِ شرم اسے نالِ حیا کہتے ہیں
پارساؤں کے لئے یہ ہے قناعت　　اور معصوم اسے جیب قبا کہتے ہیں
ہمدردوں کو مگر یہ دعا ہے　　جوہر حق اسے سرمہ سا کہتے ہیں
روح دنیا کو سب یار محبت کرتے ہیں　　اور محبت کو سب ہی کا دیا کہتے ہیں
سن کے احمد نے یہ ساختہ لہو ہارا　　اور ان سب کی بھی حسرت سے کہا کہتے ہیں
ہم اسی جام کے مری کی ہیں　　حسن لوا یار یار لقا کہتے ہیں
ہم محبت میں نمودارِ محبت ہم میں　　ہم ہیں آزاد جسے کو خدا کہتے ہیں
کہدیا احمد محمل لے جو آیا دل میں　　دیکھئے سرع کے واسطے کیا کہتے ہیں

(حسیب اڈیٹر حالی احمد خیل خاں)

جناب خان احمد حسین خان صاحب چیف ایڈیٹر شباب اردو کی مشہور عالم تصانیف

سیرۃ احمدی

یعنی

سوانح اقدس حضور سرور عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم

اس کتاب میں حضور کی سوانحعمری کے علاوہ ازدواج اولاد کا تذکرہ بھی ہے حضور کے طبعی عادات و حالات حضور کی تعلیم اور اس کی فلاسفی سوت او معجزات اور ان کی فلاسفی تکمیر ازدواج طلاق۔ غلامی اسلام مذہب سعف نہ نفاذ میں ان عنوانات پر نفصیلاً علیحدہ علیحدہ باب قائم کر کے بحث کی ہے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ خانصاحب نے ایسے جامع و دلکش پیرایہ میں لکھی ہے اور علامہ شبلی کی کتاب سے بہتر ہے قیمت حصہ اول (عمہ) حصہ دوم (۶)

لالہ زار حصہ اول و دوم مجلد سنہری بالتصویر قیمت فی جلد (عہ) بلا جلد (سے)۔ رسالوں کا مجموعہ ہے۔ جو لاٹ صاحب بہادر پنجاب کے نام پر معنون ہو چکا ہے اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ❖

رانیاں اور شہزادیاں

جس میں سات رنگین تصویریں ہیں اور جو ہز ایکسلنسی لیڈی ہیلی بالقابہ کے نام نامی سے انکی اجازت سے معنون ہے۔ اسکو شروع کر کے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ نہایت دلچسپ و دلکش ہے۔ قیمت جلد سنہری دو روپیہ (۲) معمولی جلد ڈیڑھ روپیہ (عہر)

لطیف بیگم	سہ	انگوٹھی آرا بیگم	عہ	۱۲	آئینہ روزگار قیمت	عہ
بانو رحیم جلد اول دوم	عہ	مکاماتِ گل	عہ	۱۲	وہ عورت جس نے کلیجے دکھایا	عہ
سو ر	سعہ	اسپاٹی	۱۲		صبح عشرت	۱۲
۱۱۰	۶	پریم ترشنا	۱۲		دل کے ٹکڑے	۱۲
صبح ملستان	۱	مسرت	عہ		آہ	عہ
گلبدن	عہ	سادھو کی لوٹ	۱۲		الٰہ سنگھ	۱

ڈسٹی حصہ زراعت پنجاب انگریزی، فارسی، دوائیاں، بنیادی کتابیں جمع شدہ ملن الیمین خریدار۔

المشتہر

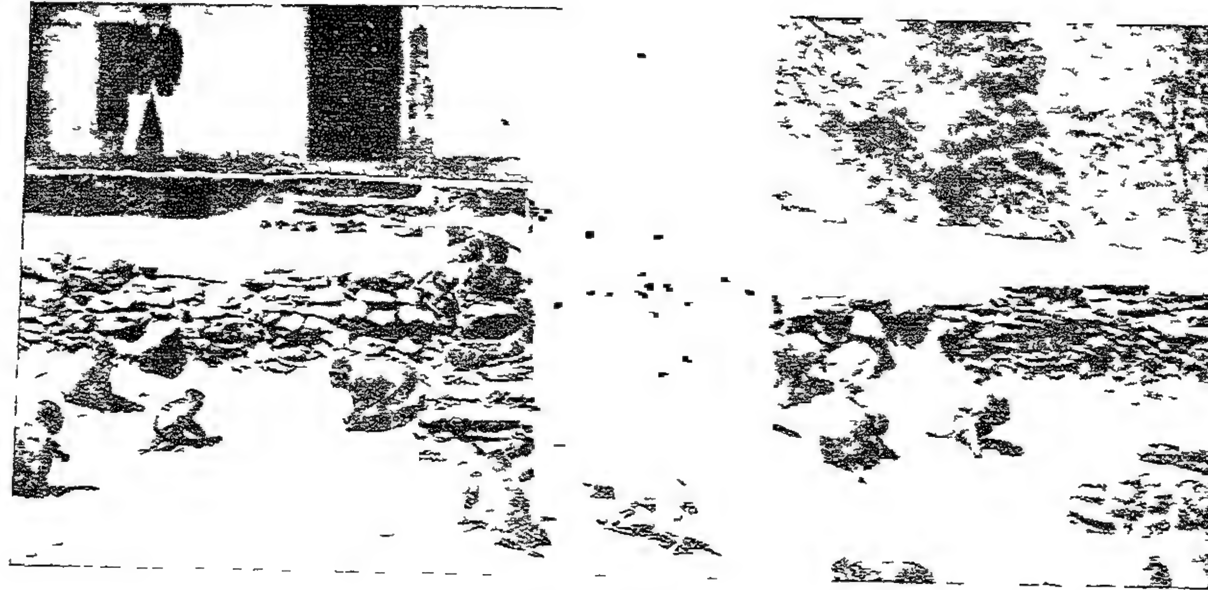
ڈی او ربیرل پبلشنگ ایجنسی وطن بلڈنگ لاہور

شباب اردو لاہور



سبکتگین رحم کھا کر ہرنی کا بچہ چھوڑ رہا ہے

کتاب اردو لاہور



جاکو پہاڑی اور مندر

جلد ۱ نمبر ۳ و ۴ بابت ماہ جون و جولائی ۱۹۲۹ء

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ شباب اُردو اپنے رستہ پر آگیا - اور اب یقین ہے کہ ماہ بماہ باقاعدگی اوقات کے ساتھ شائع ہوا کرے گا - اس دور میں تصویروں کی تعداد بہت بڑھا دی گئی ہے -

تاریخ اشاعت ہر ماہ کا آخری دن ہے - مگر انشاء اللہ تعالی رسالہ تاریخ مقررہ سے پہلے پوسٹ ہوا کرے گا - قلمی معاونین از راہ کرم ایسے اپنے مضامین جو ماہ اگست کے نمبر میں شائع ہوں گے - اگست کی دس تاریخ سے پہلے بھیج دیں مضامین نگار حضرات اور بہنیں خوشخط ایک صفحہ پر لکھا کریں -

زبیدہ سلطانہ
اسسٹنٹ اڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شباب اُردو



(۱)

نوجان پٹھانی تھی اور کابل کی رہنے والی کہتے تھے۔ کہ شاہی خاندان سے ہے غالباً ہوگی کیونکہ سرکار سے اُسے چالیس روپئے ماہوار پنشن ملتی تھی۔ ہاتھ کی سچی تھی اور چہرے پر جلال برستا تھا گردش زمانہ کا روسیاہ ہو عجب سنگدل ہے۔ بادشاہ ہو یا ملکہ راجہ ہو یا رانی۔ شاہزادہ ہو یا شہزادی نواب ہو یا بیگم اسے کچھ پروا نہیں سب کو چکی کی طرح پیس ڈالتی ہے۔ نوجان بھی اسی گردش زمانہ کی ستائی ہوئی کابل سے جہلم آئی۔ اور افغانستان کے شاہی محلات سے جلاوطن ہوکر ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں زندگی کے دن پورے کرنے لگی۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو اُس کی عمر ساٹھ کے قریب تھی بال سفید تھے اور چہرہ پہ جھریاں مگر آواز میں جوانی کی کڑک اور رفتار میں عالم شباب

کی جھلک موجود تھی۔ اردو بہت کم جانتی تھی جب اردو یا پنجابی بولنے کی کوشش کرتی تھی تو اپنے لئے صیغہ مذکر اور اپنے مخاطب کے لئے بلاتمیز اس کے کہ وہ مرد ہے یا عورت ہمیشہ صیغہ مؤنث استعمال کرتی تھی مثلاً ایک دن وہ اپنے خدمتگار پر خفا ہو رہی تھی اور آواز آئی میں کیا کہتا ہوں اور تو کیا کہتی ہے۔ یہ سنکر میں نے اخبار ہنس پڑا۔ چالیس روپئے پنشن آتی تھی۔ اور پھر انگریزی مہینہ کی یکم تاریخ کو مل جاتی تھی۔ جس دن پنشن آتی تھی اس دن نوجان کے ہاں عید ہوتی تھی پُرتکلف کھانے پکتے تھے جس میں مرغ پلاؤ اور زردہ ضرور ہوتی تھی۔ خوش قسمتی سے اس زمانہ میں قحط نہ تھا ہفتہ عشرہ بہت اچھا گذر جاتا تھا۔ اور پھر وہی جھبری روٹی اور پھر سے بسر اوقات ہونے لگی تھی۔



۲

نوجان سولہ سال سے جہلم میں تھی مگر جھونپڑی میں رہکر اُسے محلوں کے خواب ضرور آتے رہتے تھے۔ کابل کی یاد اُس کے دل میں تازہ تھی۔ کمبخت امید جو زندگی وبال کر دیتی ہے۔ صبح و شام اس کے سر پر سوار تھی۔ بظاہر کوئی صورت نہ تھی مگر اُسے یقین تھا کہ بس اب کابل سے بلاوا آنے والا ہے۔ اور کوئی دن میں وہ ہوگی اور کابل کی روح افزا آب و ہوا۔ آہ ہماری تمناؤں کی طرح نوجان کی اس آرزو نے نہ پورا ہونا تھا نہ پوری ہوئی اور سولہ سال جلاوطن رہکر بصد حسرت و یاس اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی۔ نوجان جب کابل سے آئی تو اُس کے ساتھ ایک چار سال کی یتیم بچی تھی جسے وہ گلدستہ کہکر پکارتی تھی۔ خدا جانے اُس کے ماں باپ کون تھے۔ خدا جانے وہ کس درخت کی ڈالی تھی یہ راز نوجان کے ساتھ گیا۔ مگر جب تک نوجان زندہ رہی گلدستہ کنیزوں کی طرح اُس کی خدمت کرتی رہی جب تک قسمت بیٹھائی کو پیغام اجل آیا۔ تو گلدستہ کی عمر بیس سال کی تھی اور وہ واقعی گلبدن تھی۔ قد دراز رنگ سرخ و سفید۔ ابرو ہونٹ۔ آنکھیں کوئلہ کی طرح سیاہ اور بال سنہری تھے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کابل کی شہانی دربار دل سخاوت مجسم اور خوش خو تھی۔ جس دن پنشن آتی تھی اچھے اچھے کھانے پکتے تھے ایک جوان محلہ

کی مسجد میں اور دوسرا بندوں کے گھر جو اُسکے ہمسائے تھے۔ ضرور جاتا تھا اُس کے گھر میں نہ تو کوئی مرد تھا۔ نہ زیور نہ اسباب جائداد ہی۔ تمام کا تمام پنشن تھی جو بوبوجان کی وفات کے ساتھ بند ہو گئی۔ اور گلدستہ نان شبینہ کو محتاج۔

۳

بوبوجان کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے تین سال ہو گئے لوگ اُسے بھول گئے اور اس کی قبر بھی معدوم ہو گئی۔ آج راجہ سپہ دار بخت کی شادی ہے۔ نوشہ ڈولی لیکر اپنے عالیشان مکان میں واپس آگیا۔ دولھا ایک خوش قسمت انسان ہے۔ خوش قسمت اس لئے کہ نوجوان ہے۔ خوبصورت ہے جامہ زیب ہے۔ دولتمند اور صاحب جائداد ہے۔ جیسا کہ عموماً امیرزادوں کا ہوا کرتا ہے اس کا نامۂ اعمال بھی سیاہ ہے۔ اور اب اس کی خواہش ہے کہ وہ آب زمزم اور نہر کوثر سے دُھل کر کسی طرح اجلا ہو جائے۔ دولھا کئی زندگیاں برباد اور کئی دل خاک کر چکا ہے کیونکہ امیرزادے اسے اپنا حق وراثت سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی طبیعت اس قسم کے اعمال و اشغال سے سیر ہو چکی ہے۔ اب اس کی یہ خواہش ہے کہ بقیہ زندگی کا آرام رہے اس لئے اُس نے ایک حسین دوشیزہ سے جو اس کی برادری کی ہے بڑی دھوم دھام سے شادی کی ہے۔ مکان کو عروس کی طرح سجایا ہے۔ لاہور سے بیش بہا موٹر کار منگائی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ پردۂ زمین پر اُسے فردوس بریں اور عفو و درگذر کے اعمال کے مل جائے۔

۴

آج شادی کے بعد پہلی رات ہے۔ دولھا دلہن ایک جگہ بیٹھے ہیں دلہن بیمار ہے۔ مگر ہے نفس کے جاذبیت موتیرا [illegible] جو ابل سکتی ہے بڑھی [illegible]۔ شادی اسے ایک طلسم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک [illegible] سامنے سے لطف گفتگو کر رہی ہے [illegible] جانے کے روبرو ہوتی تھی جب ہی دولھن سسرال میں آگئی تھی [illegible]

نہیں اٹھاتی تھی۔ سسرال والوں کی موجودگی میں خاوند سے بھی منہ چھپاتی تھی۔
اب یہ تمام رسمیں نقش ونگار طاق نسیاں ہو چکی ہیں۔

رات کا وقت ہے۔ اور دولہا کچھ کہہ رہا ہے۔ دولہن خاموش بیٹھی سُن رہی ہے۔

دولہا۔ آج میں نے تمھیں پہلی مرتبہ دیکھا ہے لیکن میں تمھیں از روئے ایمان کہتا ہوں۔ کہ آج سے میں تمھارا ہو چکا۔ اب محبت کا یہ تقاضا ہے کہ تم سے کسی بات کا پردہ نہ ہو۔ میں تمھارا اور تم میری ہو جاؤ۔ یک جان اور دو قالب حسینہ بیگم میں تم سے چھپانا نہیں چاہتا۔ اس وقت تک میں پاک صاف نہ تھا۔ بشریت کی وجہ سے مجھ میں کئی عیب تھے۔ لیکن آئندہ اگر خدا نے چاہا تو میں فرشتہ بن کر تمھاری خدمت بجالاؤنگا۔

دولہن۔ صاحب آپ مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں مجھے معلوم ہے۔

دولہا۔ میں تمھیں وہ بات بتانا چاہتا ہوں جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔

دولہن۔ نگاہ پُر لطف سے خاوند کی طرف دیکھا اور کہا فرمائیے۔

دولہا۔ میں ایک عورت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

دولہن۔ (حیران ہوکر) عورت!

دولہا۔ (گھبراکر) جی ہاں عورت اٹھ سال ہوئے میں نے اس عورت کو دیکھا۔ یہ خاندانی عورت نہیں ہے گو اس میں شک نہیں کہ شعلہ رو ہے۔ اور نہایت حسین ہے یہ کسی خاتون کی کہیر تھی جب وہ خاتون مرگئی تو یہ محتاج ہوگئی میں نے چاہا کہ یہ میرے ساتھ رہے۔ مگر اس مغرور عورت نے نکاح کی شرط پیش کی۔ بھلا میں ایک کنیز سے کسطرح شادی کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی اُس کے حسن و جمال نے مجھے مبہوت کر رکھا تھا۔ ناچار میں نے ایک دوست کو فرضی ملاں بناکر اس عورت کو دھوکا دیا۔ اور نقلی نکاح چند گواہوں کی موجودگی میں جو سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے اور میرے چیلے ہیں پڑھا گیا "

دولھن کا رنگ پہلے سُرخ پھر زرد ہو گیا۔

دولھا۔ ناراض نہ ہو۔ سارا قصہ سن لو۔ میں سال تک اس عورت سے مجھے اچھا جاؤ نہ سمجھی رہی خدا کا شکر ہے کہ اس سے اولاد نہ ہوئی ورنہ بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ میں سال کے بعد میری یکایک طبیعت بدل گئی۔ عجب ہے کہ وہ صورت جو میرے دل کو مقناطیس کی طرح اسی طرف کھینچتی تھی۔ مجھے بُری معلوم ہونے لگی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کمسن ہے۔ اور میں ایک خاندانی راجہ۔ میں نہیں چاہتا کہ میں خاندان کو بٹہ لگاؤں اسی خیال سے میں نے تم سے شادی کی ہے۔ اور اس کو علیحدہ کر دیا ہے۔

دولھن۔ (چونک کر) علیحدہ کر دیا ہے

دولھا۔ ہاں۔ (دراصل رکا جا رہا تھا) اُس کا دل رکھنے کو فرضی طلاق دیدی ہے۔

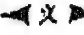
دولھن۔ اور وہ کچھ نہیں بولی۔

دولھا۔ بہت روئی بہت کچھ کہا۔ مگر میں جو کہیں کی میں تو بالکل بدل گیا ہوں مگر وہ اسی طرح مجھے چاہتی ہے اور کہتی ہے کہ میری زندگی صرف تم سے ہے۔ دیکھو ہماری حسینہ دراصل تجھے اُس سے محبت نہ تھی۔ محبت کبھی نہیں بدلتی یہ جز و روح ہے۔ محبت کا شعلہ ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ اس شمع کو کوئی دنیاوی آندھی گل نہیں کر سکتی یہی محبت جسے محبت کہنا چاہئے مجھے اس سے ہوتی ہے اور وہ تم ہے اس عورت کا خیال صرف ہوس ہوائی پر مبنی تھا جو موم کی طرح نکھل اور برف کی طرح گھل گیا۔ ماؤں کہو کہ کافور کی طرح اُڑ گیا کل نقلی طلاق ہو چکی ہے۔ وہ نہ لیتی تھی۔ پانچسو روپئے کے نوٹ زبردستی اس کے صندوقچہ میں یہ کہکر رکھدئے کہ سہارا سمجھے تو جب تمہارا مہر میرے ذمہ ہے اور یہ فرض بحکم خدا و رسول ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں۔ یہ کہکر اور اُسے روتا ہوا چھوڑ کر میں چلا آیا۔ جس مکان میں وہ رہتی تھی۔ اُس کا کرایہ بھی پیشگی تین ماہ کا ادا کر دیا ہے پہلے ہر روز اُس کے ہاں جاتا تھا میں دل سے نہیں گیا اور اب کبھی نہیں جاؤنگا۔





دولھن۔ چند ساعت تک خاموش کچھ سوچتی رہی۔اور پھر بولی۔
"وہ عورت اب کہاں ہے اور اُس کا کیا نام ہے۔"
دولھا۔ مجھے خبر نہیں ہوگی اُسی مکاں میں۔ میں اُس کا نام تمھیں نہیں بتاؤں گا تمھارے مقدس کان اُس کے نام سے ناآشنا رہیں تو اچھا ہے۔ آئندہ میں کبھی اُس کا ذکر نہ چھیڑونگا میں نے یہ راز محض اس لئے سنایا ہے۔کہ میاں بیوی کے درمیان کسی بات کا پردہ نہ رہنا چاہئے۔ اعتراف ضروری ہے تم اسے بھول جاؤ اور میرا قصور اگر تم اسے قصور سمجھتی ہو کیونکہ تمھارے وصل سے پہلے کا ہے معاف کردو۔
دولھن۔ تمام مرد بیوفا ہوتے ہیں۔کیا ایک دن مجھ سے بھی ایسا ہی سلوک کروگے۔
دولھا۔ خدا نہ کرے اگر میں تم سے پھروں تو مجھ سے میرا خدا پھر جائے۔
دولھن۔ وعدہ کرو اور قسم کھاؤ کہ آئندہ کبھی کسی عورت کی طرف نہ دیکھوگے اور کبھی اس عورت کو جسکا نام تم مجھے نہیں بتاتے۔ نہیں ملوگے۔
دولھا۔ (قرآن اٹھاکر) یہ قرآن میرا تمھارا ضامن ہے۔



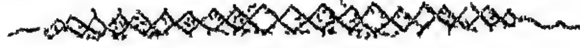
ایک مختصر مگر نفیس آراستہ مکاں میں پلنگ بچھا ہے اور اس پلنگ پر ایک جوان خوبصورت عورت بیحال پڑی ہے۔اُس کے ہاتھ میں ایک خالی شیشی ہے۔اور شیشی سے کڑوے بادام کی بو آرہی ہے۔سر کے لمبے لمبے سنہری بال پریشاں ہیں۔سرد اور سفید رخساروں پر آنسوؤں کے نشاں ہیں۔بڑی بڑی سیاہ آنکھیں سرد اور بے نور ہیں۔اور ان آنکھوں کے پردے سوچتے ہوئے۔جس دل کو وہ موم سمجھی تھی وہ پتھر نکلا۔جس چیز کو وہ سونا جانتی تھی وہ پیتل ثابت ہوا۔آہ اب وہ بیکس تھی اور اُسے کوئی دستگیر نظر نہ آتا تھا۔



ہاں گلدستہ کا انتظام ہمہ سردار کمال کے بر خلاف دیا ہے۔مارچ پتنگ بڑی لمبی

ہے۔ مگر جامعیت کے دل پر داور محشر کے روبرو ضرور پیش ہوگا۔ دیکھئے فیصلہ کیا ہو۔

(جناب ... احمد حسین ...)



نالۂ نے

کسی کے دل کی طرح گرچہ داغ داغ ہوں میں
مگر جو گل ہے شگفتہ وہ چراغ ہوں میں

مری صدا لب اظہار درد ... ی
طریق الفت گم کردہ کا سراغ ہوں میں

نگاہ ناز ... سرخوش
تجلی ہے حسن سے ... ایاغ ہوں میں

ادا ادا سے ہے ... جہاں ...
بہار لالہ کو وصال ... ہوں میں

ہمیشہ آتش الفت ہے مشتعل مجھ سے
... آگ وہ چراغ ہوں میں

... سرم ہستی ہے
... وہ ایاغ ہوں میں

مری صدا سے نمایاں ہے دل کی ...
... داغ ہوں میں

ہزاروں مرغ بہار مرے اک شرار میں ہیں
جو ... محفل کو وہ چراغ ہوں میں

نمود گلشن الفت ہے میرے داغوں سے
... بہار داغ ہوں میں

بھرے ہیں جس میں گل ہائے نغمۂ رنگیں
... داغ ہوں میں

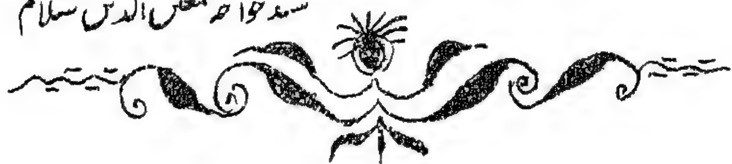
مری صداؤں میں پوشیدہ ہے صدائے الست
... وہ چراغ ہوں میں

مری جو لے ہے وہ گویا ہے مرغ ...
... ہر اک دل کا چراغ داغ ہوں میں

بہار داغ ہوئی ہے جلیس جدائی کی
کسی کے ہجر میں واللہ باغ باغ ہوں میں

سلام مجھکو ہے اندیشہ جو ... کیسا
ہوا میں جو ... وہ چراغ ہوں میں

سید خواجہ معین الدین سلام



حضرت زرتشت

زندگی کے حالات

پارسی قوم جس مذہب کو مانتی ہے۔ وہ دین یزدانی کہلاتا ہے۔ دین یزدانی کے بانی حضرت زرتشت تھے۔ آپ حضرت مسیح سے قریباً چھ سو سال پہلے ایران کے مشہور شہر آذربائیجان میں پیدا ہوئے تھے۔ جو فارس کے علاوہ میڈیا کے مغرب کی طرف واقع ہے بدھ بھگوان کی طرح آپ بھی ایک شاہی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسے بدھ دیو نے بہت سے راجاؤں کو اپنا شاگرد بنایا۔ اسی طرح حضرت زرتشت نے بھی کئی نامور تاجداروں کو اپنا مرید یا شاگرد بنایا۔

حضرت زرتشت نام زراسٹر کئی ناموں سے مشہور ہیں جیسے زراشٹر۔ سو شتامہ وغیرہ۔ زرتشت کے باپ کا نام پوروشسپ تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ نوتس۔ رتار گھ رداسٹر۔ ایک اسٹر اور اساسٹر۔ گو زرتشت منجھلے بیٹے تھے۔ انکی ماں شاہ دین کی بیٹی تھی۔ اور بڑی نیک حلیم زندہ دل اور پارسا عورت تھی۔

لکھا ہے کہ جب حضرت زرتشت پیدا ہوئے۔ اس وقت انہوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور تمام دنیا کے چرندوں اور پرندوں نے مبارکبادی کے گیت گائے جس گھر میں اُن کا جنم ہوا تھا وہ خدا کے نور سے چمک اٹھا اور شیطان مارے خوف کے وہاں سے بھاگ گیا۔ زرتشت کے پیدا ہونے سے پہلے یزدان یعنی پارسیوں کے خدا نے ایک بیل کے ذریعہ لوگوں کو یہ بتا دیا تھا۔ کہ ایک مہاتما پیدا ہونے والا ہے۔ جو دنیا سے گناہوں اور برائی کو دور کریگا۔ اس لئے شیطان کا منڈل اُن کی گھات میں رہنے لگا۔ جیسے راجہ کنس متھرا کے کرشن کے خون کا پیاسا تھا اُسی طرح ایران کا ایک بادشاہ

جس کا نام دراسرو تھا۔ زرتشت کی جان کا دشمن تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو انھیں مروا ڈالے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی سال تک ایک پوشیدہ غار میں اُن کی پرورش ہوئی جب انھیں بستی میں لائے۔ اُس وقت بھی دشمنوں نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور اُنھیں ہلاک کر ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر مارنے والے سے بچانے والا زبردست ہے۔

حضرت زرتشت شروع ہی سے بڑے محنتی ہمت ور اور بہادر تھے۔ پڑھنے لکھنے کا انھیں بہت شوق تھا۔ ذہن بھی بڑا تیز پایا تھا۔ اور عقل بھی ایسی رکھتے تھے کہ جھٹ بال کی کھال نکال لیتے تھے۔ ماں باپ نے اُن کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چھوٹی ہی عمر میں پڑھ کر لائق فائق بن گئے۔ اور مذہبی تعلیم تو اس قدر حاصل کر لی کہ بڑے بڑے مجاور اور عالم اُن کی باتیں سن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اُن دنوں ایران میں جو مت رائج تھا زرتشت نے اس کے پجاریوں کو مباحثہ میں کئی بار ہرایا۔ اور ہر طرف اپنی دھاک بٹھا دی جب لوگ اُن سے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے تو اُن کے مخالف بن بیٹھے یہ مخالفت کی آگ دن بدن تیز ہوتی گئی۔

جب اُن کی عمر پندرہ سال کی ہوئی۔ تو باپ نے فیصلہ کیا۔ کہ اپنا تمام مال و جائداد پانچوں بیٹوں میں برابر برابر تقسیم کر دے۔ باقی چار بھائیوں نے تو اپنا اپنا حصہ لے لیا مگر زرتشت نے کچھ نہ لیا۔ اور ایک کمر بند اٹھا کر اپنی کمر کے گرد باندھ لیا۔ اور کہا۔ کہ میں عہد کرتا ہوں۔ کہ اپنی آئندہ تمام زندگی دین کی خدمت میں گذاروں گا۔ اس کے بعد وہ گھر بار چھوڑ، سکھ آرام سے منہ موڑ معرفت حق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

اُن کی زندگی کا یہ حصہ تکلیفوں اور مصیبتوں کا ایک لمبا قصہ ہے۔ مگر انھوں نے سخت سے سخت مصیبت میں بھی کبھی حوصلہ نہ ہارا۔ وہ پتہ لگاتے لگاتے مہاتما تو ر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو اس نے اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ اور نیکی اور راستی کی تعلیم دی۔ چند سال تک یہاں رہنے کے بعد آپ نے ایک پہاڑ کے غار میں جا ڈیرہ لگایا۔ جہاں سے وہ باہر نہ جاتے تھے۔ اور نہ کسی سے ملتے جلتے تھے۔ کھانا پینا بھی قریب

قریب بالکل چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھار تھوڑا سا پتھر یا سوکھے میوے اور پھل کھا لیتے تھے۔ وہ یہاں کئی سال تک کھوڑ بیسا (ریاضت کرتے رہے۔

اب انہیں خیال آیا کہ دنیا کا بھی کچھ بھلا کرنا چاہیے۔ چنانچہ غار سے نکلے اور ایران کی راہ لی۔ اور دنیا داروں کو ہدایت کرنے لگے۔ ایک روز زرتشٹر کو الہام ہوا اور خدا نے کوہ سبلان پر انہیں درشن دیئے۔ جب اس کی عمر تیس ۳۰ برس کی ہوئی تو خدا نے ایک فرشتہ بھیج کر اپنے حضور میں طلب کیا۔ اور انہیں اپنے مذہب کے پرچار کا حکم دیا۔

حضرت زرتشٹر نے سب سے پہلے دو منکروں کو خدا کی پرستش کی تعلیم دی۔ مگر انہوں نے ان کی باتوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ بلکہ انکی اور ہنسی اڑائی اس بات کا زرتشت کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور انہیں کچھ عرصہ تک کسی ایرانی کے روبرو اپنے خیالات پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اب وہ طہران ہو گئے بادشاہ نے اُن کی باتوں کو پوری توجہ اور غور کے ساتھ سنا مگر اُن کا مذہب سے صاف انکار کر دیا اس کے بعد وہ بدوانسٹ نام ایران کے ایک رئیس کے پاس گئے۔ اُس شخص نے اُن کے ساتھ بہت برا سلوک کیا اور وہ اس کے پاس سے بھاگ نہ جاتے تو ضرور انکی جان کے لالے پڑ جاتے۔ یہاں سے وہ افغانستان اور بلوچستان ہوتے ہوئے عربی تک گئے مگر کچھ بھی کامیابی نہ ہوئی۔

لیکن حضرت زرتشت گھبرائے نہیں اور سیستان کے بادشاہ پرساسپ سے ملے وہ اُن دنوں بیمار تھا زرتشت نے اُس سے کہا کہ اگر تو میرا مذہب ماننے کا وعدہ کرے تو میں تجھے اچھا کر سکتا ہوں شاہ پرساسپ نے یہ سودا منظور نہ کیا اور وہ ناکام لوٹ گئے۔ اب وہ سمجھ گئے کہ ابھی میری تیاری پوری نہیں ہوئی۔ اس لئے دوبارہ جنگل میں جا ڈیرا لگایا۔

آہرمزد نے انہیں بارہ الہامات دیئے۔ تاکہ اُن کے دل سے مایوسی دور ہو جائے زرتشت نے آسمان کا چھ مرتبہ سفر کیا آخری سفر میں آہرمزد نے انہیں کتاب "سدھا"

دی۔ اور اُن کا حوصلہ بڑھا کر کہا۔ کہ جاؤ اب تمہارے دین کا خوب پرچار ہوگا جب وہ واپس جا رہے تھے نوشطاؤں نے اُن کے اوپر پورے زور سے حملہ کیا۔ کہ اُن کا خاتمہ کر دیں مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اب وہ نئی امیدوں اور نئے جوش کے ساتھ اپنے خیالات کا پرچار کرنے لگے انہیں اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے طرح طرح کی ترغیبیں اور دھمکیں دی گئیں مگر وہ ذرا نہ گھبرائے۔ اور صداقت کی راہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ بلکہ مردانہ وار کہا۔ کہ خواہ میرے جسم خاکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے لیکن میں اُس دین کو جو خدا کی طرف ۲
سے ہے۔ ہرگز منہ نہ چھوڑ دوں گا۔ آخر دو سال کی لگا تار محنت اور سخت جدوجہد کے بعد انہوں نے اپنے چچیرے بھائی میدیوماہ کو اپنا پہلا مرید بنایا۔ اس کے بعد چند ہی ماہ میں ہزاروں آدمی زرتشت کے مرید بن گئے۔

اب انہوں نے پھر اپنے وطن کا رخ کیا۔ کہ شاہ گشتاسپ کو اپنا مرید بنائیں ایران اور اس کے گرد و نواح میں اُن کی دھاک پہلے ہی بیٹھ چکی تھی اُن کا کلام مدلل موثر اور رعب ڈالنے والا ہوتا تھا۔ اس لئے شاہ کے درباریوں نے بہت کوشش کی کہ دونوں کی ملاقات ہی نہ ہونے پائے۔ مگر اُن کی ایک نہ چل سکی۔ شاہ نے زرتشت کی باتوں کو بڑے غور سے سنا۔ اور اپنے دربار لوگوں کو اُن کے ساتھ بحث کرنے کے لئے کہا مگر زرتشت کی دلیلوں کے آگے اُن کی ایک پیش نہ گئی۔

اب شاہ گشتاسپ کے درباری کمینہ حرکتوں پر اتر آئے۔ انہوں نے بہت سے کتوں بلیوں جو ہوں اور اونٹوں کے سر آنکھیں ناک کان وغیرہ چھپا کر اُس جگہ رکھوا دئے جہاں حضرت زرتشت ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور شاہ کو بہکایا کہ وہ جادوگر ہے۔ اور جادو کے ذریعہ لوگوں پر فتح پا جاتا ہے۔ شاہ نے انہیں اُسی وقت قید خانہ میں بند کر دیا خدا کی قدرت دیکھو بادشاہ کا ایک مشکی گھوڑا تھا جسے وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ ادھر حضرت زرتشت قید خانہ میں بند کئے گئے اُدھر وہ سخت بیمار ہوگیا۔ اور اُس کی چاروں ٹانگیں سمٹ کر اس کے پیٹ میں جا لگیں بادشاہ

نے شاہی علاج معالجہ کرایا۔ مگر گھوڑے کی حالت سدھرنی تو کیا، گھڑی گھڑی ابتر ہوتی چلی گئی۔ بادشاہ ڈرا اور اپنے دل میں سمجھا کہ یہ ہو نہ ہو زردشت کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ پس اُس نے فوراً اُن کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اور کہا کہ آپ میرے گھوڑے کو اچھا کر دیں۔

زردشت نے یہ چار شرائط پیش کیں کہ اگر گھوڑے کی ایک ٹانگ اچھی ہو جائے تو بادشاہ دینِ یزدانی قبول کر لے۔ اگر دوسری ٹانگ اچھی ہو جائے تو بادشاہ کا بیٹا دینِ یزدانی کی حمایت میں جہاد کرے۔ اگر تیسری ٹانگ اچھی ہو جائے تو ملکہ بھی زردشت کا مذہب اختیار کر لے۔ اور اگر چوتھی ٹانگ اچھی ہو جائے۔ تو اُن سب لوگوں کو مناسب سزا دی جائے۔ جنھوں نے بادشاہ کو حضرت زردشت کے خلاف ورغلایا بہکایا تھا۔ قدرت والے کی قدرت! بادشاہ ایک ایک شرط منظور کرتا جاتا تھا اور گھوڑے کی ایک ایک ٹانگ اچھی ہوتی جاتی تھی۔

بادشاہ بیگم اور شہزادہ اسفندیار نے دینِ یزدانی قبول کر لیا۔ اُن کے ساتھ ہی وزیروں امیروں نے بھی زردشت کے آگے سر جھکا دیا۔ اس وقت زردشت کی عمر چالیس سال کی تھی۔ اُن کی اور اُن کے دین کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ اور چند ہی سال کے عرصہ میں اُن کے پیروؤں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی۔ بہت سے بادشاہوں نے بھی یہ مذہب اختیار کر لیا شہزادہ اسفندیار نے اس مذہب کے پھیلانے میں بڑی کوشش کی اور شاہ گشتاسپ کے وزیراعظم جاماسپ اور دولال فراسوشتر نے بھی بڑی مدد دی آسمانی کتاب "اوستا" کا ایک بہت بڑا حصہ اور "زند" بھی انھیں دونوں نے لکھی۔ حضرت زردشت لکھواتے جاتے تھے اور وہ لکھتے جاتے تھے۔

ہندوستان کا ایک رشی جس کی علمیت کا دور دور تک شہرہ تھا۔ بحث ومباحثے کے لئے بلخ تک آیا۔ مگر بھری سبھا میں اُس نے ابھی ہار مان لی۔ سنتے ہیں۔ کہ اس نے ایسی سرگرمی سے دینِ یزدانی کا پرچار کیا۔ کہ صرف ہندوستان میں

میں اسی ہزار آدمی اس مذہب میں داخل ہو گئے۔ مشہور عالم یونانی فلسفی کیاطوس بھی اسی طرح دین یزدانی کا معتقد ہوا تھا۔ زرتشت کی زندگی میں ہی یہ مذہب ایران کے حدود کو پار کر کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گیا۔

شاہ ارجاسپ والئے طوران نے ابھی تک دین یزدانی قبول نہیں کیا تھا۔ حضرت زرتشت نے بہت کوشش کی مگر جب کسی طرح بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو ایران کے بادشاہ کی معرفت اُس کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ آپ دین یزدانی قبول کر لیں اُس نے یہ صرف ایسا کرنے سے انکار کیا بلکہ گشتاسپ کو بھی لکھا کہ وہ اس مذہب سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ اس کا نتیجہ آخر یہ ہوا کہ ارجاسپ نے ایران پر چڑھائی کر دی۔ اور بڑی خونریز لڑائی ہوئی۔ مگر ارجاسپ کو ہار کر بھاگ جانا پڑا۔ گشتاسپ اگر چاہتا تو اُسے کچل ڈالتا۔ مگر اُس نے ہارے ہوئے دشمن کا پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شاہ ارجاسپ بھی اُس وقت توطوران کا ساگھونٹ پی کر بیٹھ رہا۔ مگر اُس کے دل میں آگ لگی تھی اُس نے کئی سال تک صبر کیا۔ اور اپنی فوج کو بڑھاتا اور موقعہ کا انتظار کرتا رہا جونہی ایک دفعہ اُسے معلوم ہوا۔ کہ شاہ گشتاسپ اپنے پایۂ تخت سے باہر ہے اور سپہ سالار اسفندیار بھی ایک پہاڑی قلعہ کے قید خانہ میں بند ہے وہ بھاری لشکر لیکر فارس پر چڑھ آیا اور بلخ کو گھیر کر سر کر لیا۔ ارجاسپ نے قتل عام کا حکم دیدیا اور تمام آتشکدے دین یزدانی کے معتقدوں کے خون سے سرد کئے گئے۔ اس مذہب کے بڑے بڑے پجاری انتہائی بے رحمی کے ساتھ قتل کر دئے گئے خدا کے ہزاروں بے گناہ بندے تلوار کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ اُسے عورتوں اور بچوں تک پر بھی رحم نہ آتا۔

حضرت زرتشت کی عمر اُس وقت ستر سال کی تھی۔ انھوں نے اپنے مریدوں کی بہت ہمت بڑھائی۔ مگر جب بلخ سر ہو گیا تو وہ سمجھ گئے کہ ایمان بچانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ پس وہ ایک مندر میں چلے گئے۔ لیکن ارجاسپ کے سپاہیوں نے انھیں وہاں سے اس طرح ڈھونڈ نکالا۔ جیسے شکاری کتے بے گناہ

اور کمزور جرگوں کو جھاڑیں سے نکال لیتے ہیں ارجاسپ کے حکم سے اُسی وقت اُن کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۵۱۳ قبل مسیح کا ہے۔

حضرت زرتشت نے اپنی زندگی میں بہت سے نیک کام کیے۔ انھوں نے لوگوں کو مکر اور دھریہ پنے سے بچایا۔ اور خدا کی عبادت و پرستش میں لگایا۔ انھوں نے انسانوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنا سکھلایا وہ بہت ہی نیک دل تھے رحم کا مادہ اُن کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انسان تو انسان حیوانوں تک کو مصیبت میں دیکھکر اُن کا دل بھر آتا تھا۔ اور جب تک وہ اُن کے دُکھ درد کو دور نہ کر دیتے اُنہیں ہرگز چین نہ آتا تھا۔

حضرت زرتشت نے تین شادیاں کیں ان کے بیٹے بیٹیوں کے نام "اوستا" میں درج ہیں۔ حضرت زرتشت کی وفات کے وقت اُن کی تینوں بیویاں زندہ تھیں۔ دین زرتشتی کی الہامی کتاب "زند اوستا" ہے۔ لاکھوں پارسی ہر روز بلا ناغہ اُسکا پاٹھ کرتے ہیں۔ یہی زرتشتی مذہب ایران کا قومی مذہب رہا ہے۔

تعلیم

حضرت زرتشت کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے۔

نیک خیالات نیک اقوال۔ اور نیک کام جو شخص عمر بھر نیک خیالات کو دل میں جگہ دیتا ہے۔ اچھے الفاظ منہ سے نکالتا ہے اور نیک کام کرتا ہے اور جہانتک ہو سکے بنی نوع انسان کی بھلائی اور خدمت میں لگا رہتا ہے وہی خدا اور اُس کے بندوں کی نظروں میں سماتا ہے۔ اور وہی بہشت کا حقدار ٹھہرتا ہے۔

اگر انسان چاہتا ہے کہ اس کا دل نیک خیالات کا مسکن بنے تو اُس کو چاہئے کہ اپنے خالق اور مالک کا دھیان کرے۔ اور خدا کی کل مخلوق خاصکر اپنے بھائیوں یعنی نوع انسان کے ساتھ محبت۔ خلوص۔ صلح و صفائی اور امن کے ساتھ رہے۔

ہر شخص کا فرض ہے کہ مصیبت یا خطرہ کے وقت دوسروں کی حفاظت کرے۔ ضرورت کے وقت دوسروں کو مدد دے۔ اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہوں ہر طرح اُنکی بھلائی کا خیال رکھے۔ سب کو اپنا بھائی سمجھے۔ اور سب کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرے۔

نیک اقوال کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم کبھی جھوٹ نہ بولیں۔ زبان سے جو ایک دفعہ کہیں اُسے ضرور پورا کریں۔ کبھی کسی کو گالی نہ دیں نہ بُرا بھلا کہیں اور نہ کوئی ایسی بات زبان سے نکالیں۔ جس سے کسی کے جذبات کو ٹھیس پہونچے۔ بلکہ ہر شخص کا فرض ہے کہ لڑائی جھگڑا بغض وعناد۔ دشمنی۔ حسد۔ کینہ یا نفرت کی بجائے اپنے دل میں سب کی طرف سے محبت پیار۔ اور صلح و آشتی کے خیالات کو جگہ دیں۔ ۲

حضرت زرتشت کے ضروری احکام یہ ہیں۔

"تو کسی سے حسد نہ کرے گا۔ اور نہ کسی مرد، عورت یا بچے کی طرف سے اپنے دل میں بغض و عناد یا کینہ کو دل میں جگہ نہ دیگا"

"تو اپنے پڑوسی کے پیٹھ پیچھے اُس کو بُرا بھلا نہیں کہیگا کیونکہ جو سنتا ہے اور اُس کے قریب جاکر تیرے پڑوسی کی روح کو بتادیں گے کہ تو نے اُن کے بارے میں کیا کہا ہے"

"تو اپنے پڑوسی سے اُن سے زیادہ سلوک کی خواہش نہیں کرے گا جیسا تو اُس کو دیتا ہے۔"

حضرت زرتشت نے باہمی پیار اور محبت پر بہت زور دیا ہے

راقم سروپ کوشل

انسانی جسم کا تیل

سردار اقبال علی شاہ افغان نے مرکزی ایشیا کا سفر کرنے کے بعد یورپ میں

ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کا وہ حصہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے جس میں سردار صاحب نے ایران و ترکستان کی سرحد پر آپ بیتی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ سردار صاحب نے اُن لوگوں کو وحشی اور خونخوار باشندے قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ انھیں پکڑ کر ایک غار میں لے گئے جہاں اُن کے جسم سے چربی نکالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ ایک شخص کی آپ بیتی ہے۔ جسے پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک بہت سے دنیا بھر کے ممالک کی حد بہت گھوڑ دوڑ میں شامل ہے۔ وسطی ایشیا کا کوئی حصہ ایسا ہو جہاں انسانی تیل نکالا جاتا ہے۔ سردار صاحب سے جو واقعہ پیش آیا۔ عبارت ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ انھیں ایران کی کردستانی سرحد پر قزاقوں کی ایک جماعت نے گرفتار کر لیا تھا۔ یہ لوگ انسانوں کو مار کر جلایا کرتے ہیں۔ اور اُن میں سے ایک قسم کا تیل نکالتے ہیں جسے وہ اعلیٰ درجہ کی دوا سمجھتے ہیں۔ بہرحال وہ شاہ صاحب کو ایک غار کی طرف لے چلے۔ اسکے بعد شاہ صاحب پر جو کچھ گذرا۔ اُسے انھیں کے لفظوں میں بیان کرنا زیادہ دلچسپ ہوگا

غار میں مجھے برہنہ کیا گیا۔ سر و پا دونوں سے میرے جسم پر گرم گرم پانی کی تری اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے غار سے باہر ٹھنڈی ہوا میں لے گئے۔ مجھے ضرور سرنگوں کے حال میں گذارنا ہوگا۔ کیونکہ بعض اوقات میرے جسم کو ٹھنڈ سے کھٹکے سے محسوس ہونے لگتے تھے۔ اور بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں اندھیرے سے گھونٹتی ہوئی فضا میں سے گذر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے کانوں میں [illegible] کی عجیب و غریب ملی جلی آواز پڑی۔ گفتگو [illegible] محسوس ہونے لگی۔ لیکن جب میں ایک ایسی مکدر گھٹی ہوئی فضا میں [illegible] پگھلی ہوئی چربی کی بو کے ساتھ بھیڑوں کی کچی کھالوں کی سی بساند ملی ہوئی تھی تو گفتگو مدھم پڑ گئی۔

جب میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی تو میں تھوڑی دیر تک اپنی نظر کو قائم نہ

نہ کر سکا وہاں ادھر اُدھر دو دو ہوئیں دار مشعلیں جل رہی تھیں بیچ میں ایک کہن سال آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کے کپڑے میلے ۔ وضع سے نیچے ۔ اس پیرانہ سالی اور سفید ریش بدمعاش بھی کر دی کمبلوں کے گدّے پر بیٹھا تھا۔ یہ دونوں کھڑی کھالوں کے بڑے بڑے بھاری بھیے ہوئے تھے۔ ۶-۷ یا اس سے بھی زیادہ ملازمین عمارت کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ ان میں سے دو وہی تھے جنہوں نے مجھے گرفتار کیا تھا۔

لیکن جس بات سے میرے اوپر خوف دہراس چھا گیا وہ یہ تھی کہ ایک شخص نے استاد اپنا ہاتھ جوں میں شرح کر رکھا تھا۔ اور وہ ایک کونے میں آگ آلاؤ پر ۲

مکڑی کی سری بھون رہا تھا۔ مجھے آگ کے گرد تک لکڑیوں کے جنٹے سے دوبارہ باندھ دیا گیا۔ اس جنٹے پر ایک بہت موٹی سلاخ ادھر سے ادھر تک اڑا دی گئی تھی۔ اس میں ایک رسی باندھی تھی۔ جو پیالہ کے اوپر لٹک رہی تھی۔

سردار نے دوسرے بوڑھے آدمی سے کہا لو حکیم جی یہ ہے ایک سانولے رنگ کا جوان۔ آپ کی کیا تجویز ہے۔ اس کے اندر سے اپنی بیماریوں کی دوا کیونکر نکالوں؟ حکیم جی اسی جگہ سے اٹھکر اس رسی کے پاس پہنچا۔ جو شہتیر میں سے لٹک رہی تھی۔ پھر اُس نے اس پیالہ کو دیکھا۔ جو ایک نمائی سر رکھا تھا۔ اور لوہے کی دو میخوں کو کھٹکھٹا کر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس میں تقریباً دس منٹ لگے ہوں گے۔ مگر وہ دس منٹ مجھے دس برس کی عمر طولانی معلوم ہوتے۔ پھر وہ غول بیابان کی طرح مسکرا کر بولا۔ اس شخص کو پیروں کی طرف سے اس شہتیر میں لٹکایا جائے گا۔ یہ آہنی میخیں اس کی کھوپڑی میں ٹھونکی جائیں گی۔ اور جو رس پیالے میں جمع ہوگا۔ اُسے دیکھی آج سرلکایا جائیگا۔ سب تمھاری دوا تیار ہوگی۔ مگر وہ بھی ایسی ہوگی کہ تمام عمر کے روگ دور ہو جائیں گے۔

یہ الفاظ سنکر میرے دل کی جو حالت ہوئی میں اُسے بیان نہیں کر سکتا میرے اندر سے ہر بات کا احساس رخصت ہو چکا تھا۔ میں مردہ تھا یا زندہ وہاں گرمی تھی یا سردی۔ میں کچھ بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرے اندر ان چیزوں کا

احساس ہی باقی نہ تھا۔ مجھے صرف اسقدر یاد ہے کہ لوگ میرے ارد گرد تھے۔ مگر سردار نے جو کچھ کہا۔ اُسے میں نہ سن سکا۔ کسی شخص نے میرے جسم کو اچھی طرح ٹٹولا میری ہڈیوں اور میرے گوشت کو دبا دبا کر دیکھا۔ میرے پاؤں پر نظر ڈالی۔ ادھر پیالہ رکھا تھا جس میں میرا اسل نکالا جا رہا تھا۔

اس موقع پر میں ضرور بیہوش ہو گیا ہونگا۔ کیونکہ مجھے بعد کے واقعات کا بالکل علم نہیں۔ نہ معلوم کسی دیر بعد مجھے علم ہوا۔ کہ کوئی مضبوط ہاتھ میری گردن پر مالش کر رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھوں پر دوبارہ پٹی باندھ دی گئی اور دو آدمی مجھے لے چلے۔ انھوں نے میرے کان میں چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔ جاگ جاگ اے انسان کہ تیری جان بچ گئی۔ تیرے بازوؤں پر کچھ تل ہیں۔ اسلئے حکیم صاحب نے تجھے خارج کر دیا تجھ سے دوا تیار نہیں ہو سکتی۔

اس تقریر کو سنکر مجھے کس قدر اطمینان ہوا۔ اس کا اندازہ کچھ مجھ ہی کو ہو سکتا ہے۔ مجھے اس وقت اور بھی زیادہ اطمینان ہوا۔ جب کہ انھوں نے نہ صرف میرے کپڑے مجھے واپس کر دیے۔ بلکہ جو کچھ تھوڑا بہت روپیہ میرے پاس تھا۔ وہ بھی مجھے دیدیا۔ ایسا کہنا تو آسان ہے کہ یہ لوگ معمولی قزاقوں سے نہ تھے۔ مگر وہ کون تھے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ نہ تحقیقات ہی کرنے سے یہ بات مجھے معلوم ہو سکی۔

ماخوذ　　　وحیدالدین بی اے

ابر

اے ابر خوشگوار ترا انتظار تھا　　فرقت میں تیری ایک جہاں بیقرار تھا
بدلا ہوا یہ عالم لیل و نہار تھا　　تیرے لئے ہی دست دعا بار بار تھا
سوئے فلک بھی آنکھ سبھوں کی لگی ہوئی　　حسرت بھی اور یاس کی صورت بنی ہوئی

اور سکہ آس ٹوٹ چکی تھی کسان کی
حالت بھی مضمحل ہوئی ہر اک جوان کی
تونے نظر کرم کی ادھر اک آن کی
بھری ہیں گویا پھر سے رگیں جوان کی
تھے کل جو خشک آج وہ بوٹے ہرے ہوئے
دل بیکسوں کے رنج سے چھوٹے ہرے ہوئے

ہاں آج خوب زور سے کڑک کر برس ذرا
مردہ زمیں کو آج نئی زیست کر عطا
برکت سے اپنی دے گل و گلزار پھر کھلا
دیکھا نہ ہو کسی نے سماں آج وہ دکھا
سحر کے ہر نظارے میں اک آن بان ہو
فردوس زمیں سا تو سارا سماں ہو ۲

گرجوں میں مندروں میں مساجد میں جا بجا
شکر الٰہی و حمد ہر اک جا ہے ہو رہا
دنیا میں آج کافر و مسلم ہیں ہم نوا
صوفی ہوا ہے آج مرید در حرم سا
ہر اک کو آج بس کہ مسرت کمال ہے
ہاں اعتماد کا جہاں سے اپنے زوال ہے

اے ابر لایا ہے کوئی پیغام اور بھی
کوئل کی بولی آج ہے نشاط سے بھری
آ سکی اس جگہ مری مرضی تھی نا یہ بھی
ناچار تجھ کو ساتھ ہوا اپنے لے اڑی
آمد کو میری اک بہانہ بنا گیا
سنگ آ کے آج ہی سے تو اٹھا لیا گیا

مجھ کو ملا کہ اب کے برس تو کدھر رہا
کیوں ہو گیا تو نظر عنایات سے جدا
ناچیز ہندوستان سے کہیں دور جا پڑا
کیوں تو سے آفتاب کی کیوں وہ امر گیا
خطہ وہی پہاڑ وہی آسماں وہی
سب کچھ وہی ہے اک نہیں تو رہا وہی

قدرت کے قاعدے میں تسلسل ہے بیگماں
مشرق سے آفتاب نکلتا ہے ہر زماں
گرمی و سردی وقت پہ اور وقت پر خزاں
کچھ سوچ کر بتا دے ذرا مجھ کو نکتہ داں
بارش کے اعتدال پہ پھر کیوں فرق ہے
عرفان فکر فکر دل ناصبور ہے

جغرافیہ میں محو ادراک دھر ادھر
اور آج سوچ میں کو گر یہاں میں ذرا لگا
اسباب پر ابھی نہیں جاتی ہے نظر
مالک کا بھید پا سکے کس طاقت بشر
دنیا میں نہیں مسبب الاسباب ہے وہی
جز حکم اس کے ہلتا نہیں پتا تک بھی

صادق حسین بی اے

صاحبقران ثانی کا ٹائم ٹیبل

آل تیمور کے مایہ ناز فرمانرواؤں میں اکبر کے بعد جو عظمت و ہر دلعزیزی شاہجہاں کو حاصل ہوئی وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ اس کے زمانہ میں سکون و اطمینان سے قطع نظر آفتاب سلطنت حقیقی معنوں میں ترقی کے نصف النہار پر تھا۔ اور حصص حصص ملک میں کوئی رخنہ ایسا پیدا نہ ہوا تھا جسے مقدمہ زوال کہا جا سکے جس کی سب سے بڑی وجہ اس عالی جاہ کی نیک نفسی اور پاک طینتی ہے۔ یہ منجملہ بھی خدا پرستی بیدار مغزی، رعایا پروری داد گستری جود و بخشش اولوالعزمی، بے نفسی، اور حسن سلوک وغیرہ وغیرہ ایسے اوصاف حمیدہ سے متصف تھی جنہوں نے شوکت شاہانہ میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ اپنی رعایا سے مثل اولاد کے محبت کرتا اور ان کی فلاح و بہبود کے ذرائع بہم پہنچانے میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا جس کی کا یہ عالم تھا کہ ہر ادنیٰ صیغہ کے انتظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اپنے کانوں سے سنتا تھا۔ رفاہ عام کے لئے جا بجا سرائیں، پل، کنوئیں اور عبادت گاہیں تعمیر کرائی جاتی تھیں دیسی صنعت و حرفت اور تجارت کو ایک خاص عروج حاصل تھا۔ اس کی طرز معاشرت اور حالات زندگی کا مطالعہ کرنے سے سوائے حصول سلطنت کی ابتدائی سخت گیری کے اور کوئی پہلو سے دم نہیں نکلتا۔ ایک ممتاز خوبی جو اس میں پائی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ اپنے اوقات کا بہت پابند تھا۔ اور سوائے ضروری آرام و تفریح کے تمام وقت فرائض کی مصروفیت و انہماک میں گذارتا سیر و شکار سے جو اب بھی صاحبان ثروت و حکومت کا جادہ عمل ہے۔ اسے کوئی دلبستگی نہ تھی۔ وہ کہا کرتا تھا "کہ شکار کار بیکاراں است" شہنشاہ محی الدین محمد اورنگ زیب نے اپنے بیٹے محمد اعظم شاہ سے اس بادشاہ کے تقسیم اوقات اور معمولات کا ایک خط میں جو ذکر کیا ہے

اُس کا احساس دل میں ماضرین سے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ممکن ہے کہ
عادت لوجہ اور ریاضت [illegible] ہو

چار گھڑی رات رہے خوابگاہ سے برآمد ہوتا۔ وضو کر کے اوراد و وظائف
میں مشغول ہو جاتا اور قبل صبح صادق بجماعت اہل فرض فریضۂ سحری ادا کرتا۔
پھر چار گھڑی دن چڑھے تک [illegible] درس میں [illegible] دیدار کو [illegible] کرتا
ان کے بعد دربار منعقد ہوتا جس میں امرا و اعلیٰ بار پاتے [illegible] دیوان اعلیٰ و میر بخشی
اہالیان خدمت کے کارنامے حضور میں عرض کرتے۔ ہر داد خواہ کا خود سنتا۔ اور ہر
ایک کا دامن امید ذرہ مدعا سے بھر دیتا۔ تاکہ دیکھا دیکھی عرض مطلب کا حوصلہ ہو۔ اس سے
[illegible] فیلان خاصہ کے ملاحظہ میں مصروف ہوتا۔ اور [illegible]
دیوان خانہ میں رونق افروز ہوتا۔ یہاں دو پہر تک معاملات ملکی و مالی [illegible]
[illegible] رہتے [illegible] احکام و فرامین جاری کیے جاتے [illegible] بعد طعام کا صحن
پاک [illegible] تیار کرایا جاتا تھا۔ بعد [illegible] تناول فرما کر وظیفہ خواروں اور
[illegible] داروں کے حق میں [illegible] سے روشناس [illegible] مسافر اور
طلبا کے [illegible] فرماتا ہوا۔ خوابگاہ خاص میں تشریف
لے جاتا تھوڑی دیر آرام کرتے [illegible] مسجد میں تلاوت قرآن مجید کرتا۔ اور نماز ظہر ادا
کر کے [illegible] میں آکر تشریف فرما ہوتا۔ یہاں دیوان
[illegible]
[illegible] فرمایا جاتا۔ اس [illegible]
[illegible] حاکم کو حضور میں پیش کرتے اُسکے
[illegible] کی حالی [illegible] اور تنخواہ جاگیر
[illegible] حکم [illegible]
[illegible] ہو کر جلوت کدۂ خاص میں تشریف لاتا یہاں مورخ و سیاح اور علما
[illegible] موجود [illegible] اور [illegible] اور احوال [illegible] کا [illegible]

رات انھیں مشاغل میں گذرتی۔ الغرض اُس نے اس طرح اپنے اوقات شب و روز کو منقسم کر رکھا تھا۔ جب تک تخت سلطنت پر متمکن رہا۔ سختی سے اس معمول پر عمل کیا۔

سید امتیاز حسین کوثر امروہوی



خیالات اکبر



دنیا کا رنگ دیکھ سکے میں آبدیدہ ہوں
انجام ہیں نگاہ کا آفت رسیدہ ہوں

صیاد مرگ میری کمیں میں ہے رات دن
دستِ عدم کا میں کوئی صید رمیدہ ہوں

حسرت سے دیکھتا ہوں سوئے گرد کارواں
ہستی کی راہ میں راہرو پا بریدہ ہوں

سنتا نہیں ہے کوئی مجھے گوش شوق سے
بزم جہاں میں حرف مکرر شنیدہ ہوں

دوش ہوائے شوق پہ ہر دم جو ہوں حباب
میں گلشن وفا کی وہ بوئے رمیدہ ہوں

آفت رسیدہ دوست بھی آفت سے کم نہیں
اے دوست الحذر کہ میں آفت رسیدہ ہوں

اہل جہاں کے واسطے سر بستہ راز ہوں
بالائے فہم ہوں میں طلسم آفریدہ ہوں

رو میں بہائے جاتا ہوں مثل گرہ خار و خس
میں وادیٔ حیات میں سیل رسیدہ ہوں

حسرت پرست گوش سحر آشنا ہوں میں
نغمہ ہوں دلنواز مگر ناشنیدہ ہوں

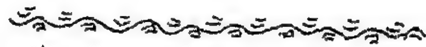
اکبر میں آشنا نہیں رنگ بہار سے
باغ جہاں میں نخل خزاں آفریدہ ہوں

جلال الدین اکبر بی اے



آنسو کی تاریخ

کائنات کا ذرہ ذرہ خوشی میں مست تھا۔ نسیم صبا نے مسرت کی لہر اڑائی۔ کلیاں مسکرائیں۔ غنچے چٹکے اور پھول کھل گئے۔ بلبل نے اپنی محبت سے لبریز چونچ رخسارِ گل پر رکھ دی۔ ساری فضا ایک نئے جذبہ، نرالی رو اور انوکھے گیت سے گونج اٹھی۔ طائروں نے سرگوشیاں کیں۔ اشجار جھک کر ایک دوسرے سے مل گئے۔ کانوں میں کچھ کہا اور وجد میں آکر جھومنے لگے۔ طاؤس رقص کرنے لگے۔ پپیہے پی کہاں پی کہاں پکارنے لگے۔ کوئل کی کوک سے ثابت ہو گیا کہ رازِ محبت فاش ہو چکا ہے۔



حضرت آدم تنہائی محسوس کرنے لگے۔ دلچسپیاں پھیکی، خوشیاں ناکمل اور جنتِ فردوس ویرانہ معلوم ہونے لگا۔ التجا کی۔ گڑگڑا کے دعا مانگی۔ اور مونسِ تنہائی کی خواہش کی۔ بارگاہِ ایزدی میں جوشِ رحمت موجزن ہوا۔ دعا مقبول ہوئی اور بی حوّا پیدا ہوئیں۔ اب اُن کی خوشی مکمل۔ مسرت موفور اور شادمانی مجسم تھی۔ دن گذرتے گئے حتیٰ کہ وہ دن آپہونچا۔ جب ابلیس کے بہکانے اور حوّا کے اصرار پر حکمِ خدا سے منحرف ہو کے دانہ گندم چکھا اور عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو کر زمین پر پھینک دیئے گئے۔ جنت کے آرام سپنے ہوئے۔ اور مسرتیں یاد آئیں۔ روح پرور مناظر کو دل للچایا۔ اور اس پر سکون وادی نے کشش کی۔ التجائیں کیں۔ تدبیریں نکالیں۔ لیکن مطلب حاصل نہ ہو سکا۔ آخر اپنی عاجزی قبول کی۔ غلطی کا اعتراف کیا۔ اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ لیکن غضبِ الٰہی ان باتوں سے نہ ٹل سکتا تھا۔ نہ ٹلا۔ گھبراہٹ بڑھی۔ اور مصیبت نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور وہ زندگی جو چند دن قبل نہایت خوشگوار اور راحت بخش معلوم ہوتی تھی۔ تلخی سے بدل گئی۔ غرض پھر دعائیں مانگیں سجدے کئے۔ اور خطا کی معافی چاہی۔ لیکن قہرِ الٰہی ان باتوں سے متزلزل نہ ہوا۔ آخر ایک نہایت قیمتی سفارش کے لئے نکلا

دعا کے وقت آنکھوں میں سما گیا - اور پیٹ سے نیچے گر پڑا - یہ پہلا اسکا تھا
لکایک ایک چاندنی پھیل گئی - آدم کا دل منور ہو گیا - اور سرہانے چھپا سے لگے
سفارش قبول ہو چکی تھی -

(اقبال احمد صدیقی، بی اے انرز)

کلام مہر

مانا کہ بدگماں ہم ہو گئے نہ آسماں سے — ہم سامنے جو ہو گئے نکلا بگا گیا زباں سے
میں اور تمہارا شکوہ کیسے ہو کس زباں سے — معلوم ہوا ہے ہو کچھ آج بدگماں سے
ہر سب بلائیں نازل ہوتی ہیں آسماں سے — ہر بد دراک سادل لائے کوئی کہاں سے
ضد ہے کہ اُن کے در پر بستر لگا کے بیٹھوں — دل میں یہی لگی ہے اب جو رہا سماں سے
آتا عرق جبیں سے زلفوں پہ شکل گوہر — نکھرے نہا کے تارے در مانگے آسماں سے
محدود ہائیں کو کیجئے کیا عشق کی حدوں سے — وسعت ہمارے دل کی ملتی ہے لامکاں سے
یہ داغ ہیں فلک پر تارے نہ ان کو سمجھو — سر آہ کے سبب غم گذرا ہے ہاں آسماں سے
کس کو سناؤں قصہ اپنے غم و الم کا — ہم بولتے سبا اعدا ہو آج بدگماں سے
بے التفاتیوں سے دنیا سے جاتے عمر بھر — زیر زمیں ہیں لاکھوں روٹھے ہوئے جہاں سے
پیری جو تیری ہی ہے تو مجھکو دیجئے گر دے — نکلیں تو سیاہ بال ہیں کافور بن زماں سے

کہتا ہے قہر تھک کر اُن کی گلی ہیں جا کر
گردش میں ہے مقدر اس دور آسماں سے

(قہر جالسی)



جہانگیر اور نور جہاں

مؤرخین اور تاریخدانوں کے درمیان جہانگیر اور نور جہاں کی ابتدائی محبت کی بابت اختلاف رائے ہے۔ بعض کو اس رائے سے اتفاق ہے۔ کہ چونکہ نور جہاں نے ابتدائی تعلیم و تربیت محلات شاہی میں حاصل کی تھی۔ لہذا بچپن ہی سے شاہزادہ جہانگیر اور نور جہاں کے مابین مستحکم تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اور ہوش سنبھالا تو ان جذبات میں زیادتی ہوتی گئی اور یہی وجہ ہے کہ تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے اس کے شوہر شیر افگن کو موت کے گھاٹ اتار کر نور جہاں کو اپنے دل و سلطنت کا مالک بنالیا۔ اب ہم کو دل کے واقعات پر غور و نظر کرنا چاہئے۔ تاکہ تمام احتمالات جو کہ مندرجہ بالا حالات سے پیدا ہو گئے ہیں رفع ہو جاویں۔ اس کے اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہم نور جہاں کی ابتدائی زندگی کا بھی مختصر حال مد نظر رکھنا ہوگا

نور جہاں جس کا بچپن کا نام مہرالنساء تھا۔ مرزا غیاث کی لڑکی تھی۔ اور جو راہ کہ قندھار سے ہندوستان کو آتی ہے وہاں ۱۵۷۷ء میں تولد ہوئی تھی بہت مصائب و مشکلات کو برداشت کرنے کے بعد مرزا غیاث کی دربار اکبری میں رسائی ہوگئی اور اقبال کا ستارہ اس کی پیشانی پر چمکا رفتہ رفتہ سلطنت کے اعلیٰ عہدہ پر ممتاز ہو گیا۔ مہرالنساء کی ابتدائی تعلیم و تربیت شاہی محلات میں ہوئی تھی لیکن اس کے اور جہانگیر کے درمیان دوستی کا پیدا ہونا کسی بھی تاریخ سے ثابت نہیں ہے اور کنبو وغیرہ کے بیانات سے مختصر حالات ملتے ہیں جس سے کہ نور جہاں کی سادگی اور معمولی پن تمام طور سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۷ برس میں اس کی شادی علی قلی خاں کے ساتھ کر دی گئی۔ جو کہ بردوان کا جاگیردار مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۶۰۶ء میں علی قلی یا شیر افگن بوجہ نفاق درمیان قطب الدین کو کہ مارا گیا اور نور جہاں آگرہ واپس چلی آئی یہاں سلیمہ بیگم (جو کہ جہانگیر کی والدہ تھیں) کے حضور میں خواصوں اعلیٰ کے عہدہ پر ممتاز ہوئی۔ ۱۶۱۱ء جشن نوروز

کا جلسہ منعقد ہوا۔ ہمارے عاشق مزاج بادشاہ کی نظر محبت اس مہ جبیں پر پڑی۔ اور تیر عشق نے دونوں کو گھائل کر دیا۔ پس فوراً جہانگیر کے ساتھ شادی ہو گئی۔ اور ایک معمولی جاگیردار کی بیوہ نہ صرف بادشاہ کے دل کی ملکہ تمام ہندوستان کی ملکہ بن بیٹھی۔

اب سوال زیر بحث یہ ہے۔ کہ آیا ان دونوں کے درمیان کوئی ابتدائی الفت بھی تھی یا نہیں؟ میں مندرجہ ذیل وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس رائے سے اتفاق کرنے کو بالکل تیار نہیں ہوں اگر ان کے ابتدائی عشق کا ہونا ایک سچا واقعہ ہوتا تو اس زمانہ کی کسی بھی تاریخ میں ضرور درج کیا گیا ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاہجہاں کے عہد تک اس واقعہ کا مورخین نے ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ لہذا یہ واقعہ محض ایک خیالی افسانہ ہے۔ جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ اور اس کو یقین کرنا خلاف از راہ عقل ہے۔ علاوہ بریں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے خطوط میں اس واقعہ کا ذرا بھی ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ سلطنت کے تمام دلچسپ و حیرت انگیز واقعات بالتفصیل ان خطوط کے ذریعہ معلوم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً خسرو کی کہانی۔ موت اور شاہجہاں کی بغاوت کے حالات ان اوراق میں بالتفصیل درج ہیں۔ سر ٹامس ہربرٹ اور پیٹر منڈی نے جہانگیر کے زمانہ کے تمام واقعات کو درج کیا ہے لیکن ان کے سفرنامہ نور جہاں اور جہانگیر کے ابتدائی عشق کی بابت بالکل خاموش ہیں۔ یہ بات ناممکن ہے کہ ان مغربی سیاحوں نے جہانگیر کے صرف اس قصہ کو قلمبند کرنے سے گریز کیا ہے۔ یہ بات اس واقعہ کی مضبوط دلیل ہے۔ کہ یہ واقعہ بالکل بے بنیاد اور آخر زمانہ کے ناول نگاروں کے دماغ کی صنعت ہے۔ اور تاریخی حیثیت سے سراسر غلط ہے۔ دوسرے یہ بات مشہور ہے کہ جب اکبر کو ان دونوں کی باہمی محبت سے آگاہی ہوئی تب اس نے مہرالنساء کی شادی شیر افگن کے ساتھ کر دی۔ تاکہ جہانگیر کے ملکہ کا مرتبہ اس ادنیٰ پایہ کی خاتون کو حاصل نہ ہو۔ یہ بات سراسر غلط ہے کیونکہ اکبر کو اپنے معمولی افسروں کے شادی بیاہ کے معاملات میں دخل اندازی کی بالکل

فرصت نہیں تھی - وہ تو اپنی مہمات ملکیہ میں مشغول تھا - علاوہ بریں نور جہاں کوئی کمینہ خاندان کی خاتون نہیں تھی - بلکہ اُس کا دادا خراسان کا وزیر اعظم تھا اور اس وجہ سے شرافت کا خون اُس کی رگوں میں بہتا تھا - لہذا اگر ابتدائی عشق ہوتا تو ضرور شادی کر دی جاتی - حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خیالی قصے جو کہ اورنگ زیب و آخری بادشاہوں کے زمانے میں لوگوں کے دل کو شاد کرنے کے واسطے ایجاد کیے گئے تھے تاریخی حیثیت سے کوئی اصلیت نہیں رکھتے - اور اکبر اعظم کے انصاف پسند و علم دوست اور فیاض نظر کے کیریکٹر پر سیاہ داغ لگانے کے واسطے ایجاد کیے گئے ہیں - اگر یہ واقعہ سچا ہوتا - تو جہانگیر اپنی تزک میں جہاں کہ اُس نے اپنی تمام غلطیاں و دیگر واقعات مثلاً ابوالفضل کا قتل شراب خواری و تخت پر آکر بیٹھنا وغیرہ کو تسلیم کیا ہے - ضرور کچھ حال اس عشق کی بابت لکھتا - پس نور جہاں کی محبت ۱۶۱۱ء میں شروع ہوئی - جبکہ وہ جہانگیر کے حرم ہی کی تھیں - بلکہ تمام ملک کی فرمانروا بن گئی تھی - مندرجہ بالا وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے یہ مفصل رائے قائم کر لی ہے کہ نور جہاں اور جہانگیر میں ابتدائی عشق قبل از شادی مطلق نہیں تھا - بلکہ یہ بعد کے ناول نگاروں کی من گھڑت ہے -

محمد الیاس علوی



غلام اور شیطان

(بچوں کے لئے کہانی)

کسی شہر میں ایک امیر رہتا تھا - وہ اس قدر دولتمند تھا کہ دور دور تو تو اُس کا ثانی نہ تھا - تمام جہان کی نعمتیں بہتر سے بہتر اُس کے پاس تھیں - ایک غلام - جو تھا -

آقا پر بڑا فخر کرتے۔ اور ہمیشہ کہتے۔ شاید صفحۂ ہستی پر ہمارے آقا کا کوئی ثانی ہو مگر اس سے بہتر آقا تو ہم کسی حال میں بھی نہیں لا سکتے۔ ہمیں اچھا کھانا کھلاتا ہے۔ کام قابلیت کے مطابق لیتا ہے۔ بغض اس سے کوسوں دور ہے۔ کسی سے دشمنی نہیں۔ کسی سے نفرت نہیں۔ تند مزاجی چھوٹ گئی۔ غرور تو کبھی پاس ہی نہیں پھٹکا۔ دوسرے آقاؤں کی طرح نہیں جو اپنے غلاموں کے ساتھ مویشیوں سے بھی بُرا سلوک کرتے ہیں۔ بغیر قصور سزا نہیں دیتا۔ ہر وقت ہماری بھلائی مد نظر ہے۔ ہماری بہتری کا خیال ہے۔ بڑی مہربانی سے گفت و شنید کرتا ہے۔ اس سے بڑھکر ہم غلاموں کے لئے اور کوئی بہتر زندگی کے اسباب روئے زمین پر نہیں۔ غرضکہ غلام ہمیشہ اپنے آقا کے مدح خواں تھے۔

(۲)

سلطان جو رعایہ قدم سے انسان سے بغض رکھتا ہے۔ یہ دیکھکر آگ بگولا ہو گیا کہنے لگا۔ "دو ٹکے ہی اف۔ یہ کس کا مقام ہے۔ کہ میری موجودگی میں ان بے ایمان غلاموں کے ساتھ ایسا اچھا سلوک ہو" پھر کیا تھا۔ اُن میں سے ایک غلام کو جس کا نام ابلیس تھا اسے بس میں کر لیا۔ اور اُسے حکم دیا۔ "دیکھو اوروں کو بھی ورغلاؤ"۔

ایک دن جبکہ سب غلام اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اپنے آقا کی تعریف کے گیت گا رہے تھے۔ ابلیس اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "یہ محض بیوقوفی ہے۔ کہ ہم اس قدر اپنے آقا کی تعریف کے پل باندھتے ہیں۔ جیسی خدمت ہم اُس کی کرتے ہیں۔ اگر ایسی سلطان کی بھی کی جائے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی ہم پر اتنا ہی مہربان نہ ہو۔ ہم تہ دل سے اُسکی خدمت کرتے ہیں۔ اُس کو ہر وقت خوش رکھتے ہیں۔ ابھی بات اُس کے منہ ہی میں نہیں آتی اور ہم فوراً اسے میسر کر دیتے ہیں۔ ہم تو اُس کی خواہشات کو پہلے ہی سے بھانپ لیتے ہیں۔ اور ہر وقت تابع فرمان ہیں۔ لازمی ہے کہ وہ مہربانی کرے۔ بھلا ذرا غور کرو کہ اگر اُس کو خوش کرنے کی بجائے ذرا تکلیف دیں تو پھر آسمان کیا رنگ لاتے ہیں تو ہمارا آقا اوروں کی طرح نامناسب نہ کریں۔

(۳)

دیگر غلاموں سے یہ سن کر رہا نہ گیا۔ اور یک زبان ہو کر بولے۔ نہیں ہرگز نہیں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ آؤ ہم شرط لگاتے ہیں۔ املت نے اس بات کا ذمہ لیا کہ وہ آقا کو ناراض کر دیگا۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ اگر املت اس شرط کو جیت جائے تو اس کو ایک اشرفی انعام اور اگر ہار جائے تو دو اشرفی جرمانہ۔ ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا بھی ذمہ لیا کہ اگر مالک اسے سزا دیگا یا قید کر دیگا۔ تو وہ اسکو رہا کرالیں گے۔

املت کے ذمہ بھیڑوں کی رکھوالی تھی اور بھیڑیں بھی ایسی جن کو آقا اپنی جان سے زیادہ رکھتا تھا۔ بس املت نے دل میں ٹھان لی۔ کہ جوں توں کر کے آقا کو ضرور ناراض کرنا ہے۔

اتفاق سے دوسرے دن آقا کا ایک دوست آیا۔ جس کو بھیڑیں دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا موقع پا کر املت نے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ کہ لو میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ تمام غلام اکٹھے ہو گئے۔ سلطان بھی یہ نظارہ دیکھنے کے لئے۔ درخت پر چڑھ گیا۔

آقا اپنے مہمان کو لے کر مویشی خانہ میں داخل ہوا۔ اور خوشی خوشی بھیڑیں اور ان کے ننھے ننھے بچے دکھائے۔ اور بعد ازاں یہ کہنے لگا دیکھئے صاحب! وہ ایک خاص بھیڑ ہے۔ جس کے سینگ مڑ کر لٹک گئے ہیں۔ ایسی ہے کہ اسکے عوض میں قارون کے خزانہ بھی نہ بیچ دیتا ہوں۔ آقا کا یہ فقرہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا۔ کہ تمام بھیڑیں سر بسر ہو گئیں۔ اور بیچارہ مہمان اور میزبان دونوں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے آقا دم بستہ رہ گیا۔ املت سے فوراً کہا۔ پیارے بھائی (رامبیری) ہماری بھیڑ کو تو پکڑ لاؤ تاکہ ہمارا مہمان ذرا اچھی طرح دیکھ لے۔ مگر دیکھنا ذرا ہوشیاری سے پکڑنا۔ کہیں ایسا ہو لاپروائی سے چوٹ آجائے۔ آقا کا کہنا تھا کہ املت بھیڑوں کے گلے پر چیتے کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اور اس لاثانی بھیڑ کو پکڑ لیا۔ اور پھر پچھلی ٹانگ پکڑ کر زمین پر گھسیٹتا ہوا مالک کے پاس لے چلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھیڑ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور وہ مائیں مائیں

گرتی ہوئی دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ ایلبت نے اسے پر بھی قناعت نہ کی۔ پھر دوبارہ مگر اب اگلی ٹانگ پکڑ کر دھڑام سے زمین پر دے پٹکا۔ اب تو سب غلام ہکے بکے رہ گئے۔ سلطان درخت پر بیٹھا خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔

(۴)

آقا کا منہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ مگر بجلی کی طرح چمک کر رہ گیا۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ مہمان و دیگر غلام حیران تھے۔ کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد آقا اپنی جگہ سے ایسے ہلا جیسے اسے غصہ کا بوجھ اتار کر رکھ رہا ہے۔ پھر آنکھیں اوپر اٹھا کر خدا کی طرف ذرا دھیان لگایا۔ اسی دیر میں اُس کا غصہ ہوا ہو گیا۔ اور ایلبت کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور کہا۔ تیرا مالک شیطان مجھ کو غصے کی طرف کھینچتا ہے مگر میرا مالک مجھ کو راہ راست پر لاتا ہے۔ میں تیرے مالک کی خوشی نہیں ہونے دوں گا انشاء اللہ میں تیرے مالک کو چابک کی طرح اپنا غلام اور تابع فرمان بناؤں گا تمہیں تو یہ ڈر ہو گا۔ کہ آقا سزا دے گا۔ مگر نہیں ہرگز نہیں۔ بجائے سزا کے میں آج سے تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ اور تم جہاں چاہو۔ جا سکتے ہو۔ تم آج سے غلام نہیں رہے۔ سلطان جو درخت پر بیٹھا تھا۔ آقا کی خدا ترسی دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ زمین پھٹ گئی اور وہ اس میں سما گیا۔

(۵)

ایلبت کی شرم کے مارے آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔ باقی غلاموں نے بھی آقا کو امتحان میں سچا پا کر خوشی کے نعرے مارے۔ اور سب نے اُسی دن سے قسم کھائی کہ آئندہ خواہ کچھ بھی ہو۔ وہ ان کا آقا رہے گا۔ اُس کا مرتے دم تک دم بھرنا ہمارا فرض اولین ہے۔ ایلبت کی کایا پلٹ گئی۔ اور اُس دن سے وہ سب سے بڑھ کر آقا پر جان دینے لگا۔

دیوراج چوہدری ایم۔ اے



مال روڈ کے ایک حصے کا نظارہ

شباب اردو لاہور



ہارس کورٹ (۱۹۲۵ء)

کلام مضطر

جلوہ طرازیٔ رخ زیبا لئے ہوئے
بیٹھا ہوں دل میں شمع تمنا لئے ہوئے

یارب کہوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کوئی دوست
سینے میں اک چراغ تمنا لئے ہوئے

آئینۂ جمال میں وہ بے نقاب ہیں
رنگینیٔ بہار تماشا لئے ہوئے

لو آرہا ہے پھر کوئی مست غرور حسن
آنکھوں میں ایک قلزم صہبا لئے ہوئے

سرار دو جہاں ہوں میں اک بے بس حباب
سر میں پھروں عشق کا سودا لئے ہوئے

میں آسمان حسن کا ادنیٰ غلام ہوں
ہستی ہے میری اوج ثریا لئے ہوئے

میری نگاہ شوق کی پہنائیاں نہ پوچھ
پھرتا ہوں اضطراب کی دنیا لئے ہوئے

میرا وجود باعث تخلیق دو جہاں
میری نمود ہستی اسما لئے ہوئے

مضطر وہ چشم مست ہے اپنی نگاہ میں
بیٹھے ہوئے ہیں ساغر صہبا لئے ہوئے

مسٹر رام رتن مضطر

مصطفیٰ کمال پاشا

مصطفیٰ کمال ۱۸۸۰ء میں سالونیکا میں پیدا ہوا۔ یہ متوسط درجے کے ایک شریف تجارت پیشہ خاندان سے ہے۔ اس کا باپ پہلے سرکاری اہلکار تھا مگر بعد میں سرکاری چوب کا سوداگر بن گیا تھا۔ اوائل عمر ہی میں مصطفیٰ نے ثابت کر دیا کہ علم ریاضی میں اُسے خاص درک اور دسترس حاصل ہے۔ اُس کی ذہانت سے متاثر ہو کر اُس کے اتالیق نے اسے "کمال" کا خطاب عطا کیا تھا جو اب تک

اُسکے نام کا جزو بنا چلا آتا ہے۔

۱۹۰۴ء میں اُس نے فوجی کالج سے فارغ التحصیل ہوکر کپتان کا رتبہ حاصل کیا۔ نوجوان ترکوں کی طرح یہ بھی پرانے طرزِ حکومت سے بیزار و برہم ہوتا۔ اور اسی وجہ سے علاقہ شام میں بھیجا گیا۔ پہلے دمشق رہا۔ پھر جافہ میں ایک نائب افسر یا اہلکار کی خدمات انجام دیں۔ اُسے ان ہر دو مقامات میں ہم خیال آدمی کثرت سے ملتے رہتے جو سلطان ترکی کے مظالم کے شاکی تھے۔ آخر جافہ سے بھاگا اور مصر اور یونان سے ہوتا ہوا سالونیکا پہنچا۔ یہاں اُس نے افسروں سے مل کر "انجمن ترقی و اتحاد" کی بنیاد رکھی۔ یہی وہ انجمن تھی جس نے انجام کار سلطان عبدالحمید کو ۱۹۰۹ء میں معزول کرکے شخصی حکومت کے جانے اور کانسٹیٹیوشن کے قیام کا اعلان کیا۔ جاسوسوں نے جو ہزاروں کی تعداد میں ملک کے ہر گوشے میں موجود تھے۔ اس کی تقریروں کی اور اس کے مشاغل اور حرکات کی نمک مرچ لگاکر حکام کے گوش گذار کردیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی گرفتاری کا حکم ہوا۔ مگر یہ اپنے دوست جمیل بے سب کمانڈنٹ پولیس سالونیکا کی مدد سے جافہ میں اپنے عہدہ پر بحال کیا گیا۔ معاملہ رفع دفع ہوا۔ اور مزید کارروائی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب پر مصطفےٰ قسطنطنیہ واپس آیا۔ حکومت کانسٹیٹیوشن کے قیام کے اعلان کے بعد انجمن اتحاد و ترقی۔ سالونیکا میں جلسہ کا انعقاد کیا۔ اس میں مصطفےٰ نے بڑے زور و شور اور سرگرمی کے ساتھ انور پاشا کی اس تجویز کی پُرزور مخالفت کی کہ افواج کو بھی اپنے ساتھ شامل کرکے سیاسیات میں دخل دینے کا موقع دیا جائے۔ اس نے نہایت معقول اور مدلل پیرایہ میں ثابت کردیا کہ فوج کا سیاسیات میں دخل دینے سے باز رہنا صرف مناسب ہی نہیں بلکہ از بس ضروری تھا۔ یہ انور بس خوب سمجھتا۔ اور بتاتا تھا۔ کہ کسی مطلق العنان خود رائے اور خود سر فوجی افسر کے ہاتھ حکومت کی باگ دے۔ جسے فوجیوں کی سرکرداری کے سبب خود اپنی اغراض کی خاطر ملکی مفاد کو خواہ مخواہ بالائے طاق رکھدیتے ہیں۔ بہت قباحتیں پیدا ہوں گی۔ اُس نے بڑی سرگرمی سے ساتھ ناقص نظام حکومت کی

بجائے حقیقی جمہوریت کے مستقل قیام کی یہ سادہ سا خیالی از دلچسپی نہیں۔ کہ وہ ہمیشہ اسی اصول پر قائم اور اُسی کے حصول حمایت کیلئے کوشاں رہا۔ آخر جب اُسے یقین ہو گیا کہ اس کے دلائل اور براہین قاطع کی سماعت کا سرے سے امکان ہی نہیں۔ تو اُس نے کمیٹی سے قطع تعلق کر لیا۔

۱۹۱۱ء میں جب اطالویوں اور ترکوں کے درمیان جنگ چھڑی تو مصر کے حکام کی بیداری اور چوکسی کے باوجود طرابلس پہنچا۔ اور درنا کے مقام پر افواج کی کمان لیکر اطالویوں کے مقابلے میں اختتام جنگ تک لڑتا رہا۔ جنگ بلقان ۱۹۱۲ء کے دوران میں اُسے بلغاریوں کی زبردست پیش قدمی کی روک تھام کے لئے گیلی پولی بھیجا گیا۔ اس عاقبت سوز جنگ کے اختتام پر صوفیہ میں جنگی اٹاچی ماسٹر کے عہدے پر مامور ہوا۔ اور جنگ عظیم کے آغاز تک اسی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

مصطفےٰ کبھی بھی جرمنی طریقۂ جنگ کا مداح نہیں رہا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں اس نے بڑے شد و مد کے ساتھ جنگ میں شرکت کی مخالفت کی۔ اور یہ تلقین کی۔ کہ ترکی کو لازم ہے۔ کہ صورت حالات اور جنگی کارروائیوں کا بحیثیت ایک غیر جانبدار ملک کے بغور ملاحظہ کرتا رہے۔ لیکن انور پاشا جو پوٹسڈم کے جنگی طریقوں کا دلدادہ اور جرمنی کی جنگ پسند جماعت کا شیدا اور والہ تھا۔ اس دفعہ بھی بازی لے گیا۔ اور روم کو جرمنی کا حلقہ بگوش غلام بنا کر رکھا۔

مصطفےٰ کمال کو انور پاشا سے اختلاف تھا۔ یہ جنگ عظیم کے دوران میں جرمنی کے اقتدار اور اُس کی قیادت کی برابر مخالفت اور قیصر کے سپہ سالاروں کی ہر موقع پر نکتہ چینی کرتا رہا۔ اُس نے ببانگ دہل اعلان کر دیا۔ کہ جنگ عظیم کا انجام جرمنی کے حق میں مہلک ثابت ہوگا۔ یہ اپنا فرض نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرتا۔ اور جو تھوڑا بہت کام طوعاً و کرہاً اس کے سپرد کیا گیا۔ اُسے بطریق احسن سرانجام دیتا رہا۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ انور پاشا کے پہلو میں یہ خار کسطرح

کھٹکتا رہا۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے انور نے اسے ایک ایسی ڈویژن کی کمان دی جس کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ اسے حکم دیا کہ اُن افواج کے بچے کھچے آدمیوں سے جو میدان کارزار میں تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ ایک ڈویژن بنالو۔ اس حکم کی تعمیل میں کمال نے ان خستہ حال اور مضمحل سپاہیوں کو اکٹھا کر کے وہ نادر اور بے مثل ڈویژن بنائی۔ جس نے گیلی پولی میں اس کے زیر کمان بڑا نام پایا۔ وہ دردانیال میں حملوں کی جو گت بنی۔ جو حشر اُن کی افواج کا ہوا۔ اور جو غلبہ اُن پر کمال کو اس محاذ پر نصیب ہوا۔ وہ جنگ عظیم کے کارناموں میں سب سے زیادہ حیرت خیز تسلیم کیا جاتا ہے۔

جب کاکیسس (یا کوہ قاف) کی محاذ پر اسے گیلی پولی سے بھیجا گیا تو جو نقصانات انور کی افواج نے اٹھائے تھے اس نے ان سب کی تلافی کر دی۔ روسیوں سے موش اور بتلیس واپس لیے۔ اور ترکوں کی پہلی شکستوں کی یاد کو لوگوں کے دلوں سے محو کر دیا۔ شام کی جنگی کارروائیوں میں بہ معیت جرمنی جرنیلوں سے ہمیشہ اُس کا اختلاف رہا کمال پاشا کی سوانح عمری میں کئی مقامات پر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کمال اور جمال کا جرمنی کے جرنیلوں کے ساتھ اکثر جھگڑا رہتا تھا کمال نے وزارت جنگ اور وزیر اعظم کی توجہ کا مذل اس معاملہ میں بار ہا کرانے کی کوشش کی مگر شکایات اور خطوط کا جواب تک نہ دیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ جرمنوں سے تعاون ناممکن ہو گیا ہے۔ تو استعفا دے کر قسطنطنیہ چلا گیا۔ یہاں اُسے حکم ملا کہ روم کے ولی عہد کے ساتھ جرمنی میں جاؤ یہ گیا۔ اس نے محاذ کا چکر لگایا۔ اور سرکاری افسروں اور وقائع نگاروں کو اپنے خیالات کے اظہار سے پریشان کر دیا۔ جہاں جاتا پہلے ہی پوچھتا۔ کہ تمھاری پرزور یا مخصوص فالتو فوج کہاں ہے۔ تم نے اڑے وقت کے لیے الگ کر رکھی ہے جواب ملتا کہ ایسی کوئی فوج نہیں۔ اس پر کمال جھنجھلا کر کہتا کہ تم ظاہر کرتے ہو کہ تم فتحیاب کہہ رہے ہو۔ مگر اس صورت میں تم ہرگز فتحمند کہلانے کے مستحق نہیں ہو تمھاری حالت بہت نازک اور مخدوش ہے۔ جب لوڈنڈورف نے اس سے پوچھا

کہ جنگ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ تو کمال نے منافقت سے کام نہ لیا۔ اور صاف
صاف بلا رو رعایت کہا۔ کہ تم نے بازی ہار دی ہے۔ حسرت دشمن کی ہے۔

جب روم واپس آیا تو کمال نے سلطان کے اصرار پر ساتویں نمبر کی
فوج کی کمان لینا منظور کر لیا۔ یہ فوج شام میں تھی۔ لیکن یہاں جنگ کے قریب
قریب اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ انگریزوں کی کثیر فوج کے سامنے ترکوں کو ہٹنا
پڑا اور حلب آ پہنچے۔

عارضی صلح کے بعد اس نے اپنی فوج کو نہایت دانائی اور کارگری سے
انگریزوں کے نرغے سے نکالا۔ لیکن اب قسطنطنیہ سے مدافعت کو جاری رکھنے کی
منظوری نہ پہنچنے پر اُس نے استعفا دے دیا تاہم ترکوں کی افواج اور کئی [illegible]
سے بچانے میں نمایاں طور پر کامیاب ہوا۔

قسطنطنیہ میں اس وقت لوگ مایوس اور افسردہ خاطر ہو رہے تھے یہاں
تک کہ بڑے بڑے گرم جوش قوم پرست بھی ہمت ہار بیٹھے تھے۔ ہر فرد و بشر اپنے
کو قسمت کے حوالے کر چکا تھا۔ اور نوشتہ تقدیر کا منتظر تھا۔ بعض کا خیال تھا۔ کہ امریکہ
عارضی طور پر حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیکر ٹرکی کو پارہ پارہ ہونے سے بچا لیگا۔
مگر مصطفےٰ کمال تھا کہ اس یاس و حرماں کے عالم میں بھی جب ادبار کی گھٹائیں ملک
پر چھا رہی تھیں مادر وطن کی خوش طالعی کا قائل تھا۔ اُسے یقین واثق تھا۔ کہ
کہ ٹرکی اغیار کی امداد سے نہیں بلکہ خود اپنی افواج اور وسائل [illegible]
سے اب بھی نجات حاصل کر سکتا ہے۔

جب یونانی سمرنا فتح کر چکے۔ تو اُسے سمت [illegible] میں فوج [illegible]
بھیجا گیا۔ سمسون بحرہ اسود پر واقع ہے۔ یہاں اُس نے سمرنا کو [illegible] کی
غرض سے افواج کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے کی [illegible] لیکن سلطان اور
اتحادیوں کو اس پر شبہ ہوا۔ اور دار الخلافہ [illegible] واپس بلا بھیجا [illegible] قسطنطنیہ لوٹ
گیا۔ مگر استعفا لکھا اور بھیج دیا۔ پہلے ارض روم [illegible] اور بعد میں ایک اور مقام [illegible]

قوم پرستوں کے جلسے منعقد کئے۔ جلسوں کے برخاست ہونے سے پہلے کانگرس نے ایک مستقل اور دوامی کمیٹی بنائی۔ اور مصطفٰے کو اس کا صدر مقرر کیا۔ سلطان نے اسے جلاوطن کر دیا۔ لیکن اس کا رسوخ اور اقتدار اس سرعت سے بڑھتا گیا۔ کہ داماد فرید پاشا کی مجلس کا بھی استعفا دینے پر مجبور ہوئی۔ علی رضا پاشا کی سرگردگی میں اب نئی مجلس کا بنی۔ اور اس وزارت نے کمال سے عارضی صلح کر لینے کی ٹھانی۔ بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو کمال نے اس شرط پر بہت زور دیا کہ نیشنل اسمبلی کا اجلاس ایسا کو چھوڑ کر کسی ایسے اندرونی علاقہ میں ہو۔ جہاں اتحادی اپنی انہی سپہ گیری تجویزوں سے یا اپنی شرکت سے اس مجلس کے کام میں مانع یا مزاحم نہ ہو سکیں۔ علی رضا اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکا تھا انگریز قسطنطنیہ پر قابض ہو گئے۔ اور اس کے ارباب حکومت کو مسمار کر کے اکثر کو مالٹے میں نظر بند کر دیا۔ اب مصطفٰے نے انگورا میں ایک ہی مجلس کا اجلاس کیا۔ سلطان نے جو اوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا تھا ایک فوج بھیجی تاکہ کمال کو ہوش میں لائے اس فوج کا نام تھا فوج امن۔ علاوہ بریں اناطولیہ کے کسانوں کے درمیان سلطان ہی کے ایما سے کمال کے خلاف بغاوتوں کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس نے فوج امن کو نہایت آسانی سے شکست دی۔ اور باغیوں کی سرکوبی کر کے فتنہ و فساد کو فرو کیا۔

انگلستان نے اب یونانیوں کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور یونانی افواج نے اندرونِ ممالک میں بڑھنا شروع کیا۔ جنوری اور اپریل میں دو لڑائیاں ہوئیں۔ اور یونانیوں کی ترقی رک گئی مگر انگریزوں نے ہار نہ مانی۔ بلکہ رسد کے ذخائر اور آلات حرب کثرت سے یونانیوں کو بھیجے۔ جس کے طفیل سے انھوں نے پھر انگورہ کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ ترکوں نے پورے بائیس دن کی طویل لڑائی کے بعد اس پیش قدمی کو بھی روکا۔ اور قومی مجلس یعنی نیشنل اسمبلی نے کمال کو اس کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں فیلڈ مارشل بنا دیا۔ لیکن اس کے پاس اب

سامان جنگ کی قلت تھی۔ اور اپنی فتوحات سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ یونانیوں نے مورچہ بندی کر کے ایک اچھا محاذ قائم کیا۔ اور اُسے مستحکم کر لیا۔ اس جنگ نے طول پکڑا۔ اور ترکوں کی حالت روز بروز نازک تر ہوتی گئی۔ کیونکہ آٹھ سال کی متواتر صبر آزما لڑائی میں اُن کی ہمت اور استقلال کا کافی سے زیادہ امتحان ہو چکا تھا۔ ترکوں کی مملکت کے بیشتر حصہ پر اتحادی قابض تھے۔ اور چونکہ سمندروں پر انہی کا پورا پورا تسلط تھا اس لئے گولہ بارود اور آلات حرب کسی صورت میں بھی میسر نہ آ سکتے تھے۔ جب مایوسی اور بے بسی کا یہ عالم ہوا۔ تو حکومت اور سپاہ نے صلح کرنا چاہی۔ مگر کمال نے اس طرح ہمت ہارنے کو مذموم سمجھ کر اُس کی پُرزور مخالفت کی اور نہایت صبر اور ثابت قدمی سے ایک آخری کوشش کی تیاری میں مصروف ہوا۔ پھر کیا تھا۔ یہ مرد میدان ہر مقام پر نظر آنے لگا۔ کبھی انگورہ میں حکومت کے ارکان افسردہ خاطر کی دلجوئی کرتا۔ کبھی میدان جنگ میں افواج کو [illegible] دے دے کر ان کا حوصلہ بڑھاتا۔ تو کبھی دیہات میں جا جا کر لوگوں کو تسلی دیتا تھا۔ آخر جس سامان کا وہ مدت سے منتظر تھا۔ آ پہنچا۔ اُس نے مجلس کو اطلاع دی۔ کہ ۲۵ ر اگست ۱۹۲۲ء کو میں جارحانہ کارروائی شروع کر دوں گا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ یونانیوں کے سب سے زیادہ مستحکم اور مضبوط مقام افیون قرہ حصار پر ایسا حملہ کیا کہ یونانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اڑتالیس گھنٹہ کے اندر اندر انکا قلع قمع کر دیا ۳۰ ر اگست کو اُن سے پھر لڑا اور قطعاً منتشر کر دیا۔ ۹ ر ستمبر کو اس کی فوج ظفر موج سمرنا میں داخل ہوئی۔ حلیفوں نے عارضی صلح کی درخواست کی۔ اور جو عہد و پیماں ہوئے اُن کی رو سے ترکی نے اپنے یورپی مقبوضات مع [illegible] واپس لے لئے۔ پھر عصمت پاشا کو لوزان بھیجا۔ اور حلیفوں کو اس امر پر رضامند کر لیا۔ کہ ترکوں نے جو مشروط امتیازات قبول کی تھیں اُن کو منسوخ کر دیا جائے۔

۲۹ ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو جمہوری حکومت کے اعلان پر اور عمارت کے کام کا پہلا حصہ اختتام پذیر ہوا۔ ترکی کا ملک گو کچھ عرصہ کے لئے [illegible] یورپ سے [illegible]

گیا تھا اس طرح سودا رہوا۔ اسکی گذشتہ کمزوریاں فروگذاشتیں اور ذلتیں صفحہ تاریخ سے ہمیشہ کے لئے محو ہو گئیں۔ اور اُس کی تحقیر حقارت اور رسوائی سب حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔

مصطفےٰ کمال کا نام تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ نہایت آب و تاب کے ساتھ چمکتا رہیگا۔ اُس کو آنیوالی نسلیں ایک نہایت ممتاز اور عظیم الشان ہستی قرار دے گی۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ اُس نے مادر وطن کو اغیار سے مخلصی دلائی۔ بلکہ زیادہ اس واسطے بھی کہ اُس نے ٹرکی کی آئندہ عظمت اور اقبال کی بنا رکھی۔ مختلف زمانہ کے بڑے بڑے آدمیوں کی طرح وسعت نظر اور خود اعتمادی میں نہ آپ اپنی نظیر ہے ترکی نسل کی آئندہ بڑائی کا اسے وثوق ہے۔ اور اس معاملہ میں اس کا ایمان کبھی بھی متزلزل نہیں ہوا۔ حتی کہ ۱۹۲۰ء کے عارضی صلح اور التوائے جنگ کے سخت پرخطر اور نا امیدوار ایام میں بھی اُس کے پاؤں نہ ڈگمگائے۔ اور ۱۹۲۱ء کے یونانی حملے کے موقع پر اُس کے جوش استقلال میں فرق نہ پڑا۔ حالانکہ اُس وقت مملکت ٹرکی کے پارہ پارہ ہو جانے کا احتمال تھا۔ سخت تباہی اور بربادی کے موقعوں پر بھی اُس کے پائے استقامت کو لغزش نہیں ہوئی۔ ہشت سالہ جنگ کے دوران میں صرف یہی ایک ایسی ہستی تھی جسے اپنی ذات پر اعتماد رہا۔ مایوسی اور ملال کو اپنے پاس تک پھٹکنے نہ دیا۔ ناامیدی سے سینہ سپر ہو کر لڑا۔ اور آڑے وقت میں اسکی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ جو رہتی دنیا تک اُن اقوام کو مشعل ہدایت کا کام دیں گے جنھیں تباہی کا یقین ہو گیا ہو۔ ہماری نسل کبھی مر نہیں سکتی۔ اور اگر بفرض محال یہ مر بھی جائے۔ تو زمین کے جوف میں ایسی طاقت نہیں۔ کہ اُس کے تابوت کے بوجھ کو اٹھا سکے۔

اس کے جنگی کارناموں کو زیادہ شرح و بسط سے لکھنے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ بس اتنا کہدینا ہی کافی ہے۔ کہ بے تعصب اور اہل الرائے جنگی مفادوں کے خیال میں دردانیال میں اس کی فن سپہ سالاری سے اعلیٰ درجہ کی

واقفیت۔ لوتاہیوں کی بسپائی اور پامالی اور اناطولیہ کی آزادی۔ یہ چند کارنامے ایسے ہیں۔ کہ یہی اور فقط یہی اسے جنگ عظیم کے سپہ سالاروں میں اعلیٰ اور ارفع ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن وہ کام جو اُس نے جنگ کے بعد ایک نئی سلطنت کے قیام کی صورت میں کیا۔ ایسا حیرت انگیز اور عالی شان ہے۔ کہ اسے حقیقی معنی میں شہرت عام اور بقائے دوام کا خلعت پہنا سکتا ہے۔ بلحاظ مصلح ناظم اور مدبر اس کی قابلیت کا صحیح اندازہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جمہوری سلطنت ٹرکی کی اُس عجیب ترقی اور کارناموں کو دیکھا جائے۔ جو اسے چند سال کے عرصہ میں کمال کے طفیل سے نصیب ہوئے۔

ٹرکی کے موجودہ مدبروں میں مصطفےٰ ہی علاوہ وہ شخص تھا جس نے اس امر کو محسوس کیا۔ کہ ٹرکی کو طبعی موت سے بچانے۔ اس کی اصلاح کرنے اور آئندہ عظمت اور اقبال کو مضبوط بنیاد پر قائم کرنے کے لئے پرانے اصول حکومت۔ اور روایات قدیمہ کو یکقلم موقوف کر دینا ازبس ضروری ہے۔ ایسی ویسی ادھوری تجاویز جو ماقبل العمل ہو چکی تھیں وہ ناقص ثابت ہوئیں۔ اس کے مسیح و مدبر نہ بن سکے۔ جو لنگڑی کس مرہم تجویز کئے گھاؤ کی تہ تک نہ پہنچے۔ اور نہ کارگر ہوئے۔ ٹرکی کے قانون اور وضع قانون کے مغربی ضوابط اور اداروں کی تجویز سے صورت کے حالات بد سے بدتر ہو گئی تھی۔ کیونکہ ایسا کرنے سے حقیقی مرض کی تشخیص زیادہ مشکل ہو گئی۔ اس کے ازالہ کے لئے مرہم کی نہیں، نشتر کی ضرورت تھی۔ وقتی اور فوری کے لئے ادھوری تجاویز کی نہیں بلکہ ایسی انتہائی مکمل تدبیر کی ضرورت تھی۔ جو سابق دستور العمل کو جڑ سے اڑا کر قدیم نظام حکومت کو زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق تھوڑا بہت بدل دینا جدال [illegible] نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ پرانی عمارت کو گرا کر ایک ایسے جدید نظام کی تعمیر لازمی تھی جو آج کل کے زمانے کے حسب حال ہو۔ اور اس کے اقتضا کو پورا کرے۔ الغرض ضرورت اس بات کی تھی۔ کہ ماضی سے تعلق قطع کر لیا جائے۔ مملکت کے اُن اجداد حصص کو جو مریضانہ [illegible] جو دیا

بدرجہ بحر وا مخالف سائل ہو سکتے تھے۔ مگر حقیقی معنوں میں اس کا جبر و بدل یہ بنے تھے۔ اُن کو گویا جراحی عمل کے بعد کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ ترکی نژاد لوگوں کی تفریق و تشتت کو دور کر کے اُن کو ایک متحد و مربوط قوم کا بنایا جائے۔ اور بتدریج ترقی کرنے کرتے زمانہ حال کی مملکتوں کی سی ایک مملکت قائم کی جائے۔ یہ بھی حکمت عملی جو اس کے ذہن میں تھی۔ جس کا یہ قائل تھا۔ اور جس کی اشاعت کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ ہے وہ نصب العین جس کے حصول کے لئے یہ کوشاں ہے۔ اور جس کو یہ یک لخت نہیں بلکہ آہستہ آہستہ اور ایسی تدابیر کی متواتر اور مسلسل ترویج سے جن سے قوم اور ملک کی ترقی کا یقین ہو۔ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے یقین ہے۔ کہ ہر چیز کی تحصیل کے لئے پوری طیاری کی ضرورت ہے۔ اس لئے کبھی کسی چیز کو محض اتفاق یا تقدیر پر نہیں چھوڑتا کسی تجویز کو نافذ کرنے سے پہلے ہر زاویۂ نگاہ سے اس پر غور کرتا ہے۔ اور پھر جب اُس کے نفاذ کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ تو اُس پر سختی سے عمل کرتا ہے۔

جب اُس نے جمہوریہ ترکیہ کے قیام کا فیصلہ کر لیا۔ تو کمال نے اس تجویز کو جامہ عمل پہنانے کی بھی منظم کوشش کی۔ پہلا کام جو اس باب میں ظہور پذیر ہوا یہ تھا۔ کہ سلطان کی عملداری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس عملداری سے لوگ اس لئے متنفر ہو گئے تھے۔ کہ سلطان نے غداری کی اور یونانیوں کی شکست فاش اور سمرنا کی دوبارہ تسخیر کے بعد سلطان ایک برطانوی جنگی جہاز پر اس خوف سے بھاگ گیا کہ کمال اپنی مظفر و منصور فوج کو لیکر قسطنطنیہ پر چڑھائی نہ کر دے۔ دوسرا کام یہ تھا۔ کہ خلافت کو جو سلطان کے فرار ہو جانے پر جاری رہ گئی تھی توڑ دیا گیا اور تیسرا کام ۲۹ ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کو جب قوم جمہوری سلطنت کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ اس کے قیام کا اعلان کرنا تھا۔

جمہوری حکومت کا اعلان گویا کمال کی عمرانی حکمت کی پہلی منزل ہی سے اسے طے کر لیا گیا۔ قانون اور حکومت دونوں کو مذہب سے جدا کر کے دنیاوی رنگ

دیا گیا۔ اب روزگار اور ترقی کا در کھولنے کے لئے کسی خاص مذہب سے تعلق کے طلسم کی ضرورت نہ رہی۔ مداخلت کے لئے دوسری دول کو اب مذہب کا بہانہ ملنا دشوار ہو گیا قانونِ دیوانی کے نفاذ اور اس کامیابی سے عملدرآمد ہونے پر اقلیتوں نے جن کے حقوق کی نگہداشت کے لئے عہد نامہ لوزان میں خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ نئی حکومت میں داخل کئے جانے اور اس کے فوائد کے متمتع ہونے کے لئے درخواست کر دی ہے۔ مذہب کی آڑ میں نسواں کو مردوں سے اب کمتر نہیں سمجھا جاتا۔ نہ کسی مسلمان ترک عورت کو غیر مسلم سے عقد کرنے کی اب ممانعت ہے۔ پردہ۔ حرم سرائے کی قید اور کثرت ازدواج اب زمانہ قدیم کی باتیں سمجھی جانے لگی ہیں۔ ہر بچہ سن بلوغت کو پہونچنے پر (لڑکا ۱۸ برس کی اور لڑکی ۱۶ برس کی عمر میں) جس مذہب کو چاہے قبول کر سکتا ہے۔ ماسوا اس کے حال ہی میں ایک قانون کی رو سے ہر شخص کے لئے جو شادی کرنا چاہے طبی معائنہ قرار دیا گیا ہے۔ اور سول مجسٹریٹ کے پاس پیشتر اس کے کہ وہ رسم شادی پر اپنی مہر تصدیق و توثیق لگائے جسمانی صحت اور تندرستی کی سند پیش کرنا پڑتی ہے۔ رنگا رنگ کے لباس جو ایک عرصہ تک آرام طلب استنبول اور دیگر ترکی شہروں کا پیارا لباس تھے اب متروک ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ پیرس کے جدید ترین فیشن کے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ اب بھی کہیں کہیں قدامت و عربیت خالص ترکی چیزیں اور رسمیں دیکھنے میں آتی ہیں مگر ہر جگہ بلکہ چپہ چپہ پر مغربیت کی لہر اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ موسیقی کے ہال متحرک تصاویر کے منڈوے اور قسم قسم تماشا گاہیں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ جو رات بھر لوگوں کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچاتی ہیں ناچ گھروں میں نو عمر آدمی اور نوخیز لڑکیاں جدید ترین ناچ ناچتی اور گاتی بجاتی ہیں۔

ترکی غازی اور اس کے قابل کارکنوں کے طفیل سے نہایت سرعت کے ساتھ اپنی وضع اور ہیئت تبدیل کر رہا ہے۔ اور ہم بلا خوف و تردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ غازی کو آدمیوں کے پرکھنے اور موزوں اہلکاروں کو مناسب عہدے دینے کا خاص ملکہ

حاصل ہے۔ اس کی حکمت عملی یہ ہے کہ زمانہ قدیم سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔

اس خصائل خصوصی میں انتہا درجہ کی حب الوطنی ملک کی ہوا خواہی غایت درجہ استقلال (جو اناطولیہ کے کسانوں کے حصہ میں عموماً آتا ہے) اور اسی قوم کی قوت قسمت میں اعتماد بدرجۂ اتم شامل ہیں۔ یہ اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار اور سپاہ گر اور مدبر ہے۔ بے تکان لگاتار کام کر سکتا ہے۔ ناقابل عمل تدابیر سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ اس میں مقناطیسی لطافت ہے جس کے سبب سے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر کے سیدھے ہاتھ ڈال لیتا ہے۔ حیرت خیز قوت مشاہدہ کا مالک اور غور و فکر کا عادی ہے۔ حسب موقعہ نہایت سخت گیر اور مہربان ہو جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے خوش طبع بھی ہے۔ انتظام سلطنت کی نہایت پُرتکلف ذمہ داری کے باوجود تفریح طبع کے واسطے کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیتا ہے۔ کبھی کبھی شراب بھی تھوڑی سی پی لیتا ہے گاہے گاہے ناچ میں حصہ اور تماشہ میں بھی دلچسپی لیتا ہے۔

یہ ہے اس بیسویں صدی کے اس مرد میدان کا مجمل حال۔ ترکیہ جمہوریہ اس کی عظمت کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ اسی کے صدقہ میں اقوام کے درمیان ترکوں کی عزت اور وقار ہوا۔ اور انہیں کے طفیل سے ان کا دم یورپ میں غنیمت میں سے سمجھا جانے لگا ہے۔

سٹنڈرڈ ٹائمز   سمرہ بیگم

جنگ ثواب

ہماری دنیا میں جو کسی کے لئے گلزار اور کسی کے لئے دشت ماتم جاری ہے ہمیں ہر جگہ دو سماں موجود ہیں۔ ایک خوشحالی ہے اور دوسری مفلسی۔ دوسری ان دونوں سے

بڑھکر سرگرم ہے۔ اسے بیماری کہتے ہیں اگرچہ ہمیں اس پر فتح حاصل کرنا ہے۔ تو ہمیں ایسی طاقت اور حکمت سے انتہا درجہ کی کوشش کرنی چاہئے۔ اُس سے لڑنا جنگ کہلاتا ہے ہم سے جہالت اور مفلسی تو میدان میں نکل کر لڑتی ہے۔ لیکن بیماری جو بڑی چالاک اور عیار ہے۔ چھپ کر حملہ کرتی ہے۔ اور اندر اندر ہی سرنگ لگا کر ہماری طاقت کو تباہ اور برباد کرتی رہتی ہے۔

ہماری باقاعدہ فوج کے سپہ سالار جو ملک گیری کے لئے بھرتی کی جاتی ہے بہت مشہور ہیں اُن کے نام آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہیں اور اُن کے مزاروں پر لوگ پھول چڑھاتے رہتے ہیں لیکن لشکر ثواب کے بہادروں کے نام غضب ہے کہ ہزار میں دو بھی نہیں جانتے۔ ہماری مراد ماہران سائنس سے ہے۔

بیماری کی فوج کا نام جراثیم بالفطرت ہے۔ یہ اس قدر باریک ہوتے ہیں کہ ہم انھیں خوردبین کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اس قدر باریک ہیں کہ ایک سوئی کی نوک پر ہزارہا کے قریب آسکتے ہیں۔ یہ اور باقی ہیں اُن کی تعداد کروڑوں تک پہونچ جاتی ہے۔ یہ بہت خطرناک ہیں۔ یہ سانس اور خوراک کے ساتھ ہمارے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ جسم کے تمام زخم کے راستہ داخل ہونا ان کے لئے سب آسان ہے۔ جس وقت یہ جسم میں جاتے ہیں تو انمیں اور ہمارے خون کے دانوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اور کمزور جسم بآسانی مغلوب ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر کوخ نے ان جراثیم کا پتہ لگایا مثلاً دق کی بیماری میں اُس نے معلوم کیا کہ یہ مرض کیڑوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض کے جراثیم لیکر اُس نے انکی پرورش کی اور تندرست جانوروں کے جسم میں انھیں پچکاری کے ذریعہ داخل کیا تو وہ سب کی سب مرگئیں۔ ڈاکٹر کوخ کی اس دریافت کے بعد مشہور عالم کیمیا داں لوئی پاسچر نے بہت سے تجربات کے بعد اعلان کیا کہ اگر جانوروں کے خون میں داخل کیا جائے ایک انسدادی مادہ جس میں اس بیماری کے کمزور جراثیم موجود ہوں بذریعہ پچکاری

داخل کر دیا جاتے۔ تو یہ بیماری نہیں ہوگی۔ لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن جب تجربہ کیا گیا تو ثابت ہوگیا کہ وہ سچا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد پاسیٹر نے معلوم کیا کہ اگر کسی کو باؤلا کتا کاٹے تو وہ بھی ٹیکا لگانے سے اچھا ہوجاتا ہے۔ اس وقت تک سگ گزیدہ کبھی اچھا نہ ہوا تھا۔

پاسیٹر کے زمانہ سے سو سال پہلے اڈورڈ جینر ایک نوجوان ڈاکٹر نے اتفاق سے ایک دیہاتی لڑکی کو یہ کہتے سنا۔ کہ مجھے چیچک نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ مجھے گائے کی چیچک کے دانے نکل چکے ہیں۔ ان ایام میں چیچک نہایت موذی مرض تھا۔ ڈاکٹر جینر نے پتہ لگایا۔ تو معلوم ہوا کہ گلوسسٹر کے لوگوں کا یقین تھا کہ بیمار گایوں کا دودھ دوہنے سے جن اشخاص کے ہاتھوں پر چیچک کے دانے نکل آتے ہیں انھیں سیتلا نہیں نکلتی بیس سال مطالعہ کرکے اس نے سنہ ۱۷۹۶ء میں گائے کا مواد لیکر ایک لڑکے کو لگایا۔ دو تین دن کے بعد لڑکے کے بازو پر چیچک کے مرض سے دانے نکل آئے۔ اور جب اس کے بازو کو آرام آگیا۔ تو اس نے چیچک کے جراثیم سے ٹیکہ لگایا۔ یہ لڑکا بالکل تندرست رہا۔ اور ثابت ہوگیا۔ کہ ٹیکہ سے چیچک بالکل مسدود ہوجاتی ہے۔ کچھ مدت تک متعصب لوگ اس کے برخلاف رہے۔ مگر آخرکار الم نشرح ہوگیا۔ کہ یہ وسیع الاثر اور خوفناک بیماری اب بہت کم ہوتی ہے۔

سر رانلڈ راس ہمارے زمانہ کے ایک ممتاز سائنس داں ہیں انکی سرکردگی میں وہ مقام جہاں مچھر پلتے ہیں۔ صاف کر دیئے گئے ہیں۔ اور ملیریا کا مرض جس سے ہر سال ہزاروں آدمی مرتے تھے۔ اور جو خاص قسم کے مچھر سے پھیلتا ہے۔ بڑی حد تک دور ہوگیا ہے۔

بعض بیماریاں اس قسم کی ہیں کہ جن میں بسا اوقات جسم کے بیمار حصے کو کاٹنا پڑتا ہے۔ یا کسی بڑی رگ کو کھول کر صاف کرنا ہوتا ہے۔ یا کسی ہڈی کو چھیلنے اور سیدھا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو سال کا عرصہ ہوا کہ جب بیچارہ مریض کو عمل جراحی کے لئے تختہ پر لٹایا جاتا تھا۔ اور جراح اس کے گوشت کو چیرتا پھاڑتا تھا

تو اُس کی حالت درد سے غیر ہو جاتی تھی وہ بُری طرح چیختا چلاتا۔ اور تڑپتا تھا خدا کا شکر ہے کہ اب اس قسم کی تکلیف نہیں رہی۔ سنہ ۱۸[illegible]ء میں ایک بائیس سال کے لڑکے ہمفری ڈیوی نے معلوم کیا کہ چند گیس جو اب آور ہیں۔ اور اُن کے ذریعہ اتنی بےہوشی آجاتی ہے اور درد محسوس نہیں ہوتا۔ لوگوں نے اس کی بات کی پروا نہ کی۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں مسمس نے جو ایک دانتساز کا لڑکا تھا۔ اس طرف توجہ کی اور بےہوش کرنے والی گیسوں کا استعمال کرنا شروع کیا۔ اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ عمل جراحی کے وقت مریض درد کے عذاب میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اگرچہ عمل جراحی کے وقت اس طرح نجات مل گئی لیکن اپریشن کے بعد درد ضرور ہوتا تھا۔ اور کھلے زخم کے اردگرد زہر ملا مادہ جمع ہوکر خون میں زہر سرایت کرجاتا اور گوشت سڑنے لگتا تھا۔ ناچار ڈاکٹر جسم کے خراب حصے کو جلا دیتے تھے اور پچاس فیصدی مریض مرجاتے تھے۔ ایک دن گلاسگو کے ہسپتال میں ایک لائق نام نوجوان ڈاکٹر جوزف لسٹر نامی آیا۔ بچپن سے بذریعہ خوردبین تجربے اور مشاہدے کا عادی تھا اس نے خوردبین کے ذریعہ معلوم کرلیا کہ جو جراثیم ہوا میں معلق رہتے ہیں۔ وہ زخم میں داخل ہوکر خرابی پیدا کرتے ہیں۔ اُسے معلوم تھا کہ کاربالک ایسڈ میں جراثیم زندہ نہیں رہتے۔ مرہم پٹی کے وقت اُس نے کاربالک ایسڈ استعمال کرنا شروع کیا۔ اور اس طرح زخم بہت خوبی سے مندمل ہونے لگے۔

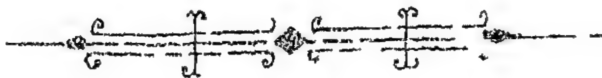
سنہ ۱۸۶۷ء کا ذکر ہے کہ پولینڈ کے شہر وارسا [illegible] اور مظلوم ملک میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ جدید سائنس کا ایک اہم انکشاف کرے۔ اُس کا نام مریم تھا۔ جس عمر میں بھی لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ [illegible] اس کے دل [illegible] میں سائنس کے پھولے دیکھا کرتی تھی [illegible] سال [illegible] اُسے ایک [illegible] اور لوگ اُسے [illegible] کہنے لگے۔

[illegible] کھیلی۔ [illegible] نکلی اور پیرس میں [illegible] ہوئی۔ کچھ عرصہ [illegible] کھائی تھی

پھر جب افسروں کو معلوم ہوا کہ وہ بڑی قابل ہے۔ تو اُسے موسیو کیوری کا نائب مقرر کردیا۔ دونوں میں محبت ہوگئی۔ اور دونوں نے اپنی زندگی ابنائے جنس کی بہبودی کے لئے وقف کردی۔ وہ دونو یورینیم کی کچی دھات پر تجربے کیا کرتے تھے۔ آخر انھوں نے بڑی محنت کے بعد اس دھات میں سے ایسی چیز برآمد کی۔ جس کی تیز شعاعیں یورینیم سے بیس لاکھ گنا تھیں۔ اس نئی چیز کا نام ریڈیم ہے۔ اور سائنس اور طب میں اس کے ذریعہ غیر محدود ترقی کا میدان کھل گیا لیکن اس کا استعمال نہایت خطرناک بھی ہے۔ کیونکہ اس کا نہایت ہی چھوٹا ذرہ جلد کے پاس رکھا جائے۔ تو اُسے جلاکر زخم پیدا کردیگا۔

یہی حال ایکس شعاعوں کی ہے۔ اس ایجاد کا سہرا پروفیسر ولیم رونٹجن کے سر ہے۔ ان شعاعوں کی یہ خاصیت ہے۔ کہ یہ موٹی چیزوں سے گذر سکتی ہے۔ اور ڈاکٹروں کی مدد سے جسم کے اندرونی حصوں کے فوٹو لے سکتے ہیں۔ پہلے اندرونی حالات معلوم نہ ہوسکتے تھے۔ اب صاف دیکھ سکتے ہیں۔ کہ جسم میں گولی کہاں ہے۔ ہڈی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے نظر آسکتے ہیں عمل انہضام بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ اور دق اور سل کے بیماروں کا پتہ لگ جاتا ہے۔ یہ شعاعیں بھی خطرناک ہیں۔ بعض ڈاکٹروں کو اس قسم کے زخم ایسے آئے ہیں کہ وہ مہلک ثابت ہوئے ہیں۔

پاسچر جینر۔ لسٹر۔ [illegible] ڈلومی۔ میڈم کیوری۔ اور دوسرے شخص [illegible] ہمارے ہادی اور رہنما رہیں۔ جنھوں نے بیماری جیسے خوفناک دشمن کو نیچا دکھایا ہے۔ [illegible] جنھوں نے [illegible] بہتر رکھا [illegible] ہمارے [illegible] رہی ہیں۔ [illegible] زندہ ہیں۔ اور ان کا نام ہمیشہ موجود ہو اور آنے والی نسلیں عزت اور احترام سے لیتی رہیں اور لیا کریں گی۔



غزل

از زاہدہ خاتون لکھنوی بنت ارتضا خان۔ تلمیذ اسد اللہ خاں اسد لکھنوی

بر آئی نہ کوئی حسرت دل ناکام ہر اک ٹھہری
ہر بات محبت میں ٹھہری یا بد خط تقدیر رہی

الزام سے خونِ ناحق کے ٹھہرے نہ کبھی ہم بچ سکتے
یہ شکر کرو کہ سر محشر خاموش زباں تر رہی

سر مژدۂ مرگ نہ ہوگا پھر اس محفل ہستی میں کوئی
قسمت میں میرے قاتل کے اگر کچھ روز جواں شمشیر رہی

یہ آس جو ہو تو کیونکر ہو یہ آس کی امید بندھی
باقی ہے فغاں میں کوئی اثر آہوں میں اب تاثیر رہی

مایوس سے بیماری اٹھی پھر چارہ گروں کی کچھ نہ چلی
بیمار محبت بچ نہ سکا ناکام ہر اک تدبیر رہی

دل دیکھ کے اسی نے سنبھالا ہے وہ قال اجل سے لکالا ہے
قربت کی امیدیں دل کو میں بس یہ پھری تصویر رہی

کب ہر جہاد سے گھر سے چلا میں جسکہ نہ تھا عالم میں
اک عمر تغافل سہہ کو تم بسد گئی با خبر رہی

ماسد نے غم کی گھٹ نہ سکے صد باس تحریر اٹھ نہ سکے
آزاد خیالی ولولوں کی اُنکے لئے زنجیر رہی

نہ جواب پریشاں ہستی اللہ مٹا کیا بر معنی
نکلا نہ نتیجہ کوئی کبھی گو کیسی کسی تفسیر رہی

دنیا سے وفا کا نام مٹا تو بھلا کیونکر بسا
قسمت کی طرح سے نرگس ہے جب تم سے دل گیر رہی

ظاہر ہے اسی سے دنیا میں اے زاہدہ حسن و عشق کا فرق
محرم انکا نہ کوئی محرم رہا تصویر مری تصویر رہا

نمکدان ظرافت

"بیٹی تم کیا تم میرے گھٹنوں پر سوار ہو یا پسند کرتی ہو۔"

"نہیں چچا میں تو ٹل گئے سوار ہوئی ہوں تمہیں معلوم ہے"

ایک گھنٹہ میں میاں آزاد اور خوجی اُس رئیس کے یہاں گئے۔

آزاد۔ (خدمتگار سے) ہیں تشریف رکھتے ہیں۔

خدمتگار۔ جی ہاں جاتیے وہ سامنے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔

آزاد۔ (کمرہ میں گھسکر) آداب بجالاتا ہوں۔

رئیس۔ آپ کہاں سے آتے۔

آزاد۔ السلام علیک آتیے مصافحہ تو کریں۔

رئیس۔ بندگی۔ آپ کہاں سے آتے ہیں۔

آزاد۔ حضرت اس کمرے بھر میں ایک تو کرسی۔ اُس پر آپ ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کچھ بیٹھنے کو منگواتیے تو عرض کروں۔

رئیس۔ (جھلاکر) کچھ بیٹھنے کو لولاؤ اسکے لئے۔

خدمتگار نے دوسرے خدمتگار سے کہا کہ کرسی اٹھاؤ۔

رئیس۔ (خفا ہوکر) کرسی نہیں مسٹر ڈبر لاؤ۔ مدبر، وہ موڑھا جو سامنے پڑا ہے۔ اٹھا دے۔

آزاد۔ (موڑھے پر بیٹھکر) کیوں قبلہ یہ مسٹر ڈبر کیسا ہوتا ہے۔

رئیس آپ کوئی قاصی ہیں۔

آزاد جی ہاں۔

رئیس۔ اور راہ بر سے کیسے ہو۔ جی ہاں

آزاد مگر سخت تعجب ہے آپ اور اسے لنگوٹیے یار کو بھول جائیں۔ ع

گر بدولت برسی مست نگردی مردی

رئیس۔ (سُرخ ہوکر) لنگوٹیے یار کیسے۔

آزاد۔ اے لٹو ہم کو بھول گیا۔ یاد ہے جب گومتی کے سامنے میدان میں بانسے کی کنکیاں ہمسے آپ سے لڑتی تھیں۔ جھدکائی ادہر سے آپ نے جھنڈی دار کل ہی بڑھائی اور ہم نے آپ کے کیے مارے اور غوطہ دیکر جو ایک گھسا دیتا ہوں تو وہ کاٹا

سب کے بھاگ گئے آج ملے ہو۔ مگر واللہ ہو جبادار کہ اتنی چار آنکھیں نہیں کرتے۔
خوجی۔ مگر حضور یہ بھی سات بار سر ہمیشہ گنڈے والا مصرع پا ہی اڑا یا کئے۔ اور کیوں نہ ہو
پھر میاں ولایتی کے ساگرد ہیں۔ مگر عقل ذرا موٹی ہے۔
اب وہ چکر میں آئے۔ کہ یہ دونوں کون ہیں بیٹھے کہاں سے آتے ہیں۔
ایک تو کہتا ہے کہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دوسرا میاں ولایتی کا
ساگرد بتاتا ہے۔ یہ دونو کچھ عجب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔
آزاد۔ کہو بھئی اچھو بتایا۔ کہو بڑا گھبرو۔
رئیس۔ یہ تو میری لمبی سفید ڈاڑھی اور رحم کیے ہو کہ جھاڑ ی دار رہنگ۔ اڑا دیا
کیسے ہیں کہ سات بار یہ گنڈے والا اڑا یا تھا مجھے حیرت ہے کہ تم ہو کون۔
آزاد واہ استاد اس تجاہل عارفانہ کے صدقے۔ اجی ہم وہ ہیں۔ جن کے ساتھ تم
میاں عبداللہ کی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ بھئی ہم سے تو چانڈو چھوڑ دی۔ مگر یار
تم شرالکر سلے ہو کہ اس بڑھاپے میں بھی چانڈو ہی سے چاسلے ہو۔ جب ہی میں بلاؤ
کا سا چہرہ ہو گیا۔
اتنا کہنا تھا کہ رئیس آگ بگولا ہو گئے۔ للکارنے کو تھے کہ آزاد نے ایک
اور فقرہ چست کیا۔
آزاد حضرت تکلیف نہ ہو تو ذرا اپنے کبک کو دیکھئے۔ کہ پیسے کی گلوری۔ اور
نسمہ کا حقہ لے آئے۔
رئیس۔ بس چلئے۔ یہاں سے ٹہلئے۔ آپ نے کسی کو لکڑ والا ہولی مقرر کیا ہے۔
چلئے۔ چلئے۔
آزاد۔ اور یہ جوتی لیجئے۔ اسی دوکان سے گرما گرم کباب اور سرمال منگوا دیجئے
سب لوگ بیس سمجھے کہ یہ بھی کوئی ہیں ایسے ویسے کا یہ جم و دم کہا تو جھاکہ آخر آپ
ہیں کون بزرگ۔ اور کہاں سے تشریف لائے ہیں۔
آزاد۔ بس ہاں اب آئیے آؤ مست سکھی۔ اب سرفا کی طرح پیر بات چیت شروع

کی۔ سدہ آپ کے دوست اور اپنے یار مرزا عبدالستار کے پاس آیا ہے۔ مگر مرد خدا ذرا اخلاق سیکھو۔ آخر آدمیت بھی کوئی شے ہے۔ یا ہر دم مرکب وحشت پر سوار رہتے ہو۔ بھلے مانسوں سے بھلا کہیں بھلے مانس یوں ملا کرتے ہیں جس طرح آپ ہم سے ملے ہیں لاحول ولا قوۃ۔

رئیس۔ واللہ ہم کو اس عمر میں ایک آپ ہی گرو ملے ہیں۔

آزاد۔ پھر حضرت برقرعو سنے رامو ساتے۔

میاں آزاد نے اُس رئیس کو ایسا اڑے ہاتھوں لیا۔ اور اس درجہ خفیف کیا۔ کہ وہ بیچارے گردن نیچی کئے اُن کی آواز جب جاپ سنا کئے۔ اور اُس کے ٹھو میاں خوجی بھی ہاں میں ہاں ملایا کئے۔ میاں آزاد کی آنکھیں راستہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ مگر اُن کے دوست مرزا صاحب نہ آئے۔ آزاد سوچے کہ مرزا تو ہم سے بھی بڑھکر آزاد رو ہیں۔ خدا جانے کہاں رہ گئے۔ اب چلنا چاہیئے۔ خوجی سے کہا کہ اڈہ پر سے گاڑی لے آؤ۔

خوجی "گاڑی" لاحول ولا قوہ۔ اجی اس شیطانی چھکڑے پر جائیگا۔ اپنے مہربان سجاد حسین اقبال نشان کی مالکی گاڑی منگوا لیجئے۔ بس اسٹیشن پر ہم کو اتار دے۔ بات کرتے تو گاڑی دن سے لوٹ جائیگی۔

رئیس۔ گھوڑا لنگ کرتا ہے۔ اور پاؤں آج شل ہو گیا ہے۔ کرایہ کی گاڑی منگوائے دیتا ہوں۔

اخلاق بھی کیا چیز ہے۔ صاحب خلق ہر دلعزیز ہے۔ اخلاق نعمۃ السابغہ ہے۔ اخلاق حدیقۃ الہیہ ہے۔ جس انسان میں خلق نہیں وہ گل ہے۔ جس میں بو نہیں اور ہے۔ جس میں کیفیت سرور یک مو نہیں۔ کج خلق آدمی ہمیشہ حبیب ہی پایا۔ جو ملاقات کو گیا۔ وہ بُرا ہی کہتا آیا۔ خوش خلقی کو نعمت عظمیٰ اور عطیہ کبریٰ سمجھنا چاہیئے۔ اگر ہم کسی سے غرور یا تکبر سے پیش آئے۔ تو اُس کی گرہ سے کچھ نہ جاویگا۔ مگر ایک تو ہماری عادت خراب ہو جائے گی۔ دوسرے رفتہ رفتہ ضعیف

الاعتقاد آدمی پھر سویرے سویرے نام نہ لیں گے۔ کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ کھانا نہ ملے۔
لاحول ولا قوت۔

ماخوذ　　(رتنوں)



بدلی کا ترانہ

(ترجمہ از پی۔ بی۔ شیلے)

میں پیاسے پھولوں کے لئے سمندر اور چشموں سے لائے ہوئے تازہ و فرحت بخش پانی کا مینہ برساتی ہوں۔ دوپہر کے وقت سے جو اپنے خواب سحر میں مصروف ہوتے ہیں اُن پر اپنا ہلکا سا سایہ کئے رہتی ہوں۔ میرے بازوؤں سے شبنم کی بوندیں گرتی ہیں۔ جو سورج کی روشنی میں جھومنے والی ٹہنیوں کی آغوش میں سوئی ہوئی ہر ایک پیاری کلی کو بیدار کر دیتی ہیں۔

میں ژالہ باری سے سرسبز میدانوں کو برف سے ڈھانپ دیتی ہوں لیکن پھر انہیں تحلیل کر کے پانی کی شکل میں تبدیل کر دیتی اور رعد باراں کے درمیان ہنستی ہوئی گذر رہی ہوں۔

میں کوہساروں پر ریزہ ہائے برف کو چھاتی ہوں تو [illegible] بار کھڑے ہوئے صنوبر کے درخت خوف زدہ آواز میں کراہنے لگتے ہیں۔ میں تمام رات برف کے نورانی تکیہ پر سر رکھے ہوا کے سرد جھونکوں کی آغوش میں سوئی رہتی ہوں۔ اور برآسمانی برجوں کے بلند میناروں پر میری رہنما (بجلی) بیٹھی ہے [illegible] سے کسی غار میں رعد زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ جو رہ رہ کر ہر گرج آواز میں گرجتا ہے۔ [illegible] ہوا اُس کی فوق الفطرت [illegible] کی عمیق گہرائیوں میں محو خرام ہوتی ہے۔ مجھے جس کی [illegible]

ہے۔ خواہ جھرنوں۔ ٹیلوں۔ پہاڑیوں۔ جھیلوں اور میدانوں کے اوپر مائل پرواز ہو۔ یا پہاڑوں اور کوہستانی چشموں کے نیچے۔ اُس کی محبوب روحانی ہستی ہر مقام پر اُس کا ساتھ دیتی ہے۔ اور جب زمین پر بارش کا سماں چھایا ہوا ہے۔ میں اُس وقت بھی فلک نیلگوں کے درخشاں تبسم سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔

جب ستارہ سحری کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ تو شہابی آنکھوں والی لالہ گوں نمود سحر اپنے شعلہ آسا بازوؤں کو پھیلاتے فضا میں تیرتے ہوئے بادل کے ٹکڑے پر اس طرح لپکتی ہے جیسے کوئی عقاب پہاڑ کے ہلتے ہوئے اُس ٹیلہ پر جو زلزلہ کے گہوارہ میں جھول رہا ہو۔ اُتر کر ایک لمحہ کے لئے اپنے سنہرے بازوؤں کی روشنی میں جا بیٹھے۔

جب شفق گوں سمندر کی سطح کے نیچے غروب ہونے والا آفتاب آغوش فضا کو لطف انگیز سکون اور محبوب و مسرور ساعتوں سے معمور کر رہا ہو اور جب آسمان کی گہرائیوں سے شام کی قرمزی عبا مائل انقیاد ہو۔ میں اپنے ہوائی آشیانہ میں بازوؤں کو سکیڑے اس خاموشی سے محو استراحت ہوں۔ جیسے کوئی فاختہ انڈوں پر بیٹھی اُونگھ رہی ہو۔

وہ درخشاں لالہ والی نورانی دوشیزہ جسے فانی مخلوق ماہتاب کے نام سے پکارتی ہے آدھی رات کے چلنے والی سرد ہوا کے جھونکوں سے بکھرے ہوئے پرے ادنیٰ فرش پر آہستہ آہستہ رفتار سے چلتی ہے جہاں جہاں اس کے [illegible] پاؤں [illegible] سے حسن کی نرم و لطیف آواز [illegible] ہی کے گوش زد ہو سکتی ہے۔ میرے سنہری حسن جس کا تار ٹوٹ جاتا ہے۔ تارے [illegible] چھا گئے ہیں اور میں ایسی سنہری [illegible] کے جھولوں [illegible] لگی ہوں۔

[illegible]

سے پھٹ جاتی ہے۔ جو گویا میرے روزنوں سے نیچے گر پڑتے ہیں۔

میں تحت خورشید کے گرد حلقۂ نورانی قائم کرتی اور تحت قمر کو موجوں کے ہالے سے مزین کرتی ہوں۔ اور جب بگولے میرے جھنڈے کو فضا کی وسعت میں دور دور تک لہرانے لگتے ہیں۔ تو آتش فشاں پہاڑوں کی شعلہ سامانی ماند پڑ جاتی ہے۔ اور ستارے ناچنے اور تھرکنے لگتے ہیں۔

متلاطم سمندر کے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک میں پل کی طرح چھا جاتی ہوں۔ اور جب میں پہاڑی ستونوں پر چھت کی طرح معلق ہوتی ہوں تو آفتاب کی ایک کرن بھی مجھ میں سرایت نہیں کر سکتی۔

وہ قوس فیروزمندی جس کے نیچے میں برق و باد و باراں کے ساتھ اس حالت میں کہ ہوا کی قوتیں میرے تحت سے وابستہ ہوتی ہیں۔ نہایت شان و شوکت سے گذرتی ہوں لاکھوں دلکش رنگوں سے مزین ہوتی ہے۔ الوان لطیف کی اس شاہراہ سے دور بلندی پر کرۂ آتشیں پر لٹکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور نیچے شاداب زمین ہنستی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

میں بحر و بر کی رانندہ اور آغوش فلک کی پروردہ ہوں۔ میں ہر آن نئے انداز میں جلوہ پیرا ہوتی ہوں لیکن صفحہ ہستی سے معدوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جب مینہ کھل جانے کے بعد آسمانی گنبد پھر صاف و شفاف نظر آتا ہے اور سورج کی مغربی شعاعوں سے ہوا کا قصر نیلگوں تیار ہوتا ہے تو میں اس منظر کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوب ہنستی ہوں۔ اور پھر اس بچہ کے مانند جو رحم مادر سے یا اس روح کی طرح جو کسی مزار سے نکلے بلند ہو کر قصر آسمانی کو پھر منہدم کر دیتی ہوں۔

عبدالسلام



لمعاتِ اثر

وسعت میں داخل نہ ہو جو سوزِ مستور ہے
اسکو اسرارِ درد سے جدا جیسے مفرور ہے

جہاں دنیا سہل ہے لیکن وفا سے دور ہے
کہنے والے نے بھی کہدیا ہے مجھکو کیا منظور ہے

قریب کیسے ہیں جسے ہے دوریاں ہی ذات سے
جسد پر مرد تک ہے اسی پہ منزل دور ہے

کھل گیا رازِ حقیقت کفر کی رسم بڑھی
عادۂ روئے صنم جا کسر مستور ہے

ختم کر اک لغزشِ مستانہ میں سیر و سفر
جادۂ عمرِ رواں ہمسایۂ محشور ہے

دیکھنے والو کہاں دیکھا جمالِ دلفروز
نور سمجھے ہو جسے وہ بھی غبارِ نور ہے

پوچھتے کیا ہو دلِ حسرت زدہ کا ماجرا
جوہرِ آئینہ عرضِ حال سے معذور ہے

کہہ رہا ہے یہ دلِ پر حسرت کا اضطراب
حکمتوں کا حد سے بڑھ جانا ہی نامور ہے

ٹھوکریں کھا کھا کے پہنچا تھی جو حرماں نصیب
یہ صدا آئی ملیٹ جا میکدہ معمور ہے

پھر بھی فرصت نہ ملی یا رب ابھی الجھن میں ہوں
یہ سنانے راز قدرت تک ملی کیا منظور ہے

میں جو کہتا ہوں ستمگر کس لئے ہو تم خفا
یہ تو کہتا ہے اثر کیا کیجئے دستور ہے

جعفر علیخاں اثر بی۔ اے

پروفیسر موبجے کا آخری دن

پروفیسر موبجے کو اہل بحاث کبھی نہیں بھولیں گے۔ ابھی اس کا نام زندہ ہے۔ یہ شخص بھاس کا انسان تھا۔ ہر بات میں وقت کا پابند تھا کیا مجال کہ اس کے دستور العمل میں فرق آ جائے۔ بارہ دن کی چھاؤں اٹھتا تھا۔ سب سے پہلے غسل کرتا پھر کپڑے

بدلتا۔ اور اپنے کتب خانہ میں جا بیٹھتا تھا۔ آٹھ بجے تک وہ مطالعہ میں سرگرم رہکر ہلکی غذا استعمال کرتا تھا۔ گوشت سے اُسے نفرت تھی۔ کھانا وسیع تھا۔ کھانا کھاکر وہ اپنی کوٹھی کے باغ میں جو دریائے راوی کے کنارے پر تھی چہل قدمی کرتا تھا۔ دس بجے سے بارہ بجے تک ملاقات کا وقت تھا بارہ بجے پھر سادہ غذا کھاتا تھا۔ ایک بجے سے تین بجے تک قیلولہ کرتا تھا۔ تین بجے سے چھ بجے تک پھر مطالعہ میں مصروف رہکر چھ بجے پھر کھانا کھاتا۔ اور کھانا کھاکر سیر کے لئے نکل جاتا۔ اور نو بجے واپس آتا تھا۔ نو بجے سے بارہ بجے تک پھر مطالعہ کرتا۔ اور بارہ بجے سو جاتا تھا۔ غالباً پابندی اوقات اور باقاعدگی کی وجہ سے اسکی صحت بہت اچھی تھی

(۲)

پروفیسر ہوبجے کی سترہویں سالگرہ تھی۔ اور وہ چالیس سال کا دکھائی دیتا تھا۔ سر کے بال ابھی تمام و کمال سفید نہ ہوئے تھے۔ دانت سلامت تھے اور پیشانی یا چہرے پر جھریوں کا نشان تک نہ تھا آج اُس کی سترہویں سالگرہ تھی اور پروفیسر ہوبجے نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی تھی۔ مہمانوں کو بارہ بجے دوپہر کا وقت دیا گیا تھا۔ پروفیسر صبح کی چہل قدمی سے فارغ ہوکر ملاقاتی کمرے میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اور خانساماں کو کھانوں کی فہرست لکھا رہا تھا۔ جب وہ ہدایتیں دے چکا تو خانساماں نے اُسے ایک کاغذ کا پرزہ دیا۔ جس پر شکستہ مائل ٹوٹی پھوٹی روشنائی سے چند الفاظ لکھے مگر راقم کا نام نہ تھا مضمون عبارت یہ تھا۔ "افسوس ہے میں آپکی ضیافت میں موجود نہیں ہو سکتا لیکن آدھی رات کو ضرور آؤں گا "

پروفیسر نے ہر چند سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ خانساماں سے دریافت کیا۔ تو اُس نے کہا کہ وہ بظاہر ایک معزز انسان تھا۔ اُس نے نام نہیں بتایا۔ اس جواب سے پروفیسر کی تسلی نہ ہوئی۔ اور عقدہ حل نہ ہوا۔ کیونکہ ہوبجے کے ملنے والے تمام معزز اور چیدہ اشخاص تھے "تو کیا جن لوگوں کو ملا کرتا ہے اُن میں سے ایک شخص آئیگا" خانساماں نے پوچھا۔ پروفیسر نے کہا کہ "مگر، سب آئیں گے

نہ کہا اور وہ رقعہ میز پر پھینک دیا۔ خانساماں انتظام دعوت کے لیے باورچی خانہ کی طرف چلا گیا

(۳)

خانساماں کو رخصت ہوئے تھوڑی دیر گذری تھی۔ کہ پروفیسر کا ایک پرانا ملاقاتی جو کسی زمانہ میں اُس کا ہم مکتب تھا گھبرایا ہوا آیا اور چشم پُرآب ہو کر بولا۔ کہ جناب میں اس وقت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میری دستگیری کیجئے۔ میری ایک لڑکی ہے۔ اُس کی منگنی ایک بیرسٹر سے ہو چکی ہے۔ اب وہ بیرسٹر منحرف ہو کر کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر ناطہ ٹوٹ گیا تو اس میں میرے خاندان کی بہت بڑی ہتک ہوگی۔ یہاں تک تو خیر تھی مگر میرا لڑکا جو فوج میں ملازم ہے۔ نہایت ضدی اور مغلوب الغضب نوجوان ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس بیرسٹر کو قتل کر دونگا اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ میرے لڑکے کے سر پر خون سوار ہے۔ اور جو کچھ کہہ رہا ہے کر گذرے گا۔ پروفیسر نے کہا کہ میں نے کئی بار بیرسٹر کو تمہاری لڑکی کے ساتھ پارک میں سیر اور بازار گلی میں چہل قدمی کرتے دیکھا ہے۔ بوڑھا بولا۔ کہ یہی تو خرابی ہے۔ اس مغربی شائستگی نے یہاں تک ہمیں سکھا لیا ہے۔ کہ منگنی کے بعد مرد اور عورت اس طرح بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ کہ گویا شادی ہو چکی ہے۔ اور بارہا آخر کار پچھتانا پڑتا ہے۔ رونا تو یہ ہے کہ اگر اب منگنی ٹوٹ گئی۔ اور بہت ہنسائی ہوگئی تو میری لڑکی کہیں کی نہ رہیگی اور مجھے برادری میں مجھ کو شرمندہ ہو کر رہنا پڑے۔ پروفیسر نے کہا کہ تمہاری بیوی نے بیٹی کو کیوں نہ روکا اور کیوں اس قدر آزادی دی۔ بوڑھے نے جواب دیا کہ تمام قصور میری بیوی کا ہے۔ اب وہ گذر گئی ہے۔ کہ اسے علم نہ تھا۔ مگر وہ سب کچھ جانتی تھی۔ وہ شائستہ تھی۔ اُس کی اور رسم سلطان سے ہے اور یہ ممکن نہیں کہ سلطان نے اُسے اصلیت سے آگاہ نہ کیا ہو۔ پروفیسر نے کہا کہ اچھا میں بیرسٹر کو سمجھاؤں گا۔ جب بوڑھا چلا گیا تو پروفیسر کی نگاہ اس رقعہ پر پڑی جو اُس نے میز پر پھینکا تھا اور اگرچہ اُس کے ... ادا ہوا تھا

اُس پر جو عبارت ہے وہ خون سے لکھی ہوئی ہے۔ اسکے بعد اس کے جسم میں خود بخود کپکپی پیدا ہوئی۔ مگر فوراً اُس کی طبیعت اپنی اصلی حالت پر آگئی۔

(۴)

دوپہر کے وقت پروفیسر کے مہمان آگئے اُن میں ایک بیرسٹر۔ ایک مصور۔ ایک ڈاکٹر اور ایک شاعر تھا۔ ادہر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

مصور نے پوچھا۔ کہ جناب پروفیسر صاحب ان روحوں کے کرشموں کے متعلق آپکی کیا رائے ہے۔ کیا واقعی روحیں عالم ارواح سے آتی ہیں۔ اور ہماری امداد کر سکتی اور ہمیں غیب کا حال بتا سکتی ہیں۔ پروفیسر نے بات ٹال کر کہا کہ یہ تمام باتیں عالم شباب سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب میں جوان تھا تو مجھے سحر و ساحری کا شوق تھا اب پیری کا وقت ہے اب نہ وہ دل ہے نہ وہ ولولے۔ ع

وقت پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اب میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں خود ہی عالم ارواح میں جانے کو تیار ہوں۔ بیرسٹر کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے سُنا تھا آپ کی شادی ہونے والی ہے اب دیر کس بات کی ہے۔ بیرسٹر نے کہا بدقسمتی سے مجھے پسند نہیں ہے۔ اس سے بہتر دو لڑکیوں میں سے انتخاب کی ہے۔ پروفیسر نے کہا کیا غضب کر رہے ہو۔ اس کا نتیجہ بہت خراب ہوگا۔ بیرسٹر نے کہا کہ میں ابن الوقت ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ دنیا میں وہی کامیاب ہوتا ہے۔ جو سب سے پہلے اپنا خیال کرے اور تمام جہان کو اپنے مقاصد اور اغراض پر قربان کر دے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری موجودہ منسوبہ کا دل ٹوٹ جائیگا۔ اور اُس کے کنبے کی بدنامی ہوگی لیکن ان خیالی باتوں کے لئے میں سونے کی کان نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اپنے زریں مستقبل سے منہ نہیں موڑ سکتا پروفیسر نے کہا۔ کہ زبردستی کر رہے ہو تمہارا خیال خام ہے۔ اور نتیجہ بہت ہولناک ہوگا بیرسٹر نے ازراہ حقارت ہنسکر کہا کہ کچھ پروا نہیں۔ عورتوں کے آنسو مجھے موم نہیں کر سکتے دنیاوی اغراض کے لئے انسان کو لازم ہے۔ کہ ہواؤں کے [illegible] اور [illegible] کے

شور و شین چپ سے لو ہنس دے۔ ورنہ منزل مقصود پہ پہنچنا مشکل ہے۔ سلسلہ گفتگو یہاں تک پہنچا تھا کہ خانساماں نے اطلاع دی کھانا تیار ہے۔

(۵)

پروفیسر مرغن اور پُر تکلف کھانے اپنے لئے پسند نہ کرتا تھا مگر جب اپنی سالگرہ پر اپنے خاص خاص دوستوں کو بلاتا تھا۔ تو اُن کے لئے طرح طرح کی نعمتیں تیار کی جاتی تھیں۔ اور مشہور مشرقی اور مغربی کھانے دسترخوان پر آتے تھے کھانا کھانے وقت مسٹر ہڈسن ہرزہ سرائی کرتا رہا۔ اور اُس نے شراب ارغوانی اس طرح پی۔ جیسے مچھلی پانی۔ مسٹر ایک تو فطرتاً باتونی تھا اب نشہ کی وجہ سے حد سے بڑھا جاتا تھا ڈاکٹر اور منصور اُس کی حرکات اور لایعنی گفتگو پر ہنس رہے تھے۔ اور شاعر کا رنگ غصہ سے سرخ ہوا جاتا تھا۔ کیونکہ شاعروں کے مذہب میں وہ شخص جو کسی کا دل توڑے قاتل اور خونی سے بدتر ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور منصور نے پیٹ بھر کر انواع و اقسام کے کھانے کھائے۔ لیکن شاعر نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ بظاہر سوء ہضمی کا عذر پیش کیا۔ چپکے سے ڈاکٹر کے کان میں کہا کہ میں اس سفید لباس شیطان کو جانور سے بدتر سمجھتا ہوں۔ اور میری خودداری مجھے اجازت نہیں دیتی کہ ایسے سنگدل کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھاؤں یکایک پروفیسر کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ کوئی نغمہ آوارہ جس سے اُس کے کان پہلے سے آشنا ہیں۔ کہہ رہی ہے۔ کہ

از مکافات عمل غافل مشو   گندم از گندم بروید جو ز جو

ایک بار پھر اُسے وہی کسک محسوس ہوئی۔ مگر صرف ایک لمحہ کے لئے۔ غرض مہمان کھانا کھا کر رخصت ہوئے۔ ابھی پروفیسر کی کوٹھی سے نکلے مشکل پانچ منٹ ہوئے تھے کہ پہلے بندوق کی آواز۔ اور پھر چیخ سنائی دی۔ اندر خانساماں دوڑا ہوا آیا۔ اور کہا کہ حضور غضب ہو گیا مسٹر ہڈسن صاحب کو کسی نے ہلاک کر دیا۔ اور وہ مر گئے۔ سڑک پر [illegible] کے

مردے کی طرح بے جان پڑے ہیں۔

(۶)

جب پروفیسر فیلولہ کے لئے اپنے کمرے میں گیا تو اُسے نیند نہ آئی اُس کی عمر میں غالبًا یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے یہ بےچینی اور اضمحلال محسوس کیا وہ تاریک کمرے میں بچھونے پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اور قرار کوسوں دور تھا۔ عجیب بات یہ تھی۔ کہ اس رقعہ کے سُرخی مائل بھوسیلے الفاظ اُس کی آنکھوں کے سامنے سینما کی تصویروں کی طرح متحرک تھے۔ اور رقص کر رہے تھے۔ سات بجے وہ ہوا خوری کے لئے گیا۔ شفق کے بھر برے لہرا رہے اور دریا کے پانی میں سنگرف ملا رہے تھے عجیب سا ارتسام تھی۔ پروفیسر نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اور دریا کے کنارے دیر تک کھڑا رہا جب آسمان کے شلجم نما سائبان پر ستارے طلسمی لالٹینوں کی طرح جگمگانے لگے۔ تو وہ گھر کی طرف لوٹا۔ اور راہ میں اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی دکھاری نالہ و بکا کر رہی ہے۔ اور اُس کی آواز سے اُس کے کان مانوس ہیں۔ مگر یاد نہیں آتا کہ وہ کون ہے۔ وہ حسب معمول کتب خانہ میں گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ اُس کی طبیعت کتاب بینی نہ تھی۔ رہ رہ کر اُسے شفق کے بھر برے عہد شباب یاد دلا رہے تھے۔ یکایک گھڑیال نے منادی کر دی کہ آدھی رات گذر گئی۔ پروفیسر خوابگاہ میں داخل ہوا۔ اور پلنگ پر لیٹ گیا ابھی لیٹا ہی تھا کہ پھر وہی کیفیت محسوس ہوئی۔ اور کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ پروفیسر نے کہا آجاؤ۔ مگر اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ دروازہ کھلا۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ تو وارد نے منہ سے کچھ نہ بولا۔ صرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ پروفیسر اٹھ کر اُس کے ساتھ ہولیا۔ اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

مصنف اڈیٹر (خان احمد حسین خان)



نائٹر ڈیم کا مداری

شہنشاہ لوئی کے عہد سلطنت میں برنابا نامی ایک غریب مداری رہا کرتا تھا۔ جو شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ پھیر پھرا کر اپنے طاقت و ہنر کے کرتب دکھلا کر کسی طرح اپنا پیٹ پالتا تھا۔

میلوں ٹھیلوں کے موقعوں پر وہ اکثر ایک بوسیدہ و روزگار دیدہ دری بچھا دیا کرتا۔ اور اپنی مضحکہ خیز لطیفوں سے بچوں اور ناکارہ لوگوں کا ایک ہجوم اپنے اردگرد جمع کر لیا کرتا۔ اس کے بعد وہ اپنے جسم کو ایک عجیب و غریب انداز سے موڑتا اور اپنی ناک کی نوک پر ایک ٹین کے ٹکڑے کا توازن برابر کرتا۔ گو بچے اُس کے اس ادنیٰ کام پر بھی تالیاں بجا کر اُس کے کرتب کی داد دیتے۔ مگر ہجوم میں زیادہ عمر والے لوگ لاپرواہی سے اُس کی جانب گھورتے رہتے۔ مگر جب وہ ٹانگیں اوپر کر کے ہاتھوں کے بل کھڑا ہو جاتا اور چھ سنہری گیندیں پیروں سے پھینک پھینک کر پیروں ہی پر انہیں روکتا جاتا۔ اور چمکدار گیندوں کے سرعت سے گرنے اور پھر اٹھنے سے ایک روشنی کا حلقہ بن جاتا۔ تو خورد و کلاں یکساں انگشت بدنداں ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے۔ اور جب اس کے بعد وہ اسی حالت میں گیندوں کے بدلے تیز و چمکدار چھریاں پھینکنا شروع کرتا تو لوگوں کی خاموش تحسین "شاباش شاباش اور واہ واہ" کے بلند نعروں میں تبدیل ہو جاتی۔ اور پھٹی پرانی دری پر پیسوں اکنیوں اور دیگر سکہ جات کی بارش شروع ہو جاتی۔

اور اس پر بھی غریب برنابا کو اس فرقہ کے افراد کے مطابق جن کا گذارہ صرف اُن کے فن و ہنر پر منحصر ہے۔ زندگی کی دشوار گذار گھڑیاں کاٹنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ اپنا خون پسینے کی طرح بہا کر روزی کماتا تھا۔ مگر پھر بھی اسکی قسمت میں وہ آسائشیں لکھی تھیں جنکا وہ واقعی مستحق نہ تھا۔

کتاب اردو لاہور



مہاتما بُدھ گیا میں بڑ کے درخت کے نیچے دھیان میں مگن ہیں



شملہ کی سرسبز وادیوں میں سفید بادلوں کا نظارہ

مزید براں وہ اس قدر کام نہ کر سکتا تھا۔ جیسا کہ حقیقتاً وہ کرنے کا خواہشمند تھا اپنے دلآویز کھیتوں کو پھلانے کے لئے اُسے حرارت اور روشنی کی ضرورت تھی موسم سرما کی برف سے ڈھکی ہوئی زمین اُس کے لئے بیکار تھی۔ اُس موسم میں اُس کی وقعت اُن برہنہ درختوں سے زائد نہ تھی۔ جو اپنا سرمایہ برگ و ثمر نذر خزاں کر چکے ہوں۔ اسکی حالت اُس ٹڈے کے مانند تھی۔ جو گرمیوں میں تو کسی طرح اپنی خوراک فراہم کر لیتا ہے۔ لیکن جاڑوں کے ایام میں شدت کی سردی اور بھوک کے مصائب برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر بپٹسٹ چونکہ نیک طبیعت صاف دل انسان تھا وہ اپنی مصیبتیں صبر و استقلال سے برداشت کرتا تھا۔

اُس نے نہ تو کبھی دولت کمانے کے پیچ در پیچ مسئلوں پر غور کیا۔ اور نہ اس امر پر کہ ہر انسان بہ اعتبار دولت و حشمت کیوں یکساں نہیں ہے۔ اس کا راسخ عقیدہ تھا۔ کہ اگر یہ دنیا اچھی نہیں ہے تو دوسری دنیا یقیناً اچھی ہوگی۔ اس ایمان پر اس کی زندگی کا انحصار تھا وہ ان مکاروں نامعقول اور در در پھرنے والے مداریوں کی نقل نہیں کرتا تھا۔ جو اپنی روح شیطان کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں۔ وہ دیانت دار شخص تھا۔ اور نیک زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کے جیب خالی تھے۔ مگر اُس کی نظریں کبھی کسی امیر کی تھیلی پر نہیں پڑیں۔ وہ ناکتخدا تھا مگر بھول کر بھی اُس نے کبھی کسی عورت کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا۔ اُسے معلوم تھا۔ کہ انجیل مقدس میں یہ ممنوعات میں سے ہیں۔ اور وہ انجیل مقدس کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ نفسانی خواہشات سے اس کا دل یکسر خالی تھا۔ وہ عورتوں کی اتنی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ جیسا کہ وہ کھاتے ہوئے بعد دو ایک گھونٹ شراب کا جسکا کہ وہ بغیر کھوتے ہوئے اعتدال کے عادی تھا۔ وہ نہایت نیک اور خدا ترس انسان تھا۔ اور مقدس مریم کے لئے اُس کے دل میں ایک خاص جذبہ احترام موجود تھا۔ گرجا میں داخل ہونے سے قبل اُسے کبھی یہ دعا نہیں بھولی۔

مقدس مریم اس ناچیز زندگی کو اپنی پناہ میں رکھ اُس وقت تک

دنیا پر نازل کی گئی تھیں۔ خوف۔ زہد۔ لیاقت۔ قوت۔ صلاح۔ دہشت۔ اور عقل۔

سنہری بالوں والی چھ نورانی ہستیاں اُس کے ہمراہی میں بنائی گئی تھیں۔ انکساری۔ دانائی۔ احترام۔ عصمت۔ اور فرمانبرداری کی دیویاں تھیں۔

اس کے پیروں پر دو سفید و عریاں تصویریں گرجا و برازی کی بنی ہوئی بنائی گئی تھیں۔ یہ روحیں عذاب میں پڑی ہوئی تھیں۔ اور الٰہی نجات و شفا کے لئے گڑگڑا رہی تھیں —— اور مریم کے فیض لامتناہی کا صدقہ پکار رہی تھیں ——

اسی کتاب کے دوسرے صفحہ پر بھائی سکندر نے بی بی مریم اور بی بی حوا کو روبرو بیٹھے ہوئے بنایا تھا تاکہ کنواری مریم کی عظمت عورت کے معاملہ میں بخوبی نمایاں ہو جائے۔ اور اسی کتاب میں جہنم میں ماکو حیرت میں ڈال دینے کے لئے آب حیات کا چشمہ، شمس و قمر در فردوس اور شہر خداوندی نہایت خوبصورتی سے بنائے گئے تھے۔

اسی طرح بھائی ماربود مریم کے عزیز ترین فرزندوں میں سے تھا۔ وہ سنگ تراش تھا۔ اور ہمہ وقت پتھر میں سے کھود کھود کر مقدس مریم کی شبیہ تیار کرتا تھا اس کام میں اُس کی عمر صرف ہو گئی تھی۔ اور ہمیشہ اس کی دراز ریش اور سفید بھویں کام کی ریت سے گرد آلود رہا کرتیں اور آنکھیں نرم۔ لیکن اس دیرینہ سالی میں بھی وہ خوش اور مطمئن تھا۔ اور یقیناً فردوس کی ملکہ اُسے اس ضعیفی میں اپنے رحم و حفاظت میں لئے ہوئے تھی۔ ماربود نے مریم کو ایک تخت پر بیٹھا ہوا بنایا تھا۔ اور اُس کی سمٹی ہوئی ابروؤں کے گرد اور سر کے اطراف ایک جواہرات کا بنا ہوا نورانی ہالہ حلقہ کئے ہوئے تھا۔

اسی طرح مونسٹری میں شعرائے باکمال بھی موجود تھے۔ جو ہمیشہ لطیف غزلیں لکھنے میں سرگرداں رہتے اور ان میں سے ایک خاص ناٹرڈہم کی زبان میں مریم کی حمد و ثنا لکھا کرتا۔

مقدس مریم کی شان میں اس عظیم الشان مقالہ کو دیکھکر بربات کا دل بھر آیا اور اُسے اپنی کم مائگی پر سخت صدمہ ہوا۔

"افسوس صد افسوس" اس نے دل ہی دل میں شام کو باغ میں گھومتے ہوئے کہا۔ "میں کس قدر بدنصیب ہوں اپنے دیگر بھائیوں کی طرح میں مقدس مریم کی حمد و ثنا نہیں کر سکتا۔ آہ اُس مقدس ترین ہستی کے لئے میں نے اپنے دل کی ساری محبت وقف کر دی ہے۔ مگر صد حیف کہ دوسروں کے مقابلہ میں میری۔ ساری ہیچ میری خدمات بے سود نظر آتی ہیں۔ اُف میں کس قدر ناکارہ ہوں۔ مجھے کوئی ہنر نہیں آتا۔ نہ اُس کی شان میں نہ تو میں کتابیں لکھ سکتا ہوں، اور نہ غزلیں۔ نہ تو مجھے مصوری آتی ہے اور نہ سنگتراشی۔ اُف۔ اُف۔

اور اس پر حزن و ملال کی کیفیت طاری ہوگئی۔

×××

ایک روز شام کو جنگلہ سے راہب بیٹھکر باتچیت سے دل بہلا رہے تھے ایک نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا۔ جو نرا جاہل تھا اور صرف مقدس مریم کے اسم مبارک کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہ جانتا تھا۔ اس کی کم علمی کے باعث لوگ اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ مگر جب وہ مرا تو اسکے مزار پر م۔ ر۔ ی۔ م کے چار حرف یعنی چار گلاب کے پودے نمودار ہوئے۔

اس قصہ کو سنکر بربات فرط محبت سے کانپ اٹھا اور مقدس مریم کی نیکی اور بندہ نوازی سے سخت متاثر ہوا۔ مگر اس پاک موت کی مثال سے اُسکی تشنہ روح کو تسکین نہ ہوئی۔ کیونکہ مریم کی پرستش میں وہ سب سے زیادہ حصہ لینا چاہتا تھا۔

اُس نے عبادت کے صدہا طریقہ سوچے۔ مگر بے سود۔ روز بروز اپنی کم مائگی کا خیال اُسے حیران کئے رہتا۔ اور وہ بحالت نا امیدی و جہالت کہا کرتا۔ کہ یا اللہ میں کیا کروں۔

آخر سنیاسی کے بدل ہو جانے پر وہ ہمیشہ اٹھتا۔ آج اُس کے دل پر ایک نامعلوم خوشی غالب تھی۔ اور وہ پہلے سے بہت زیادہ ہشاش بشاش نظر آتا۔ وہ اٹھا اور گرجا کے بڑے ہال میں داخل ہوا۔ اور وہاں (غالباً) گذشتہ اکیلا بیٹھ کر کھانا کھانے کے وقت واپس آیا

اور اُس روز سے ہی اُس کا یہ دل ہو گیا۔ جب دوسرے راہب دیگر کاموں میں مشغول ہو جاتے۔ تو یہ بات چپکے سے کھسک جاتا۔ اور گرجا میں بہا گھنٹوں گذار دیتا۔ اب تو اس کے چہرہ پر مزاج و خوشی ہی کے آثار رہتے۔ اور نہ وہ کبھی افسردہ خاطر ہی دکھلائی دیتا۔

اُس کی اس عجیب و غریب حرکت نے بہت جلد اسے ہمراہیوں کے شکوک کو بھڑکا دیا۔ اور وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ کہ آخر یہ بات کیا ہے گرجا میں جانے اور دیر تک ٹھہرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ بڑا پادری جس کا کہ یہ فرض تھا کہ اپنے ہمراہیوں کے ہر فعل پر نظر رکھے۔ یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ضرور یہ معلوم کروں گا۔ کہ یہ بات اس بھائی کے ہو سکتی گرجا میں کیا کرتا ہے۔

چنانچہ ایک دن جبکہ یہ راہب ول دروازہ بند کئے گرجا کے اندر تھا بڑا پادری صاحب کے ہمراہ وہاں گیا۔ تاکہ دروازوں کی درازوں سے جھانک کر یہ معلوم کرے کہ اندر کیا ماجرا ہے۔



قربان گاہ کے سامنے یہ راہب ہاتھوں کے بل اور سر کے بل ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ اور جسم پر کی گیندوں اور ایک درجن چھریوں سے تماشہ کر رہا تھا۔

بوڑھے راہب اس منظر کو دیکھ کر فرط غصہ سے کانپ اٹھے اور اس مذہبی بے ادبی پر لعنت بھیجی۔

ان بے چارے راہبوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ قربان گاہ کے سامنے تماشہ دکھا کر اپنی زندگی کا عزیز ترین سرمایہ، اس کا فن وہنر، جس کو اس نے سالوں

کی مشق کے بعد سیکھا تھا۔ جیسے وہ چھ سو فریوں میں اپنا کر شہرت حاصل کر سکا تھا
جس کی بدولت شہر میں لوگ اُسے جانتے تھے۔ جس کی بدولت بچے اُسے دیکھ کر
خوشی سے انگلیاں دکھاتے تھے۔ جس کی بدولت وہ کسی نہ کسی طرح رشتۂ روح و جسم
کو قائم رکھے ہوئے تھا۔

برنابہ کوئی جانتا تھا کہ ہر بات کے سبب میں ایک ایک دلیل [illegible] مگر
اب اُسے اس امر میں بھی کوئی شک باقی نہ رہا کہ اس [illegible] طرح [illegible] دلوائی کے
جرائم بھی نشوونما پاتے رہتے ہیں

پیر تھوں آس میں مشورہ کر ہی رہے تھے۔ کہ دروازہ کھولا [illegible] کو
فوراً باہر نکال دیں۔ کہا [illegible] دیکھتے ہیں۔ [illegible]
ہوئیں۔ اور قربان گاہ کی سیڑھیوں سے اتر کر [illegible] اور
اپنے آسمانی آنچل سے کو [illegible] کی پیشانی کو صاف کیا [illegible] کی نکالی
کھوپڑی سے پسینے کے قطرات جمع ہو گئے تھے۔

برنابہ فوراً حد درجہ احترام سے [illegible] ہو کر بولا۔

"خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو [illegible] کیونکہ وہ
حسنِ جمال [illegible] سے مسرور ہوں گے"

اُس کے بعد [illegible]

"[illegible]"

(اناطول فرانس) [illegible]

پھول

کبھی یہ پھول سے گل [illegible] کا زیور [illegible]
کسی کے پھولوں میں کام آ سکے [illegible]

مشامِ جاں ہے معطر کبھی تو نکہت سے | تو گاہ ہوتا ہے دوراں گلو سے دردِ سر
کبھی ہے سہرے کو ساتھ ہر گل حسرت | مرآئی اُسے گھر امید مادر اور پدر
کبھی حسینوں کے بنتے ہیں یہ گلے کا ہار | کبھی ہیں پھولوں میں سیج پر یہ بالا سحر
کبھی ہے باغ میں اورنگ چمن یہ الٹی بہار | کبھی مسند پہ ہیں سہرے کا گھر بنے بستر
کبھی یہ ڈالیوں میں جو تماشا دکھائی دے | کبھی یہ دھوپ سے گر گر پڑے ہیں مرجھا کر
کبھی تو سوں سے گل چیں لئے ہیں دامن میں | کبھی زمین پہ کھاتے ہیں ہر طرف ٹھوکر
کسی نے شوق میں کتر کے لگائی ہیں ایسے | کسی نے الگ عرق کھینچا ہوس دمست کر
کبھی ہیں بلبلیں اسیرِ بہار اور قمری | کبھی نثار یہ خود ہوتے ہیں حسینوں پر
کبھی تو گریہ ہے ہر وقت باغباں محنت | کبھی ہے بلبل نالاں جو داسہ جسم نثر
کبھی ہیں ڈالیاں مست النسیم و زمستاں | کبھی یہ پھول زمیں سے ہیں سدہ بوئی میں مگر
ہوائے باغ جہاں تک سک مدار گئی | جو گل کھلے سے تنے گل جن کو ہو گئے دوپہر
یہی دورنگیِ گلشن و بہار دہا ہے | کہ ایک حال سے ہوتی نہیں کسی کی بسر
صدائے حسرت ہر گل یہ صاف آتی ہے | ہمیں بھا جو جو پھولوں سے بنتے ہم بہتر
غرض کہ باغ جہاں میں ہر ایک ساکی ہے | ہوا ہمیں غنچہ کہ گل ہو ثمرِ با کہ شجر

اگر یہ جانتے جن جن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ نہاتے رنگ و بو لے کر

میرزا محمد حسن ماہ عظیم آبادی

اچھے نواب

(۱)

اچھے نواب کے حالات سُن لیجئے۔ آپ سارے نواب کے اکلوتے صاحبزادے

ہیں۔ بیچارے نواب لکھنؤ کے رئیس اعظم کہلاتے تھے۔ پچیس سال کی عمر تک اولاد کو بیٹھے ترسا ۱
کئے۔ خدا کی شان عین مایوسی میں امید نے جھلک دکھائی۔ دل کی امید بر آئی۔ قبر میں
پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ کہ اچھے نواب ملک عدم سے بازار وجود میں روتے ہوئے
تشریف لائے۔ اُن کے آتے ہی سب کی باچھیں کھل گئیں۔ بیگم صاحبہ کو چاند چڑھ گیا۔
نواب صاحب کو دولت ہفت اقلیم مل گئی۔ مگر اللہ آمین کا بچہ ابھی تین سال کا نہ ہونے
پایا تھا کہ نواب نامدار ڈھلک گئے۔ اچھے نواب نے بیگم صاحبہ کے زیر سایہ پرورش
پائی۔ بیگم صاحبہ کا حکم قادری حکم تھا۔ کیا مجال کہ اچھے نواب گھر سے باہر قدم رکھ سکیں ۲
لڑکیوں کی طرح محلوں میں رہنے لگے۔ کئی سال ناک میں نتھ کانوں میں بالیاں۔ اور
ہاتھوں میں چوڑیاں رہیں۔ اگر کبھی کبھار باہر جاتے تو برقعہ اوڑھ کر۔ تاکہ کسی کی نظر نہ
لگ جائے۔ سات آٹھ سال کی عمر تک برقعہ پوش رہے۔ دسویں سال برقعہ بڑھایا
گیا۔ نورت جگا ہوا۔ مسجدوں میں گھی کے چراغ جلائے گئے۔ مکتبوں میں مٹھائی بانٹی
گئی۔ یوں مکتبوں میں شیرینی تقسیم ہوئی۔ مگر اچھے نواب نے کبھی بھولے سے بھی مکتب
کا منہ نہ دیکھا۔ وہاں قدم رکھنے کا تو کیا ذکر۔ سولہ سال کے ہو گئے مگر بالکل کورے
رہے۔ امی محض بالکل جاہل سخت کندہ ناتراش سولہ سال کی عمر تک شیرخوار
بچوں کی طرح ماں ساتھ سلاتی رہی۔ اکیلے سوتے ڈر لگتا تھا۔ سولہ سال کی عمر تک
ماماؤں کے کٹکھڑے میں سوار رہے۔ خدا خدا کر کے اٹھارہ سال کے ہوئے تو شادی
ہوئی اور باہر آنے جانے لگے۔ مگر طبیعت میں زنانہ عادتیں گھر کر چکی تھیں۔ اور نور تعلیم و
تربیت سے بالکل محروم تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں باپ کا دیوان خانہ از سر نو سجایا گیا
دس ہزار روپیہ ماہوار کی آمدنی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی لکھنؤ کے اوباش جو سب کے
سب ٹھنڈے ملنے کے شہد سے اور میٹھے ہوئے گڑ کے تھے۔ صدا کی طرح آموجود ہوئے
اور اچھے نواب کھل کھیلے چونکہ تمام عمر زنان خانہ میں پرورش پائی تھی۔ اور گھر سے باہر
قدم رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ اب بھی یہ معمول تھا کہ دن بھر کمرے میں بیٹھے یاروں دوستوں
سے گپیں اڑایا کرتے۔ کبھی چوسر کا رنگ جما کبھی بازی لڑائی۔ کبھی شطرنج جمی کبھی صبح

شام تو اچھا خاصہ میلا لگ جاتا تھا۔ مصاحب ملک کا دم لگائے بیٹھے۔ اور جانڈو کے چھینٹے اڑاتے تھے۔ اور ایسے نواب کو جو بے ہی آلو بنائے بیٹھے یوں تو کئی حاشیہ نشین تھے مگر میر گلباز مرزا نعیم بیگ۔ شیخ جھٹن اور کالے خاں منزارت کے اربعہ عناصر اچھو نواب کے خاص مصاحب تھے۔

(۲)

صبح کا سہانا سماں تھا ان کے لاڈلے نواب صاحب مسند پر جلوہ افروز تھے میر گلباز چینی کی پیالی میں افیون گھول رہے تھے۔ مرزا نعیم بیگ جانڈو کا قوام بنا رہے تھے۔ اور شیخ جھٹن طلسم ہوش ربا سنا رہے تھے۔ کہ نواب صاحب نے ہیک سے چونک کر میر گلباز سے پوچھا۔ کہ میر صاحب یہ ہما جانور کہاں ہوتا ہے۔ کیا آپ نے بھی دیکھا ہے کبھی۔

حضور قسم ہے آپ کے نمک کی۔ سہ

بہت ڈھونڈا کہیں اس کو نہ پایا

مگر یہ جبور (جانور) ہے بہت نایاب کیا کہنے کہ جس کے سر پر سے گذر جاتے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے خدا جانے کہاں ہوتا ہے۔

مرزا ۔ حضور میں نے ماموں جان کی زبانی سنا ہے کہ یہ لندن (لنڈن) میں ہوتا ہے لندن میں ایک شہر ہے۔ اسوقت نام بھول گیا منہ پر پھر رہا ہے۔ مگر یاد نہیں آتا۔ اچھا سا نام ہے ——— "

میر گلباز ۔ "پیرس"

مرزا ۔ ہاں پیرس۔ پیرس خوب یاد دلایا جیتے رہو استاد خالصاً اس پیرس میں ایک بڑے عظیم الشان۔ بس اس پر اس کا آشیانہ ہے ماموں جان فرماتے تھے۔ کہ ایک دن وہ پیرس کی گلیوں میں سیر کیا کر رہے تھے۔ رات کا وقت تھا چاروں طرف سناٹا ہو رہا تھا۔ اتفاق سے اُدھر جا نکلے جدھر یہ سڑک ہے۔ ہما کا قاعدہ ہے کہ باہر نہیں نکلتا۔ ہوا میں چکر لگا رہا ہے۔ ماموں جان اسی خیال میں جا رہے

تھے۔ کہ یکایک ایک شیر ببر ڈکارا۔ اور ماموں جان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھپ سے
اس پیڑ پر چڑھ گئے۔ اب حضور میں کیا عرض کروں اُنکا درخت پر چڑھنا تھا۔
کہ ہما ٹہنیوں سے نکلکر اڑا۔ اُس کے پروں سے نور برسنے لگا۔ اور ماموں جان کی
آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہما سر کے پاس سے نکل گیا۔ قسمت کی بات ہے اگر سر پر سے
گذر جاتا۔ تو ماموں جان بادشاہ ہو گئے تھے۔

نواب "سچ کہنا تمہیں میرے سر کی قسم"

مرزا — قسم ہے جناب علم بردار کی جو اسمیں سرِ مو فرق ہو"

شیخ چھٹن — دیکھنے کو تو غلام نے بھی ہزاروں اقسام کے جانور بلبل بستان سے لیکر بوم شوم تک دیکھ ڈالے۔ مگر جناب ہما کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ بڑے درجہ کا جانور ہے۔ جانور کیا ولی ہے۔

میر گلباز "اس میں کیا شک ہے۔ شیخ سعدی نے گلستاں میں کہا ہے کہ ہما ہڈیاں کھاتا ہے۔ مگر جانور کو نہیں ستاتا۔ ؎

کہ استخواں خورد و طائرے را نیازارد

نواب — بھئی میر صاحب ہمیں ہما دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کیا کسی طرح اسکی تصویر مہیا نہیں ہو سکتی۔

مرزا — کیوں نہیں ہو سکتی۔ لاؤں اور جھٹ پٹ لاؤں۔ حضور کے حکم کی دیر ہے۔ گو پیرس کا سفر بہت دور دراز ہے۔ مگر غلام جان پر کھیلنے کو تیار رہتا ہے البتہ وافر روپیے کی ضرورت ہوگی۔

نواب "کیا مضایقہ ہے۔ تم حساب بنا کر دو۔ پھر فیصلہ کیا جاویگا"

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی اتفاقاً ایک چڑیا کی چونچ سے رسی کا بالشت بھر ٹکڑا جو وہ اپنے گھونسلے میں لیجا رہی تھی گر کر فرش پر آرہا اور کالسحال کے منہ سے بے اختیار نکلا "ارے سانپ" بس پھر کیا تھا نواب صاحب جوتیاں چھوڑ کر اندر بھاگے۔ اور چلا کر کہا "ارے سب دروازے بند کر دو" اب

مصاحب ہیں کہ بیرون در کھڑے قسمیں کھارہے ہیں کہ حضور خانصاحب کو دھوکا ہوا۔ وہ سانپ نہ تھا رسی تھی۔ مگر وہاں کس کو یقین آتا ہے۔ نواب صاحب ہیں کہ چھوٹی بیگم کے پاس چھپرکھٹ میں دبکے ہوئے الم علم درود پڑھ رہے ہیں۔ اور بڑی بیگم کھڑی پہر فقیر مسار رہی ہیں۔ اور دروازہ کھولنے نہیں دیتیں۔ بار بار کہتی ہیں۔ کہ اگر میرے بچے کو آنچ آئی تو سب کو زندہ جلوا دوں گی۔ خیر دار جو دروازہ کھولا۔

بانی ماتی　　　چیف اڈیٹر (خان احمد حسین خان)

میٹھی زبان

کرو کلام نہ سرمی کہ سرم گھسا رہی　　　ہزار سخت کلامی سے کار گر ہے سوا
کرو کلام نہ سرمی کہ سر وسد کلام　　　نہ کار حر کو کر دے رذیل اور رسوا

کرو کلام نہ سرمی جو طفل کم سِن سے　　　تو ہے یقین کہ وہ مانوس تم سے ہو جائے
سکھاؤ اسکو سعیفانہ سرم لہجے میں　　　کسی کو کیا ہے خبر کب یہ لعل کھو جائے

کرو کلام نہ سرمی ہمیشہ بوڑھوں سے　　　دل سکستہ کو کیوں اور پائمال کرو
جہاں سے اکو نہ امن و اماں گذر لے دو　　　یہ قعر گور ہیں گرنے کو ہیں خیال کرو

کرو کلام نہ سرمی ذرا سی بات ہے یہ　　　عمل جو اس پہ تمہارا بطرز احسن ہو
تو ایک روز وہ آئیگا جسکو دیکھو گے　　　گل مراد سے تم بھر کے میٹھے دامن ہو۔

(ترجمہ)　　　(ملوک احمد مخدوم بی اے)

ایک خط

(۱)

سنبلہ۔ مرزا طاہر بیگ کی خوبصورت۔ مدرسہ کی پڑھی ہوئی۔ سلیقہ شعار۔ نکتہ رس۔ مگر مغرور اور تند مزاج بیٹی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں اس کی نسبت مرزا جہانگیر سے ہوگئی۔ جو اُس کے چچا کا بیٹا تھا۔ مرزا جہانگیر نوجوان تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کا بی۔اے تھا۔ مگر وہ لیمسدہ تھا۔ آجکل مفلسی نا قابل معافی عیب ہے۔ وہ صاحب ڈائرکٹر محکمہ تعلیم کے دفتر میں ایک سو بیس روپئے ماہوار پر کلرک تھا۔ سنبلہ اور جہانگیر بہت خوش تھے۔ اور خیالی پلاؤ ابھی آئندہ زندگی کے متعلق پکا رہے تھے۔ کہ یکایک امیدوں تمناؤں اور ارمانوں کا خیالی قلعہ تاش کے گھر کی طرح گر کر پاش پاش ہوگیا۔ کیونکہ نواب بلند اختر نے جو دہلی کے رئیس اعظم اور صاحب جاہ و ثروت تھے۔ سنبلہ کے حسن و جمال کا شہرہ سن لیا۔ اور فوراً شادی کا پیغام بھیجا۔ نواب صاحب لاولد تھے۔ بیوی مر چکی تھی اور اب دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ اُس وقت نواب صاحب کی عمر پینتالیس سال کی۔ اور مرزا جہانگیر کی اٹھائیس سال کی تھی۔ نواب صاحب سیاہ فام تھے۔ اور جہانگیر گلفام۔ مگر نواب صاحب کا پلہ بھاری تھا۔ جہانگیر تمام دن دفتر میں جان کھپا کر ایک سو بیس روپئے کا منہ تیس دن کے بعد دیکھتا تھا۔ اور نواب کی یومیہ آمدنی بیس سو سے اوپر تھی۔ جہانگیر کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔ غربت میں اُس کی روٹی پکاتی تھی۔ اور بائیسکل پر دفتر جاتا تھا۔ نواب صاحب کی رہائش عالیشان سہرلوا ماں محل میں تھی۔ جس میں خانساماں اور باورچی۔ چھوٹے بڑے دو درجن سے زیادہ خدمتگار۔ مہریاں۔ مامائیں اور مغلانیاں تھیں۔ اصطبل میں کئی گھوڑے اور دو موٹر تھے۔ طاہر مرزا کی باچھیں کھل گئیں۔ جہانگیر کی طرف سے فوراً آنکھیں بدل لیں۔ حقیقی بھتیجے کو

ٹکا سا جواب دیدیا۔ غریب کا کلیجہ دم بخود ہو گیا اور سنبلہ کلیجہ پکڑ کر رہ گئی۔
غریب کیا کر سکتے تھے۔ یہ کمبخت زر خدا نہیں ہے بیشک خدا نہیں۔ لیکن بڑا پردہ
پوش ہے۔ عیب چھپاتا ہے۔ ستار ہے۔ اور ہماری مرادیں بر لاتا ہے۔ ہاں یہ زر
خدا نہیں ہے۔ لیکن قاضی الحاجات ہے۔

(۲)

خادم۔ کیا حضور نے گھنٹی بجائی ہے۔ فدوی حاضر ہے۔
نواب۔ ہاں ہم نے گھنٹی بجائی ہے۔ جاؤ اس عورت کو کہدو۔ کہ تیرے خط کا
کوئی جواب نہیں ہے۔

خادم چپ کھڑا رہا اور اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

نواب۔ تو کیا سوچ رہا ہے۔ کیا تو نے نہیں سنا۔ ہم نے تجھے دہلیز کی سجاوٹ
کے لئے نہیں رکھا۔ ہم تعمیل حکم کے لئے تنخواہ دیتے ہیں۔ ہمارا حکم یہ ہے کہ
اس عورت کو کہدو چلی جائے۔

اس ملک میں خدمتگار بہت ذلیل سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بہت کم ہوتے
ہیں جن میں غیرت کا پاس ہو۔ لیکن یہ خادم اوروں سے مختلف تھا۔ یہ اپنی جگہ سے
نہ ہلا اور مؤدب ہو کر کہا۔

خادم۔ میرے آقا خدا آپ کو سلامت رکھے۔ یہ بدقسمت عورت قابل رحم ہے
زار زار رو رہی ہے۔ اُسکی حالت دیکھکر پتھر کا کلیجہ پانی ہو رہا ہے۔ حضور! اسکا رنگ
اسوقت ہلدی کی طرح زرد ہے۔ اور کھڑی کانپ رہی ہے۔

خادم کی گفتگو کا نواب صاحب کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انھوں نے اُس کیطرف
سے منہ پھیر لیا۔ اور کہا "بس بس،، ناچار ملازم اپنا سا منہ لیکر باہر چلا گیا۔ یہ
شام کا وقت تھا۔ اور سردی کا موسم نواب صاحب اس وقت اپنے پر تکلف
کمرے میں جو دولہن کی طرح آراستہ تھا بیٹھے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے۔ جب خادم
چلا گیا۔ نواب نے اخبار اسوقت میز پر رکھدیا۔ اور انگیٹھی کی طرف دیکھنے

لگے۔ جس میں آگ کے شعلے اس وقت مانسی بھوتوں کی طرح رقص کر رہے تھے۔ یکایک اُنکی نگاہ اس خط پر جا پڑی جو بیرقعہ نویس نے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اور جس کے متعلق نواب صاحب نے فرمایا تھا۔ کہ کہہ دو۔ کوئی جواب نہیں ہے۔

خط کو دیکھکر نواب صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گیا اور بیساختہ اُن کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ مکر۔ لغو۔ فضول۔ بری بکواس۔ وہ شخص چور ہے۔ فی الحقیقت چور ہے۔ مگر خدا جانے کیوں بجلی کے لیمپ کی روشنی میں جس کا سبز گلوب زمرد پر اوس برسا رہا تھا۔ اس خط کو اٹھا کر کہیں کہیں سے پڑھنے لگے۔ دل کے فقرے اُن کی نظر سے گذرے۔

"حضور آپ کو معلوم ہے۔ گھر کیا شے ہے۔ حضور یہ وہ مقام ہے جہاں سے آپ نہ صرف آسمان بلکہ ستارے اور خداوند عالم کو دیکھ سکتے ہیں۔ حضور حوالات میں اور زندان میں ستارے نظر نہیں آتے۔ قصور معاف کرنا صاحب خداوندی ہے۔ ۔ ۔ میرے خاوند کی بہت خاطر تھی۔ ہم دونوں اپنے گھر میں بہت خوش تھے۔ خدا کے لئے اُس کا قصور معاف فرماویں۔ میرا خاوند چور نہیں ہے۔ مجبور ہو کر اُس نے زیور اٹھا لیا تھا۔ وہ ہمیشہ دیانتدار رہا ہے۔ جب فساد ہوا۔ اور میں سخت بیمار ہو گئی۔ تو ہمارے پاس جو کچھ تھا۔ سب صرف ہو گیا۔ مجبوری میں اُس سے یہ غلطی ہو گئی۔ ہم قسمت دیدہ ہو گئے۔ حضور میں تمام عمر کے لئے لونڈی ہو جاؤنگی۔"

نواب صاحب نے خط سائی پر رکھدیا۔ اور کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے وہ اپنے دل میں کہہ رہے تھے۔ میں اس عورت کو نہیں جانتا۔ اور نہ جاننا چاہتا ہوں اس نے مجھے کیوں خط لکھا۔ میں ہرگز اُس کی مدد نہیں کر سکتا۔ بیشک اُس کا خاوند ہمارا وفادار ملازم تھا۔ اور پہلے کبھی بددیانتی نہیں کی۔ لیکن کیوں فرض ادا۔ کیوں نہیں یاد رکھا کہ [illegible]

کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ اگر بیوی بیمار ہو گئی تھی تو کیوں نہیں پہلے کچھ پس انداز کیا تاکہ بیماری میں کام آتا۔ سنبلہ بیگم سچ کہا کرتی تھی کہ اس شخص کو قابل اعتماد نہ سمجھو۔ بیگم کے کہنے پر میں نے اُسے پولس کے حوالہ کیا۔ اب وہ حوالات میں ہے۔ اور اُس کی بیوی بہت بیمار ہے۔ اب میں اس خط کو کیا کروں۔ اس قسم کی عورتیں شوہر کے بہانے میں بڑی دلیر ہیں۔ اور یہ اُن کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

یکایک دروازہ کھلا۔ اور سنبلہ بیگم فوقِ البھڑک لباس میں اٹھلاتی ہوئی وہاں آئیں اُن کے کانوں کے الماس لگار آویزے بجلی کی روشنی میں سورج کی آبرو خاک میں ملا رہے تھے۔

سنبلہ (حیران ہو کر) واہ آپ بھی غضب کر رہے ہیں آٹھ بجنے کو ہیں۔ اور ابھی تک آپ نے کپڑے نہیں پہنے۔ کیا بھول گئے کہ آج سمبادکیے جانا ہے۔

نواب۔ بیگم میں معافی مانگتا ہوں۔ مجھے مطلق یاد نہیں رہا۔ کہ آپ کے ہمرکاب جانا ہے۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ اس خط کو پڑھ کر میری طبیعت بہت مدہوش ہو گئی۔

سنبلہ۔ (تنک کر) کس کا خط؟ کیسا خط؟

نواب۔ امداد حسین کی بیوی دکھیہ کا خط ہے۔

سنبلہ کا رنگ لال چقندر ہو گیا۔ اور تلخ ہو کر بولی۔

سنبلہ۔ امداد حسین چور کی بیوی کا خط۔ بڑی گستاخ عورت ہے۔

نواب۔ بیگم میرے خیال میں آپ ایک بار اس خط کو پڑھ لیں۔ شاید آپ اُسے معاف کر دیں۔

بیگم۔ (بگڑ کر) نواب صاحب آج آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کہتے ہیں۔ امداد حسین کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔ اُسے ضرور سزا ہونا چاہئے۔ ہم نے اُس پر اعتبار کیا اسے اچھا سمجھا اور اُس کے بدلے اُس نے نمک حرامی کی۔ اگر ہم مجرم کو چھوڑ دیں تو ہم قابل الزام

ٹھیرے ہیں۔ آپ مہربانی کرکے کپڑے پہنئے۔ وقت جا رہا ہے دیر ہو رہی ہے۔ تماشہ شروع ہو گیا۔ مجھ سے غلطی ہوگی۔ میں اس خط کو ہرگز ہرگز نہ پڑھوں گی۔

بیگم صاحبہ نواب پر حاوی تھیں۔ اس لئے پھر وہ کچھ نہ بولے۔ اور بھیگی بلی کی طرح دوسرے کمرے میں کپڑے پہننے چلے گئے۔

شمسہ بیگم صوفہ پر بیٹھ گئی۔ خط اُس کے قریب ایک سائڈ پڑا تھا۔ نواب صاحب کو جو دیر ہو گئی۔ تو اُس نے نفرت سے تمام گویا وہ خط ایک میلا اور غلیظ چیتھڑا تھا ہاتھ میں رومال لپیٹ کر اٹھایا۔ اور سرسری طور سے پڑھا۔ اور کہا اوئی یہ کاغذ کیسا خراب ہے۔ اور جامنی رنگ سے لکھا ہوا ہے مگر خط کے پڑھتے ہی بیگم کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ وہ چہرہ جو گلابی تھا اب زرد تھا۔ اور سرد مہر آتش فشاں آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور کوئی غیبی آواز اُس کے کانوں میں کہہ رہی تھی۔

طاہر مرزا کی بیٹی تیرا بھی گھر ہے۔ اور بڑا عالیشان گھر ہے۔ لیکن تم نے بھی اپنے محل کی کھڑکیوں سے جھانک کر کبھی ستارے اور خدا دیکھا ہے۔ کیا کبھی تو نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے۔ کہ ستارے کیا ہیں۔ اور خدا کیا ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ پھولوں کے مسکراتے ہوئے چہروں کو ستارے۔ اور محبت کو خدا کہتے ہیں۔ اور تو دونوں سے محروم ہے۔ کیا ان کا ستارا اور مقدس لفظ تیری زبان میں استعمال ہو سکتا ہے اگر تو آج مر جائے تو کیا ہو۔ نواب صاحب ہی ایک سال انتظار کریں۔ بیوی مر جائے۔ تو خاوند بہت جلد دوسرا بیاہ کر لیتا ہے۔ شمسہ یہ آواز سن رہی تھی کہ جہانگیر کی شکل تصور سے نمودار ہوئی۔ اور یہ ہر چند کہ کے بولی۔ اے دل بیتاب بیگم۔ غریب دکھیا تجھ سے بہتر ہے پھر اس لئے سنے۔ کہ وہ ستارے دیکھتی ہے اور خدا اُس کے پاس ہے۔

جب نواب صاحب واپس آئے۔ تو شمسہ نے کہا۔ نواب میں آج سینما دیکھنے نہیں جاؤں گی۔ دکھیا کو کہلا بھیجو کہ ہے اُسکے خاوند کا قصور معاف کیا۔ نہ صرف قصور

معاف کیا۔ بلکہ ہم اُسے ایک موقعہ اور دیں گے۔ ہم اُسے بحال کرتے ہیں۔ پولیس میں دست برداری دیدی جائیگی۔ اب اُس کے شوہر کا چالان نہ ہوگا جب وہ رہا ہو لوا ہی نوکری پر حاضر ہو جائے۔ بیبلہ جس وقت یہ کہہ رہی تھی اُس کی نرگسی آنکھوں میں دو آنسو گالوں کے آویزوں کے پہروں کو شرمارہے تھے۔ اور اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ دکینہ اُس سے اچھی ہے۔ اسے میں ایک فقیر سڑک پر سے گذرا۔ وہ گا رہا تھا۔ ؎

شال و زربفت مبارک تمہیں دولتمندو
ہم کو کمبل میں دو شالے کا مزہ ملتا ہے

حسب اڈیٹر (خان احمد حسین خان)



خواب

بے سروساماں ہزاروں ہی رہا ہے میری — پاؤں پھیلائے ہوئے ہیں بے غم اس گھڑی
خواب نوشیں ! واہ مشغول نے اہل جہاں — ڈر گئی کیوں مجھ سے رہی ہو یوں دامن کشاں
لطف سے آکر یہاں آنکھوں میں گھر کرلی ہیں — فکر دنیا سے مجھے تو نے جدا کر لی ہیں
کنج ظلمانی میں گھر تیرے فرش سرائے مار ہیں — سو رہے ہیں تجھ کو مانند لوریوں سے کم نہیں
نہ جام پُرتکلف اور نہ خوش نما مکاں — نغمہ داؤد سے سرمست نہ جوش افشاں
ہر طرح ساماں راحت ہے مہیا اس جگہ — مر مجھے آتے ہی ہو جاتا ہے سودا اس جگہ
کیوں کمینوں کی گھر سے فرش پر رہی ہے لو — سید رنداں ہے تجھے پھولوں کی سیج ارمست ہو
مار سے مسلول پر بیٹھا گھڑا ہے ناخُسدا — سیدموجوں سے بہے جولے میں جھکولے رہا
رو در سر آتا ہے طوفاں چل رہی ہیں آندھیاں — اہ نکسہ لہروں کو ہو ہیے جارہی ہیں موکاساں
موج سر اٹھتی ہیں لہریں آ رہی ہیں دائیں بائیں — کاں سٹے ہیں سہلا کی ہورہی ہے سائیں سائیں

ہو رہا ہے چار سو ہنگامۂ محشر بپا موت چونک اٹھی ہے سنتے ہی یہ پُر قہر ندا

ایسے شور و شر میں ملا جو کچھ نہ غمخوار ہاں اسعد رکیوں تجھ میں ہیں ای خواب جانبداریاں

ہاں شب خاموش آسایش کے ساماں مزید اور تو کروٹ نہ لے اے وائے سخت نا سعید

سکھ سے تو اسے لے تو اسواست ہمیں آ ناقس تاج زر جس سر دھرا ہے جس اس سر کو نہیں

(ترجمہ شکسپیر) سید احمد کبیر

نیرنگ دنیا

(۱)

انبساط و طمانیت کا وہ شخص بجا طور پر اہل ہے۔ جس کا دل مسرت کا خزینہ ہے عزیزوں کی فرقت دائمی میں مضطرب نہیں ہے۔ محبت مادری و شفقت پدری سے محروم نہیں ہے۔ دشمنوں کی افترا پردازی سے محفوظ ہے۔ خاندان میں ہر دل عزیز ہے۔ زیور علم سے آراستہ ہے۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔ ہمدردی و اخلاق (جو بنی نوع انسان کا اعلیٰ ترین جوہر ہے) سے اُس کا دل معمور ہے۔ بس وہ مجسم مسرت ہے۔ مسرت و شادمانی کا خزینہ ہے۔ انبساط کا بہترین مرقع ہے۔

ثروت آرا بیگم کو ابھی جوش لطفی پر مار تھا۔ اُس کا محل جس میں آج اُلو بول رہا ہے جس کی در و دیوار سے آہ و بکا کی صدا بلند ہے۔ جو صدیوں سے ویران پڑا ہے۔ کبھی خوشیوں کا مسکن تھا۔ اس کے مکیں ہر طرح سے شاداں و فرحاں تھے ثروت آرا بیگم مسٹر طاہر حسن ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی لائق و خوبصورت فرزانہ شریک ہوئی تھی۔ دونوں میں کمال محبت تھی۔ یہ اگر شمع تھے تو وہ پروانہ۔ وہ اگر گل تھے تو یہ بلبل۔ مسٹر طاہر حسن ابھی ہمہ صفت موصوف بیوی کے دل سے قدرداں تھے۔ پروانہ وار نثار تھے کسی نے سچ کہا ہے ؎

بلبل کو بھی یہ عشق گلستاں نہیں ہوتا پروانہ بھی یوں شمع پہ قرباں نہیں ہوتا

افسوس فلک کج رفتار کو اُن کی شادمانی پسند نہ آئی۔ شہر میں عالمگیر وبا اس طرح پھیلی کہ کوئی گھر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ مسٹر ظہیر حسن کا چمن بھی خزاں نے پامال کر دیا اور دیکھتے دیکھتے ثروت آرا بیگم کے والدین بھی موذی طاعون کی نذر ہو گئے۔ جواں پسر و دیگر افگار کا چھوٹا بھائی رشید احمد بھی شکستہ دل بمردہ بہن کو روتا بلکتا چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھارا۔ ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد مرتے وقت اپنی مرحومہ بہن کی بچی نکہت آرا بیگم کو جسے وہ بہت ہی چاہتا تھا۔ افتخار حسن کے ساتھ منسوب کر گیا۔ اور اپنی جائیداد افتخار و نکہت کے نام ہبہ کر دی۔ اس موت سے ثروت آرا پر رنج والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس وسیع دنیا میں وہ اور اُس کا شوہر یکہ و تنہا رہ گئے۔ حقیقی خیرخواہ بھائی۔ محبت کرنے والے والدین غمگسار بہن ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے تھے۔ وہ صابرہ بھی کوشش کرتی تھی۔ کہ خدا اسے اس صدمہ کے سہارنے کی طاقت دے۔ ظہیر حسن نے سوائے ملازمت کے باہر کی آمد و رفت تک قلم موقوف کر دی۔ ہر وقت ثروت آرا بیگم کے پاس ہی بیٹھے رہتے۔ ہر طرح سے تلقین صبر کرتے۔ گو وہ جانتے تھے۔ کہ یہ زخم جگر کاری ہے۔ تلوار یا نشتر کا زخم نہیں ہے جو علاج سے جلد بھر آئے گا۔ بلکہ یہ وہ زخم غم ہے جسے مضمون کیا برسوں میں بھی اچھے ہونے کی امید نہیں۔ ان جانکاہ صدموں نے اُسے بیمار کر دیا جب مصیبت آتی ہے تو ہر طرف سے آتی ہے۔ بیوی کی بیماری ہی نے بے چارے ظہیر صاحب کی جان پر بنا دی تھی۔ پھر نکہت آرا کے چچا نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ نسبتی بھائی کی جائداد کو بھاوج کی ملکیت بنا کر عدالت میں بحیثیت حقیقی وارث چارہ جوئی کی۔ یہ قانون قدرت ہے کہ حق کی فتح ہوتی ہے۔ اور دشمن ہمیشہ مغلوب رہتا ہے۔ جب مقدمہ فیصلہ ہو گیا۔ اور وصیت نامہ کی رو سے نکہت کے ولی یہ لوگ قرار پائے۔ تو چند احباب نے ظہیر حسن کو یہ بھی کہا کہ اُس شخص کو جس نے جھوٹے گواہ مہیا کر کے کذب بنانے کی کوشش کی۔ آپ لوگ سزا دلوانے سے کیوں احتراز کرتے ہو۔ مگر میاں بیوی نے یہی کہا۔ کہ انسان کے ساتھ بُرائی

کبھی نہ کرنا چاہیئے۔ اُس نے جو کچھ کیا نہ اُس کا حق تھا۔ نگہت کے حقیقی وارث وہی ہیں اگر اُن کی زیادتی بھی تو خود کیفر کردار کو پہنچیں گے۔

(۲)

کئی مہینے گذر گئے۔ ثروت آرا کی طبیعت آہستہ آہستہ رو بہ اصلاح ہونے لگی ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ مریضہ کو جو دل کی بیماری ہو گئی ہے۔ اُس کا مکمل اچھا ہونا غیر ممکن ہے دفعتاً اگر کوئی رنج یا خوشی ہوئی تو دل کی حرکت بند ہو جانے کا اندیشہ ہے طاہر حسن کو ڈاکٹر کی باتوں سے ایسا صدمہ ہوا۔ کہ وہ باہر دیوان خانہ میں جا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے آب وہوا تبدیل کی پہاڑ پر لے گئے بڑے بڑے سول سرجن کو علاج کے لئے بلایا۔ اکثر راتوں کو مصلے پر سر بسجدہ رہتے۔ آخر خدا نے اُن کی سُن لی۔ اور ثروت آرا بیگم بالکل تندرست ہو گئیں۔

طاہر حسن کو اطمینان تھا کہ قلبی طمانیت حاصل ہو گی۔ جب بیوی کی طرف سے بالکل اطمینان ہو گیا۔ تو افسر انچارج کے ساتھ ڈیوٹی پر ایک ہفتہ کے لئے فرخ آباد گئے اُن کے جانے کو صرف دو ہی روز ہوتے تھے۔ کہ ثروت آرا بیگم تنہا کمرہ نشست میں بیٹھی اخبارات کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ "آج کی خبریں" کے کالم میں لکھا تھا کہ "مسٹر طاہر حسن ایک اتفاقیہ حادثہ کی وجہ سے کل انتقال کر گئے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال گئی ہے۔ اور ..." وہ آگے کچھ نہ پڑھ سکی۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ دھماکے کی آواز سے نوکرانیاں دوڑی آئیں۔ فرش پر سے اٹھا کر پلنگ پر لٹایا۔ ننھی نگہت گھبرا کر رونے لگی۔ اعجاز بھی امی امی کہہ کر ہوشیار کرنے لگا۔ ڈاکٹر آئے بہت کچھ علاج معالجہ کیا۔ مگر مریضہ مسلسل ۵ گھنٹے تک بیہوش رہی۔ جب ہوش آیا۔ اپنی امیدوں کے مرکز اور دلدار بیٹے حسن اعجاز کو سینہ سے لگا لیا۔ نگہت بھی خالہ کے گلے لگ گئی۔ فوراً ہی ٹیلی گرام بھیجا گیا۔ جواب آیا۔ طاہر حسن بخیر ہیں۔ کل تک پہنچ جائیں گے۔

دوسرے روز طاہر حسن آ گئے۔ سارے گھر میں خوشی کے شادیانے بجائے

سے پھٹنے لگے۔ ثروت آرا کو دیکھا تو بخار سوں کی مریض تھی۔ چند گھنٹوں کے صدموں نے ابتر حالت کر دی تھی۔ ظہر حسن نے ہو ہی سے کہا۔ "بیگم اس تو سمجھ ہوں۔ منوتی سچ تھا۔ ساید آپ نے کل واقعہ پڑھا ہیں میرا ہم نام مرحوم آفس میں کلرک تھا (مینیجر) خبر جیتے ہی ہم نے اپنا نام دیکھ لیا۔ مگر میری ثروت کو جو صدمہ ہو گیا۔ اُس کی تلافی میں ہرگز نہیں کر سکتا۔

(۳)

یہ بالکل ٹھیک ہے کہ ماؤں کی گود بچوں کا ابتدائی مدرسہ ہے۔ ثروت آرا بیگم جیسی نیک نہاد بی بی جن کے اوصاف حمیدہ ضرب المثال تھے۔ ایک لائق ماں قابل معلمہ کی حیثیت سے دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتی تھی اختر تمکنت آرا سے تین سال بڑا تھا۔ اس لئے وہ اکثر ماں کو تجربہ کی سمجھتا تھا۔ کچھ تو ماں کی تربیت کا اثر۔ ساتھ ہی نیک بخت والدین سے ورثہ ہی میں ملی تھی۔ بزرگوں کا ادب۔ چھوٹوں سے محبت۔ کسی کو حقیر نہ جاننا۔ ہر ایک سے اظہار ہمدردی نے اُسے بہت جلد ہر دلعزیز کر دیا۔ اسکول میں بھی ہمیشہ اپنے کلاس میں اول رہتا۔ اُستاد بھی اپنے ہونہار شاگرد کو دل سے چاہتے تھے۔ لڑکے بھی اُس کی دوستی پر فخر کرتے تھے۔

تمکنت آرا پانچ سال کی معصوم بچی تھی۔ بچے تو مانڑوں کی نقل کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ تمکنت آرا خالہ کو نماز پڑھتے دیکھتی تو خود بھی اُس کے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔ وہ تلاوت کرتی تو بھی تمکنت بہت خوش ہوتی۔ ثروت آرا نے موقعہ بموقعہ سے قرآن مجید کی عظمت تلاوت کے فائدے اُس کے ذہن نشین کر دیتے تھے۔ کبھی کوئی سبق آموز نتیجہ خیز قصہ تمکنت آرا کو سناتی۔ بُرے کاموں کے بُرے نتیجے اور اچھے کام کے اچھے نتیجے تمکنت کو سمجھاتی۔ تواریخ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سناتی اور یہ حضرت فاطمۃ الزہرا کا ایثار۔ ام المومنین عائشہؓ کا علم اور بلند خیالی۔ حضرت رابعہ بصری کی عبادت اور ریاضت۔ چاند بی بی کی بہادری۔ نور جہاں کی حاضر جوابی۔ رضیہ سلطانہ کی حکومت۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت۔ یہ سب اس قصہ کے پیرایہ میں بیان

کرتی۔ اور کبھی تمکنت بھابی توجہ سے سینا اور سبق حاصل کرلیتی۔ یہ سلائی کرتیں تو وہ کچھ
نہ کچھ ضرور سیکھتی ثروت آرا جب باورچی خانہ میں جاتی یہ بھی ساتھ ہوتی۔ غرضکہ تمکنت
نے سالوں میں ایسی تعلیم حاصل کرلی تھی جو عام گھروں میں چھوٹی بچیاں کتابیں
رٹ کر دو ماہ میں سال میں سیکھتی ہیں۔ علمی شوق تمکنت آرا کے سرشت میں تھا۔ پھر خالہ
کی سرپرستی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ دسویں سال وہ بغرض تعلیم لاہور کے زنانہ اسکول
میں داخل کردی گئی۔ گو کہ ثروت آرا نہیں چاہتی تھی۔ کہ تمکنت آرا کو اپنے سے جدا کرے
مگر آگرہ میں لڑکیوں کی تعلیم کا کافی بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً لاہور بھیجنا پڑا
اعجاز حسن کو بھی تمکنت کی تعلیم میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ مثل بہن کے اُسے چاہتا تھا اور
نوجوان ہم خیال ہونے کے اُس کی لیاقت اور عقلمندی کی بہت قدر کرتا تھا۔ تمکنت آرا بیگم
بھی اُس کی بڑے بھائی کی طرح عزت کرتی تھی۔ چودھویں سال اس نے پنجاب یونیورسٹی
سے انٹرنس پاس کرلیا۔ وہ تمام یونیورسٹی میں اول رہا۔ اخبارات میں بڑی تعریف
ہوئی۔ ظہیر حسن نے اپنے نور دیدہ کی کامیابی کی خوشی میں انجمن و یتیم خانہ میں روپے دیئے
ثروت آرا بیگم نے غربا کو کپڑے اور روپے تقسیم کئے۔ ظہیر حسن نے حصول علم کے لئے بیٹے
کو علی گڈھ کالج بھیجدیا۔ ظہیر حسن نہایت روشن خیال تھے۔ چند احباب کا یہ بھی خیال تھا کہ
اعجاز حسن کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ظہیر حسن صاحب جائداد
تھے جس سے پانچ سو روپیہ کی ماہوار آمدنی تھی۔ تعلیم انسان صرف ملازمت کے
لئے حاصل کرتا ہے۔ یہاں اعجاز کو ملازمت کی ضرورت ہی نہیں۔ پھر تمکنت آرا بیگم تو
لڑکی ہے۔ اُس فرقہ سے جسے تعلیم سے محروم رکھکر اس کے حقوق سے چشم پوشی کی جاتی ہے
ناقص العقل کے مذموم الفاظ اُس کی جانب موسوم کئے جاتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کیا
اُن کے اعضا اُن کے قوائے عقلی صرف کھانے پینے حامل رہنے اور مرجانے کے لئے ہیں
تواریخ کے صفحات پر آجکل اُن باکمال لائق فائق خاتونوں کے نام روشن ہیں جو دنیا
میں بڑے بڑے کار نمایاں کرگئیں اور اب بھی جہاں اُن کو ادنیٰ دنیا کی سے حصہ لے
علم کا موقع دیا جاتا ہے وہ مردوں پر سبقت لیجاتی ہیں۔ جو کچھ بڑے اسکولوں میں [illegible]

اُس کے بانی وہی مرد ہیں۔ جو تعلیم دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ جلسے پارٹی میں شرکت کرنے سے روکتے ہیں۔ اور کہتے ہیں سوسائٹی سے الگ رہو۔ اب فرماتے وہ ناقص العقل کیوں نہ ہوں۔ ایک جاہل مرد کا ایک جاہل عورت سے مقابلہ کیجئے۔ پھر آپ کو اس بحث کی گنجائش ہی نہ رہے گی۔ جب تک آپ اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم نہ دلوائیں گے۔ ہماری قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ قوم کی آئندہ ترقی کا انحصار اُن کی ذات پر ہے۔ کیونکہ مائیں ہی جب علم کے نام سے ناواقف بلکہ بہت سے ناآشنا ہوں گی تو آنے والی نسل جو اُن کی گود میں نشو و نما پائیگی اور انکی تربیت ناقص ہوگی اور کی ناقص تربیت جو کچھ نقصان ہوگی اُس کا اثر ہماری قوم پر ہوگا۔ بیچاری عورتوں کو تعلیم نہ دینے سے ضرر اثر صرف اُنکی ہی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ ترقی میں سدّ راہ ہوتا ہے۔ علم جسمانی و روحانی غذا ہے۔ جس طرح زیست کے لئے ہوا ضروری ہے اسی طرح انسان (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کے لئے علم حاصل کرنا لازمی ہے۔ حضرت اکبر نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎ کہتے ہیں۔

کہتے ہیں لوگ علم سے بہتر و رنج رہنا گی ۔۔۔ بے علم ہے کوئی۔ تو وہ انسان ہے نام کا

بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم ۔۔۔ نیچر کا قصا ہے رہے بیکے وہ غلام

نائی نائی ۔۔۔ ام الحکیمہ مرحوم (مسز طاہر جمیل)

ایک انگریز کپتان

ملکہ الزبتھ کا نام بہت مشہور ہے۔ وہ انگلستان کی نامور ملکہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بہت دانا اور بہت خوبصورت تھی۔ ایک دن ملکہ اپنی خواصوں کے ساتھ تازیادہ محل سے سیر کو نکلی ٹہلتے ٹہلتے ملکہ اور ملکہ کی خواصیں ایسے مقام پر پہونچیں جہاں کیچڑ

تھا ملکہ کے پاؤں میں زرنگار بالوس تھیں۔ اور جسم پر زرق برق ریشمی لباس۔ ملکہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ اس مقام سے جہاں کیچڑ تھا۔ گذرنا ضروری تھا اور کیچڑ پر قدم رکھنے سے جوتوں کا ستیاناس اور چھینٹوں سے پوشاک کا بگڑ جانا یقینی تھا۔ ناگاہ ایک طرف سے ایک صاحب جمال مخمل پوش نوجوان غزال رعنا کی طرح نمودار ہوا اور آتے ہی اپنا مخملی کوٹ زمین پر بچھا دیا۔ ملکہ کوٹ پر سے گذر گئیں۔ اُنکو نوجوان کا یہ انداز بہت پسند آیا نگاہ لطف سے اسکی طرف دیکھا۔ اور مسکرائیں یہ نوجوان والٹر ریلے تھا۔ جو تاریخ انگلستان میں سر والٹر ریلے کے نام سے مشہور ہے۔ اور جسپر انگلینڈ کو فخر اور ناز ہے۔

ملکہ کی خوشنودی مزاج سے والٹر ریلے کی قسمت جاگ اٹھی۔ چونکہ وہ صاحب جمال اور لسان تھا اُسے محافظان شاہی کا کپتان بنا دیا گیا۔ یہ عہدہ قدر عمدہ تھا مگر ریلے کی طبیعت شباب حصال اور سیلانی تھی۔ حاضری دربار اُسے وبال معلوم ہونے لگی۔ وہ چاہتا تھا کہ دنیا دیکھے اور شہرت عام حاصل کرے۔ کچھ عرصہ کے بعد اُس نے ملکہ سے کہا کہ میں امریکہ جاکر آپ کے زیر سایہ ایک نیا ملک آباد کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امداد دی جائے۔ اُس زمانہ میں امریکہ میں جنگل بھرے پڑے تھے۔ اور وہاں جو لوگ آباد تھے اُنھیں ریڈ انڈین کہتے تھے۔ ملکہ نے منظور کیا اور اُسے آدمی دیئے اور مالی امداد کی۔ ریلے نے وہاں کے باشندوں سے اچھا سلوک نہ کیا۔ بلکہ اُن سے لڑکر اُنھیں مار بھگایا۔ پھر اُن کے ملک پر قبضہ کرکے اُس علاقہ کا نام ورجینیا رکھا۔ ورجینیا کی یہ رعایت تھی۔ کہ انگریزی زبان میں ورجن کے معنے ہیں کنواری۔ اور ملکہ الزبتھ کنواری تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد ریلے انگلستان واپس آگیا۔ وہ اپنے ساتھ اعلیٰ قسم کے تمباکو اور زعفران اور بہت سے موتی لایا علاوہ ان تحائف کے وہ آلو۔ خربوزے۔ اور ٹماٹو کو بھی لایا۔ ان چیزوں سے اہل انگلستان بالکل ناآشنا تھے۔ ریلے انگلستان کا پہلا شخص ہے۔ جس نے تمباکو پیا۔ لکھا ہے۔ کہ ایکدن ریلے اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا حقہ پی رہا اور دھواں اڑا رہا تھا کہ اُس کا

پیش خدمت اتفاقیہ وہاں آگیا اور یہ سمجھا کہ اُس کے آقا کے کپڑوں کو آگ لگ گئی ہے دوڑا دوڑ گیا۔ ایک ڈول پانی سے بھرا ہوا لایا۔ اور ریلے کے سر پر الٹ دیا۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں سر والٹر ریلے کی بڑی قدر رہی۔ ملکہ کی وفات کے بعد جیمز ششم فرماں روائے انگلستان ہوا۔ وہ سر والٹر ریلے کا مخالف تھا۔ ریلے کے دشمنوں کو موقعہ مل گیا۔ اُنھوں نے بادشاہ کے خوب کان بھرے۔ اور اسقدر بھڑکایا کہ وہ محسن ملک قید کر دیا گیا وہ تیرہ سال قید رہا۔ اور قیدخانہ میں اُس نے تاریخ دنیا لکھی۔ جسے لوگوں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ یہ جوانمرد زندانی بھی بیکار نہ بیٹھا۔ قید میں تنگ آکر اُس نے بادشاہ کو کہلا بھیجا۔ کہ جنوبی امریکہ میں ایک سونے کی کان ہے۔ مجھے اُسکا مقام معلوم ہے۔ اگر مجھے آزاد کر دیا جائے۔ تو میں وہاں جاؤنگا۔ اور وہاں سے سونا جہازوں پر لاد لاؤنگا۔

بادشاہ جیمز یہ چاہتا تھا کہ سر والٹر ریلے رہا کیا جائے۔ مگر چونکہ اُسے روپیہ کی بہت ضرورت تھی۔ اُس نے منظور کر لیا۔ ریلے جہاز لیکر گیا۔ لیکن جہاں وہ گیا۔ وہ ملک ہسپانیہ والوں کے قبضہ میں تھا۔ جن سے اُس کی لڑائی ہوگئی اس جنگ میں ریلے کا لڑکا نشانہ بندوق ہوکر کام آیا۔ اور اُسے ناکام واپس آنا پڑا۔ بادشاہ اُسے خالی ہاتھ دیکھکر آگ بگولا ہوگیا۔ ساتھ ہی ہسپانیہ والوں نے شکایت کی۔ اور کہا کہ تمھارا آدمی قزاق بحر ہے۔ اُس نے ہماری بستیوں پر حملہ کیا ہے۔ اُسے سخت سزا دو۔

بادشاہ جیمز تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اور موقعہ ڈھونڈ رہا تھا۔ ہسپانیہ والوں کو خوش کرنے کو اُس نے اس بے نظیر انسان کے متعلق قتل کا حکم صادر کیا۔ جب اُسے مچان پر گردن مارنے کو کھڑا کیا گیا۔ تو اُس نے جلاد کے ہاتھ سے کلہاڑی لے کر اُس کی دھار دیکھی۔ اور مسکرا کر کہا۔ کہ یہ کڑوی دوا ہے۔ لیکن تمام بیماریوں کا حکمی علاج ہے۔ جس وقت اُس کا سر تن سے جدا ہوا۔ تو حاضرین میں سے ایک شخص بے اختیار بول اٹھا۔ " تمام انگلستان میں یہ لاثانی

سرہے۔

(ترجمہ)		سعیدہ خاتون

کھلونے کی گاڑی

اجین کا راجہ پالک بڑا نااہل تھا۔ اُس کے ظلم سے چھوٹے بڑے نالاں تھے برہمن گو اُس کے ڈر سے بظاہر دم نہ مار سکتے تھے۔ مگر پیٹھ پیچھے دن رات اسے کوستے تھے۔ آخر جب اُس کا ظلم و ستم حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ تو ایک سادھو نے پیشین گوئی کی۔ کہ ایک گوالا جس کا نام آریک ہے۔ اس ادھرمی راجہ کا کام تمام کر دیگا۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر پالک کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ پھر کیا تھا سینکڑوں گوالے پکڑے اور قید کر دئے گئے۔ اکیلا آریک ہی بچا۔

اسی شہر میں ایک خوبصورت نوجوان برہمن تھا جس کا نام چارودت تھا وہ حد سے زیادہ سخی تھا۔ اُس نے اجین کی دولت مند اور مشہور گائن وسنت سینا کو جس کے حسن کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور جو فن موسیقی میں لاجواب تھی دیکھا اور اُس کی محبت کا دم بھرنے لگا۔ وسنت سینا بھی اس نوجوان برہمن کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ مگر جو لوگ سخی ہوتے ہیں وہ سب کچھ پرمیشر کی راہ میں دے ڈالتے ہیں۔ اور اپنے لئے کوڑی بھی نہیں رکھتے۔ یہی حال چارودت کا تھا۔ وہ اسی سخاوت کی وجہ سے نادار تھا۔ اور نہیں چاہتا تھا کہ بیوی کی دولت پر ہاتھ صاف کرے۔ اور پھسلا سا پھرے۔ اس لئے شادی نہ ہوئی تھی۔ وسنت سینا چاہتی تھی۔ کہ اپنی تمام دولت خوبصورت برہمن پر قربان کر دے۔ مگر چارودت نے اپنی وضعداری نہ چھوڑی۔ زمانے نے لاکھ جتن کئے مگر ایک نہ چلی آخر ایک دن وہ اسے جواہرنگار زیورات کی صندوقچی لیکر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اور سیدھا

برہمن کے گھر کا رخ کیا۔ اُس وقت بھیاں بھیاں مینہ برس رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ اور وسنت سینا کے عطر سے بسے بالوں کی بلائیں لے رہے تھے۔ راہ میں اُسے راجہ پالک کا سالا سنستھانک جو ایک چھٹا ہوا شہدا اور بدذات شرابی۔ اور بس بھرا کالا ناگ تھا اُسے مل گیا۔ وہ مدت سے وسنت سینا کا مشتاق تھا۔ اور چاہتا تھا کہ کسی طرح اُسے اپنی بنا لے۔ مگر وہ اُس کے قابو میں نہ آتی تھی۔ اُس وقت جو وہ راہ میں مل گئی تو اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ چاہتا تھا کہ جھپٹ کر اُسے اُٹھا لے اور زبردستی گھر لے جائے۔ کہ بادل زور سے گرجا اور بجلی اس طرح کڑکی اور کوندی کہ ڈرتے ڈرتے عیاش کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وسنت سینا نے موقع غنیمت سمجھا وہاں سے اُلٹے پاؤں بھاگی۔ اور موذی کے چنگل سے نکل کر سیدھی چارودت کے مکان میں جا پہنچی۔ وہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وسنت سینا نے اُسے کہا کہ سنستھانک مجھے بہت دق کر رہا ہے۔ اور میں اُس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ ابھی راہ میں ملا تھا۔ مگر خیر گزری کہ بادل اور بجلی اور بلا ٹل گئی۔ اب کرپا کیجئے کہ یہ صندوقچی اپنے پاس رکھ لیجئے آج کل چور چکاروں کا ڈر ہے۔ چارودت انکار نہ کر سکا۔ صندوقچی رکھ لی۔ اور مسلح نوکروں کو ہمراہ دے کر وسنت سینا کو اُس کے گھر پہنچا دیا۔ اور سنستھانک خون سک پیکر خاموش ہو گیا

وسنت سینا کی ایک بال باندھی باندی تھی۔ اُس کا نام مدنکا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کی شادی سرولک برہمن سے ہو جائے۔ مگر اس صورت میں ہو سکتی تھی، کہ داسی کا بھاری مول جو وسنت سینا نے دیا تھا چکا دے۔ سرولک نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے روپیہ پیدا کرے مگر ممکن نہ ہوا۔ دل کی لگن بہت بری ہوتی ہے محبت میں انسان سب کچھ کر گزرتا ہے۔ ہار کر اور مایوس ہو کر سرولک نے دل میں ٹھان لی کہ بلا سے خواہ کچھ ہی ہو کسی امیر کے گھر چوری کر کے مال میسر ہو تو مدنکا کی قیمت ادا کرنی چاہئے۔ اُس نے چارودت کا گھر چنا۔ گو اُس کے پاس روپیہ نہ تھا مگر ٹھاٹھ امیرانہ تھے۔ اس لئے بھرم بڑا تھا

سرویلک نقب لگاکر چارودت کے مکان میں داخل ہوا۔ چارودت نے وسنت سینا کی صندوقچی کی حفاظت کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک آدمی دن رات پہرہ دیتا تھا سرویلک نے دیکھا کہ چارودت کا نوکر صندوقچی پر ہاتھ رکھے سو رہا ہے۔ سرویلک نے چپکے سے صندوقچی اٹھالی اور ہوا ہوگیا۔ صبح جب چارودت کو چوری کا حال معلوم ہوا۔ تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اُس کے پاس ایک نایاب موتیوں کی مالا تھی وہ لیکر وسنت سینا کے گھر گیا۔ اور نوکر کو بلا کر کہا کہ میرے پاس جو کچھ تھا وہ کل رات جوئے میں ہار دیا۔ پھر وہ صندوقچی جو مالو نے میرے پاس امانت رکھی تھی گرو رکھکر روپیہ لیا۔ اب معلوم ہوکہ وہ ساہوکار صندوقچی لیکر روپوش ہوگیا ہے۔ جوئے کی لت بہت بری ہوتی ہے۔ کہیں یہ بیش قیمت مالا بھی نہ ہار دوں۔ یہ میرے بزرگوں کی نشانی ہے۔ یہ مالو کو دیدو اور کہو کہ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ وسنت سینا نے مالا رکھ لی اُسے چارودت کے گلے کا ہار ہونے کا اور بہانہ ہاتھ آگیا۔

اب سرویلک کا حال سنئے۔ وہ صندوقچی لے کر خوشی خوشی مدنکا کے پاس گیا اُسے یقین تھا کہ صندوقچی دیکھکر وسنت سینا کی باندی باغ باغ ہو جائے گی مگر اُس نے صندوقچی پہچان لی اور آگ بگولا ہوگئی۔ اور سرویلک کو برا بھلا کہنے لگی۔ وسنت سینا اوٹ میں کھڑی اُنکی لڑائی سن رہی تھی۔ جب دونوں بکتے جھکتے تھک گئے۔ تو وہ سامنے آئی اور کہا کہ مدنکا میں نے تجھے آزاد کیا میری خوشی اب یہ ہے کہ تو سرویلک کے ساتھ اپنی شادی کرلے اور اسکے پاس چلی جا۔

اب وسنت سینا کو جو دل لگی سوجھی تو وہ صندوقچی لیکر چارودت کے ہاں پہنچی اور کہا کہ میں نے جوئے کی سبھا میں آپکی مالا ایک شخص کے پاس گرو رکھی تھی وہ اُسے لیکر کہیں چلتا ہوا۔ اسلئے یہ سوچا کی صندوقچی اپنے پاس رکھئے۔ چارودت تا ڑ گیا یہ بڑی جو اس کا مطلب سمجھ گیا اور کھل کھلا کر ہنس دیا۔

دوسرے دن باروں کی چھاؤں میں جب چارودت کہیں جانے لگا تو اسے

نوکروں سے کہا کہ جب بابو جاگیں تو انھیں کہنا کہ پالکی میں بیٹھکر باغ میں آجائیں۔ صبح جب وسنت سینا جاگی تو اُس نے جلدی جلدی سنگار کیا۔ اور باغ جانے کو تیار ہوئی اتنے میں رہوسین روتا ہوا آگیا۔ یہ چارودت کا بیٹا اُس کی پہلی بیوی سے تھا اُس کی ماں مر چکی تھی۔ اور بچہ کی عمر کوئی پانچ برس کی تھی۔ وسنت سینا نے اُسے گود میں اٹھالیا۔ پیار کیا۔ چوما اور رونے کا سبب پوچھا۔ تو اُس نے کہا ہماری ہمسایہ نے اپنے لڑکے کو ایک کھیلنے کی گاڑی جو سونے کی بنی ہوئی ہے لادی ہے۔ میں نے اماں سے کہا کہ مجھے بھی یہ کھلونا لادو۔ تو اُس نے مٹی کی بگھی لادی ہے۔ ہمیں سونے کی گاڑی منگا دو۔ وسنت سینا نے اُسی وقت دو تین زیور نکالکر انا کو دئے اور کہا کہ بچے کو سونے کی گاڑی بنوا دو۔ بچہ کو بہلا کر وہ باہر نکلی۔ تاکہ پالکی میں سوار ہو کر باغ کو جائے۔

اتفاق سے سنستھانک وہاں ایک افسر کے ہاں جو چارودت کے پڑوس میں رہتا تھا آیا ہوا تھا۔ اُس کی پالکی باہر کھڑی تھی۔ وسنت سینا نے اُس کی پالکی کو چارودت کی پالکی سمجھا۔ اور اُس میں بیٹھ گئی اور پردے چھوڑ دئے کہار کچھ فاصلہ پر بیٹھے تھے انھوں نے سمجھا کہ سنستھانک سوار ہوئے۔ وہ پالکی اٹھا کر روانہ ہوگئے دوسرا اتفاق دیکھئے کہ سرویلک نے عیاری کر کے آریک گوالے کو قیدخانہ سے نکال دیا تھا۔ اور سپاہی اُس کی تلاش میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ وہ سپاہیوں سے بچتا بچاتا چارودت کے مکان کے قریب آنکلا اور چپکے سے اُس کی پالکی میں بیٹھ گیا۔ کہاروں نے پالکی اٹھالی اور بے خبر باغ کی طرف روانہ ہوئے۔

چارودت نے بڑے شوق سے پالکی کا پردہ اٹھایا۔ تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اس میں وسنت سینا کی جگہ ایک قیدی بیٹھا تھا۔ اُس وقت اُسے سادھو کی پیشین گوئی یاد آئی۔ اُس نے فوراً آریک کی بیڑیاں کاٹ دیں۔ اور کہا کہ یہاں ٹھیرنا خطرناک ہے۔ جلد کہیں چلا جا۔ اب سنستھانک کی سنئے۔ وہ جب افسر کے گھر سے آیا تو وہاں پالکی کا نشان نہ تھا۔ ناچار پیادہ گھر آیا۔ دیکھا تو پالکی ڈیوڑھی

ڈیوڑھی پر موجود ہے۔ پہلے تو کہاروں پر بہت خفا ہوا۔ مگر جب وسنت سینا کو دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ چاہا کہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچے۔ کہ اُس نے ایسا دھکا دیا۔ کہ سنستھاناک چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا۔ آگ بھبھوکا ہو کر اٹھا۔ اور اُس نازنین کو مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ پھر بزدل عیاش نے جب دیکھا کہ وہ ہلتی جلتی نہیں تو سمجھا کہ وہ مر گئی۔ پھر تو وہ بہت ڈرا۔ ادھر اُدھر سے پتے جمع کر کے اُسے ڈھانپا اور وہاں سے بھاگا ہوا سیدھا عدالت میں گیا۔ اور چارودت پر وسنت سینا کے قتل کا الزام لگایا۔ عدالت سے وارنٹ طلبی جاری ہوا۔ چارودت عدالت کو جا رہا تھا۔ کہ راہ میں اُسے میترا ملا۔ جو اُس کا ہمسایہ تھا۔ اُس نے اُسے ایک پوٹلی زیورات کی دی۔ اور کہا یہ وسنت سینا کا مال ہے۔ میرے پاس امانت تھا۔ اب میں اُسے نہیں رکھ سکتا۔ اسے لیلو اور وسنت سینا کو دے دینا۔ چارودت نے وہ پوٹلی لے لی اور بغل میں دبا کر عدالت میں پہنچا۔ وہاں اُسے سنستھاناک کا استغاثہ سن کر بہت غصہ آیا اور سر عدالت اُس نے لفظ سانی شروع کی۔ جوش کے عالم میں کہیں ہاتھ جو ہلا تو بغل سے وہ پوٹلی گر گئی۔ جس میں وسنت سینا کا زیور تھا۔ سب نے وسنت سینا کے بیش بہا زیور شناخت کر لئے۔ اور مقدمہ ثابت ہو گیا۔ کیونکہ سنستھاناک چشم دید گواہ تھا۔ چارودت برہمن تھا اُسے عدالت موت کی سزا نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے بن باس کی سزا دی گئی۔ مگر راجہ پالک نے مسل منگوا کر اُس کے موت کے حکم پر مہر کر دی۔

چارودت کو چنڈال مرگھٹ میں لے گئے۔ تاکہ اُس کو قتل کر دیں مگر ابھی وہ تلوار قلم نہ کرنے پائے تھے۔ کہ وسنت سینا بدھ مت کے ایک سادھو کے ساتھ جس نے اُسے پتوں کے نیچے سے نکالا اور ہوش میں لا کر علاج معالجہ کر کے تندرست کیا تھا وہاں آ گئی۔ اور ساری صورت بدل گئی۔ لوگ یہ حال دیکھ کر بہت بگڑے اور چاہتے تھے کہ سنستھاناک کی تکا بوٹی کر ڈالیں کہ چارودت نے اُس کا قصور معاف کر دیا۔

یکایک شور مچا اور اریکا جس نے سرد ملک کی مدد سے پالک کو مار کر اجین پر قبضہ کر لیا تھا برسرِ موقع نمودار ہوا۔ اُس نے چارودت کو بدھ مت کی تمام خانقاہوں کا افسر مقرر کیا۔ اور اُس کی شادی بڑی دھوم دھام سے وسنت سینا سے ہو گئی۔ پھر اریکا نے سرد ملک کو اپنا سپاہ پتی مقرر کیا۔

(ترجمہ)　　　مسز مارتھا ڈیوڈ از کرنال

جوانی

جب گرم تھا ہنگامۂ دربارِ جوانی
جز عشق نہ تھا کوئی خریدارِ جوانی

کھیلے ہوئے ہنگامۂ طفلی کا زمانہ
آتا ہے کوئی لو سرِ بازارِ جوانی

اک وقت میں صحبت یہ اسے دل کا وسیلہ
اس سے ہے جو لذتِ آزارِ جوانی

ہر لفظ میں پوشیدہ ہیں سو مطلب رنگیں
ہے شرحِ طلب دفترِ طومارِ جوانی

اشارے سے ہو سکے ہر اک کو سرہی معمور
شاداب ہی کیا گلشنِ سحّار جوانی

صد حیف کہ سب بھول گئے کچھ نہ رہا یاد
فطرت نے سکھائے تھے جو اسرارِ جوانی

ہے دَور ادھر ختم اُدھر رخصت ساقی
ہوشیار ہو ہوشیار ہو سرشارِ جوانی

تھا نقش ہر دل پہ ترا عشق جنوں خیز
ہر داغ تھا اک تمغۂ سرکارِ جوانی

اک وہ ہیں جو مسرور ہیں ہر فصل طرب خیز
اک ہم ہیں کہ مشہور ہیں بیزارِ جوانی

اُس شخص سے پوچھو در لطفِ اسیری
عالم میں جو ہو بارہ گرفتارِ جوانی

کھوئی ہوئی دولت نہیں ہوتی ہے میسر
اب کوششِ بیجا ہے طلبگارِ جوانی

افسوس کہ پیری میں کوئی کام نہ آئے
وہ عضو بدن تھے جو مددگارِ جوانی

کمزوری یہ سمجھو کہ ہو جوش میسر
یہ مسئلہ ثابت ہے وہ کارِ جوانی

ڈوبی ہوئی ماتم میں ہر بات تھی پیری
اللہ رے وہ لذتِ گفتارِ جوانی

شباب اردو لاہور

شملہ کا نظارہ

تساب اردو لاہور



والسرکل لات

کس طرح کرے صبر گرفتارِ محبت — ہے پاس شکن طرۂ طرارِ جوانی
افسوس کی کچھ قدر کرو میرے جوانو — پھر ہوگی تمہیں حسرتِ دیدارِ جوانی
ہر گام پہ ہے لغزشِ مستانہ کا عالم — ہے ہوش ربا جامۂ خمارِ جوانی
ہے مرکزِ جذبات سویدائے دلِ سنگ — اور جادۂ عشرت خطِ پرکارِ جوانی
اے حسن تری بزمِ طرب خیز میں جا کر — طاقت ہے کسے جو سُنے اظہارِ جوانی
ہے ذوق تماشا تو اٹھا آئینہ افسوس — رخسار ہوں جب مطلع الانوارِ جوانی
وہ فلسفہ حسن کا اصلی ہے مرقع — چہرے پہ نظر آتے ہیں جب آثارِ جوانی
افسوس کہ گم کردہ نشاں ہے سرِ منزل — وہ جوش جو تھا قافلہ سالارِ جوانی
یہ یاد رکھو پھر کبھی آنسو نہ تھمیں گے — دیکھو گے اگر چہرۂ بیمارِ جوانی

پیرانِ در میکدہ روتے ہیں عزیز اب
تا چند سناؤ گے یہ اشعارِ جوانی

مرسلہ فضل اکبر بی اے۔ — عزیز

مسئلہ سالمات

گذشتہ سے پیوستہ

برّاعظم کے بعض حصص اس مشہور مسئلہ کی طرف کم و بیش متوجہ رہے۔ ایک قابل الذکر ڈانیل برنولی ہے۔ جو ۱۷۰۰ء اور ۱۷۸۲ء کے درمیان گذرا ہے۔ یہ شخص گرونِنگن ملک ہالینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ اور ریاضیات اور طبیعیات کا ایک بہت مشہور استاد تھا۔ اُس نے مسئلہ سالمات کے علم میں قابل قدر اضافہ اپنی زبردست تصنیف کے ذریعہ سے کیا تھا۔ جو ۱۷۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُس نے بالواسطہ یہ ظاہر کیا تھا۔ کہ گیس بہت باریک ذروں سے مرکب ہے۔ جو بڑی تیزی کے ساتھ اِدھر اُدھر

اڑتے پھرتے ہیں۔ بھرے ہوئے برتن کے کناروں پر گیس کا جو دباؤ پڑتا ہے وہ انھیں ذروں کے تصادم اور ٹکڑوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر کسی برتن کا حجم بدل جاتے تو دباؤ الٹا ہوگا۔ یہ بائل کا نظریہ تھا۔ برنولی کا استدلال بہت کمزور اور غیر مطمئنانہ ہی جس کی وجہ سے اس کا تصور ایک صدی تک کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ اس کے بعد اس کی طرف بعض محققوں کا خیال رجوع ہوا۔ اور انھوں نے اس میں انتہائی مساعی حسنہ سے اس میں ترمیم کی۔ اور اسے اچھی بنیادوں پر قائم کیا۔

جیمس باسکووچ اٹلی کا ایک مشہور استاد ریاضیات اور محقق عالم تھا۔ ۱۷۱۱ء اور ۱۷۸۷ء کے درمیان گزرا ہے۔ اس نے اپنی تحقیق و تفتیش سے مسئلہ سالمات کے سلجھاؤ کی بہت کوشش کی اور نئی باتیں اس کے متعلق دریافت کیں۔ اس نے ۱۷۵۹ء میں ایک کتاب "فلسفہ طبعی" کے عنوان سے لکھ کر شائع کی۔ اس میں اس نے سالمات کی نوعیت کے مسئلہ پر تفصیلی اور عالمانہ بحث کی۔ اور یہ دکھانا چاہا کہ جیسا وہ مادہ سمجھتا ہے۔ اس کی بنا پر جملہ مظاہر طبعی مثلاً تصادم۔ اتصال۔ مائعات دباؤ۔ لسلساہٹ اور لچک کی توجیہ ہو سکتی ہے۔ اس کے خیال کی رو سے ذرہ ایک وسطی نقطہ ہے جس کی طرف مقدار مادی منسوب کیا جاتا ہے۔ اسے نقطۂ مقدار بھی کہنا بجا ہوگا۔ اور قوت کا مرجع بتاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک اور نقطہ مقدار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ پہلے کی طرف ایسی سرعت سے مائل ہوتا ہے۔ جو معکوس بعد مربع کے ساتھ نسبت پر موقوف رہتی ہے۔ جب فاصلہ تھوڑا ہوتا ہے تو اس قوت میں گریز اور کشش کی کئی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جب دونوں نقطے ایک دوسرے کے بہت ہی قریب آجاتے ہیں۔ تو گریز بھی انتہا درجہ کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وسطی نقاط مقدار کبھی ایک دوسرے سے اتحاد نہیں پکڑ سکتے۔ باسکووچ نے قوت کی بابت کوئی خاص خیال ظاہر نہیں کیا۔

انیسویں صدی کی تحقیقات

اس سے قبل جو عالم اس مسئلہ کی تحقیق و تفتیش کے سلسلہ سے مشہور ہوتے تھے۔ وہ یہ تسلیم

کرتے تھے کہ ذرہ کے گرد اگرد ایک بھاسخت قلب ہوتا ہے۔ باسکووچ نے اسے غیر ضروری ٹھہرایا اور یہ سوال قائم کیا کہ جب دوسرے طرف کا ذرہ ایک کے پاس پہنچتا ہے۔ تو اُن میں انتشار اور گریز پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے اتحاد پکڑنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس نظریہ نے اپنے انوکھے پن سے محققوں کی توجہ کو اپنی طرف مائل کیا مثلاً انگلستان کے عالم و محقق پادری جوزف پریسٹلے نے جس کا ۱۸۷۴ء میں انتقال ہوا تھا۔ اسے قبول کر لیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد انگلستان کے نامی گرامی ماہر برقیات مائکل فراڈے نے بھی اُس سے اتفاق کیا وہ کہتا تھا کہ مادہ کے ذرات یعنی جو طاقتیں اُس سے وجود پذیر ہوتی ہیں وہ صرف ایسی ہیں جن کی بابت ہمیں علم ہے۔ یہ تو ہیں مادہ ہیں۔ اور جہاں یہ وسعت پکڑتی ہیں۔ وہاں مادہ بھی پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم ایک ذرّہ تمام خلا میں پاتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بنیاد ماکہ ذرّہ کے مرکز سے قوتیں نکلکر خطوط مستقیم میں ہر طرف جاتی ہیں۔ اور روشنی کے نورانی ذرے انھیں خطوط پر سے گذرتے ہیں۔ اس نظریہ کی سر جے ٹامسن نے تجدید کی اور اسے درست ٹھہرایا۔

لارڈ کیلون جو کئی برس ہوئے سر ولیم ٹامسن اور اس سے پیشتر پروفیسر ٹامسن کے نام سے مشہور ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے علما و محققین یورپ و امریکہ میں نہایت ممتاز نامآور اور استاد و یکتا سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ ۱۸۲۴ء میں شہر بلفاسٹ (آئرلینڈ) میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے باسکووچ کے مسئلہ کی تحقیقات شروع کی اور یہ دکھایا جا یا کہ ذرّے جمع ہو کر کس طرح بلوریں شکل اختیار کر سکتے ہیں اور اُن کے ذریعے سے مثلاً ہر روشنی کیونکر ظہور میں آتے ہیں۔

حساب اور ہندسہ کے واسطے لابدی ہے۔ کہ باسکووچ کا نظریۂ ذرات قبول کیا جائے چاہے وہ کسی صورت میں کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اُن قوتوں کا اندازہ کرنا محال ہے۔ جو فاصلہ پر موقوف ہیں۔ ریاضی اصول سے یہ مسئلہ آسانی عقل میں آجاتا ہے

مگر طبعی طور پر اُس کے ماننے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ مادہ اور سالمات کو بری قوت تسلیم کرنا بہت دشوار ہے۔ اگر قوت کو فعل جسمانی قرار دیا جائے اور اُسے عصبی سعی سمجھا جائے۔ تو یہ بات عقل میں آجاتی ہے۔ مگر یہ فہم و ادراک سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ فعل جسمانی کا فعل جسمانی پر اثر ہوتا ہے اور خالص قوت کے سوا دوسری اور کوئی شے نہیں ہے۔ اس سے یہ الزام آتا ہے۔ کہ ہم کم از کم عملاً دوئیت کو مانیں۔ جب ہم ذہن میں قوت کا خیال کرتے ہیں تو اُس کے ساتھ ایک اور شئے کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے۔ جو قوت کی مزاحم ہوتی ہے اور اُسے ہم مادہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اگر ہم باسکوویچ اور فراڈے کے خیال کی تقلید میں متحرک کو تحرک کے ساتھ وابستہ کریں۔ اور یہ کہیں کہ مادہ قوت ہے تو قوت کا دوہرا خیال پیدا ہوتا ہے۔ ایک حالت میں اُس کے ذریعے سے عمل کی تحریک ہوتی ہے۔ اور دوسری حالت میں خود عمل قبول کرتی ہے۔ ایک تو ارادت کا دوسرا تحسین کا نشان ہے۔ مسائل طبیعات میں باسکوویچ کے مسئلہ کا اخیر میں چاہے کچھ ہی حشر ہو۔ مگر اس سے انکار محال ہے۔ کہ مادہ اور قوت کے اتحاد اور اتحاد تصور قوت کے تصور سے فلسفیانہ خیالات میں مستقل اور قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے۔

اب یہاں اس امر کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ کہ کیمیائی دریافتوں سے مسئلہ سالمات پر کیا اثر پڑا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری نصف حصہ تک تو اس علم کی یہ کیفیت رہی۔ کہ محققین اسے ٹٹول کر استعمال کرتے تھے۔ مگر کیمسٹری میں ترقی ہوتی رہی۔ خام دھاتوں کو نکالا۔ صاف کیا اور پگھلایا جاتا تھا۔ اور کئی قسم کے مرکبات تیار ہوتے تھے۔ جو زیادہ تر صنعتی اور علمی قدر و قیمت رکھتے تھے۔ مگر جب تک عناصر اربعہ ہوا پانی خاک اور آگ کا پسندیدہ مسئلہ غالب و رائج رہا۔ کیمیا کے علم میں خاطر خواہ ترقی ہونا محالات سے تھا۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں جرمنی کے ایک مشہور ماہر کیمیا جارج اسٹال نے جو سنہ ۱۶۶۰ء اور سنہ ۱۷۳۴ء کے درمیان گذرا ہے۔ ایک مسئلہ فلوجسٹن پیش کیا جس سے پرانے خیالات درہم برہم ہو گئے۔ (باقی باقی)

جی آر۔ رائے جبلسٹ

شمع و پروانہ

بسکہ وحشت چھا چکی تھی باعث رات آنکھوں میں کٹی — صبح تک تھا اک جہاں حسرت بھرا اہل نظر
شمع و پروانہ میں باہم تھے عجب راز و نیاز — طرفہ پر دونوں طرف تھا جذب الفت جلوہ گر
اشکباری اک طرف تھی بیقراری اک طرف — اک طرف جلتی تھی وہ یہ اک طرف دیتا تھا سر

شمع سے پروانہ کہتا تھا کہ اے شعلہ عذار — میرا جلنا ہے بجا ہوں عاشق خستہ جگر
تجھکو کس کا سوگ ہے بکھرائے ہیں کیوں الٹے بال — رو رہی ہے آٹھ آٹھ آنسو تو کیوں اس کی وجہ کہہ
تیرے دم کی روشنی پھیلی ہوئی ہر بزم میں — پرتو رخسار سے تیرے ہیں روشن بام و در
تو نہ ہو جس گھر میں بدتر ہے اندھیری گور سے — تو ہو جس بزم میں وہ بزم ہے ظلمت اثر
نور باطن کی نظر میں گو نہ ہو سرا فروغ — چشم بینا کے لئے لیکن ہے مشعل نور نظر
عاشق صادق ہوں میری ہمت مردانہ کو دیکھ — کود پڑتا ہوں دہکتی آگ میں کیا ہے خطر

شمع کس آنسو ربائی سے ہوئی گرم سخن — جل کے کہتی تھی کہ اے پروانہ شوریدہ سر
بے زباں ہوں دوست دشمن سب جلاتے ہیں مجھے — گرم رو راہ فنا میں رہتی ہوں مثل شرر
سر سے تلووں تک لگی اُس پر یہ سر سے تا پاؤں — کس قدر ثابت قدم ہوں دیکھ میری رہگزر
تو ذرا سی آنچ کی بھی تاب لا سکتا نہیں — میرے سر چڑھتا ہے اس پر ہوں گراں تا سحر

سُن کے یہ اک شب کی یہ پروانہ جانباز نے — اور پہنچا منزل مقصود تک لے بال و پر
دل پہ جو گذری شفق افسوس کہہ سکتا نہیں — دیر تک یہ شعر میں پڑھتا رہا با چشم تر
دیکھ کر بزم جہاں میں شمع کا سوز و گداز — جل بجھا کس موج سے کہتا نکلا پروانہ تھا

(شفیق عماد پوری)

بیخودی

مسٹر راک ویل بستر علالت پر پڑے ہوئے اپنے مکان کی خوبصورت چھت کو جس پر ستارے اور گل بوٹے جگمگا رہے تھے۔ بے وجہ ہی دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے تھے۔ کہ ابھی پندرہ دن اور اسی طرح بیکار ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل میں رہنا ہوگا۔ کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی۔ کہ جب وہ کچھ سوچتے تو اُن کے دماغ پر ہزاروں خیال ایک دم دھاوا کر دیتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُن کا سر غبارے کی طرح پھول رہا ہے اور عنقریب پھول کر پھٹ جائیگا۔ مگر انھیں ابھی بہت کچھ سوچنا تھا۔ یکایک انھیں اپنی ماہ پیکر دختر ملی کا خیال آیا۔ ساتھ ہی مسٹر لارنس کا خیال آیا۔ مسٹر راک ویل امریکہ کے ایک کروڑ پتی تھے۔ ملی اُن کی خوبصورت نیک سیرت اکلوتی بیٹی تھی۔ مسٹر لارنس فن موسیقی میں ماہر تھا مگر نادار۔ ملی کو اس سے محبت تھی اور لارنس ملی کو آنکھ کا تارا سمجھتا تھا۔ سوچتے سوچتے مسٹر راک ویل نے اپنی بیوی مائل کو آواز دی۔ مائل اپنے شوہر کے پلنگ سے کچھ فاصلہ پر بیٹھی کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ وہ خاوند کی بیماری میں لاثانی نرس ثابت ہو چکی تھی۔ مسٹر راک ویل نے سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا گو شادی کو دس سال ہو چکے ہیں مگر مائل ویسی ہی حسین اور مہ جبین تھی جیسی کہ ایام دوشیزگی میں تھی۔ خاوند کی آواز سنکر اُس نے اپنا سامان زردوزی تپائی پر رکھ دیا۔ اور وہاں آئی جہاں مسٹر راک ویل لیٹا ہوا تھا۔

"کیا کوئی خبر مسٹر لسکٹرسل کی آپ کو ہے" مسٹر راک ویل نے پوچھا۔

ہاں وہ آپکو ملنا چاہتا تھا۔ بشرطیکہ آپ مل سکیں۔

"اگر یہ وعدہ نہ ہوتا۔ تو ملنے کی خواہش ہرگز نہ کرتا" راک ویل نے تیوری چڑھا کر کہا۔

پیارے جب آپ تندرست ہو جاؤ گے۔ تو کاروبار کے دھندوں میں پڑنا ابھی آپ کو آرام کرنا ہے "۔

"لیکن اُسے ابھی ٹیلیفون سے کہو کہ میں ابھی روپیہ وصول کرونگا۔"

مائل اپنی مرضی کے خلاف اپنے کمرے کو جارہی تھی کہ راستہ میں ملی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی ملی۔ آج ایک اندرونی خوشی نے اُسکے گلاب سے رخسار جو والد کی بیماری میں زرد پڑے ہوئے تھے اور سرخ کردے تھے۔

اماں! آج مسٹر لارنس کولنڈن سے آرہا ہے۔ اور موسیقی کے کالج میں جلسہ لیکچر دینے کے واسطے دعوت دی گئی ہے مجھے کہتے ہیں کہ تم بھی ساتھ چلو وہ شادی پر زور دے رہے ہیں کہتے ہیں کہ فارغ ہو کر اٹلی کی سیر کریں گے۔

ایک صاف اور رعبناک آواز نے اُنکے پیچھے سے کہا۔

"کیا تم جا رہی ہو"

نہیں اماجان میں آپ کو اس بیماری کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔

راک ویل نے غصہ میں کہا۔ تم اُس مفلس لارنس کے ساتھ ہرگز نہیں جاسکتیں۔

اماجان آپ اطمینان رکھیں۔ اور جاکر چادر اوڑھ لیں۔ کہیں بیماری زیادہ نہ بڑھ جائے۔

میکڈ نیل ایک شریف اور نرم دل آدمی تھا۔ وہ بیانوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اُس نے مسٹر راک ویل سے بہت سا روپیہ قرض لیا ہوا تھا۔ تاکہ اپنا کاروبار آسانی سے کرسکے۔

میکڈ نیل۔ میں خوش ہوں کہ آپ آگے سے بہت اچھے ہیں۔

راک ویل۔ ہاں اچھا ہی ہوں۔

"کیا آپ نے اُس پرونوٹ کی بابت یاد کیا ہے۔" "ہاں"

مگر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کی میعاد ایک سال کے لئے اور بڑھادیں۔

"ہرگز نہیں"

مسکڈ ییل۔ ایکے بکری بہت کم ہوئی ہے۔ اور بقایا روپیہ بھی لوگوں سے وصول نہیں ہو سکا۔ مگر از کم چھ ماہ کی مہلت اور دیں۔

"آپ مجھے ایسا کاروبار سمجھانے کی تکلیف مت دیں۔ میں ایک دن کی مہلت بھی نہیں دے سکتا۔"

"آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ میرے واسطے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"مجھے اس سے کچھ غرض نہیں۔ میں اپنی بیوی اور لڑکی کو آسودہ حال دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تو مجھے ابھی دوکان مکان اور مال سب فروخت کرنا پڑے گا۔ اور آئندہ غریبی کی زندگی بسر کرنی ہوگی۔"

"غریبی ہی میں تو اصل راحت ہے۔ بس ہرگز میں نوٹ کی میعاد نہیں بڑھا سکتا۔"

مسکڈ سن کا رنگ اس آخری جواب سے زرد پڑ گیا۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر چلدیا۔ اُسکے جانے کے بعد مائل جانے لیکر آئی جسکو آتے ہی راک ویل نے خوشی سے بتایا کہ اُسے کل ہی روپیہ ادا کرنا پڑے گا۔

مائل۔ ابھی ایک منٹ ہوا مسٹر لارنس آیا تھا۔ وہ آپکی مزاج پرسی کرنا تھا اور آپ کو دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ مفلس اور روسیاہ لارنس؟ کیا وہ چلا گیا ہے۔

"نہیں وہ ابھی تلک سے لائبریری میں کام کر رہا ہے۔"

"تو اُسے بلا لو۔"



لارنس کی عمر اس وقت ۲۶ سال کی تھی وہ ایک خوش وضع نوجوان تھا۔ اُس نے آتے ہی راک ول کی مزاج پرسی کی۔

ملی۔ مسٹر لارنس آپ کے بہت ممنون ہیں۔ کہ آپ نے انھیں یاد فرمایا۔ آپ کو مسٹر لارنس کچھ حالات اٹلی کے سنائیں گے۔

یہ کیا سا سکتا ہے وہ ابھی کل کا بونڈا ہے۔

مسٹر راک ویل۔ میں دو سال وہاں رہوں وہیں تعلیم پائی ہے اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے وطن کو جا رہا ہوں۔

بس ایسا ہی سا سکتے ہو" راک ول نے طنزاً کہا۔

اس پر سب نے ایک قہقہہ لگایا۔

مائل۔ پیارے ابا آپ نے کہا تھا کہ ہم بھی یورپ کی سیر کو جائیں گے۔ اگر آپ اس وقت اچھے ہوتے تو ہم بھی چلتے۔

میں بالکل تندرست ہوں اور پہلے کبھی ایسا تندرست نہیں ہوا۔

لارنس نے یہ موقع غنیمت جانکر کہا۔ تو کیا مسٹر راک ول آپ ملی کو میرے ساتھ جانے کے واسطے اجازت دے سکتے ہیں۔ ہم تمام یورپ کی سیر کریںگے۔

ملی نے کہا نہیں ابا بیمار ہیں میں اُن کو اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

راک ول "میں تمکو صاف صاف کہہ چکا ہوں۔ خواہ میں بیمار ہوں یا تندرست۔ تم کسی طرح نہیں جا سکتیں۔"

مسٹر لارنس نے معافی مانگتے ہوئے رخصت چاہی۔ اور کہا برائے مہربانی آپ اپنے فیصلہ پر پھر غور فرمائیں۔ اسکے بعد لارنس اور ملی دونوں اٹھکر لائبریری میں چلے گئے۔ اور راک ول بستر علالت پر لیٹ گئے۔

راک ول کچھ دیر خاموش پڑے پہروں کو یا ہوا۔ کہا میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ کیا میرے واسطے اب کچھ نہیں رہا۔ ہوں۔

مائل ہمدردی بات سمجھ میں ابھی نہیں آتا ہے۔ اگر کچھ ہو گیا۔ تو میں تمہارے اور بچوں کے واسطے کافی روپیہ چھوڑ چلا ہوں۔ اُس کے ان الفاظوں میں بہت زبردست تسلی کا بارہ تھا۔ وہ تسلی جو دنیا میں ہر شخص جو اپنے بیوی بچوں کے واسطے مرتے وقت روپیہ چھوڑ جاتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ مسٹر اسکاڈسل کو یہ تسلی اُس کے مرتے وقت نہ ہوگی۔ مگر میں اپنے دماغ سے مسٹر اسکاڈسل کو بالکل نکال دینا چاہتا ہوں۔ اُس کا عدم وجود میرے لئے برابر ہے۔

آج میں نے اُن سے کوئی بُرا سلوک نہیں کیا۔ پھر بھی اسی روز وہ ہی مانگتا تھا [illegible] ہو کر اُس نے اپنے سر کو پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے منہ پر مسٹر اسکاڈسل جیسی ڈاڑھی ہے۔ اور انگلیاں بھی مسٹر اسکاڈسل جیسی ہیں۔ وہ گھبرا گیا اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ مسٹر اسکاڈسل بن گیا ہے۔ وہ اور بھی گھبرایا۔ اور کوٹ پہن کر مسٹر اسکاڈسل کے مکان کی طرف چلا۔ وہ فوراً وہاں پہنچ گیا اور اب وہ واقعی اپنے آپ کو مسٹر اسکاڈسل محسوس کرنے لگا [illegible] اُس نے [illegible] ہر گز [illegible] کو [illegible] اُس کی [illegible] کر کہا تو کیا [illegible] کو [illegible] کھا پڑ گیا۔ اب ایک دل کو مسٹر اسکاڈسل کی وہ تکلیف محسوس ہونے لگی۔ [illegible] ایک غریب آدمی جو اپنے بچوں کے واسطے کچھ نہیں چھوڑ جاتا ہو معلوم کرتا ہے۔ اب اُسے دونوں میاں بیوی کی تکلیف محسوس ہونے لگی۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس نے چلانے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ کچھ دیر بعد اسی درد [illegible] کے بعد اُسے گانے کی آواز آئی۔ آہ یہ کون گا رہا ہے۔ آہ یہ تو اُسی [illegible] لارنس کی آواز ہے۔ اور یہ نرم انگلیاں کس کی ہیں۔ وہ تمہاری ہیں [illegible] ایک دل اب مسٹر لارنس کی وہ تکلیف جو اپنے عزیزوں سے جدا ہونے کے وقت ہوتی ہے۔ محسوس کرنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ لارنس بن گیا

ملی سانوں سے اٹھی - اور اُسے گلے لگا کر رونے لگی اور بولی پیارے میں مجبور ہوں بے بس ہوں - روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی -

---

مسٹر ڈاک وِل نے آنکھ کھولی - سورج کی کرنیں کھڑکی سے اُس کے منہ پر پڑ رہی ہیں - وہ خوشی میں چلا اٹھا - کہ ہم اپنے ہی کمرے میں ہیں - مائیکل آہستہ آہستہ اپنے ہی کمرے میں آئی اُس کی آنکھیں بیداری کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں مسٹر ڈاک وِل نے کہا مائیکل آپ آرام کریں میں بالکل بہتر محسوس کرتا ہوں آپ کو بے آرام دیکھ کر میں بے چین ہوا جاتا ہوں - جتنی آپ نے تکلیف اٹھائی ہے وہ کیسی بے مثال ہے - اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں - اور آپ کو یاد کرنے کے لئے اختیار نہیں پڑا - کہ شاید لکھنے والا میں ہی ہوں - اسی اثنا میں ٹی بی مزاج پرسی کو ہاتھ میں ایک خوشنما گلدستہ لئے داخل ہوئی - مگر ٹی کو دیکھ کر وہ اور بھی بہتر دکھا - اور ایثار حسن قائم رکھنے کو بولا - آپ کو معلوم ہے - کہ کل بیماری میں بیہوش رہا - کئی کئی ماہ بیہوشی کی باتیں تھیں اور قابل اعتماد نہیں ہیں - اچھا تو مائیکل جاؤ مسٹر ٹی کو ابھی فون کر دو - کہ کل میں بخود تھا - میں نے اُس کے پروموشن کی میعاد اُن ۳ دن کی مہلت سے بڑھا دی - اور تم ٹی روم جانے سے پہلے اپنی شادی کی بو باس ہوا تاکہ تم لارنس کے ساتھ جا سکو -

"مگر ابا جان آپ تو بیمار ہیں"

بس جاؤ میں بالکل اچھا ہوں - میرے حکم کی تعمیل کرو -

سارے لعل و گہر

شملہ

شملہ اگر تم نے نہیں دیکھا تو اُس کا تخیل مشکل ہے - الفاظ کے ذریعہ اُس کا

تو ذرا دکھانا تو آسان ہے۔ مگر وہاں کی بہار کا رنگ سمجھانا ناممکن۔ سرسری طور پر یہ کہا جائے تو شملہ کو ہندوستان ہمالیہ کے ان سلسلوں کا جو شمالی ہند میں سمندر کی سطح سے ۷،۱۰۰ فٹ کی بلندی اور میدانی علاقہ سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر ہیں۔ ایک حصہ ہے لیکن فی الحقیقت یہ ہندوستان کا ایک مشہور صحت افزا مقام ہے۔ اس وقت یہ تمام پہاڑی علاقوں کی ملکہ ہے۔ اس کی بہار اور سبزہ زار۔ اس کی فضا اس کی مسام جاں کو معطر کرنے والی سرد سرد ہوا۔ یہاں کی فرحت۔ یہاں کی شان یہاں کی شوکت۔ یہاں کے چرند۔ یہاں کے پرند۔ یہاں کے جمگھٹے۔ یہاں کے کھٹ کھٹے۔ یہاں کی گھٹائیں یہاں کی ہوائیں۔ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ درختوں کو دیکھو کہ کاسنی مخمل کی وردیاں سجائے کھڑے ہیں۔ پرندوں کی طرف دھیان کرو کہ اپنے قدرتی سازوں سے ہوا میں جان ڈال رہے ہیں۔ نیم بسمل یہاں آتے ہیں۔ اور ترو تازہ ہو کر جاتے ہیں۔ دن کو مسلسل نگار رہتا ہے۔ اور رات کو تمام شہر مطلع الانوار بن جاتا ہے۔ سیاحوں کے لئے یہ بڑی سیرگاہ ہے۔ شکاریوں کے لئے یہ دلکش جائے شکار ہے۔ بیماروں کے لئے یہ دارالشفا ہے۔ مستقل سکونت اور عارضی قیام کے لئے عمدہ سے عمدہ ہوٹل موجود ہیں جہاں ہر طرح کا آرام و آسائش میسر ہے۔ انگریزوں کے لئے کلب اور ایوان رقص ہیں تو ہندوستانی شرفاء کے لئے سینما۔ تھیٹر اور سیرگاہیں موجود ہیں غرض کشمیر جنت نظیر کے بعد شملہ سے بڑھکر کوئی مسرت بخش اور راحت خیز مقام ہندوستان میں نہیں ہے۔ شملہ کے حالات ایک مفصل اور مصور پمفلٹ کے ذریعہ نارتھ ویسٹرن کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں۔ جسکا اقتباس ناظرین رسالہ اردو کی ضیافت طبع کے لئے حسب ذیل ہے۔

آج سے سو سال پہلے شملہ تک گمنام بستی تھی۔ ۱۸۱۷ء کی گورکھا لڑائی میں جب ایک انگریز افسر اسی طرح لشکر گذرا۔ تو وہ اس مقام کی سردی اور خوشگوار آب و ہوا سے بہت محظوظ ہوا۔ اور اس طرح حکومت کو اس پُر فضا قطعہ زمین کا علم ہو گیا سب سے پہلے ۱۸۲۷ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ایمہرسٹ شملہ پہونچے۔ اور

میجر کیمبڈی کے مکان "کیمبڈی ہوس" میں فروکش ہوئے۔ میجر موصوف اس وقت ان کوہستانی اضلاع کے پولیٹکل ایجنٹ تھے۔ اُس زمانہ سے لیکر آج تک نائب السلطنت اور گورنر جنرل اپنے عہد حکومت میں موسم گرما شملہ کی وادیوں میں بسر کرتے رہے ہیں۔ اس طرح شملہ پہلے کلکتہ کی اور اب دہلی کی جگہ موسم گرما میں دار الحکومت بنجاتا ہے۔ شملہ پنجاب کے گورنر کی قلمرو میں ہے۔ اس لئے وہ بھی موسم گرما شملہ میں گذارتے ہیں اور سپہ سالار ہند یعنے کمانڈر ان چیف بھی۔ علاوہ بریں تمام بڑے بڑے سرکاری دفتر اور اراکین حکومت بھی گرمی کے موسم میں یہاں رہتے ہیں۔

پہلے شملہ گمنام علاقہ تھا۔ دساتو درکنار قریب و جوار کے لوگ بھی اس سے ناواقف تھے۔ ۱۸۶۴ء میں سر جان لارنس کے عہد حکومت میں ہندوستان کا دار الخلافہ موسم گرما کے لئے قرار پایا۔ اور چھوٹا سا گاؤں بارونق شہر بن گیا۔ اب تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اب اس میں پچاس ہزار نفوس آباد ہیں وائسرائے کی جائے سکونت پر ۳۸ لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے کمانڈر انچیف کی جائے رہائش کا نام سنوڈن ہے۔ یہ جگہ پہلے لارڈ رابرٹ کی ملکیت تھی۔ اُس کے بعد لارڈ کچنر نے اس میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ اب سنوڈن ایک نہایت خوبصورت کوٹھی ہے۔ پنجاب کے گورنر صاحب جس دلکشا اور خوبصورت کوٹھی میں رہتے ہیں۔ اُسکا نام بارنس کورٹ ہے۔

وائسرائے کمانڈر انچیف اور گورنر پنجاب کے علاوہ کوئی شخص شملہ میں موٹر یا گاڑی نہیں چلا سکتا۔ شہر کا انتظام میونسپل کمیٹی کے سپرد ہے۔ جس کا صدر شملہ کا ڈپٹی کمشنر ہوتا ہے۔ اُس کی مدد کے لئے نو سرکاری اور غیر سرکاری ممبر ہوتے ہیں۔ شملہ کی سڑکیں صاف ستھری اور کشادہ ہیں۔ صرف پانی بہم پہنچانے کی اسکیم پر قریباً ۲ لاکھ صرف ہوا ہے۔ شملہ میں کئی مسجدیں۔ گرجے۔ اور مندر ہیں۔ قطب کی مسجد سب سے پرانی ہے۔ جو لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد ۱۸۲۹ء

میں تعمیر ہوئی تھی۔ اور سب سے بڑی مسجد سوداگروں کی مسجد ہے۔ یہ اسکے معبدوں میں سے قدیم ترین انڈ ہل کے قریب واقع ہے۔ دفتر میونسپل کمیٹی اور سرکاری دفاتر کی عمارت شاندار ہے۔ اسی بازار میں تمام انگریزی طرز کی دکانیں ہیں۔ جہاں ہر قسم کا سامان مل سکتا ہے۔ شہر کے جنوبی ڈھلوان کی طرف ہندوستانی بازار ہے۔ جہاں تبت اور سطح پہاڑ کے پہاڑی لوگوں کا ایک جم غفیر لگا رہتا ہے۔ شملہ میں تمام ضروریات زندگی مہیا ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ شہر صحت افزا مقام ہے۔ اسے کوہستانی مقامات کی ملکہ کہتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ سر چارلس ووڈ جو موجودہ وائسرائے لارڈ ارون کے دادا تھے۔ سر جان لارنس کو جو اس وقت ہندوستان کے گورنر جنرل تھے یہ اجازت دی تھی کہ وہ شملہ میں کسی مقام پر جسے وہ پسند کریں۔ موسم گرما بسر کریں۔

ریلوے اسٹیشن کے بالمقابل ایک سرسبز ڈھلوان پر سڑکیں اور بنگلے بنے واقع ہیں۔ جن کا اکثر حصہ چیڑ اور سایہ دار درختوں میں چھپا رہتا ہے۔ لیکن جب سورج غروب ہو جاتا ہے۔ اور سارے شہر پر رات کی تاریکی مسلط ہو جاتی ہے۔ اور گرد و نواح کے پہاڑ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا کسی مصور نے آسمان سے [illegible] ہلکے سے جا کر نیلے رنگ کی لکیریں کھینچ دی ہیں۔ تو اس وقت اگر ریلوے اسٹیشن پر کھڑے ہو کر سامنے ڈھلوان کے ساتھ ساتھ پہاڑ کی چوٹی تک [illegible] نگاہ ڈالی جائے [illegible] زمین ایک [illegible] نور نظر آتا ہے بجلی کے ہزاروں لیمپوں کی شعاعیں [illegible] اور [illegible] پہاڑوں کے [illegible] چمک رہی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وسیع خطے میں ستارے درختوں میں جگنوؤں کی جگہ [illegible] لٹک رہے ہیں۔ اگر رات کو بارش شروع ہو جائے تو ان نظاروں میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب بارش کے قطروں پر روشنی کی کرنیں پڑتی ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان

سے موتی برس رہے ہیں۔

شملہ سے قریباً چھ میل کے فاصلہ پر ایک اونچی پہاڑی واقع ہے۔ جو سرسبز جگہ ہے۔ یہاں ایک بڑا جنگل ہے۔ جس میں ہر قسم کی گھاس اور پھول موجود ہیں اس مقام پر وائسرائے کی "ریٹریٹ" نامی کوٹھی کے علاوہ چند اور خوبصورت بنگلے بھی ہیں۔ مشوبرہ میں ہر اتوار کو اہل شملہ سیر و تفریح کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ یہ علاقہ کوٹی کے مہاراجا کی ریاست میں ہے۔ اور یہاں ہر سال مئی میں پہاڑی لوگوں کا میلہ لگتا ہے۔ جسے "سیپی" کہتے ہیں۔ اس میلے میں اطراف و اکناف کے کوہستانی، لوگ اور عورتیں گوناگوں اور مخصوص لباسوں میں جمع ہوتے ہیں۔ اور یہ نظارہ قابل دید ہوتا ہے

جاکو ایک پہاڑی ہے۔ جو سمندر کی سطح سے ۸۰۴۸ فٹ بلند ہے۔ اس کی چوٹی پر قدیم زمانہ کا ایک ہنومان جی کا چھوٹا سا خوبصورت مندر ہے۔ اس مندر کا بہت اثر اس پہاڑی کے بندر اس مقام کی شہرت کا باعث ہیں۔ یہاں بندروں کی ایک لاتعداد جماعت ہر وقت موجود رہتی ہے۔ یہ بندر پجاری کی آواز پر جمع جمع ہو جاتے اور اس کے اشارے پر عمل کرتے ہیں کہتے ہیں کہ یہاں بندر ایک خاص نظام کے ماتحت رہتے ہیں۔ اور ان کا ایک راجہ اور رانی ہیں جن کی رعایا ہیں لوگ اس مندر کو دیکھنے اور اس پہاڑی کی سیر کے لئے آتے ہیں وہ بندروں کو چنے اور لوبیاں وغیرہ ضرور ڈالتے ہیں

جاکو پہاڑی کے گرد بہت سی سیرگاہیں ہیں۔ اور جب مطلع صاف ہو تو اس پہاڑ [illegible] کی دس ہزار فٹ بلند چوٹی پر دائمی برف کا نظارہ [illegible]

شملہ میں چار موسم ہوتے ہیں اور [illegible]

پہلا موسم جنوری سے شروع ہو کر مارچ میں ختم [illegible] دوسرا موسم اپریل سے شروع ہوتا ہے۔ تیسرا موسم جولائی سے ستمبر تک [illegible] رہتی ہے۔ اور موسم [illegible]

آب و ہوا بہت خوشگوار اور روح پرور ہوتی ہے۔ برسات کے بعد تمام زمین اور کہسار سبزہ زار اور سرسبز ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان پہاڑوں نے سبز مخمل کا لباس پہن لیا ہے۔ جب شملہ کی سرسبز وادیوں سے سفید بادل جھومتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ اور دیکھتے دیکھتے بہت بلند پہاڑوں پر چھا جاتے ہیں اور موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔ تو یہ سماں عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے تھوڑی سی بارش کے بعد بادل پھٹ جاتے ہیں۔ اور آسمان پر ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوا میں اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور بلند پہاڑوں کے عقب سے سورج کی نورانی شعاعیں نکلکر ان بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے گرد نقرئی زنجیریں ڈال دیتی ہیں۔ اور جب یہی شعاعیں سبزہ زار پہاڑوں کے ڈھلوانوں کے ساتھ ٹکراتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ فرش زمرد پر موتیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ غرض جو موسم آخر ستمبر سے شروع ہوتا ہے۔ وہ تمام موسموں سے خوشگوار اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ اگر یہ ایام شملہ میں بسر کئے جائیں تو بدن میں ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ اور صحت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس موسم میں قدرتی نظاروں کے دلدادہ پہاڑوں کی بلندیوں کی سیر کرتے ہیں۔ اور قدرتی چشموں کے گرد ڈیرے لگا کر روحانی مسرت کے موتیوں سے اپنا دامن بھرتے ہیں۔ دیکھو تو خوبصورت پرندے سرسبز درختوں کی رقصاں شاخوں پر نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ کہیں ہری ہری گھاس اور ناصرہ نواز سبزہ لہلہا رہا ہے۔ غرض ہر چیز حسن و شباب کے نشے میں سرشار جمال قدرت کے شیدائیوں کو دعوت نظارہ دیتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ تمام دلفریبیاں اور رنگینیاں اس موسم کے ہی کرشمے ہیں۔

شملہ جہاں خوشگوار اور معتدل آب و ہوا کی وجہ سے ایک بہترین سیر گاہ اور صحت افزا مقام ہے۔ وہاں اسے قدرتی مناظر اور دلکش کوہستانی علاقے کی بدولت سیاحوں اور طالبان سیر و تفریح کے لئے ایک بے نظیر جگہ ہے۔

اس کے علاوہ شملہ ایک مشہور شکارگاہ بھی ہے۔ گرد و نواح کے پہاڑوں میں ہر قسم کا شکار پایا جاتا ہے۔ زیادہ تر تیتر اور چکور کا شکار کرتے ہیں۔ کبھی کبھی سیاہ چکور بھی مل جاتا ہے اس کے علاوہ کوہ ہمالیہ کے مشہور سیاہ فام ریچھوں اور چیتوں کا شکار بھی کیا جاتا ہے۔ شملہ سے کچھ دور چلے جائیں تو طرح طرح کے پرندے مل سکتے ہیں ان پرندوں میں سب سے مشکل شکار پہاڑی تیتر کا ہوتا ہے جب یہ پھڑپھڑاتے چمکدار پر پھیلا کر پہاڑ کی ناہموار ڈھلوان سے اڑتا ہے۔ تو مشاق سے مشاق شکاری کے لئے نشانہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس پرندے کو پہاڑی زبان میں "کالنگ" کہتے ہیں۔

آج سے کوئی بیس برس پہلے لارڈ منٹو اور لارڈ کچنر نے شملہ کے قریب ایک جنگل میں کالنگ جمع کر کے ان کا شکار کرنے کی کوشش کی چنانچہ گرد و نواح کے پہاڑیوں سے اس پرندے کے انڈے بڑی مشکل سے حاصل کر کے ان پر مرغیاں بٹھائیں۔ اور ان کی حفاظت کے لئے گورکھا سپاہی اور جنگلات کے افسروں کی خدمات حاصل کیں لیکن افسوس کہ ۴ یا ۵ انڈوں کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ اور کل بیس کالنگ پیدا ہوئے۔ جن میں سے اکثر گیدڑوں کا لقمہ بن گئے۔ کیونکہ وہ کالنگ کے بچوں کو مزے سے کھاتے ہیں۔ آخر جب شکار کا دن آیا۔ تو بصد مشکل چودہ کالنگ شکار کئے جا سکے۔

شملہ کے قریب دھامی ریاست میں ایک گھنا جنگل ہے۔ جہاں وائسرائے موسم خزاں میں بغرض شکار تشریف لیجاتے ہیں شکار کا موسم ۱۵ ستمبر سے شروع ہو کر ۱۶ مارچ تک رہتا ہے۔ اور اس موسم میں ہر قسم کے پرندوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ ریچھ اور چیتے تو ہر موسم میں مل جاتے ہیں۔ شملہ میں شکار کی اجازت سپرنٹنڈنٹ ہل سٹیٹ سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مشک آہو اور مور کے شکار کی ہمیشہ کیلئے ممانعت ہے۔

ابتدا میں شملہ جانے کے لئے پختہ سڑک اور باربرداری کا خاطر خواہ

انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بڑی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ۱۸۴۹ء میں سر چارلس نیپیر سپہ سالار افواج ہند نے بڑے اہتمام سے ایک پختہ سڑک تیار کرائی مگر انبالہ اور کالکا کے درمیان دریائے گھاگرا ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ جب برسات کے موسم میں اس نالہ میں طغیانی آجاتی تھی تو پھر اسے بیل گاڑیوں یا محمول اور کشتیوں کی مدد سے بھی عبور کرنا محال ہو جاتا تھا۔ آخر ۱۸۵۶ء میں انبالہ اور کالکا کے درمیان ایک پختہ سڑک یعنی شاہراہ ہندوستان تیار کرائی گئی۔ جس پر ڈولیاں استعمال ہوتی تھیں پھر ٹکہ گاڑی کا رواج ہو گیا اور کچھ مدت کے بعد تانگے بھی چلنے شروع ہو گئے۔ آخر کار عوام الناس کی آسائش اور سہولت کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ انبالہ کالکا اور شملہ کے درمیان ریلوے لائن تیار کر دی جائے۔ چنانچہ کالکا شملہ ریلوے بڑی محنت و مشقت اور صرف کثیر سے تعمیر کر دی گئی۔ جو محکمہ ریلوے کا عدیم النظیر کارنامہ ہے۔ ۹ نومبر ۱۹۰۳ء کو سب سے پہلی گاڑی کالکا شملہ کی جانب روانہ ہوئی۔

طاہر حسین خاں

انجام محبت

گذشتہ سال مجھے اپنے عمو صاحب بہادر جناب خانصاحب حاجی شیخ محمد جان ایم۔ بی۔ ای۔ کوئٹہ کے ساتھ "برلن" میں "انجام محبت" کا اعلیٰ ڈراما دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ناٹک شروع سے آخر تک اس قدر دلچسپ تھا کہ میں اسے اصلی واقعہ کہنے پر مجبور ہوں۔ اور ہیرو و ہیروئن کی دلکش نوحہ گری نے میرے دل میں عجیب کیفیت پیدا کر دی۔

یہ ڈراما اسی نوعیت کا ایک نرالا تماشہ تھا۔ جسے میں اردو کا جامہ

پیش کر ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

یہ سخت بے منصفی ہوگی اگر میں یہ ذکر نہ کروں کہ "مس مریم سلطانہ ہمر لینک" نے اس ڈرامے کے سمجھنے میں میری بڑی امداد کی۔ جو جرمنی زبان میں ادا کیا جا رہا تھا۔ اور جس سے میں نابلد محض تھا

(خانصاحب) حاجی محمد غلام حسن خان۔ پشاوری
ہوٹل وٹل سبرگ۔ برلن۔ جرمنی

سین پہلا

بندرگاہ پری یوس یونان

اول جو ہی پردہ اٹھتا ہے تو ہمیں چند بدوی عرب جنگجو سپاہیوں میں نظر آتے ہیں جنکے لمبے لمبے سیاہ بال چمکتی ہوئی آنکھیں اُنکے ڈھیلے ڈھالے لباس اُنکے سرخ کمر بستہ ہوئے رومال۔ جنپر سیاہ اگال چسپاں تھے۔ اُنکی فولادی تلواریں اُن کا قومی جاہ و جلال ظاہر کر رہی تھیں۔ اُنکا گندمی رنگ (جو بظاہر تمازت آفتاب سے جھلسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔) لمبا قد و قامت اور تنومند جسم اچھے اچھوں کے دل میں ہول پیدا کر دیتا تھا۔ اُنکے پُر رعب چہرے اور ہولناک صورتیں دیکھکر یہ ممکن تھا کہ بہت سی یورپین بے ہوش ہو جاتیں لیکن وہ جانتی تھیں کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہیں اصلی کی نقل ہے۔ الغرض یہ خونخوار اور جری لوگ ایک جنگی جہاز کے ڈیک یعنی عرشہ پر آپس میں بات چیت میں مشغول نظر آتے ہیں۔ یکایک اُنکا کمانڈر "قاسم پاشا" اپنی کیبن یعنی کمرہ سے نکلکر باہر عرشہ پر آجاتا ہے۔ بہت سہانا منظر ہے۔ ایک طرف قاسم پاشا کے سونے کا کمرہ ہے۔ اُسمیں سمندر کے رخ ایک کھڑکی ہے۔ اور جس میں سے سمندر کی گرداب نما لہریں ابھار و رسور

دکھائی نظر آرہی ہیں۔ اور نیلگوں آسمان جو کوسوں تک محیط ہے۔ آخر کار حدِ نگاہ بن جاتا ہے۔ جونہی قاسم پاشا برآمد ہوا سپاہیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اور جھٹ سب نے حسب مراتب قطار میں کھڑے ہو کر اپنے بہادر اور جری سردار کو ہدیۂ سلام پیش کیا۔ اور اُس کی درازیٔ عمر کا ایک پرجوش نعرہ لگایا جس کی گونج سمندر کی شور افزا لہروں میں غائب ہو گئی۔ قاسم پاشا نے اپنے جاں نثار سپاہیوں کے سلام کا جواب ہاتھ کے اشارہ اور سر کو قدرے خم کر کے دیا۔ چہرہ پر ہلکا سا تبسم بھی عیاں تھا۔ اور نزدیک ہو چکنے پر عبداللہ (جو اُس کا خاص مددگار "اڈی کانگ" ہے۔) کو بلا کر اپنے زخمی بازو کی مرہم پٹی کرنیکا حکم دیا۔ چونکہ عبداللہ کے کھردرے ہاتھ جبیر مسعف کے نشان عیاں تھے۔ اور اس کی نا تجربہ کاری" تعمیل ارشاد میں اسے ایک حد تک ناکام سبب رکھتے ہیں۔ اور یوں قاسم پاشا نصرانی لڑکی "بلقیس" (جو اُس کی حراست میں ہے) کو اس کام کے انجام دینے کیواسطے زنداں سے لائے جانے کا حکم دیتا ہے۔ عصمت مآب" بلقیس" اپنی مرضی کے خلاف جبراً و قہراً مع اپنے پدر بزرگوار کے قید خانہ سے باہر آئی ہے۔ اور جب اُسے قاسم پاشا کے زخمی بازو کو ڈریس کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ تو وہ یہ کہتے ہوئے صاف انکار کر دیتی ہے "کہ میں ایک مسلمان کے بازو کو کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گی اس پر جب قاسم پاشا اول بزور حکومت و بعدہٗ منت التجا کرتا ہے۔ تو بلقیس مجبوراً صرف اپنے محافظ کی خوشنودی کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ ادھر جونہی وہ اس کے قریب ہوتی ہے۔ قاسم پاشا جھٹ اُس کی ہتھکڑیاں نکالدیتا ہے اور نہایت ملائم اور سریلی آواز (جسمیں محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی) سے درخواست کرتا ہے۔ کہ وہ اس سے نفرت نہ کرے۔ بلکہ رحم و مہربانی سے پیش آئے۔ چنانچہ بلقیس بڑی احتیاط اور زندگی سے آہستہ آہستہ اس کے زخم کی مرہم پٹی کر لیتی ہے۔ جبکہ عین اُسی وقت قاسم پاشا کے دل کی دیرینہ سلگی ہوئی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

اس کے بعد قاسم پاشا فرامرز یعنی فیروز (جو اُس کی قید میں ہے اور بلقیس کا چچا زاد بھائی ہے) کو اپنے سامنے کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور پھر اُن سب کے روبرو قاسم پاشا اپنے بچپن کے حالات اپنے کارنامے اور کچھ ابھی سرگذشت کا حصہ بڑی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ جس کے سننے سے بلقیس کے نازک دل پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ❀

فیروز ظاہرا ایک بہادر آدمی ہے۔ مگر ساتھ ہی مغرور اور جنگجو۔ اس کے بعد سپاہی مع اپنے کمانڈر قاسم پاشا چلے جاتے ہیں اور فیروز کو پھر قید خانہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ لیکن بلقیس اور اس کا باپ تنہا مجسمہ حیرت بنکر رہجاتے ہیں۔ جعفر (بلقیس کا باپ) اپنی لڑکی کو اُس کی کمزوری پر لعنت و ملامت کرتا ہے۔ اور اُس کو دنیا کے نشیب و فراز سمجھا کر مذہب عیسوی اور اُس کے احکام پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ باپ کے کلمات بھولی بھالی بلقیس کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور وہ قاسم پاشا سے انتقام لینے یا خودکشی کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے۔ لیکن جعفر اُس کو خودکشی کے ارادہ سے باز رکھتا ہے۔ اس پر وہ پُرجوش لہجہ میں کافر سردار قاسم پاشا کے خون بہانے کا پختہ ارادہ کر لیتی ہے جسے وہ کافر سمجھتی ہے۔ رات جس کی تاریکی بحر ظلمات سے کم نہیں۔ زیادہ گذر چکی ہے۔ اور قاسم پاشا نے عبداللہ کو آخری بگل "لاسٹ پوسٹ" (جس سے مراد چراغ بجھا کر سو جانا ہے) بجانے کا حکم دیدیا ہے۔ مدہم روشنی والی جھلملاتی ہوئی لالٹین (جو ڈیک یعنی تختہ جہاز کے ستون سے لٹک رہی تھی۔) کے علاوہ تمام محل کی روشنی بجھا دی گئی۔ وہاں چند مستی تلواریں بھی ادھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ قاسم پاشا اپنے اسی کیبن یعنی سونے کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ اور عبداللہ کمرہ کے باہر دروازہ کے پاس تختہ فرش پر بستر بچھا کر اور اپنی اونی عبا اوڑھکر سو جاتا ہے۔

بلقیس آدھی رات کے وقت سنسان اندھیری رات میں کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ کسی ترکیب سے اپنے زندان سے نکلکر ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر لئے

نظر آتی ہے۔ اول وہ دو زانو ہو کر اپنے [illegible] ہوالے سے اپنے اٹھائے ہوئے ارادہ کے
سر انجام ہونے میں مدد چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ چھپ چھپ کر رک رک کر
اور کسی آنے جانے والے سے اپنے آپکو بچا بچا کر ڈرتی ڈرتی اور سہمی ہوئی سر دار یعنی
قاسم شاہ کے پلنگ کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اور رانی اسی گھبراہٹ و سراسیمگی میں
جھٹ پٹ قاسم باسا پر وار کر دیتی ہے۔ مگر خنجر قاسم باسا کے دل کے پار ہو جانے کے
بجائے ریشمی رضائی میں الجھ جاتا ہے۔ اور یوں بلقیس کا وار کاری ثابت نہیں ہوتا
اور کسی نامہ جری اور دلیر قاسم باسا اس کھٹکے سے فوراً بیدار ہو جاتا ہے اور قبل
اس کے کہ اس کا حملہ آور ہو۔ وہ بلقیس (جسکا چہرہ اس وقت خوف سے سفید ہو گیا
تھا۔ کہ اب وہ اسکو قتل کر دیگا) کو کلائی سے پکڑ لیتا ہے۔ اور جھٹ بجلی کی روشنی
کے بٹن کو دبا دیتا ہے۔ کمرہ بقعۂ نور ہو جاتا ہے۔ اور یوں قاسم باسا اپنے دل کی
مالکہ بلقیس کا زرد چہرہ اور اس کے ساتھ ہی سرہانے خنجر دیکھکر حیران ہو جاتا ہے اور
بجائے اسکے کہ اسے فوراً قتل کر کے اپنا بدلہ لے۔ وہ ہراساں و لرزاں بلقیس کے
روبرو دو زانو ہو جاتا ہے۔ اور ہاتھ جوڑ کر یہ کہتا ہے۔ کہ وہ اس مذہب [illegible]
کی حسن کی دیوی کے ہاتھوں مرنا بخوشی قبول کر لیگا۔ اور شہید وفا کہلائیگا۔ یہ کہتے ہوئے
وہ اپنا چوڑا چکلا سینہ برہنہ کر دیتا ہے۔ اور بلقیس سے التجا کرتا ہے۔ کہ وہ اپنے
دست سیمیں والا خنجر اس میں بھونک دے ؎

ہم نے انکے سامنے پہلے تو خنجر رکھدیا
پھر کلیجہ رکھدیا دل رکھدیا سر رکھدیا

قاسم شاہ کے دلمیں [illegible] بلقیس کی محبت نے پورا گھر کر لیا تھا۔ اور وہ اسی
سچی محبت کے اظہار ہی میں اپنی قسمت جان اسپر قربان کرنیکو تیار تھا۔ اب دوسری
بلقیس کی بابت بھی جو ابھی اس کے بھولے بھالے اور نازک دل میں محبت کی
چنگاری (جو ایک [illegible] ہے) سلگی ہے۔ وہ مدہوش ہو کر گر پڑتی ہے
یہ واقعہ دیکھکر قاسم باسا کو اپنے [illegible] دست بڑھاتے ہیں۔ اور وہ جھٹ کسمہ محبت بلقیس کو

اسے مضبوط ہاتھوں اور طاقتور بازوؤں میں اٹھا کر اُسے زنداں "کوٹھڑی" میں پہونچا دیا ہے۔

سین دوسرا

بندرگاہ پیری یوس یونان

دوسرے سین میں ہم مصر کی جنگی جہاز کا ڈیک یعنی عرشہ دیکھتے ہیں۔ جس پر فوجی سپاہی ادھر اُدھر پھرتے نظر آتے ہیں۔ بلقیس خاموش ایک کونہ میں بیٹھی ہوئی ہے اور اُسکا والد اُس سے جدا نظر آتا ہے۔ کیونکہ بلقیس نے آئندہ مسلمانوں کی شکل [illegible] نہ دیکھنے کا عہد کر لیا ہے۔ اتنے میں عبداللہ ادھر سے گذر رہا ہے جسے [illegible] ہے۔ اور اُس کی وساطت سے وہ اپنے بیمار بھائی کو ملنے کی اجازت قاسم پاشا سے طلب کرتی ہے۔ قاسم پاشا اصرار کرتا ہے کہ وہ خود آکر اس سے یہ اجازت کیوں حاصل نہیں کرتی۔ عین اُسی وقت اُس کا سپہ سالار شیخ کئی سپاہیوں کے وہاں پہونچ جاتا ہے۔ اور عیسائی قیدیوں کے قتل کر دی جانے کی اجازت چاہتا ہے۔ لیکن قاسم پاشا اسے سپہ سالار کے خلاف منشا صاف انکار کرتا ہے۔ سپہ سالار جب اُس کو پہلا حکم یاد دلاتا ہے۔ اور فوجی قانون کا حوالہ دیتا ہے۔ تو قاسم پاشا غصہ میں اسے سپہ سالار یوسف کو معزول کر دیتا ہے۔ اور اُسکی جگہ ایک سپاہ گری مغرور فرانسیسی مقرر کر دیتا ہے۔ موقوف شدہ سپہ سالار اس بات پر سخت ناراض ہوتا ہے۔ اور برانگیختہ ہو کر قاسم پاشا کے سپاہیوں میں محض اس خیال سے بغاوت پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ قاسم پاشا کھلم کھلا ایک نصرانی لڑکی کا شیدائی ہے۔ سپاہی بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن قاسم پاشا اور اُس کے باقیماندہ جانثار سپاہی اُن باغیوں کو جلد ہی قابو کر لیتے ہیں

اس کے بعد قاسم بابا فیروز کے حاضر ہونے کا حکم دیتا ہے۔ اور جب وہ آجاتا ہے
تو قاسم بابا ماہرو بلقیس و فیروز دونوں کو بحبہ جہار سر چھوڑ کر خود ایک ضروری کام
انجام دینے چلا جاتا ہے۔ ادھر ہاتھ لگے موقع کو غنیمت سمجھ کر فیروز گلدستہ واقعات
کی بنا پر ایک دفعہ پھر اپنی تقدیر آزمائی کرتا ہے۔ اور نازنین بلقیس سے اظہار
محبت کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کو منع کرتی ہے۔ اور التجا کرتی ہے کہ بجائے
پیار اور بھائی بہن کی محبت کے بدلے جونہی وہ خشکی پر پہنچیں وہ اس کے سینہ
میں خنجر اتار دے۔ فیروز انکار کرتا ہے۔ اس پر وہ ماہرو بلقیس اس کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے کر منت اور لجاجت کے ساتھ دوبارہ وہی التجا کرتی ہے کہ
اسے جلد سے جلد ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اور ساتھ ہی اس کا نازک دل اس جذبۂ
محبت کو برداشت کرتے ہوئے تلملا اٹھتا ہے۔ اور وفورِ غم سے گرم گرم آنسو
اس کی نرگسی آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں۔ عین اسی وقت قاسم بابا وہاں
پہنچ جاتا ہے۔ اور ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر بدگمان ہو جاتا ہے۔
اور فوراً اس کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ نازک اندام بلقیس یہ حکم سن کر سہم جاتی
ہے۔ اور اس کا گرفتارِ آلام دل سینے میں دھڑکنے لگتا ہے۔ اور نہایت ہی
عاجزی اور منت و سماجت سے سرنگوں ہو کر قاسم بابا سے عرض معروض
کرتی ہے۔ کہ وہ اسے اس جابرانہ حکم کو منسوخ کر دے۔ پھر صاف کہہ دیتی ہے
کہ فیروز سے اسے صرف محبت برادرانہ ہے۔ ادھر فیروز کو لگا یک غصہ آجاتا ہے
اور وہ موقع پا کر طیش میں ایک پاس پڑی ہوئی تلوار اٹھا کر قاسم بابا پر جھپٹتا
ہے۔ قاسم بابا جو پری وش بلقیس سے باتوں میں منہمک تھا۔ فوراً ہوشیار
ہو جاتا ہے۔ اور فیروز کے پر دلانہ وار کو اپنی تلوار آب دار پر روکنے کی کوشش
کرتا ہے۔ اس اثنا میں بلقیس قبل اس کے کہ کسی کو وار کا موقع ملے دونوں کے
درمیان جا کھڑی ہوتی ہے۔ اور ڈراپ سین گر جاتا ہے۔

سین نمبر ۱
بندرگاہ پیری یوس یونان

آخری سین ناظرین کے لیے سب سے زیادہ پُرجوش ۔ ہوتا ہے وہی جنگی جہاز جسے ہم گذشتہ سینوں میں مسلمانوں کے قبضہ میں دیکھ چکے ہیں پھر گئے زمانہ کی ہاتھوں اب یونان والوں کے قبضہ میں آ گیا ہے۔ کیونکہ قاسم پاشا کے بزدل سپاہی اُس کو تنہا چھوڑ کر مفرور ہو جاتے ہیں اور وہ مغرور فرانسسی جو سپہ سالار بنایا گیا تھا قاسم پاشا سے باغی ہو کر دشمنوں سے مل جاتا ہے۔ اور یوں آخرکار دھوکا دے کر جری قاسم پاشا کو قید کر لیا جاتا ہے۔ اور اب وہ سپر تیر عیسائیوں کی حراست میں نظر آتا ہے۔ ماہوش ملقیس کا باپ جعفر جبار کا کمانڈر ہو جاتا ہے۔ اور اب وہ قاسم پاشا سے بدلہ لینے پر تلا ہوا ہے۔ اور فوراً قاسم پاشا کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ لیکن ملقیس اُس کو ایسا کرنے سے یہ حکمت عملی باز رکھتی ہے۔ موقع ملنے پر فیروز ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کرتا ہے اور ملقیس سے محبت جتاتا ہے۔ مگر بے سود۔ اور اس دفعہ گرفتار آلام ملقیس اُسے صاف لفظوں میں برملا کہہ دیتی ہے۔ کہ وہ قاسم پاشا کو دل سے چاہتی ہے۔ اور پھر یہ کہ اُس کی محبت کو اب دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں بدل سکتی۔ اور وہ بے وفا کہلانے کے بجائے قاسم پاشا پر اپنی جان عزیز تک نثار کر دینے کو تیار ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ مر کر بھی اُس سے جدا نہ ہو گی۔ بلکہ یقیناً وہ بہشت میں بہت جلد ایک دوسرے سے ملیں گے۔ یہ سُن کر فیروز ایک مرتبہ اور ملقیس کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی اُس کو مذہب کا فرق بھی جتاتا ہے۔ لیکن ملقیس اُسے یہ کہہ کر خاموش کر دیتی ہے۔ کہ خداوند جل شانہٗ بڑا مہربان ہے۔ اور وہ ذات پاک رب العالمین ہے۔ صرف عیسائیوں ہی کا خدا نہیں۔ فیروز جب یہ دیکھتا ہے

کہ واقعی قاسم پاشا کی محبت اسکے دل میں مضبوطی سے جڑ پکڑ گئی ہے۔ تو اُس کی حمیت انسانی اور وفاشعاری اُس پر غالب آجاتی ہے۔ اور وہ آخرکار بلقیس اور اُسکے پیچھے طالب قاسم پاشا کو درد دینے کو تیار ہوجاتا ہے۔ سچ ہے ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

الغرض فروزا سے تمام جعفر کو ہزار ہمت سمجھاتا ہے۔ کہ وہ قاسم پاشا کی جان بخشی کرے خدا واسطے نہیں۔ بلکہ خاص اسی لڑکی بلقیس کی خاطر۔ لیکن افسوس لوٹیرے جعفر پر ان باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا قاسم پاشا جو ایک شیر کیطرح زنجیروں میں جکڑا پڑا ہے اور موت سے بالکل نڈر۔ اس حالت میں بھی اگر وقت آن پڑے تو لڑنے مرنے کو تیار ہے۔ جعفر جو اسی طرح غضب میں بھرا تھا۔ اسی لڑکی بلقیس کی ضد پر کہ وہ قاسم پاشا کی محبت سے منہ نہ موڑے گی طیش میں آکر قاسم پاشا پر گولی چلا دیتا ہے۔ خوش قسمتی سے نشانہ غلط بیٹھتا ہے۔ اور قاسم پاشا کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ گولی کی آواز سنکر ملازمین جہاز اور سپاہیوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ فروزا اس موقع کو غنیمت جانکر جھٹ قاسم پاشا و بلقیس کو خفیہ طور پر ایک چھوٹی کشتی پر (جس کا اُس نے پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا۔) سوار کرا کے بھگا دیتا ہے۔ پھر دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ اور رول کی بکی بلقیس ہمیشہ کیواسطے قاسم پاشا کی ہوجاتی ہے۔ اور ڈراپ سین گر جاتا ہے۔

انجام

یہ قصہ تاریخی ہے۔ اور اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جب ترکوں اور یونانیوں کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس ڈراما کا برلن کے اسٹیج پر ہو بہو دکھلایا جانا خالی از عجب نہ تھا۔

کیونکہ ایک عیسائی لڑکی آخر ایسے مسلمان سردار کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ جس سے کہ پہلے وہ اس قدر نفرت کرتی تھی۔ کہ اُس کے خون کی پیاسی تھی۔ مگر وہ بہادر اور جری سردار دکھا دیتا ہے۔ کہ محبت میں بڑی طاقت ہے۔

تماشا دیکھنے والوں (جس میں ہر قوم اور ملت کے لوگ تھے۔) کی ہمدردی اُس وقت قابل دید ہے۔۔ جب جعفر "مقدس کا باپ مسلمان" سردار کو محض اس خیال سے کہ وہ مسلمان ہے قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ حکم سنکر تماشائیوں میں ایک سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سب عیسائی بوڑھے جعفر کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔۔ واقعہ صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ اب مذہبی تعصب کے دن گئے۔ اور بندگان خدا بلا امتیار قومیت رنگ۔ یا مذہب۔ ہر ایک بہادر کی قدر کرنے لگے ہیں۔ اور آخر جب وہ دونو رہا کر دیئے جاتے ہیں۔ تو تماشائیوں کی نفرت کی نگاہیں فوراً خوشی اور مسرت میں بدل جاتی ہیں۔

(خانصاحب) حاجی غلام حسن خان
"امام برلن جرمنی"

اذان

اے مؤذن تیری صدائے اذان گلشن افروزِ جنتِ ایماں
دل کشا۔ دل گداز۔ روح فزا بخدا ہے حریم قدس نما
گونجتی ہے فضا میں صبح و مسا ساز ہے سوز ساز بہر ہوا

مرے کانوں میں جب یہ آتی ہے — رگ رگ میں دوڑ جاتی ہے
ہو کے عالم میں اسکی شانِ جلال — فخرِ اسلام و نازِ حبشِ بلال
راز پرداانوں کا بتاتی ہے — روح انساں سے لو لگاتی ہے

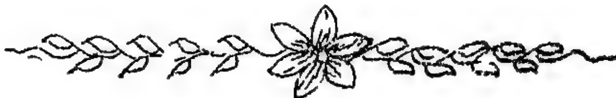


کئی مجھ جیسے اُس کو سنتے تھے — پھول اس گلستاں سے چنتے تھے
اب ہیں دشتِ عدم میں خانہ بدوش — پی کے جامِ فنا ہوئے مدہوش
پنبہ درگوش دم بخود فانی — نہیں سنتے اذانِ انسانی
بیخودی کا سرور ہے اُن کو — موت آغوشِ حور ہے اُن کو

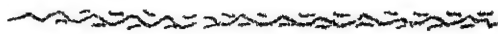


مرے پہلے کئی گئے جیسے — ایک دن میں بھی جاؤنگا ویسے
یاد آئیگی نوا اذان مجھے — یاد جنت میں میں کرونگا تجھے
میرا اُن وادیوں میں ہوگا مکان — دیتے کرّوبیاں جہاں ہیں اذان

چیف اڈیٹر (خان احمد حسین خان)



میں نے حسن یوسف کی ایک شیشی جو مجھے مشتہر نے مرا سے دی تو تجربہ کی آزمائش کیلئے اسی ایک سہیلی کو دی وہ کہتی ہیں کہ چہرے کے داغ دور کرنے کو بہت مفید ہے۔
سیدہ سلطانہ اسسٹنٹ ایڈیٹر



نرخنامہ اشتہارات

نوٹ۔ نصف صفحہ سے کم اشتہار نہیں لیا جائیگا۔ ہندستانی اشتہار کسی خریدار سے نہیں لیا جائیگا

معیاد	ٹائٹل کے صفحے	معمولی صفحے
سال بھر کے لئے	[illegible]	[illegible]
۶ ماہ کے لئے	[illegible]	[illegible]
تین ماہ کیلئے	[illegible]	[illegible]
ایکبار کے لئے	[illegible]	[illegible]

منیجر رسالہ اردو اورنگ آباد

حیات اردو



یورلینڈ کی انیس سالہ لڑکی
جسکا وزن تین سو ساڑھے تیرہ
پونڈ ہے



کانگڑہ کے قلعہ کا بلند مورچہ

جلد ۸ نمبر ۵ بابت ماہ اگست ۱۹۲۹ء

شذرات

جناب مسٹر ظفر حسین خانصاحب بی اے پبلسٹی آفیسر نارتھ ویسٹرن ریلوے کے روشن دماغ اور فاضل رکن ہیں جس خوش اسلوبی سے آپ پبلسٹی کے کام کو نبھا رہے ہیں وہ صرف آپکا حصہ ہے شباب اردو آپکی توجہ کا ممنون احسان ہے آپکا ایک مدلل مضمون بعنوان سہ سالہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے اسکے ماہ اگست کا رسالہ آپکے دوسرے مضمون وادی کانگڑہ سے مزین ہے ناظرین بہرہ اندوز حلاوت ہوں ہر دو مضامین وسعت معلومات کے لئے لاجواب ہیں اس ضمن میں ہم جناب ایجنٹ صاحب محکمہ ریل کے تہ دل سے شکر گذار ہیں۔ کہ انھوں نے ان ہر دو مضامین کی صراحت کے لئے بلاک مستعار دیکر دونوں مضامین کو دوبالا کر دیا ہے۔

انجمن موید العلوم مدرسۃ الواعظین لکھنؤ دنیائے ادب پر احسان بالائے احسان کر رہی ہے حال میں ہمیں انجمن کی طرف سے جو کتاب برائے ریویو وصول ہوئی ہے۔ اسکا نام النجمۃ السائرہ ہے اس کتاب میں اصل محیط الدائرہ بھی جسکا یہ ترجمہ ہے شامل ہے۔ اس کتاب کے مصنف جناب مولانا سید سبط حسن صاحب ممتاز الافاضل مولوی فاضل علامہ فاضل ہیں جنکا نام نامی کتاب کی مشہور ہونیکا ضامن ہے۔ علم عروض میں نہایت جامع کتاب ہے اسکے محاسن دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں قیمت فی جلد ایک روپیہ ہے انجمن موصوف سے مقام لکھنؤ دستیاب ہو سکتی ہے۔

ہم خوش ہیں کہ ہماری بہنوں کو بھی تصنیف و تالیف کا شوق ہو چلا ہے اسوقت ہمارے روبرو گلزار طلاکاری مرتبہ محترمہ سیدہ رضوان ہے۔ جو سید حیدر علی شاہ صاحب مرحوم کی دختر اور سید ولایت علی شاہ صاحب ریلدار و رئیس سید نگر ضلع گوجرانوالہ کی بیگم ہیں۔ یہ رسالہ دستکاری کی شائق بہنوں کیلئے لکھا گیا ہے اور ہمارے خیال میں شاید یہ دستکاری کی پہلی کتاب ہے واضح ہو کہ کلابتون کا کام کارچوبی کام سے زیادہ خوشنما اور نفیس ہے۔ کارچوبی کام سے کپڑا بہت بھاری ہو جاتا ہے اور لاگت بھی بہت آتی ہے۔ کلابتون کا کام اگر اپنے ہاتھ سے بنا جائے تو صرف چند تولہ کلابتون خرچ کرکے نفیس قسم کا کپڑا تیار ہو سکتا ہے۔ کتاب کی قیمت صرف آٹھ آنہ ہیں۔ اور محترمہ سیدہ رضوان سے مقام سید نگر ڈاکخانہ اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ مل سکتی ہے۔

افسوس ہے کہ پروف ریڈر کی بے اعتنائی سے جناب سید محمد اشرف صاحب قادری کے بے مثل فسانہ میں چند کتابت کی غلطیاں درست نہ ہوئیں۔ ناظرین ازراہ کرم انکی درستی فرمالیں یعنی زندگی کی "روحانیت" کو "رومانیت" اور "وہ مرا ہے" کو "وہ مترا ہے" پڑھنا چاہئے۔

قلندر علی خاں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



فاروق اس وقت اپنے کمرہ میں بیٹھا اور لکھ رہا تھا۔

ایک حالوں کی موجودگی کا جو وبال موجود تھی۔ احساس اس پر غالب تھا۔ تصور سے وہ اس وقت اُس کے گیسو سلجھا رہا تھا۔

قلم اُس کے ہاتھ میں تھا۔ کاغذ کا تختہ سامنے تھا۔ بار بار وہ قلم دوات میں ڈالتا اور سوچتا تھا کہ کچھ لکھے۔ مگر خیالات پریشان ہو جاتے تھے اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ مرد کو اگر کسی خیال سے محبت ہو اور وہ خیالوں کی اُسے دل سے چاہے۔ تو پھر کسی اور چیز کی پروا نہیں ہوتی۔ فاروق سمجھ گیا کہ آج وہ [illegible] اصل میں اس وقت وہ ایک حرف بھی نہ لکھ سکے گا۔ اُس نے کاغذ کا تختہ پھاڑ، قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ وہ اٹھ کر آرام چوکی پر جا لیٹا اور سگریٹ پینے لگا۔ کمرہ دولہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ [illegible] اور انگیٹھی

میں آگ جل رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں روح افزا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ افسوس کہ روح افزا اس دفعہ وہاں نہ تھی۔ روح افزا کا آنا اور وہاں ہونا لازمی تھا اگر کلثوم نہ ہوتی۔

کلثوم کون تھی؟ وہ فاروق کی اہلیہ تھی۔ وہ پانچ سال سے بیمار تھی۔ وہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں۔ ممکن تھا کہ وہ فوراً مر جائے ممکن تھا کہ کئی سال تک لٹکی رہے۔ پانچ سال کا طویل اور مسلسل عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ بیمار کے ساتھ ایک ہفتہ گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر آدمی کا حوصلہ کیسے پانچ سال کوں کاٹ سکتا ہے۔ کلثوم کی محبت اب فاروق کے دل سے زائل ہو چکی تھی۔ اب فاروق کے لئے بیمار کلثوم کے کمرے میں جانا مصیبت تھا۔ اُترا ہوا چہرہ، پتھرائی ہوئی آنکھیں، آنکھوں کے گرد حلقے، پتلی پتلی پولی کی طرح بانہیں، سوکھ کر کانٹا جسم اور زرد و ناتواں کمزور دماغ سو بخار اب اُسے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ مریضہ کے کمرے میں جاتا تو بہت گھبراتا تھا۔

ناگاہ اُس کی نظر کلثوم کی تصویر پر جا پڑی جو دیوار سے لٹک رہی تھی۔ یہ شادی کے وقت کی تصویر تھی۔ تصویر میں ایک خوبصورت پیاری دوشیزہ جسم ناز میں کھڑی مسکرا رہی تھی جس کے لمبے لمبے بال گھٹنوں تک لٹک رہے تھے۔ جب شادی ہوئی تو فاروق اپنی بیوی کا حسن دیکھ کر محبت میں سرشار تھا۔ اُسے دیکھ کر جیتا تھا۔ تین سال تک کلثوم اُس کے دل کی ملکہ رہی۔ پھر بیمار ہوئی۔ پانچ سال ہو گئے علالت نے اُس تصویر کو بدل ڈالا۔ اُس کی اور مرض بیماری کی ہولناکیوں نے قصہ مختصر بیمار کر دیا۔ اب ایک آدھ اُس کے دل میں بسی ہوئی۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور نرس داخل ہوئی۔ نرس کو دیکھ کر فاروق کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ نرس پیغام لائی ہے اور مریضہ کے کمرے میں جانا اسے بہت ناگوار تھا۔

نرس نے فاروق کی طرف مخاطب ہو کر کہا اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو آج ان کی حالت زیادہ نازک ہے اور بار بار آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ ... وہ کہتی تھیں کہ وہ ... رہی ہیں۔ ... فاروق ناراض ... کلثوم اُسے اندر

ملاقی رہتی تھی۔ اور وہ ان ملاقاتوں سے تنگ آگیا تھا۔ بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا " یہ
مجھے چین بھی لینے دیگی یا نہیں۔ کیوں مجھے ناحق دق کرتی ہے۔" لیکن جب وہ مرلصہ کے
کمرے کے دروازے میں جاکر ٹھہرا تو عجب معاملہ رونما ہوا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا اور
ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی کا عکس مرلصہ کے کمرے میں داخل ہوکر اُس کی چارپائی پر
پڑ رہا تھا۔ اور اُس گلابی کہر کے اوسکے گلال میں مرلصہ کا چہرہ پھر جوان اور نکھرا نظر آرہا
تھا۔ یہ حال دیکھکر تمام نفرت کافور ہوگئی۔ فاروق قدم برداشتہ مرلصہ کی چارپائی کے
قریب گیا۔ اور اُس سے بغلگیر ہوا۔ اُس وقت کلثوم کے چہرے کی زردی اور اُس کے
سر کے بالوں کا خیال جو بیماری کی وجہ سے کچھ جھڑ گئے۔ اور کچھ سفید ہو گئے تھے۔ اُس
کے دل سے معدوم ہوگیا۔ کلثوم نے حیران ہوکر اُس کی طرف دیکھا۔ کانپتی ہوئی بانہیں
اُس کے گلے میں ڈال دیں۔ اور نہایت کمزور آواز میں کہا " میرے سرتاج کیا اب بھی
میری محبت تمہارے دل میں ہے؟"

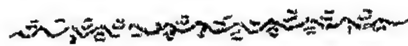
"اور محبت گئی کہاں؟" فاروق نے گرمجوشی سے جواب دیا۔ یہ سنکر کلثوم
باوصف ضعف ونقاہت مسکرائی اور اُس کی بھرائی ہوئی آنکھوں سے آنسو [illegible]
کر عارض ہونے لگی [illegible] سینے کا [illegible] ہاتھوں [illegible] فاروق کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یہ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
تجھ سے جدا ہو گئے۔

"پیاری کلثوم" فاروق نے کہا [illegible]
[illegible]
[illegible]

میں موت سے نہیں ڈرتی۔ مجھے صدمہ یہ ہے کہ تم سے جدا ہو جاؤں گی۔ یقین جانو یہ میرا آخری وقت ہے۔ اور میں کوئی دم کی مہمان ہوں۔ میرا وہم ہے۔ کہ سر شام میری جان ہوا ہو جائے گی۔



حق تو یہ ہے کہ فاروق ہزاروں مردوں سے اچھا تھا۔ ورنہ مرد بڑے زبردست ہرجائی کی ذات ہوتا ہے۔ ہم مغرب کا ذکر نہیں کرتے۔ مشرق میں پہلی بیوی کی زندگی میں ایک چھوڑ کئی بیاہ کر لیتے ہیں۔ پہلی بیوی کی چھاتی پر مونگ دلتے ہیں اُسے جلاتے ہیں ستاتے ہیں۔ خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ اور کوئی اُنہیں روکنے والا نہیں پہلی بیوی کا کفن میلا ہونے نہیں دیتے پہلی بیوی کی ہڈیاں چتا میں ابھی گرم ہوتی ہیں کہ نئی دلہن لے آتے ہیں۔ فاروق سے تو صبر کیا ہر چند کہ کلثوم کی محبت اُس کی بیماری میں کافور ہو چکی تھی۔ مگر پانچ سال تک وہ اپنی خواہشات پر صبر کئے رہا مگر اب وہ آزاد تھا کلثوم اب ہمیشہ کے لئے اس خاردار جھاڑی سے [illegible] رخصت ہو چکی تھی۔



"مگر کیوں؟ اب کس بات کا وسوسہ ہے فاروق! اب تمہیں کیا عذر ہے۔ کلثوم کی زندگی میں میں شادی پر زور دے سکتا تھا اب تو وہ بھی نہیں رہی میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اگر تم نے اب بھی انکار کیا۔ تو میں سمجھوں گا۔ کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ دیکھو اب مجھ پر رحم کرو"

"مسٹر فاروق میں تمہاری ممنون ہوں کہ تم بڑے [illegible] ... لیکن پہلے جان لو کہ میری ایک لڑکی ہے اس وقت پانچ سال کی ہے۔ یہ لڑکی میرے پہلے شوہر کی ہے۔ کیا تم اس لڑکی سے ایسی محبت کر سکو گے۔ جیسی لوگ اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔"

"تمہاری لڑکی ہے کیوں [illegible] تم نے تو کبھی نہیں بتایا"

ہاں میری لڑکی گلبدن ہے۔ کیسا نام ہے پیارا ہے نا؟ میں نے تمہیں [illegible]

مناسب نہیں سمجھا۔ میری تمہاری سرسری ملاقات تھی۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ایک دن تم شادی کی درخواست کرو گے۔

روح افزا صاف گوئی میری عادت ہے۔ میرا ظاہر باطن یکساں ہے۔ میں تمہاری خاطر اس لڑکی کو اپنی آنکھ کا تارا سمجھوں گا۔ لیکن اور کی اولاد کبھی اپنی اولاد نہیں ہو سکتی۔ یہ میرا یقین ہے"

یہ سنکر روح افزا کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر بدستور سابق شگفتہ ہو کر بولی۔ "آؤ اور باتیں کریں۔"

"لیکن تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"میرا فیصلہ وہی ہے جو پہلے تھا۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ تمہیں ایسی دلہن دے جو مجھ سے بہتر ہو۔"

فاروق نے کچھ کہنا چاہا مگر روح افزا نے رد کر دیا۔ اور کہا کہ دیکھو صاحب میرا فیصلہ آپ نے سن لیا۔ اس معاملہ میں مزید گفتگو میرے لئے رنج کا باعث ہوگی۔ فاروق اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔ اور چند منٹ تک ادھر اُدھر کی باتیں کر کے وہاں سے چلا آیا۔

فاروق اور روح افزا بمبئی کے رہنے والے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ بمبئی میں پردے کی رسم نہیں ہے۔ روح افزا کا بھائی جو ایک نوجوان بیرسٹر تھا۔ فاروق کا ہم جماعت اور دوست تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے فاروق کی روح افزا کے گھر بہت آمد و رفت تھی۔ لیکن جب سے روح افزا نے جواب دیدیا۔ تو دو ماہ تک وہ اُسکے یہاں نہ گیا۔ ایک دن روح افزا کا بھائی اُسے سمندر کے کنارے پر ملا۔ فاروق نے روح افزا کی خیریت پوچھی۔ تو اُس نے کہا کہ اچھی ہے۔ مگر جب سے اُس کی لڑکی مری ہے وہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اُسے بچی سے بہت محبت تھی۔ یہ سنکر فاروق کی باچھیں کھل گئیں۔ اور اُس نے خیال کیا کہ اب وہ چیز جو اُسکی راہ میں سد سکندری تھی دور ہو گئی۔

دوسرے دن وہ پھر روح افزا کے ہاں گیا۔ وہ حسب معمول خندہ پیشانی سے ملی۔

"روح افزا مجھے گلچہرہ کی موت کا صدمہ ہے۔ لیکن دنیا کا یہی حال ہے۔ یہ سرائے فانی ہے۔ خدا کی ذات کے سوا کسی کو بقا نہیں اب اُسے بھول جاؤ۔ اور مجھے اپنی غلامی میں قبول کرو۔"

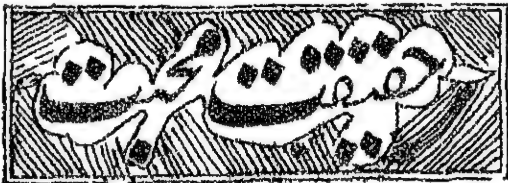
یہ سنکر روح افزا کا چہرہ مکدر ہو گیا۔ اور وہ تیوری چڑھا کر بولی "میری گلچہرہ کی قبر یہاں سے قریب ہے اُس کی زندگی میں تمھاری طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ وہ میری اور تمھاری بیٹی ہے۔ کیونکہ وہ تمھاری بیٹی نہ تھی لیکن مجھے جو اُس کی ماں ہوں یہ گوارا نہیں ہے کہ تم سے شادی کر کے تمھارے گھر جا رہوں۔ اور اُس کے بعد مروں تنہا چھوڑ دوں۔ میری گلچہرہ اندھیرے سے بہت ڈرتی تھی کبھی اکیلی اندھیرے میں نہ جاتی تھی اب وہ تاریک قبر میں اکیلی پڑی ہے۔ میں کیسی اُسے چھوڑ کر نہ جاؤں گی میں تمام دن اُس کی قبر کے سرہانے بیٹھی رہتی ہوں۔ اور جب شام ہو جاتی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میری بچی سو گئی ہے تو گھر آ جاتی ہوں۔"

روح افزا کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اُس وقت سر تفنگ اور سنگ فلاخن اسے کم نہ تھا اور فاروق عرق انفعال میں غرق ہوا جاتا تھا۔ آخر اُس نے جرأت کر کے کہا۔

"روح افزا مجھ سے قصور ہوا میں نے غلطی کی میرا قصور معاف کرو۔ اور مجھے ایک اور موقع دو تاکہ میں دکھا دوں کہ تلافی اسے کہتے ہیں۔"

روح افزا نے جواب میں صرف ہنس دیا۔ اور یہ ہنسی زہر خند تھی جس میں ہزاروں انکار نفرت کی آندھیاں اور حقارت کے طوفان پوشیدہ تھے۔

جیف اڈیٹر (خان احمد حسین خان)



کسی نے جو بیگانۂ عاشقی تھا باصرار واثق سے اک بار پوچھا

تجھے شوقِ عزلت گزینی کا کیوں ہے		تجھے ذوقِ صحرا نشینی کا کیوں ہے
یہ کیا ہے کہ اس درجہ بیتاب ہے تو		شرارہ ہے بجلی کہ سیماب ہے تو
سسکتا کبھی ہے تڑپتا کبھی ہے		تری زندگی روز کی جانکنی ہے
جہاں میں کوئی تیرا مونس نہ ہمدم		دلا ایک دل ہے سو وہ کشتۂ غم
ہمیشہ تجھے آبدیدہ ہی دیکھا		ترے رنگ و رخ کو پریدہ ہی دیکھا

کہا اس سے واعظ نے کیا پوچھتا ہے		مرے دردِ دل کا عجب ماجرا ہے
میں مدت سے بیٹھا ہوا سوچتا ہوں		کہ عذرا کو ایسی جگہ لے کے پہنچوں
جہاں آدمی زاد ہو مثلِ عنقا		وہ انساں و دد ہوں نہ ساماں صحرا
وہاں اس طرح محوِ نظارہ میں ہوں		کہ عذرا ہو موجود لیکن نہ دیکھوں
یہاں تک کہ عذرا سے عذرا جدا ہو		تصور میں صورت گری کا مزا ہو
ملے اس طرح اتصالِ من و تو		کہ دونوں کا جلوہ بھی واحد عیاں ہو

رہِ عشق میں ہر قدم پر خطر ہے		طبیعت میں جب تک دوئی کا اثر ہے
محبت اسی وقت ہوتی ہے کامل		محبت کا جب خود محبت ہو حاصل
محبت ذریعہ ہو ترکِ خودی کا		وسیلہ ہو سلبِ نفس کی زندگی کا
تعلق کا پردہ اٹھے درمیاں سے		تعلق رہے جسم سے اور نہ جاں سے

پھر اس ذاتِ مطلق سے ہو جائے واصل
جہاں وصل و ہجراں ہیں اوہام باطل

(جعفر علی خاں اثر)

خوف خدا

—— [illegible] ——

ٹھاکر چندن سنگھ دس گاؤں کے زمیندار ہیں۔ اُن کی زمینداری اُس گاؤں کے حسن [illegible] کی
حکومت ہے چاروں طرف کے گاؤں میں سے اس میں چھ سات کوس کے ارد گرد اُن کی پوری
حکومت ہے ٹھاکر چندن سنگھ [illegible] زمینداروں سے [illegible] اور انصاف کی قسمت
سمجھنے والوں کے دلوں میں زمینداری کے خلاف اگر آج مخالفت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے
وہ عزت رتبہ کا قانون جو سارے زمینداروں کے لئے باعث [illegible] سمجھتے ہیں مار [illegible] لیا
اُن کا پیدائشی حق ہے [illegible] رعیتوں و کساروں کو [illegible] اُن کے لئے ایک
زمینداری نشان ہے جو گاؤں [illegible] ساٹھ سال میں اُن کی رعیت تھی اُن
سے تھر تھر کانپتی ہے۔ کیا مجال کہ ٹھاکر [illegible] کے خلاف کوئی کوئی [illegible] بھی کر سکے۔

دوپہر کا وقت تھا ٹھاکر چندن سنگھ اپنی حویلی کی چوپال میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے اُن
کے پاس دو چار مصاحب بھی بیٹھے تھے۔ اسی وقت ایک کسان ایک اُجلی مرزئی پہنے ایک
موٹی سفید دھوتی (جو گھٹنوں کے ذرا ہی نیچے تک تھی) اور سر پر ایک سفید کپڑا لپیٹے ٹھاکر صاحب
کے سامنے آیا اور کہا "جہار مالک"

ٹھاکر صاحب نے [illegible] سر ہلا دیا کسان ایک طرف زمین پر بیٹھ گیا ٹھاکر صاحب
کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتے رہے [illegible]

کسان بولا "سرکار میں [illegible] آیا ہوں مالک"

ٹھاکر صاحب بولے "کالکا [illegible] دونوں میں کہاں غائب
رہا؟ کہاں تھا"

کالکا۔ "مالک۔ شہر چلا گیا تھا سال بھر وہیں رہا۔"

ٹھاکر۔ "شہر میں کیا کرتا رہا؟"

کالکا۔ نوکری کرتا ہوں

ٹھاکر۔ کاہے میں نوکر ہے۔

کالکا۔ ڈیری فارم میں۔

ٹھاکر۔ کیا سرکاری ڈیری فارم میں۔

کالکا۔ نہیں مالک ایک مہاجنی ڈیری فارم ہے

ٹھاکر چندر سنگھ ہوں کر کے چپ ہو گئے۔ اُن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ تھوڑی دیر تک چپ چاپ حقہ پیتے رہے۔ پھر بولے۔ دیکھو کالکا۔ آج ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن آئندہ جو کبھی ہمارے سامنے یہ ٹھاٹھ باٹھ سا کر آئے گے۔ تو ٹھیک نہ ہوگا۔ جیسے ہو ویسے ہی رہنا ٹھیک ہے۔

کالکا کانپ اٹھا اسے خواب میں بھی یہ امید نہ تھی۔ کہ ٹھاکر صاحب کو اس کے ان معمولی کپڑوں میں بھی ٹھاٹھ کی جھلک نظر آئے گی۔ اس نے سوچا کہ یہاں سے ٹل جانا ہی بہتر ہے یہ سوچ کر وہ جھار کر کے وہاں سے چل دیا

اُس کے چلے جانے پر ٹھاکر چندن سنگھ [illegible] اس نے شہر میں رہ کر مال پیدا کیا ہے۔ باپ کی نوکری [illegible] ہو [illegible]

ایک مصاحب نے کہا جس کا نام سنگھو سنگھ تھا۔ لیکن اُس نے روپیہ کمایا ہے ابھی اس روز ایک سو روپے کی بھینس مول لی ہے [illegible] کی بھی لایا ہے۔

ٹھاکر چندن سنگھ۔ سچ ہاں؟

سنگھو سنگھ [illegible]

ٹھاکر چندن سنگھ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ٹھاکر چندن [illegible]

دوسرے دن ٹھاکر صاحب نے اسی گاؤں کے جس میں کالکا پرشاد رہتا تھا، ایک برہمن کو بلایا اور اس کو دعائیں... جاکر کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ باتیں ہو چکیں تو اس سے بولے۔ اچھا جاؤ۔ مگر دیکھو مہاراج جیسا کہا ہے۔ اس میں فرق نہ پڑے۔ نہیں تو چوٹی کٹوا دوں گا یہ یاد رکھنا۔

برہمن ہاتھ جوڑ کر بولے "دوہمن (?) مالک، فرق کیسے پڑ سکتا ہے۔"

اس سے اگلے روز صبح کے وقت ایک آدمی ٹھاکر صاحب کے پاس آیا۔ ٹھاکر صاحب حوائج ضروریہ سے فارغ ہوکر بیٹھے داتن کر رہے تھے۔ وہ شخص ٹھاکر صاحب سے بولا "سنا مہاراج پور میں کل رات کو پنڈت مہاراج کے ہاں چوری ہو گئی ہے۔"

ٹھاکر صاحب لاپرواہی سے بولے "ہو گئی ہو گی۔ اپنے سے کیا۔ دیہات میں چوری چکاری ہوا ہی کرتی ہے۔"

اس شخص نے کہا "کچھ بہت سا سامان ہے۔ ٹھیک نہیں کہا جاتا ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد پنڈت مہاراج ہانپتے ہوئے گرتے ہوئے آئے۔ دور ہی سے بولے "دہائی ہے سرکار کی۔ غریب برہمن لٹ گیا۔ آپ کے راج میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

یہ وہی برہمن دیوتا تھے جن سے ٹھاکر صاحب نے علیحدگی میں باتیں کی تھیں۔

ٹھاکر صاحب بولے "ارے ہوا کیا۔"

برہمن دیوتا نے جواب دیا، آنسو پونچھ کے "سرکار لٹیا تھالی سب چلی گئی۔ بس یو سرکار امر گیا (?) پیٹ کاٹ کاٹ کر بال بچوں کے لئے جو کچھ جوڑا تھا، سب چلا گیا۔"

ٹھاکر صاحب "کیا ہوا، چوری ہو گئی کیا؟"

برہمن "ہاں سرکار سب چلا گیا۔ مہاجن (سیٹھ جی) کے پاس جو سو پچاس روپئے کا گہنا تھا وہ بھی چلا گیا۔"

ٹھاکر صاحب "یہ تو بڑی خراب بات ہوئی۔ کوئی آدمی پکڑا گیا ہے؟"

برہمن "اب بھلا بتائیے کس کا نام لوں سرکار۔ ہاں ڈھکا چھپا کہتا ہوں کہ رات کے دس بجے

جب وہ بات کرکے اٹھا۔ تو اُس نے کالکا اہیر کو ایک آدمی کے ساتھ کھسر پھسر کرتے دیکھا تھا۔

ٹھاکر صاحب۔ کون کالکا۔

بدلا۔ وہی بدھوا کا بیٹا جو ابھی تھوڑے دن ہوئے آیا ہے۔ شہر میں نوکری کرتا ہے۔

ٹھاکر صاحب۔ ارے وہ تو بیچارہ بہت بھلا آدمی ہے وہ ایسا کام نہیں کر سکتا۔

بدلا۔ سرکار! یہی تو میں کہتا ہوں

ٹھاکر صاحب بولے "مگر یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُسکا کام نہیں ہے۔ کسی کے پیٹ کا کیا ٹھیک۔ اچھا ڈھکیا چمار کو تو بلاؤ"

اُسی وقت ایک نوکر دوڑ گیا۔ وہ ڈھکیا چمار کو بلا لایا

ڈھکیا بولا "سرکار! بات یہ ہے۔ کہ کل رات کے کوئی دس بجے ہوں چاہے گیارہ بس ایسا ہی وقت تھا۔ میں پیشاب کرنے کو اٹھا۔ پیشاب کر کے جو لوٹنے لگا۔ تو میں نے بدا مہاراج کے گھر کے پاس دو آدمیوں کو کھڑے کچھ باتیں کرتے دیکھا۔ بس سرکار! میں نے کھکھارا۔ میرا کھکھارنا تھا کہ وہ دونوں چپ ہو گئے۔ اور وہاں سے چل دئے۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ اس پر وہ نہ بولے۔ تب میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ کون جاتا ہے۔ تب سرکار! ایک بولا ہم تو کالکا ہیں۔ بس سرکار! پھر میں گھر میں جا کر سو رہا۔ سویرے اٹھ کر سنا کہ بدا مہاراج کے ہاں چوری ہو گئی۔ اتنی بات تو میں نے آنکھوں سے دیکھی وہی ان سے بھی کہہ دی اور کچھ میں جانتا وانتا نہیں۔"

ٹھاکر صاحب کچھ دیر تک سوچ کر بولے۔ "جب تو یہ بات ہے اچھا کالکا کو بلواؤ۔"

فوراً آدمی گیا۔ اور کالکا کو بلا لایا۔ ساتھ کالکا کا بوڑھا باپ بدھوا بھی لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا۔

ٹھاکر صاحب نے اس سے کہا کل رات کو بدا مہاراج کے ہاں چوری ہو گئی ہے۔

کالکا بولا۔ ہاں مالک سویرے میں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا تھا بڑا غضب ہوا۔

ٹھاکر۔ کل رات کو تم کہاں تھے۔

کالکا ذرا غمزدہ ہو کر بولا کل تو مالک میں گھر ہی پر تھا۔

کالا [illegible] سدھوا [illegible] سرکار [illegible] شام ہی سے کھا پی کر سو گیا تھا۔

ٹھاکر صاحب نے کہا "کل رات کو گیارہ بجے لوگوں نے انھیں مہاراج کے گھر کے پاس [illegible] کھڑا دیکھا تھا"

کالا [illegible] ہو کر بولا "کیسے؟ [illegible] سرکار میں تو کل رات کو چارپائی سے نہیں اٹھا!"

سدھوا بولا "کون کہتا ہے؟"

ٹھاکر صاحب نے کہا "ڈھکلا چمار کہتا ہے۔"

سدھوا نے ڈھکلا کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیوں رے کیا کہتا ہے"؟

ڈھکلا [illegible] کچھ جواب نہیں دیا۔

ٹھاکر صاحب نے ڈھکلا سے کہا "تم نے جو کچھ دیکھا ہے وہ کہتا کیوں نہیں۔"

ٹھاکر صاحب نے [illegible] نگاہ ڈالی۔

ڈھکلا نے کہا "سرکار کالا کو [illegible] آدمی سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔"

ٹھاکر صاحب "کہاں دیکھا تھا۔"

ڈھکلا "مہاراج کے گھر کے پاس"

سدھوا [illegible] کالی [illegible] سامنے کو دل میں سوچتا [illegible] ایک دوسرا [illegible] آتا ہے۔ [illegible] لگاؤ گے [illegible]

[illegible] اڑنے لگیں۔

ٹھاکر صاحب [illegible] گھبرا [illegible] دیکھا وہ کہہ دیا۔ پاس تو ہم کسی کو لگا [illegible]

سدھوا بولا [illegible] جھوٹ بول [illegible] لگا [illegible]

ٹھاکر صاحب نے کہا "تھانیدار، اس جھگڑے سے کیا مطلب؟ تفتیش ہو جانی چاہیے۔ تھانیدار صاحب خود پتہ لگا لیں گے۔"

سدھوا بولا "مالک، وہ بیٹا سیتا کا [illegible] ٹھیک ہے۔ چور ہو وہ ڈرے۔ جو کر [illegible] کو ڈر کاہے کا۔"

——— (۲) ———

تھانہ میں اطلاع دی گئی اور دوسرے دن تھانیدار صاحب گاؤں میں [illegible] سوار اور دو سپاہیوں کی معیت میں آدھمکے۔ پہلے ٹھاکر صاحب سے ملے۔ ٹھاکر صاحب نے انھیں تنہائی میں لے جاکر [illegible] تھانیدار نے پوچھا "آپ کو کس پر شبہ ہے؟"

ٹھاکر صاحب نے کہا "معاملہ کیا ہے، آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے"

تھانیدار صاحب بولے "[illegible]"

ٹھاکر صاحب۔ وہ بیٹا [illegible] ملتا ہی نہیں۔

تھانیدار۔ کون ہے؟

ٹھاکر صاحب۔ سدھوا [illegible] کا بیٹا [illegible]

تھانیدار۔ چوری کا سراغ کیسے ملے گا؟

ٹھاکر صاحب۔ چوری کسی [illegible] ہوئی [illegible] آپ کی خاطر ہے۔

تھانیدار۔ آپ سمجھ [illegible] پتہ چلانا [illegible]

[illegible]

ٹھاکر صاحب۔ [illegible] کہ اس [illegible] آدمی سے [illegible] لیے [illegible]

یہ کہکر ٹھاکر صاحب [illegible]

تھانیدار صاحب بولے: پھر کیا ہے [illegible]

پہلے بھی کچھ ہے۔

ٹھاکر صاحب۔ آپ تو بچوں کی باتیں کرتے ہیں پہلے نہ ہوتا تو یہ سب باندھو باندھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ نے مجھے کوئی لونڈا سمجھ رکھا ہے۔

تھانیدار صاحب دانتوں تلے جیبھ دباکر بولے۔ آپ ہمارے مالک ہیں ہم بھلا ایسا سمجھ سکتے ہیں۔

کچھ دیر تک دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اسکے بعد ٹھاکر صاحب بولے "اب آپ جائیے۔ ڈھکیا چمار کے یہاں پر کالکا کے گھر کی تلاشی لیجئے۔"

یہ کہکر ٹھاکر صاحب نے کرتے کی جیب سے دو چاندی کے گہنے نکالے۔ اور تھانیدار صاحب کے ہاتھ میں دیکر کہا۔ لیجئے یہ تلاشی کے لئے مسالہ۔

تھانیدار صاحب نے مسکراکر دونوں گہنے مسکراکر جیب میں رکھ لئے۔ پھر اٹھکر بولے۔ "اچھا تو جاتا ہوں۔"

ٹھاکر صاحب۔ ہاں جائیے۔

تھانیدار صاحب سرائی لور چلے گئے۔

دو گھنٹے کے بعد تھانیدار صاحب لوٹے۔ آگے آگے تھانیدار صاحب تھے۔ اور پیچھے دونوں سپاہی کالکا کی کمر میں رسی باندھے اُسے لا رہے تھے۔ ہاتھوں میں ہتکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ پیچھے کالکا کا باپ سدھوا روتا ہوا آرہا تھا۔ ساتھ چار چھ آدمی اور بھی تھے۔

تھانیدار صاحب نے سب حال بیان کیا اور دونوں گہنے ٹھاکر صاحب کے سامنے رکھدئے۔

ٹھاکر صاحب سب دیکھ سنکر بولے "داروغہ جی! کالکا بیچارہ بڑا بھلا آدمی ہے۔ اُس نے ایسا کام کیسے کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

تھانیدار۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کو کیا کریں ثبوت سامنے رکھا ہے۔ اب قانونی کارروائی کرنی ہی پڑیگی۔

ٹھاکر صاحب۔ بیشک یہ تو ٹھیک ہی ہے۔ مگر اسمیں کہہ سکتا ہوں۔ کہ کام کالکا کا

ج۔ ھدے ندیم اور حوسما نقش و نگار

[۴] ان گنگا کی ندی کا ریلوے پل

نہیں ہے۔

سکھو روتا ہوا بولا۔ مالک دودھوں نہائیں، پوتوں پھلیں۔ مالک سے یہ بات کہی۔ میرا بچہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ ان گاؤں والوں سے دشمنی ہے۔ کتنوں ان کرتے اُن پہ بجلی گرے۔ سالوں کے بال کو بھی رو رہے ہو۔ اب ادھر رہتے۔ جیسے میرے تئیں کوئی تماشا نچوا دیکھنے والا ہے۔

یہ کہکر سکھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ٹھاکر صاحب نے سکھو کو بلایا۔ یہاں تو آ رے۔

سکھو قریب آیا۔ ٹھاکر صاحب اسے ایک طرف لیجا کر بولے۔ دیکھ سکھو یہ ہنسی نہیں ہے کہ کام کا لڑکا کا ہی ہے۔ اگر جستہ تلاشی میں گہنے برآمد ہوتے ہیں تو اسے سزا پائے میں بچ گا۔ لمبی سزا ہوگی۔

سکھو نے کہا۔ ارے مالک یہ سب ہو۔ میرا لڑکا مارا جائیگا۔ لے آئی اس بچاؤ لگا کوئی تدبیر کرو جو کچھ خرچ پڑے گا میں دونگا۔ وکیل بالسٹر کی فیس جو پڑیگی جو میں دونگا اپنی لٹیا تھالی بیچ ڈالوں گا بچہ سلامت رہیگا تو تمہاری غلامی کر کے بہت کما لیگا۔

ٹھاکر صاحب۔ تو ہماری صلاح مانو۔ کچہری عدالت کا جھگڑا نہ رکھو۔ ہاں معلوم نہیں جو بڑے بات تھانیدار کو نہیں کچھ دے لے کر معاملہ رفع دفع کر ڈالو۔

سکھو۔ تھانیدار صاحب مان جائیں گے۔

ٹھاکر صاحب۔ کیوں نہیں مان جائیں گے۔ ہم کہیں گے تو مان جائیں گے۔

سکھو۔ مالک ایسا کر دو۔ تو مالک اس جنم بھر گن گاؤنگا۔

ٹھاکر صاحب۔ اچھی بات ہے۔

یہ کہکر ٹھاکر صاحب تھانیدار صاحب کو ایک طرف لے گئے کہا ... کتنا دلوا دوں۔

تھانیدار۔ جو آپ کی پرورش ہو۔ مجھے کیا۔ جو کچھ کبھی مل جائیگا۔ وہ بات ہے۔

ٹھاکر صاحب۔ اچھی بات ہے۔

ٹھاکر صاحب نے سدھو کو الگ لے جا کر پانچ سو روپے مانگے تھے،

سدھو۔ مالک اتنا سالو سر نہ کے دکا مر جاؤں گا سب سر اڑ گیا ہو گا

ٹھاکر صاحب۔ اس سے کم میں راضی نہ ہوں گے۔

سدھو۔ حضور مالک ہیں جو آپ سے ہو سکے کر سکتے ہیں۔

ٹھاکر۔ اچھا تم جتنا دے سکتے ہو وہ بھی تو بتاؤ۔ یہ سمجھ لینا کہ عدالت میں بھی تمہارے
ہیں چار سو روپے خرچ ہو جائیں گے اور پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چھوٹ ہی جاؤ گے چھوٹے
نہ چھوٹے تو جیل حاکم کیا ہیں کیا سمجھ میں آوے۔

سدھو۔ تو سرکار آپ جو مناسب سمجھیں کرا دو۔

ٹھاکر۔ ڈھائی سو

سدھو۔ ہاں مالک اتنا بھی بہت ہے سو کہ ... ڈھائی سو کے پھیر میں
تقدیر پھوٹ گئی ... ڈھائی سو کا بہت ہے۔ کلیجہ نکلا آتا ہے۔ ان گاؤں والوں کی
۔ معلوم نہیں سالوں نے کس کا سر کاٹا ہے۔

ٹھاکر صاحب نے کہا "اچھا دیکھو کیسا ہوں جو مان جائیں۔"

اسی طرح ٹھاکر صاحب نے دو بار ادھر ادھر کر کے دو سو میں فیصلہ کیا۔ سدھو
سے بولے تھانیدار صاحب دو سو سے کم پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔

سدھو۔ جو حکم سرکار کہیں۔

ٹھاکر صاحب۔ کیا کیا ہے دو پچاس روپے کی تو بات ہی ہے سب معاملہ نہیں
رفع دفع ہوا جاتا ہے

سدھو اسی وقت گھر دوڑا ہوا گیا لوٹ کر اس نے ڈیڑھ سو روپے ٹھاکر صاحب
کے ہاتھ میں دھر دیے۔ روپے دیتے وقت اس کی بری حالت تھی۔ گویا اپنے بیٹے کو بچانے
کے لئے اپنا کلیجہ نکال کر دے رہا ہے۔

ٹھاکر۔ یہ تو یہ ڈیڑھ ہی سو ہیں۔

سدھوا - ہاں مالک اتنے ہی تھے۔ پچاس ہم اسے پاس سے دے دو۔ چاہے فصل پر سود بیاج لگا کر لے لینا اور چاہے میری بھینس ستر روپے کی ہے وہ لے لو روپے لو اور راہ نہیں۔

ٹھاکر۔ اچھی بات ہے۔

ٹھاکر صاحب نے تھانیدار صاحب کو ایک طرف لے جا کر پچاس روپے پکڑا دیے اور بولے غریب آدمی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔

تھانیدار صاحب نے کوں کہوں نہیں کئے۔ انہیں بھی ٹھاکر صاحب کی مہربانی درکار تھی اس لئے انہوں نے شکریہ کے ساتھ وہ روپے لے لئے۔ کالکا [illegible] چھوڑ دیا گیا۔

اکثر و بیشتر لوگ یہ سمجھے کہ کالکا چور تھا مگر ٹھاکر صاحب کی [illegible] سے چھوٹ گیا [illegible] اور [illegible] لیکن کسی کی مجال نہیں کہ ٹھاکر صاحب اور تھانیدار صاحب کے خلاف کچھ کہہ سکے۔

[illegible] کو کالکا [illegible] اور گاؤں کے دو چار اور آدمی ساہو کی چوپال پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے [illegible] آدمی کہہ رہا تھا کہ [illegible] ٹھاکر [illegible] کی [illegible] چوری ہوئی ہے چاری

کالکا۔ [illegible] کہاں جائے۔ ہمارا لوٹا تھالی تک گئی۔ [illegible] ہوں

سکھو۔ [illegible] گاؤں [illegible] ٹھاکر [illegible] ملک [illegible] کا ٹھیکہ [illegible] ٹھاکر صاحب ہیں پچھلے سال ہمیں بلایا اور بولے سکھو کچھ روپے ویسے نہیں لیے معلوم ہوتا ہے بڑے مالدار ہو گئے ہو۔ میں نے کہا مالک قرض لینا کا ہے نہیں ہے لینا آسان ہے مگر دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ بولے۔ ایسا کیا لیے ہو۔ کچھ نہیں تو دیا کرو۔ میں کچھ نہیں بولا دوسرے دن گاؤں والوں سے

کہا ٹھاکر صاحب سے کچھ قرض لے لو۔ ہمیں تو کسی طرح انہیں پیسا دینے ہی لگے۔ تب ٹھاکر پچیس روپئے ان سے لئے۔ ابھی روپئے کا سود دیتا ہوں۔

کالکا۔ "مگر ضرور دے لئے۔"

سکھو کیا کریں بیٹا ڈیڑھ سو روپیہ ہوا اور انھیں بیٹھے بٹھائے دے رہے ہیں۔ یہ دن بھلا کس سے سہے جائیں۔

دوسرا شخص بولا "سکھو بھیا، تمہیں یہ حال معلوم ہو یا نہ ہو ابھی برسوں ایسے ہی کلوا کاچھی نے کہا تھا اس لئے اُن کی بات پر کچھ دھیان نہیں دیا۔ بس پھر رہے ہی دن رات کو سارا کھیت اجاڑ دیا۔ رات بھر میں سب بالیاں کاٹ لی گئیں۔ خالی ٹوٹے ٹھونٹھ ایسے کھڑے رہ گئے۔ کلوا بے چارہ زار زار رویا، بولا کی مگر کچھ نہ ہوا۔ بیچارہ ہی من لگا کر بہت مسوس کر رہ گیا۔ ڈھائی سو روپئے کے تھے گئی"

سکھو نے ایک لمبی آہ بھر کر بولا "ایک نہ ایک دن بھگوان غریبوں کی بھی سن لیں گے۔"

سکھو۔ [illegible] ابھی تک [illegible] اُن پر ڈال رکھے ہیں [illegible] کو [illegible] لوٹی لنگوٹی لگا کر اُلٹا [illegible] حال ٹھاکر [illegible] بیٹھے بس [illegible] اس کے پاس [illegible]

کالکا۔ بھلا ان سے کوئی جو بھی ہے۔

سکھو [illegible] ان لوگوں سے کون سوچ ہوگا کہ سکھو تھوڑا ہو [illegible]

کالکا۔ کوئی جوش نہیں ہے ابھی یہ حال ہے [illegible] ابھی یہ باتیں کر رہے ہو لیکن ابھی اگر ٹھاکر کہیں، تو ہمارا لگا کا۔ ہے کو ہوشیار ہو جاؤ۔

دوسرا شخص بولا "بھائی کیا کریں کچھ خوشی سے تھوڑے ہی ایسا کر رہے ہیں ڈر لگتا ہے کہ [illegible]

سکھو۔ [illegible] ہی جان اور [illegible] کا سارا ہو [illegible] اسی خاطر [illegible]

کرتے ہیں۔

سکھوا۔ کبھوں تو دین دیال کے بڑے گی کان کبھی تو بھگوان غریبوں کی سنیں گے۔

ننکو۔ پچھلے سال ٹھاکر نے بیٹھ لگوایا تھا۔ آس پاس کے گاؤں کے دس بیس آدمی پکڑ بلائے جاتے تھے۔ دن بھر کام کرتے تھے اور شام کو اٹھ بیٹھ دیتے تھے۔ ہمیں پاؤ آٹے میں کون دن بھر خوشی سے مرے جاتا ہے۔ مگر کیا کریں۔ سب کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا شخص بولا " ہاں بھائی ایسی ہی بات ہے دن بھر جی توڑ کر کام کیجئے پھر بھی ٹھاکر کی نگاہ ٹیڑھی ہی رہتی تھی۔ ایک روز میں نے کہا مالک ہمارے دن کی چھٹی دیدو۔ تو کہنے لگے بس۔ سو کیسے جا رہے ہیں۔ بولے کھیتوں میں آگ لگا دو۔ ہمارا کام ہو چکیگا۔ سب ایسا کام کر لے تاؤ گے۔ میں چپ ہو گیا۔ اور کچھ کہتا تو مار پڑتی۔ پھر یہی ہوا کہ اسے کام کے لئے پانچ آنہ روز کا مزدور رکھنا پڑا۔ دو آنے ہمیں ملتے تھے اور پانچ آنے ہم دیتے تھے۔

کالکا۔ بیٹھ کا ہے کو لگوایا تھا۔

وہی شخص۔ جو شوالہ بنوایا ہے۔ اُسی کے لئے بیٹھ لگوایا تھا۔

کالکا۔ غریبوں کا گلا کاٹ کر شوالہ بنوانے میں کیا ثواب ہے۔

ننکو۔ اس نہ اُسے کون پوچھے۔

وہی شخص۔ بھیا کی بات ایسا تو بھیا بڑا کام ہے ذرا دراسی بات میں تو بیٹھ کی کھال اڑا دی جاتی ہے ایسا جو کوئی کہے تو اُن سے سہا نہ جائے کسی دوسرے ہی سے اور دو ش بائیں۔ تو کچھ نہ کہہ دادا رہ۔ دل لگی تھوڑے ہی ہے۔ چھوٹے موٹے زمینداروں کی تو مجال ہی نہیں ہے کہ اُن کی بات کو دیکھیں۔ پھر کسان بے چارے کس گنتی میں ہیں۔

سکھوا۔ بھیا ہمارے تو سب کرم پھوٹ گئے ہیں آبرو تک گئی۔ اب حال لکھا رو گئے ہیں۔

ننکو۔ مال تو ہاں گیا ہی لیکن آبرو جانے کی کوئی بات نہیں کیا۔ دل میں سمجھ گیا ہے نہ

یہ ٹھاکر صاحب کی کھڑت تھی۔
سال ہوا۔ جو کچھ بیلے تھا وہ چلا گیا اوپر سے ٹھاکر صاحب کے پچاس روپے کے قرضدار
ہو گئے۔ بھیس سر ٹھاکر کا دانت ہے۔" وہ بیس تو ہم دوال ہی نہیں۔ روپے اور
بیاج دے دیں گے۔"
سکو۔ یہی ہماری غلطی ہے۔ بیس دو گے تو مرتے ہی رہو گے۔ ٹھاکر کا قرض رکھا
ٹھیک نہیں کہوں بھائی رام چرن! کچھ جھوٹ کہتا ہوں
رام چرن جیسے ہم ابھی تک "وہی شخص" کہنے آتے ہیں بولا "یہ بات ننکو بھائی
کی سولہ آنے ٹھیک ہے جنم بھر دیتے رہو گے۔ تب بھی ٹھاکر صاحب سے سبکدوش نہ ہو
سکو گے۔ سمجھے ساد ہو بھائی۔ بیس دے ڈالو۔ تمہاری زندگی ہے تو بیس پھر
پچاس ہو جائیں گی۔ کنھیا اہیر کے باپ نے ٹھاکر سے پندرہ روپے لئے تھے۔ پانچ برس
[illegible] مر گیا اور چار برس سے کنھیا دے رہا ہے۔ پھر بھی پانچ روپے
[illegible] پڑے ہیں۔ ہر فصل میں ساج دیا جا رہا ہے۔ اور دو میں روپے اصل میں
پیچھے [illegible] نہیں اتر سکے۔
[illegible] سارے ہی لئے ہوں گے۔
[illegible] حساب کتاب کچھ نہیں۔ وہ ٹھیک سمجھیں وہی حساب ہے۔ اس کے سوا
[illegible] پچھلے سال کہنے لگا "مالک حساب سے تو روپے
[illegible] ٹھاکر صاحب بولے "ابھی آٹھ روپے باقی ہیں"۔ کنھیا نے جواب
دیا "جی مالک" ۔ واللہ سچی بات نہیں رہا۔ بس ٹھاکر آگ ہو گیا بولا "مار لو سالے کے
پچاس جوتے سالا ہمیں بے ایمان بتاتا ہے۔" ابھی بحث دس پندرہ جوتے بیچارے کے
[illegible] پھر ٹھاکر بولے "اب سالے! تیرے دس دے پڑیں گے۔ دو روپے جرمانہ کیا۔"
[illegible] تو پچھ کے چلا آیا اب وہی دس ادا کر رہا ہے
[illegible] ٹھاکر سے بیس روپے کاہے کو لئے۔
[illegible] کرنے کے لئے تھوڑے ہی لئے ہیں حالی ڈیڑھ روپیہ ماہوار سات

دے رہا ہوں۔ اصل میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دیا اور کبھی دوں گا۔ اٹھا کر آپ اصل ہی سے مانگیں گے تو ایک دم محسن بن جائے گا وہ دو چار چکر لگے تو آئیں گے کبھی دیتے ہی نہیں ہمیں تو ساری عمر نہیں اس پر ہنسی آئی۔ مجھ کو کمائی ہی پڑتی گی۔ ہم نے [illegible] لیا ہے۔ کہ جہاں اپنے بال بچوں کے لئے کماتے ہیں۔ وہاں ڈیڑھ دو سو روپے کا بوجھ [illegible] منہ کھلنے رہیں گے۔

[illegible]

اگر لوگوں سے پوچھا جائے کہ ان میں پاپ کون زیادہ کرتا ہے تو اکثر [illegible] یہی جواب دیں گے کہ غریب آدمی۔ لیکن اگر ہم سے پوچھا جائے تو ہم یہی کہیں گے [illegible] دولتمند آدمی جتنا پاپ کرتا ہے اس کا دسواں حصہ بھی غریب آدمی نہیں کرتا۔ اگر [illegible] نکالی جائے تو بے ایمان بد چلن چھوٹے اور بد معاش آدمیوں کی زیادہ تعداد دولتمندوں ہی میں پائی جائے گی۔ دولتمند آدمی کو پاپ کرنے کا موقع جیسے آسانی سے ملتا ہے۔ اس طرح غریب کو نہیں ملتا۔ پاپ کرنے کے لئے جتنا حوصلہ امیر آدمی کے دل میں ہوتا ہے۔ اتنا غریب آدمی کے دل میں نہیں ہوتا۔ اور جس قدر جلد غریب آدمی کا پاپ ظاہر ہو جاتا ہے اتنی جلدی بڑے آدمی کا نہیں ہوتا۔ چھوٹے آدمی پر لوگوں کو جلدی شک ہو جاتا ہے اور اسی لئے اس کا پاپ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پاپ کے ظاہر ہو جانے پر غریب آدمی کے پاس اپنے بے قصور ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ جلد سزا پا جاتا ہے۔ برعکس اس کے امیر اور بڑے آدمی پر شک کرنے کی ہمت لوگوں میں بہت کم ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا پاپ ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر ظاہر بھی ہو گیا تو زر کے زور سے وہ عموماً اس کے لئے سزا پانے سے بچ جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے آدمیوں کے گناہ کے بدلے چھوٹے آدمی سزا پاتے ہیں اور بڑے آدمی بچ جاتے ہیں

مندرجہ بالا واقعہ گذرے ایک سال ہو گیا

شام کا وقت تھا سیٹھ ہوا ایک نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھا سماوتی رہا تھا [illegible] دو چار آدمی اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی وقت ایک آدمی گھبرایا ہوا آیا۔ اور [illegible]

سے بولا "چچا بڑا غضب ہو گیا۔"

سندھوا نے پوچھا کیا ہوا؟

اس نے جواب دیا۔ سودن مر گیا

سندھوا نے متحیر ہو کر پوچھا۔ مر گیا؟

وہ۔ ہاں۔

سودن اکیلے؟ سویرے تو چنگا بھلا کام پر گیا تھا۔ ۲

وہ۔ ٹھاکر نے مروا ڈالا۔

سندھوا۔ ارے تو کہتا کیا ہے۔

وہ۔ بکتا نہیں ٹھیک کہتا ہوں۔

سندھوا۔ کیسے مروا ڈالا۔

وہی شخص وہ کام کر رہا تھا اتنے میں اسے پیاس لگی۔ وہ پانی پینے گیا۔ پانی پینے کے بعد تھوڑی دیر ٹھہر رہا۔ اتنے میں ٹھاکر ادھر آ نکلے۔ انہوں نے ڈانٹ کر کہا کیوں بے بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ کام نہیں کرتا؟ سودن بولا "مالک! ابھی ابھی پانی پینے کو آیا تھا اب جاتا ہوں۔" ٹھاکر بولے اٹھ جلدی۔ اس نے کہا مالک! ابھی جاتا ہوں ذرا ستا لوں۔ اتنا سنتے ہی ٹھاکر نے اس کے ایک لات ماری اور کہا سالے تجھے ستانے آتا ہے یا کام کرنے۔ بس اتنا سننا تھا کہ سودن بولا وہ کہاں بولا۔ اس کے سر پر موت کھیلتی تھی اس نے بولا "مالک! اور پھر تو کام کیا ہم بھی آدمی ہیں کوئی جانور نہیں ہیں۔ ایسی مزدوری ہمیں نہیں کرنی کل ہم نہیں آئیں گے اور کوئی آدمی ڈھونڈ لینا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنا سنتے ہی ٹھاکر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پڑے ہوئے ایک ڈنڈا اٹھا ہی تو دیا۔

ڈنڈا اٹھا کر سودن بولا "بس مالک اب نہ مارنا۔ نہیں تو اچھا نہ ہو گا۔" بس پھر کیا تھا ٹھاکر کا منہ انگارہ ہو گیا انہوں نے [illegible] ایک گٹھے کو بلایا اور کہا مارو سالے کو جوتے مارو۔ گٹھے نے ڈنڈا لے کر جیسے ہی [illegible] مارا کہ ٹھاکر کھڑے کہہ رہے

نہیں مت ڈر کاہے کا۔ اُس نے تین چار لاٹھیاں جو ماریں۔ تو بس چچا! سودلوا بسر گیا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ دیں۔ پھر بھی ٹھاکر بولے سالا مکر کرتا ہے مارے جاؤ۔ گرڑبت نے تین چار لاٹھیاں اور ماریں۔ بس غریب سودلوا کے پران نکل گئے۔

سن ہوا۔ پھر کیا ہوا؟

وہی شخص بولا: اُسی بخت چھبی پور کے زمیندار صاحب اپنے گاؤں کو جا رہے تھے۔ شہر سے دو سے کی گاڑی میں آتے تھے۔ پلہ جو ہوا وہ بھی اتر پڑے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ سودلوا مر گیا۔ تو اُسی وقت تھانے میں رپوٹ کروائی۔ اُن کی اور ٹھاکر چندن سنگھ کی لاگ ڈانٹ تو چلی ہی آتی ہے۔ تھانیدار صاحب آئے زمیندار نے اپنے سامنے گرڑبت کے بیان دلوائے۔ گرڑبت نے کہدیا۔ کہ ٹھاکر صاحب نے پہلے تو آپ مارا پھر مجھ سے مارنے کو کہا۔ میں نے بھی دو تین لاٹھیاں ماریں بس مر گیا۔ اب لاش تھانے پر گئی ہے ٹھاکر چندن سنگھ اور گرڑبت بھی پکڑے گئے ہیں۔

سن ہوا۔ یہ تو بڑا غضب ہوا اب ٹھاکر بچے سزا سے نہیں بچیں گے۔

ایک دوسرا آدمی بولا "بھگوان نے ٹھیک ہی کی ہے۔ بڑی آفت مچا رکھی تھی۔ ٹھاکر غریبوں کو مارے ڈالتا تھا۔ اب پاپ کا گھڑا پھوٹا ہے"

اس حادثہ سے آس پاس بڑی سنسنی پھیلی لیکن سب خوش تھے ادھر کچھ دنوں سے ٹھاکر صاحب اور چھبی پور کے زمیندار میں جو لاگ ڈانٹ ہو گئی تھی اُس نے جی [illegible] ٹھاکر صاحب کو پھانسنے کی کوشش شروع کر دی لیکن چھبی پور کے زمیندار کی طرح [illegible] اور چندن سنگھ میں کافی بغض و عناد تھا کئی بار مقدمہ بازی بھی ہو چکی تھی اس لئے اُن کی [illegible] زیادہ زور دار تھی پولس نے آس پاس کے دیہات کے [illegible] گواہی میں لینا شروع کیا اور [illegible] سے مجبور [illegible] شمار کر لئے [illegible] سب [illegible] ہی [illegible] ٹھاکر کے سامنے [illegible] آتا تھا وہ تو تیار ہو ہی گئے لیکن جو لوگ [illegible] موجود نہیں تھے وہ بھی جھوٹی شہادت دینے کو تیار ہو گئے [illegible] ادھر گاؤں والوں نے بھی کہا۔ ہمارے لئے کبھی [illegible] ٹھاکر [illegible] کم

سے کم کالے پانی کو بھجواؤ۔

سدھوا نے ہر چند بچنا چاہا۔ بولا "جھوٹی گواہی تو ہم نہ دیں گے۔" مگر اس کی ایک نہ چلی۔ تھانیدار نے آنکھیں نیلی پیلی کر کے کہا۔ سنتا ہے بے تجھے گواہی دینی ہی پڑے گی۔ جہاں چپڑ چپڑ کرے گا تو تجھے بھی چار سال کو بھجواؤں گا۔

سدھوا نے مجبور ہو کر منظور کر لیا۔

ٹھیک وقت پر مقدمہ پیش ہوا۔ پولس نے گواہوں کو سکھایا تھا کہ کہنا۔ ٹھاکر اور گرٹ ہے دونوں نے مل کر مارا ہے۔ ٹھاکر صاحب ڈنڈے سے پیٹ رہے تھے۔ اور گرٹ سا لاٹھی سے۔

ادھر سدھوا نے کالکا سے کہا تھا۔ "بیٹا! جھوٹی گواہی دینا بڑا پاپ ہے پھر خون کے معاملہ میں مگر پولس نہیں مانتی"

کالکا نے جواب دیا "چچا! جھوٹ سچ نہ دیکھو۔ اس نے ہمارے ساتھ کونسی نیکی کی ہے۔ گواہی ضرور دو۔ بات تو ٹھیک ہی ہوئی ہے پھر پاپ پن کاہے کا۔"

سدھوا۔ ٹھیک تو ہے۔ پر وہاں تو یہ کہنا پڑیگا۔ کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں تو اس وقت وہاں تھا نہیں

کالکا۔ اس سوچ بچار میں نہ پڑو۔ سب ٹھیک ہے ایسے کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

سب گواہوں نے ویسا ہی کہا جیسا پولس نے سکھایا تھا جب سدھوا کی باری آئی۔ تب اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا جب اس سے سوال کیا گیا۔ تو وہ بولا۔ حضور! میں اس وقت وہاں نہیں بلکہ اپنے گاؤں میں تھا مجھے نہیں معلوم کس نے مارا۔ ہاں میں نے یہ ضرور سنا کہ ٹھاکر نے سودن کو گرٹ سے پٹوایا تھا

مجسٹریٹ۔ گرٹ سے پٹوایا اور خود بھی مارا۔

سدھوا۔ نہیں حضور! خود تو ٹھاکر صاحب دو ایک ڈنڈے مارے تھے۔

مجسٹریٹ۔ تم وہاں موجود تھا

سدھوا۔ نہیں سرکار! میں نے سُنا تھا۔

مجسٹریٹ۔ کس سے سُنا۔

سدھوا۔ گاؤں کے آدمی یہی کہتے تھے۔

مجسٹریٹ کو یہ بات جچ گئی۔ کہ سدھوا سچی شہادت دے رہا ہے اُنھوں نے ٹھاکر کو تین سال قید بامشقت دی۔ اور گڑ بیس کو سشن سپرد کر دیا۔

جیل جاتے وقت ٹھاکر صاحب نے سدھوا کو اپنے پاس بلایا اور روتے ہوئے کہا "میں نے جو کچھ تمھارے ساتھ کیا تھا۔ اُسے بھول کر تم نے میرے ساتھ یہ نیکی کی ہے اسے میں تاحیات نہیں بھولوں گا۔ سدھوا! تو نے غریب ہوتے ہوئے بھی یہ دکھا دیا۔ کہ دنیا میں سچے اور ایشور سے ڈرنے والے آدمیوں کی کمی نہیں بھائی! میری خطا معاف کرنا۔

سدھوا کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "مالک! بھگوان آپ کا بھلا کرے۔

سدھوا لوٹ کر گاؤں کو نہیں آیا۔ وہ شہر میں اپنے بیٹے ہی کے پاس رہنے لگا۔

دوسرے دن چندن سنگھ کا بیٹا سدھوا کے پاس پہنچا۔ اور اُس نے اُس کے سامنے ایک ہزار روپے کی تھیلی رکھدی سدھوا متحیر ہو کر بولا "یہ کیا؟

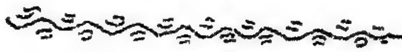
چندن سنگھ کے بیٹے نے یہ جواب دیا۔ "والد صاحب نے یہ روپے تمھیں دلوائے ہیں۔

سدھوا بولا۔" بھوا! کیا ٹھاکر یہ سمجھے کہ روپیے کے لوبھ سے میں نے سچی بات کہی رام رام بیٹا! جو کچھ میں نے کہا۔ وہ بھگوان کے ڈر سے۔ مجھے روپیے پیسے کی ضرورت نہیں۔ انھیں لے جاؤ۔

چندن سنگھ کے بیٹے نے بہت کچھ کہا مگر سدھوا نے ایک پیسہ بھی قبول نہ کیا

اس کی اس سچائی کا سبب صرف خدا کا خوف تھا۔

(ترجمہ) رام سروپ کوشل





آلام ہست و نیست سے گھبرا گیا ہوں میں
کیا جانے کیوں جہان میں لایا گیا ہوں میں

ہر لحظہ حشر خیزیوں کا بارہ دور ہے
حالانکہ گرد و پیش سے گھبرا گیا ہوں میں

خود خیر مانگتا ہوں جفاؤں کی رات دن
ایسا ہی کچھ وفاؤں سے سیر آ گیا ہوں میں

لے انتظار مرگ! مرا آخری سلام
کانوں میں کہہ رہا ہے کوئی آ گیا ہوں میں

اب اور گھر تلاش کر اے آرزوئے دید
مہماں نوازیوں سے تو گھبرا گیا ہوں میں

کیوں چین آ گیا ہے مرے دل کو یک بیک
شاید کسی کو بھول کے یاد آ گیا ہوں میں

کیا اور پیش آئیں گی مجبوریاں مجھے
پہلے ہی امتحاں میں تنگ آ گیا ہوں میں

پھر کھینچتی ہے پاؤں کی زنجیر سوئے دشت
صحرا نوردیوں سے اب اکتا گیا ہوں میں

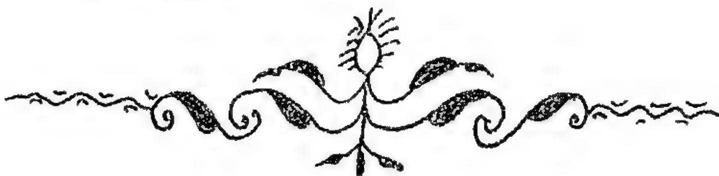
دنیا مری تلاش میں حیران ہو گئی
جب سے تری تلاش میں کھویا گیا ہوں میں

کن کن ندامتوں کا اٹھاتے ہوئے ہوں بار
کیا جرم زندگی کی سزا پا گیا ہوں میں

راہ عدم میں راہ نما کی تلاش کیا؟
سو بار اس مقام سے آیا گیا ہوں میں

اخگر! دماغ سوزیوں سے کوئی فائدہ
خود اپنے ہی کمال سے شرما گیا ہوں میں

اخگر جبرور پوری





سنہ ۱۹۱۷ء میں مجھے جونپور جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ شہر اگرچہ بہت چھوٹا ہے۔ لیکن چند تاریخی خصوصیات کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہاں کے حالات ناظرین شباب اردو کی دلچسپی کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

وجہ تسمیہ

سنہ ۷۷۲ھ میں فیروز شاہ تغلق شورش بنگالہ فرو کر کے واپس آ رہا تھا۔ کہ ظفر آباد جو جونپور سے جانب مشرق چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ پہونچکر مقیم ہوا۔ شب کو اپنے عم بزرگوار فخر الدین شاہ جوناں کو خواب میں دیکھا۔ کہ وہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ گومتی ندی کے کنارہ پر ایک شہر آباد کیا جائے اور اُن کے نام سے موسوم کیا جائے۔ چنانچہ ایک قلعہ تعمیر کیا گیا اور اُس کے گرد شہر آباد کیا گیا۔ جو "شہر جونپور" کے نام سے موسوم ہے۔

سنہ ۷۷۲ھ

اُس وقت یہ شہر علماء فضلاء کا مرکز تھا۔ مولانا محمد عوض صاحب جو زبردست عالم تھے اسی شہر میں سکونت پذیر تھے۔ اُنکو آخر عمر میں جنوں ہو گیا تھا حفاظت کی غرض سے انکو زنجیر پہنائی گئی۔ تو یہ شعر برجستہ فرمایا تھا۔

نام زنجیر و جنوں گم شدہ بود از عالم ۔ شکر للہ کہ من این سلسلہ برپا کردم

حالت جنوں میں کسی بچے نے انکو پتھر مارا جس سے خون نکلا۔ اور کسی نے تو جانا

کیا ہے؟ جواب میں فرمایا۔ ؎

از سنگ طفلاں لالہ را راست جنوں گل کردہ ایام بہار است

ان کے علاوہ ملا محمد محمود صاحب جید عالم کا وطن مالوفہ یہی شہر تھا۔ یہاں پر بہت سے مدارس تھے۔ جن میں فارسی۔ عربی اور منطق کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ اور دور دراز سے طلبہ تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔ اب بھی ایک مدرسہ حنفیہ اسلامیہ قائم ہے جسکی سرپرستی نواب یوسف علیخاں صاحب فرما رہے ہیں۔

قلعہ

دیول کرار کے مندر کو توڑ کر فیروز شاہ نے ۷۶۲ھ میں اس قلعہ کی تعمیر کی تھی چنانچہ اس کو اسی بناء قلعہ کرار کوٹ کہتے ہیں۔ قلعہ کے اندر ایک مختصر سی مسجد ہے جس کے سامنے ایک ستون نصب ہے جس پر کچھ عبارت بخط عربی کندہ ہے مگر پڑھی نہیں جاتی ہے مسجد کے سامنے فٹ بال و ہاکی گراؤنڈ بنا لیا گیا ہے۔ جسمیں مسں وہائی اسکولوں کے طلبہ کھیلا کرتے ہیں۔ مجھے بھی عرصہ تک کھیلنے کا اتفاق ہوا ہے۔

اٹالا مسجد

جے چند والئی ظفرآباد نے سمت ۱۴۱۹ بکرمی میں ایک بہت بڑا بت خانہ بنوایا تھا۔ جس کے اندر اٹلا دیوی کا بت تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے یہ بت خانہ دیول اٹالا کہلاتا تھا۔ فیروز شاہ نے اسے مسمار کر کے ایک عالیشان مسجد تعمیر کی۔ جو آجتک اٹالا مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد میں مجھے نماز پڑھنے کا بارہا اتفاق ہوا ہے۔

جامع مسجد

۸۴۲ھ میں اس رفیع البنیان مسجد کی بنا د سلطان ابراہیم شرقی نے ڈالی وجہ تعمیر یہ ہوئی کہ سات سال سے متواتر قحط پڑ رہا تھا۔ اور رعایا سخت پریشانی میں

مبتلا تھی - رات کو بھی تعمیر کا کام کیا جاتا تھا - اکثر شریف آدمی رات کو مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے -

یہ مسجد زمین سے بہت بلندی پر واقع ہے - اور نہایت وسیع ہے - اسمیں آجکل عربی مدرسہ قائم ہے - جسکا انتظام چندہ سے کیا جاتا ہے -

قبرستان شاہی

جامع مسجد کے شمال جانب قبرستان ہے - اکثر قبریں جو سُرخ پتھر کی بنی تھیں بالکل سفید ہوگئی ہیں - اور بعض بعض قبریں جنکی ہیں - جو سفید ہوتی جاتی ہیں -

پُل

یہ پُل ۹۷۵ھ میں تعمیر کیا گیا - نہایت سنگین اور خوبصورت ہے دورویہ دس دس قدم کے فاصلہ پر دوکانیں ہیں - اور روشنی کا باقاعدہ انتظام ہے پُل کے دو حصہ ہیں وسط میں مغرب جانب ایک مسجد ہے جس کے اندر ایک مجذوب بزرگ کا مزار ہے - جسمیں مسیں خوب مانی جاتی ہیں مسجد کے مقابل دارالمطالعہ ہے شہر کے روشن خیال اصحاب کا شام کو اسمیں جمگھٹا رہا کرتا ہے - یہ منظر قابل دید ہے -

اپنی سرگذشت

اس شہر میں میرا قیام تقریباً ایک سال تک رہا - اسدا اثر ہوا جگی ٹولی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیکر ٹھہرا سب کو میں اکال سفر کی وجہ سے نہایت غافل سو رہا تھا کہ میرے سر پر کسی نے گرم گرم ہاتھ رکھا میں دفعتاً بیدار ہوگیا دیکھا ایک لڑکا میں بہا سے جسکی جس کی عمر تقریباً سولہ سال کی ہوگی - میرے سرہانے کھڑی ہے - میں نے پوچھا کون ہو؟ جواب ملا - گمنام - میں نے عرض کیا کہ میں بھی ایک گمنام شخص ہوں جب کہ رکی ہوں اٹھیں سگے دلوا - نمبر و

یہ بات اگرچہ میں نے مذاقاً کہی تھی مگر اُس مہ جبیں کو نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ اور اُس نے نہایت متکبرانہ و تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ کہ بے ادب خاموش رہ۔ میں نے عرض کیا کہ سرکار آپ ناحق خفا ہو رہی ہیں۔ آخر آپ کا یہاں آنا شرافت سے دور ہے آپ ایک نامحرم کے پاس کیوں آئیں۔ اور سوتے سے کیوں جگایا۔ اُس نے کہا اچھا میں عصمت فروش ہی سہی۔ یہ کہکر نازنین یکایک غائب ہو گئی۔ پھر تو مجھ پر خوف طاری ہوا۔ اور میں آیۃ الکرسی کی تلاوت کرنے لگا۔

صبح کو دوسرا مکان کرایہ پر لیا۔ وہاں بھی چین سے سونا نصیب نہ ہوا۔ رات بھر کھٹ کھٹ کی آواز آتی رہی الغرض ایک سال کے عرصہ میں میں نے آٹھ مکانات بدل سکتے مگر کوئی ایسا گھر نہیں ملا جس میں امن ملا۔ میرے خیال میں جسقدر اس شہر میں جنوں کا اثر ہے۔ اور کہیں نہیں ہے۔

ایک عامل صاحب نے حصار کی ترکیب بتائی جس سے پھر کبھی مجھے خوف طاری نہیں ہوا اور نہ کوئی شے میرے قریب آئی۔

آیۃ الکرسی تین بار چاروں قل تین بار اور بسم اللہ الرحمن الرحیم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ گرد بر گرد حصار در حصار گردا گرد حصار بسم وصل لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلعم صم بکم عمی فہم لا یرجعون ؕ

ایک بار پڑھکر چاروں طرف دم کریں اور اپنی چارپائی کے گرد حصار کر لے۔

اسکی اجازت بغرض نفع رسانی مخلوق دیجاتی ہے۔

جب میرا خوف جاتا رہا تو میں پھر اُسی منحوس مکان میں آگیا مگر افسوس وہ [illegible] نظر نہ آئی جس سے آج تک اس قسم کی [illegible] دیکھی ہے اور نہ آئندہ کی توقع ہے۔

محمد وارث علی خاں [illegible]

شاب أُدو لاهور



ما رارياام يور

شاب اُردو لاہور



جامنوں کی سڑک



یہ کہتے ہیں رخ تاباں کا جلوہ دیکھنے والے (مرتبت) کہ ہم ہیں کفر و اسلام اک جا دیکھنے والے

جو رکھتے آنکھ کچھ حسن سراپا دیکھنے والے (راحت) خدائی دیکھ لیتے سراپا جلوہ دیکھنے والے

تیرِ صحرا مری حسرت میں یکسوئی اگر ہوتی (مرتبت) مری جانب سے [illegible] دیکھنے والے

سو صحرا مری حسرت جو کوئی [illegible] (راحت) [illegible] دیکھنے والے

ازل سے تا ابد [illegible] (مرتبت) مری ہستی کو دیکھیں ایک تماشا دیکھنے والے

کسا کس میں یہ کس بیمار کی امید آخر ہے (راحت) نگاہیں کہہ رہی ہیں [illegible] دیکھنے والے

عدم گئے اجمالی رنگ و روغن کا سرا ہے (مرتبت) [illegible] اپنی نظر کا دیکھنے والے

اگر فصل بہار آئی تو داغ [illegible] (راحت) [illegible] دیکھنے والے

سکوت بیخودی کو چھوڑ کر ہوش میں آ جا (مرتبت) [illegible] دیکھنے والے

جوانی مضطرب ہے اور خودداری [illegible] (راحت) [illegible] نظر کو [illegible] دیکھنے والے

سنبھل کر وادیٔ وحشت میں [illegible] (مرتبت) کہ ہر ذرہ میں ہیں [illegible] دیکھنے والے

کہاں رہ گئی اک بیخودی اور [illegible] کی راحت (راحت) [illegible] جلوہ دیکھنے والے

محمد [illegible] علی خاں - مرتبت
محمد [illegible] علی خاں - راحت



[illegible]
[illegible]

بہاریں جن سے ہم آغوش ہو چکی ہیں۔

میرے یہ بال جو اب کوڑے سے زیادہ سفید نظر آتے ہیں کسی زمانہ میں شب دیجور سے زیادہ سیاہ تھے۔ اور یہ جو اب حلقوں میں غائب ہوتی چلی جاتی ہیں میری آنکھیں جو اب میرے سر کے اندر دھنس گئی ہیں۔ اور جن کی بینائی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ کسی وقت ستاروں سے زیادہ روشن تھیں اور جسم جو اب ہے زیادہ خوبصورت۔ میرا قد جو اب مثل کمان خمیدہ ہے کسی زمانہ میں سرو کو شرماتا تھا۔ مگر اب۔ آہ اب۔ وہ سب گذشتہ داستانیں اور عہد گذشتہ کی یادداشتیں۔ خواب کی باتیں ہیں۔

ہاں، میں حسین تھی۔ بلا کی حسین اور میری رگ رگ میں محبت کا طوفان حسر دریا موجزن تھا۔ محبت میری زندگی کے لئے اتنی ہی ضروری تھی جتنی انسانی زندگی کے لئے ہوا ہوتی ہے۔ بغیر محبت کئے اور کئے جانے کے میں ایک لمحہ بھی نہیں بسر کر سکتی تھی میرے پہلو میں ایک ایسی ہستی کا ہونا ضروری اور لازمی تھا۔ جو میری محبت میں سرشار ہو جس کی محبت میں میں سرشار ہوں۔

جمی خوبصورت تھا۔ دلبر تھا۔ بہادر تھا سادگی سے سر تا پا حسن و اخلاق اور عشق و وفا کا پیکر تھا۔ اور اُس کی محبت کی پذیرائی میں میں نے اتنا سب کچھ اُس پر قربان کر دیا لیکن جس دن سے ہم دونوں گرجا میں عہد وفا کا ایک جا ہوئے اُسی روز سے اُس میں ایک نئی چیز ایک نئے انداز پائی رہ تا ہونے لگی۔ یہ بات نہ تھی کہ اُس نے مجھ سے محبت کرنا ترک کر دیا یا اُس کے جوش محبت میں کوئی کمی واقع ہوئی مگر اُس کے اطوار سے مجھے یہ معلوم ہو چلا کہ اس میں اجتماعی زندگی کو خوش اسلوبی سے نباہنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔ وہ دقیانوسی خیالات کا انسان تھا اور جدید تمدن کی جدت طرازیاں اُسے ایک نظر نہ بھاتی تھیں۔ اُس کی طبیعت میں ایک خلا تھی اور وہ کسی کی رائے زنی کو گوارا نہیں کر سکتا تھا اُس کو علم نہ تھا کہ اجتماعی زندگی کا راز باہمی رائے، صلاح اور گفت و شنید میں پنہاں ہے علاوہ ازیں وہ حد سے زیادہ وہم پرست اور "شکی" واقع ہوا تھا کسی شک و بدگمانی کا آجانا ہی اُس کے دل میں کافی تھا پھر دنیا کی کوئی طاقت اُس کے اس خیال کو نہیں مٹا سکتی

تھی۔ مجھے اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر بڑی سخت اذیت ہوتی تھی مگر میں بے بس تھی مجبور تھی میں اُسے زندگی میں کامیاب دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ اُس کی کامیابی میری کامیابی تھی لیکن میری نیک صلاحیں اُس کے دل پر کیا خاک اثر کرتیں۔ جبکہ اُس کا یہ مقولہ تھا کہ عورت کی کوئی صلاح عقل سے نہیں ہوتی اُس کی صلاح کو ماننا اور اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا برابر ہے۔ وہ اپنی کسی رائے کے منافی اشارہ بھی کوئی گوارا نہ کرتا وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کے نقطۂ نگاہ کے علاوہ اور کوئی پہلو بھی کسی چیز کے دیکھنے کا ہو سکتا ہے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا دماغ ہر چہار طرف سے بند ہے۔ اور بند ہے تاکہ تازہ خیالات کا گزر اس میں محال ہے جس طرح ایک بند مکان میں صاف ستھری ہوا کا گزر دشوار ہو۔ جو اُس کی صفائی کے لئے ضروری ہے۔

ہم لوگوں کا مکان آبادی سے بہت دور ایک سنسان مقام میں واقع تھا مکان کے چاروں طرف بڑے بڑے درخت احاطہ کئے ہوئے تھے قریب ہی کئی تالاب تھے۔ جو کائی اور مختلف قسم کی گھاسوں سے پُر ہو گئے تھے۔ اُنہیں میں سے ایک کے کنارے جو کسی قدر محفوظ تھا میرے خاوند نے کٹی بنا رکھی تھی جس میں بیٹھ کر ہم اکثر جنگلی بطخوں کا شکار کیا کرتے تھے۔

ہم لوگوں کے پاس کئی نوکر تھے۔ مگر ایک حبشی پہرہ دار جو میرے خاوند پر جان تک دینے کو تیار رہتا اور ایک خادمہ سگوٹی جو مجھے بہت عزیز تھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں سگوٹی کو میں پانچ سال پہلے اسپین سے لائی تھی اُسکی عمر اسوقت سولہ سال کی تھی لیکن آسودگی و خوشحالی کے باعث وہ اپنی عمر سے پانچ چھ سال بڑی معلوم ہوتی تھی۔

بہار کا آغاز تھا۔ ہم لوگوں کو سیر و تفریح اور شکار کا از حد شوق تھا قرب کے جنگلات میں ہم لوگ شکار کے کئی دورے کر چکے تھے۔ اس دوران میں ایک شخص جورف نامی ہمارے ہاں بہت زیادہ آنے جانے لگا اُس کی ملاقات ہم لوگوں سے ایک وقت شکار کے موقع پر ہوئی تھی اُس کے آنے کی کوئی خاص وجہ نہ معلوم ہوتی تھی نہ تو وہ مجھ سے بات کرتا تھا اور نہ میرے خاوند سے۔ صرف نوکروں کے پاس آکر بیٹھتا اور نشست کرکے چلا جاتا میرے

خاوند نے ایک بار دوران گفتگو میں مجھ سے پوچھا۔

"کیوں! اس عورت کے روزانہ آنے جانے کی کیا وجہ ہے"؟

"میں کچھ نہیں جانتی" میں نے سادگی سے جواب دیا۔ "شاید نوکروں سے ملنے جلنے آتا ہوگا۔"

میرے خاوند نے ایک ناگوار "ہوں" کی اور خاموش ہو گیا۔

دوسرے روز میرے خاوند نے کچھ اس انداز میں عورت سے اس کے گھر آنے کی وجہ دریافت کی کہ بیچارہ سٹپٹا کر جو نکلا تو پھر آنے کا نام نہ لیا۔ میں نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی اور بہت جلد بھول گئی۔ مگر سمجھتی تھی کہ میرا نباہ بدا یوں کچھ کھوکھلا ہو گیا جان پڑتا ہے۔

رفتہ رفتہ اس نے مجھ سے باتیں کرنا تک ترک کر دیا۔ دن بھر وہ کسی گہرے خیال میں غرق نظر آتا۔ میرے پے در پے سوالات پر بالآخر اٹھتے بیٹھتے بھی جواب دینا چھوڑ دیا۔ میں اس کے رنج و فکر کا باعث دریافت کرنے کے لیے بیتاب تھی مگر وہ اس قدر کم گو واقع ہوا تھا کہ اس سے کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف دریافت کر لینا ناممکنات میں سے تھا۔ میری زیادہ چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ نکلا کہ اس نے دوسرے کمرہ میں سونا شروع کر دیا اور میں ملاقات کے ان چند لمحات سے بھی محروم ہو گئی جو مجھے باوجود اس کی خاموشی کے ایک میسر تھے۔

ایک رات کو سوتے سوتے جب میری آنکھ کھلی تو میں محسوس کرتی کہ کوئی شخص دبے پاؤں میرے کمرے کے دروازہ تک آتا ہے اور میرے کروٹ لینے کی آہٹ پا کر الٹے پاؤں واپس چلا جاتا ہے۔ میں اکثر منگوٹی کو جگا کر جو میرے پاس ہی سویا کرتی تھی کہتی کہ دیکھو کون اس طرح چوروں کی طرح آکر میرے کمرے میں جھانکا جھوکی کیا کرتا ہے۔ یہ غریب خادمہ باہر نکلتی اور دور دور تک دیکھ آتی اور کبھی میں خود اُٹھ کر تمام گھر میں تمام دیکھ آتی کہیں کوئی نظر نہیں آتا۔

پہلے پہل میں نے بھی اسے وہم ہی محمول کیا لیکن میں زیادہ دنوں تک خود کو فریب میں نہ رکھ سکی یقینی طور پر کوئی سایہ کبھی دروازہ پر کبھی باغ میں کھلنے والی کھڑکی پر چھپا ہوا ملا کرتا تھا۔ اور میرے ہوشیار ہوتے ہی غائب ہو جاتا تھا۔ آخرکار مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور ایک دن اپنے خاوند کو میں نے اسکی اطلاع دے دی۔

میرے خاوند نے اس واقعہ کو سنکر اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور اس انداز سے گھور کر دیکھا کہ میں سہم گئی۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے اُس نے کہا۔ "کچھ نہیں پہرے والا ہوگا۔"

اور پھر وہ یک لخت اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا



ایک روز رات کو میرا خاوند میرے کمرہ میں آیا اور کہنے لگا۔

"آج کم دو تین گھنٹہ کے لئے میرے ساتھ شکار کو چل سکتی ہو۔ کہیں دور نہیں جانا ہوگا اسی باغ میں ہی ایک لومڑی روز آکر میرے جوڑے کو کھا جایا کرتی ہے۔ میرا گمان ہے کہ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد سناٹا ہو جانے کے بعد وہ ضرور نکلے گی۔"

مجھے کچھ تعجب ہوا۔ اور دل ہی دل میں میں کچھ پس و پیش کرنے لگی۔ مگر چونکہ وہ نظریں جمائے مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اور اُس کے چہرہ پر کچھ تحکم کچھ ضد کے آثار نمودار تھے میں نے کہا "کیوں؟ کیا مضائقہ ہے میں ضرور چلوں گی۔"

اس سے پیشتر میں تیتروں اور جنگلی سوروں کا شکار کئی بار کر چکی تھی اس لئے میرے خاوند کا مجھ سے شکار کے لئے اصرار کرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر جس بات نے میرے دل میں ایک خفیف دھڑکن پیدا کر دی تھی۔ وہ میرے خاوند کا غیر معمولی اضطراب تھا شام اُس نے اپنے کمرہ میں ٹہل ٹہل کر گذاری تھی صبح سے اُس نے چار بجے تک اپنی بھی میں سے نوکروں کو کمرے میں کئی بار جھانکتا دیکھا تھا مگر اُس نے جھڑک جھڑک کر ٹال دیا تھا ایک بار میں نے خود ڈرتے ڈرتے جھانک کر دیکھا تھا تو مجھے بھی اُس نے نہایت ناخوشگوار انداز میں جواب دیا کہ مجھے دق نہ کرو۔ میں ایک ضروری کام

میں مشغول ہوں۔

مجھے سیر پر چلنے کے لئے کہکر از راہ صحیح الفاظ میں حکم دیکر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ قریب دس منٹ کے وہ پھر آیا اور بولا "کیوں تم تیار ہو"

میں اٹھ کھڑی ہوئی وہ میری سویٹر خود ہی لیتا آیا تھا۔ اسے لیتے ہوئے میں نے پوچھا۔ اس میں کیا تھا اور وہ کون تھا یک بیک سناٹا؟

کچھ دیر خاموش میری جانب گھورنے کے بعد اس نے کہا۔

گولی کی کیا ضرورت، سنا ہے کہ سانپ بڑے کالے ہوں گے احتیاطاً میں نے ایک نال میں سمبل بھرلی ہے۔

اور چند لمحوں کے بعد کچھ سوچ کر مجھ سے پوچھنے لگا۔

"کیوں مستقل مزاجی تو تم میں کافی حد تک موجود ہے۔ استقلال تو نہ کھو بیٹھو گی؟"

میں بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

مجھ میں؟ مستقل مزاجی؟ کس لئے کیونکہ میں ایک لومڑی مارنے جا رہی ہوں وہ کیا چیز ہے؟"

وہ خاموش ہوگیا

ہم آہستہ آہستہ باغ کی طرف بڑھے۔ سارا گھر خواب غفلت میں مدہوش تھا۔ پورے چاند کی روشنی میں ہماری دیواریں کچھ کچھ زردی مائل نظر آرہی تھیں۔ مگر چھت پر کا سلسلہ صاف طور پر چمک رہا تھا۔ دونوں ستارے دور دور سفیدی کے دھبے نظر آرہے تھے۔ کوئی آواز اس خاموشی اور گورستانی سکون کو توڑنے والی نہ دیتی تھی نالیوں کے مینڈک خاموش تھے۔ درختوں پر پرندے خاموش تھے ہوا بھی خاموش تھی پھر بھی ایک مبہم اداسی چھائی ہوئی تھی پھر بھی تمام ماحول ٹمٹما رہا۔ جب ہم باغ کی وسط میں پہنچے تو سرد ہوا کے ایک جھونکے نے ہمارے جسموں کو لرزا دیا اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ جو سوتے سارا باغ مہک اٹھا میرا شانہ پکڑا کہ لو اپنے سکار کی دھن میں ادھر

اُدھر دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ شکاری کتوں کی طرح چوکنا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ سمٹ سمٹا کر ہر چہار طرف شکار کی بو سونگھ رہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد ہم تالاب کے کنارے ہو گئے۔

تالاب میں اُگی ہوئی جھاڑیاں گھنی تھیں۔ ایک ہلکی سی ہوا ذرہ برابر بھی اُن کے سکوت میں خلل انداز ہوتی تھی۔ صرف تالاب کے بیچ میں کسی مقام پر کوئی جانور مچھلی سر نکال کر چاندنی کو جھانک لیتی تھی۔ اُسکی اس حرکت سے پانی کی سطح پر ایک دائرہ بننا شروع ہوتا تھا۔ اور بڑھتے بڑھتے پانی کی وسعت میں گم ہو جاتا تھا۔

جب ہم اُس کُٹی کے قریب ہوئے جہاں ہم شکار کی گھات میں بیٹھنے والے تھے تو مسٹر جاوید نے پہلے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اور بہت آہستگی سے پہلے اپنی بندوق کو کھول کر بھر لی۔ اس سکوت میں بندوق کے گھوڑے کی کھٹ ہی ایک دھماکے کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے میں سر سے پیر تک لرزہ بر اندام ہو گئی۔ مسٹر جاوید نے مجھے کانپتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور بولا۔

"شاید ایسا ہی امتحان تمہارے لئے بس ہے۔ اگر تمہاری ہمت نہیں پڑتی تو واپس چلی جاؤ"

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ "ہرگز نہیں، میں ... یہاں ... کا ... آئی ہوں واپس جانے کے لئے نہیں آج ہم ... [illegible]

تمہاری مرضی" اُس نے ... اور ہم خاموش ... بیٹھ ...

قریب ایک گھنٹہ گذر گیا۔ اور اس اندھی سکوت کی خاموشی ... [illegible] اُکتا کر میں نے بہت دھیمی آواز میں دریافت کیا

"تمہیں کامل یقین ہے کہ وہ اس راستے سے ... [illegible]

مسٹر جاوید ... [illegible]

کانوں کے قریب لا کر اُس نے آہستہ سے ... [illegible]

"ہاں ... کامل یقین ہے ... [illegible]

اور وہ میری جانب نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اور ایک مرتبہ پھر وہی اگلی خاموشی طاری ہوگئی۔

مجھے پسینے کے جھونکے آنے لگے۔ اور شاید میں نیم خواب اور نیم بیداری کے عالم میں تھی۔ جب میرے خاوند نے میرا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

کیوں! کچھ دیکھا تم نے؟ درختوں کی آڑ میں۔ وہ اُدھر! میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میرے خاوند نے بغیر مجھ پر سے اٹھائے اپنی بندوق کا گھوڑا چڑھا لیا۔

اسے دیکھ کر میں بھی بغیر کسی حرکت ارادی کے گھوڑا چڑھا ہی رہی تھی کہ اتنے میں قریب بیس گز کے فاصلہ پر چاند کی پوری روشنی میں میری نظر ایک انسانی مجسمہ پر پڑی جو پیر قدم رکھتا ہوا چوروں کی طرح دبکتا دبکتا آگے بڑھ رہا تھا۔

مجھے اس قدر تعجب ہوا کہ بے ساختہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ میں مڑ کر اپنے خاوند کی طرف دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ "ٹھائیں ٹھائیں" کی دو آوازیں ہوئیں! جن کی صدائے بازگشت سے ساری پہاڑی گونج اٹھی۔ اور پرندے خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر اُڑنے لگے۔

وہ غریب جو انہی جھاڑیوں میں سے برآمد ہوا تھا۔ نیم بسمل ہو کر زمین پر لوٹ رہا تھا۔ جیسے کوئی بھیڑیا گولی کھانے کے بعد لوٹتا ہے۔

میں خوف سے بالکل دیوانی ہوگئی۔ اور زور زور سے چلانے لگی۔ ایک آہنی ہاتھ میرے خاوند کے فولادی پنجے میری گردن پر پڑے۔ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اُس نے مجھے گھسیٹ کر اُٹھا لیا اور ٹانگتے ہوئے اُس پڑی ہوئی لاش کے قریب تک لایا۔ اور پھر اس زور سے مجھے اُس پر دے پٹکا۔ کہ گویا وہ سراسر چکنا چور کر دینا چاہتا تھا۔

میں یہ بھی نہ سوچ سکی تھی۔ کہ آخر کس جرم کی پاداش میں یہ عتاب مجھ پر نازل ہو رہے ہیں کہ میرے خاوند نے بندوق کی نال میرے سینہ پر رکھ دی۔ اور گرج کر

لولا: آنکھوں —

ایک لمحہ اور - اور میرا کام ہو گیا تھا - لیکن اتنے میں کسی نے اُس کو پیچھے سے پکڑ لیا اور وہ چور لڑکھڑا کر گر پڑا۔

[illegible] ایک کونا اُٹھ بیٹھی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میری جادو [illegible] گھائل شیرنی کی طرح میرے جادو [illegible] پر سوار ہے - اور اپنے پنجوں اور دانتوں سے اُس کی مونچھیں اور رخساروں کا گوشت نوچ رہی ہے اور پھر کسی چوری [illegible] وہ [illegible] اُٹھ کھڑی ہوئی - اور [illegible] کی لاش پر [illegible] گر پڑی اور اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر [illegible] اور وحشیانہ [illegible] اُس کے مردہ لبوں اور آنکھوں کو مار مار [illegible] دینے لگی۔

میرا جادوگر [illegible] عالم میں [illegible] مار ہا - اور پھر لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا - اور میرے قدموں پر گر پڑا۔

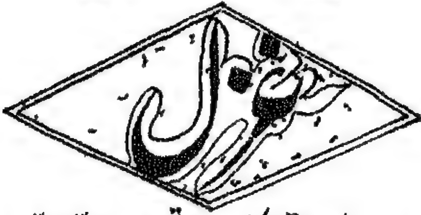
مارگٹ [illegible] ہوئی آواز [illegible] کہا میں تجھ سے کس طرح معافی مانگوں [illegible] میری آنکھیں [illegible] میری عقل [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہوں - مگر افسوس [illegible] [illegible] مارگٹ [illegible] مجھے معاف کر سکتی ہے - [illegible] میں [illegible] تو [illegible] لولی [illegible] رحم کر - اگر تو مجھے معاف کر دے [illegible] مر سکوں گا۔

مارگٹ، مارگٹ — — —

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہی [illegible] اُٹھائی۔

میں مرقع حسرت بنی اُس کشتۂ محبت حور ف، اور حسرت نصیب پیگوٹی کو دیکھ رہی تھی جو اس بے ساختہ پن کے ساتھ اپنے الوداعی بوسوں سے اُس کے مردہ جسم کو ڈھانپ رہی تھی۔

(ماخوذ) سید ممتاز اشرف قادری۔



نغموں سے بھر دیں محفلیں وقت نہیں قرار کا
رقص میں ذرّہ ذرّہ ہے دل کے ہر ایک تار کا

عشق کا ایک پھول ہے حسن کا اک مزار ہے
داغ نہیں ہے دل پہ یہ نقش ہے اعتبار کا

شعلۂ حسن دوست نے آگ لگا دی ہر طرف
بزم چمن میں جا کے آج دیکھو تو رُخ بہار کا

دردوں نے میرے دل کے پھر مل کے بنا دی اک لحد
ورنہ مٹا دیا ہی تھا تم نے نشان مزار کا

کر کے ستم کو نیم جاں جاتا کہاں ہے سنگدل
میرا بھی دل ہے منتظر تیری نگہ کے وار کا

ساقی کی چشم مست نے بھر دی ہیں اتنی مستیاں
بعد فنا ہے آنکھ میں رنگ وہی خمار کا

میرے گناہ بخش دے میری خطا معاف کر
یہ بھی تو غور کر ذرا میں ہوں تیرے دیار کا

دیکھو تو آہ سرد نے اٹھ کے یہ جا کے کیا کیا
رنگ بدل گیا ہے دل کے ہر اک شرار کا

پچھلا پہر وہ ہو گیا تارے چمک کے رہ گئے
نور بھی اب تو اڑ گیا دیدۂ انتظار کا

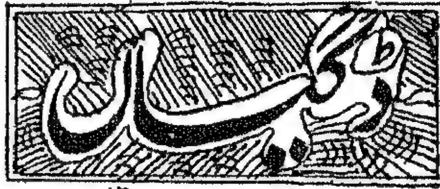
دل کی تمام قوتیں اک ہی نگاہ میں کھینچ گئیں
یہ بھی تھا معجزہ سا مرہم میں چشم یار کا

فطرتِ جوشِ دل کے ہیں کاسہ رہے ہیں لوگ کیا
یہ بھی تو اک طلسم ہے عشق کے کار زار کا

دیکھ کے وہ بھی رو دیے پھر بھی ہل کے رہ گئی
کس نے یہ رُخ بدل دیا سنگ سر مزار کا

بستۂ دل میں بجلیاں شعلے یہ اب بھی اسی ہیں
دیتا ہے ذرّہ ذرّہ لو اٹھ کے مری غبار کا

محمود علیجان عرف آغا علیجان تعلقدار



جہاں انگریزی کے بے شمار الفاظ اردو میں بے تکلفی سے مستعمل ہونے شروع ہو گئے ہیں وہاں انگریزی لفظ DIG بمعنی کھودنا نے بھی ڈگی بمعنی ڈگیاں کا اردو عامہ میں لیا ہے۔ اور اردو میں آکر اسم بن گیا ہے۔ اور کھودی ہوئی جگہ یا تالاب کے معنی اختیار کر لئے ہیں۔ پنجاب میں یہ لفظ اسم نکرہ اور اسم معرفہ ہر دو صورتوں میں زبان زد عوام ہے۔ اسم معرفہ کی صورت میں اس کے معنے واٹر ورکس مکتسر ہے۔ مکتسر سعد صحرائے بیکانیر کے مشرقی دامن پر آبادی کا ایک سیاہ دھبہ ہے۔ مذہبی اور تجارتی لحاظ نگاہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پانی تحت الثریٰ میں نظر آتا ہے۔ چودہ ہزار کی آبادی کے قصبہ میں صرف چند کنوئیں ہیں۔ جو باشندگان کی ضروریات کے لئے نہایت ناکافی تھے کھانے اور پینے کے سوا باقی تمام ضروریات کے لئے تالاب کا پانی استعمال ہوتا تھا۔

تجارتی قصبہ ہونے کی وجہ سے میونسپل کمیٹی اچھی متمول ہے۔ کمیٹی دیر سے لوگوں کی پانی کی شکایات کو دیکھتی تھی۔ لیکن دم بخود تھی کہ اس تکلیف کا کس طرح مقابلہ کرے۔ بالآخر بابو فضل الٰہی صاحب سکرٹری کمیٹی کی مساعی جمیلہ سے کمیٹی نے گورنمنٹ عالیہ سے تین لاکھ روپیہ قرض لیکر عظیم الشان واٹر ورکس بنا دیا۔ جو ڈگیاں کے نام سے معروف ہے۔ گلی کوچوں میں نلکے لگ گئے ہیں غربا بھی بافراط پانی استعمال کرتے ہیں۔ ہیضہ کا خطرہ جو ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا اب عنقا ہو گیا ہے۔

واٹر ورکس مشرقی جانب کوٹ کپورہ کی سڑک پر ۱۳ ایکڑ رقبہ میں گھرے ہوئے ہے خوبصورت باغ تیار کیا گیا ہے۔ جو راہگیروں کی کشش کا باعث ہے۔ اور ڈگیاں اب مکتسر کے لئے لاہور کا لارنس گارڈن بن گئی ہیں۔ بڑا دروازہ اکثر بند رہتا ہے۔ اس لئے بغلی دروازوں سے آمد و رفت جاری ہے۔ [illegible] داخل ہوتے ہی ایک طرح سڑک ہے۔ جو نشست گاہ تک

جاتی ہے دو رویہ پھولوں کی کیاریاں ہیں اور ان کے پیچھے درختوں کی خوبصورت باڑیں
ہیں جنکے پیچھے سے دو ہیکل گملے اپنے سر پر رکھے ہوئے راہ رَو کو سلامی دیتے ہیں ۔
داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت مجسمہ سرو گویا سنگِ مرمر سے بنا ہوا نظر آتا ہے اُس کے پیچھے
نرگس اپنی سرمگیں آنکھیں فرشِ راہ کر رہی ہے ۔ ساتھ ہی گلاب سے کامل نظر آتا ہے ۔ جس میں
مسجد او ملی جلی اور اونچا سلسلہ کرتی ہوئی سدا بہار نظر آتی ہے ۔ پھول اپنی کھلی
کھلی ہوئی آنکھوں سے آنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہیں ۔ دیگر چھوٹے چھوٹے پودوں کی موسمی
کے لئے بنائے ہیں لیکن کہیں سورج کی کرن لیکر دور تک سر اٹھائے ہوئے
دیوار سے سجا ہوا نظر آتا ہے ۔ اور ادھر سر اٹھائے کھڑا نظر آتا ہے ۔ کبھی ڈالیاں سہارا دیتی ہیں گویا
گویا دیا ہوا ساتھ ہے ۔ سر اٹھا کر ایک ساتھی کا سہارا ہی ہے اور اسی کے نظارہ جمال
میں محو ہے ۔

سبزہ گاہ میں بیچ اور کرسیاں راہگیروں کی آرام کے لئے رکھی ہوئی ہیں پاس
ہی ایک بڑا فوارہ ہے ۔ جو حوض میں چھوٹا سا ہے اور دو فوارے پھولوں کی
کیاریوں میں لگے ہیں ۔ اُن کے گرد اگرد ایک خوبصورت سبزہ زار ہے جو ہاتھ
والٹر ورکس کی انگوٹھی کا نگینہ ہے ۔ مختلف قسم کے پھول مختلف رنگوں کیاریوں میں لگائے
گئے ہیں ۔ اگر کوئی منظر دل چاہے تو چھتری کی دائرہ اسکال میں بیٹھا جا سکتا ہے ۔
درمیان میں ایک جگہ ... بہار ... کا منظر ... ہیں ۔ ...
جاتا ہے جس میں ... لئے ہیں ... اسکے سر آمد
میں سنگ مرمر کا ...
انتظام ... [illegible]
مالی جمع کیا جا سکتا ہے ۔

فواروں کے سرخ ... دو سطح ... [illegible] ... ہیں ... کا رقبہ
۵ × ۴ ... [illegible] ... جاتا ہے ... میں شہر ...
ڈالا جاتا ہے ... [illegible] ... جاتا ہے پانی

میں شفق کا نظارہ عجب دلربا ہوتا ہے۔ سورج کی دھیمی کرنیں پانی کو منور کرتی ہیں
پانی چمکتا ہے۔ ہر گاہ اس وقت ہوا پانی سے کھیلتی ہے۔ امواج تلاطم میں ہیں۔ اور سطح
آب پر ناچتی کودتی کناروں سے سر پھوڑ کر مر جاتی ہے۔ کہیں کہیں اس بحر ناپیدا میں
مچھلی بھی سر لٹکا کر ہماری دلربائی ہوا کھاتی ہے اس دلچسپ نظارے میں بہت سے پنچھی اور
شمسیر پر ناچ رہے ہیں۔ چونکہ نہر کا پانی گدلا ہوتا ہے اس لئے مٹی وغیرہ نیچے بیٹھ جاتی
ہے۔ اس میں کائی اور دوسری دریائی بوٹی پیدا ہو گئی ہے جب تالابوں میں پانی
تھوڑا ہوتا ہے۔ تو دریائی دلدل کا عجیب نظارہ نظر آتا ہے۔ صبح کو جب سورج کی سنہری
کرنیں سطح آب سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ تو سورج کا سنہری تھال پانی میں عجب بہار دیتا
ہے۔ اور یہ عکس آنکھوں کو خیرہ کئے ڈالتا ہے۔ انجن ہاؤس کے پاس ایک کنواں ہے
جس کی سطح تالابوں کی سطح سے نیچی ہے۔ نلوں کے ذریعہ تالابوں کا پانی خود بخود اس کنویں
میں آجاتا ہے۔ یہاں سے پانی کو انجن دوسرے تالابوں میں پھینکتا ہے جس کو
"پانی سول ٹینک" کہتے ہیں اُن کے مغرب میں پانی صاف کرنے والے
تالاب بنائے گئے ہیں جن کی سطح بہت نیچی ہے۔ اُن کو "فلٹر ٹینک"
کہتے ہیں۔ اونچے تالابوں سے پانی خود بخود نالیوں کے ذریعہ نلکیوں میں آجاتا ہے۔ یہاں پانی
صاف ہوتا ہے۔ اور ایک مخصوص تالاب میں جمع ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے انجن اٹھا کر اونچی
ٹانکی میں ڈالتا ہے۔ یہاں سے شہر میں [illegible] اتارا جاتا ہے۔ اونچے تالابوں کے پاس
ایک عجیب و غریب مشین ہے۔ جس کو "سینڈ واشنگ مشین" کہتے ہیں۔
اس سے مقطر کرنے والے تالابوں کی ریت کو صاف کر کے چکنی مٹی وغیرہ علیحدہ کی جاتی ہے جب
ریت بالکل صاف ہو جاتی ہے [illegible] خاص قسم کی [illegible] اور [illegible]
کے ڈھیروں کے لئے بہت خرچ کرنا پڑتا ہے

مستقبل میں وسعت دینے کا خیال رکھ لیا گیا ہے۔ دونوں بڑے تالابوں کے بیچ
میں باہر کی چار دیواری کے ساتھ [illegible] والی سڑک کے سرے پر ایک وسیع
قطعہ چھوڑا گیا ہے۔ جس میں نئے تالاب اور [illegible] پانی صاف کرنے کی [illegible]

اس جگہ پھولوں اور گھاس کے قطعات اور ٹینس گراؤنڈ ہے۔ یہاں شام کو اچھی رونق رہتی ہے دروازہ کے پاس مغرب کو کارکنان کے مکانات ہیں جن کے سامنے سنتروں کی اونچی باڑ ہے جس کی بھینی بھینی خوشبو سے ہوا معطر رہتی ہے۔ یہاں انگوروں کی بیلیں اور دیگر سبزی وغیرہ لگائی گئی ہے۔ پاس ہی ایک پودینہ کا تختہ ہے۔

ڈگیاں ملکہ سر کے لئے ایک نہایت اعلیٰ اور دلچسپ سیرگاہ ہے موسمی پھولوں کی ہر وقت بھرمار رہتی ہے۔ گویا یہ جگہ کبھی خزاں نہیں دیکھتی۔ ہمیشہ بہار رنگارنگ جلوہ فگن نظر آتی ہے۔ اور ایک عجیب مستی کا سماں چھایا رہتا ہے ہوائیں فواروں سے کھیلتی ہیں تو دل و دماغ میں فرحت و انبساط کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور معصوم دل بھی غنچہ کی طرح کھل جاتا ہے زائر بھٹک جاتا ہے۔ لیکن نگاہ نہیں تھکتی۔ اور وہ برابر اس دلکش منظر کے لوٹے لئے جاتی ہے۔ پھولوں پر کچھ اس قدر نکھار ہے کہ خار بھی حسین نظر آتا ہے۔ کچھ فاصلہ سے ریل رینگتی ہوئی گذرتی ہے۔ ریل کے انجن کا شور و غل مقامی انجن کے نغمہ مختصر جیر میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ مگر ریل کا گذرنا اس نظر خیز منظر کی شان کو بڑھا دیتا ہے۔

شیخ محمد عبدالرحیم بی اے

ملفوظات ابوالقاسم میر کرامت اللہ

انوکھا رنگ لیے آئی سحر آہستہ آہستہ — کیا اُس نے حجاب اندر حجاب آہستہ آہستہ

کہوں کیا کس طرح سحر کی نقاب اُس نے رخ سے — اٹھائی اس طرح جیسے آفتاب آہستہ آہستہ

مرے آتے ہی ادھر دل ہو رہا ہے حیرانی سے — [illegible] حجاب حیرت آہستہ آہستہ

اولوالعزم ہو کہ رہ میں تو وہ آسودگی [illegible] — چلا چل ہو رہے گا کامیاب آہستہ آہستہ

تحمل ہی تحمل [illegible] — کہ صدا [illegible] آہستہ آہستہ

عبث سر پر ہوا ہے مغز میں پھولا سمایا ہے
نکل جائیگی پھونک اک دن حباب آہستہ آہستہ

کہاں تک اس ہوس کی بار برداری کئے جائیں
لگی ہے زندگی دینے جواب آہستہ آہستہ

بتاں مصحف رُخ کا اگر کچھ دھیان ہے دل میں
پڑھا کر رات دن ام الکتاب آہستہ آہستہ

ملمع سازیاں اے میر سب دھوکے کی ٹٹی ہیں
یہ اُڑ جائیگا رنگ خضاب آہستہ آہستہ

میر کرامت اللہ میر



(گذشتہ سے پیوستہ)

دوسرے دن جب تسلی ہوگئی۔ کہ سانپ نہ تھا۔ تو نواب صاحب چپر کھٹ سے اٹھے اور دیوان خانہ کی طرف چلے۔ مگر کوئی دس قدم گئے تھے۔ کہ چھینک پڑی اور اُلٹے قدموں پھر لوٹ آئے اتنے میں بڑی بیگم کو کسی نے خبر کر دی کہ اچھے نواب باہر جا رہے ہیں فوراً بوکھلائی ہوئی ہوئے کمرے میں آموجود ہوئیں۔ پہلے تو باہر جانے سے منع کرتی رہیں۔ لیکن جب اچھے نواب نے کہا کہ امی جان تم ناحق ناحق ڈرتی ہو آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے وہ تو بالشت بھر کا سانپ تھا۔ خاک چاٹ کر کہتا ہوں اگر چاہوں تو دم بھر میں اژدر کے گلے چیر کر دھر دوں۔ میں خود حیران ہوں کہ میں یہاں آ کیوں گیا۔ چھوٹی بیگم پاس بیٹھی تھیں مسکرا کر بولیں۔ میں سمجھی ہوں تمہیں سانپ پر رحم آگیا۔ اس لئے دیوان خانہ اُس کے سپرد کر کے یہاں چلے آئے۔ بڑی بیگم نے بگڑ کر کہا کہ اے او دلہن کبھی کسی کی سانجھی کرو۔ آخر میں نے جو ڈانٹا ہو تب میں سعید نہیں کیا۔ کئی بار تمہیں سمجھا چکی ہوں کہ کیڑے کا نام نہیں لیا کرتے۔ اُس کا ذکر کرنا ہو تو رسی کہکر مطلب سمجھانا چاہئے۔ چھوٹی بیگم نے ہنسکر کہا کہ امی جان سچ کہتی ہو۔ وہ بھی رسی تھی۔ یہ فقرہ سنکر نواب صاحب بہت ہی جھینپے

[illegible] لگے۔ [illegible] بیگم سے [illegible] کا روپیہ [illegible]۔ اور کہا [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] میں [illegible] بیگم [illegible]
[illegible] اور [illegible] گھر [illegible] گئے۔ اور [illegible] جھک کر
آداب [illegible] سلام کئے۔
[illegible]
[illegible]
[illegible] آداب [illegible]
[illegible] آ [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] ہوگا [illegible] آپ [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] اللہ [illegible] آ [illegible]
[illegible] کسی
[illegible]
[illegible] ہوگا
[illegible] اور [illegible] یہاں [illegible] لگا وہاں
[illegible]
[illegible] اور [illegible] اگر [illegible]
[illegible]
[illegible] ہزار [illegible]
[illegible]

شیخ سعدی کی بات دل سے

کہ سوئے شتر سے مار کو حذر ہے

غرض میر صاحب استاد کو اشاروں میں کچھ سمجھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔
میر صاحب کے جانے کے بعد نواب صاحب چاندی کی گٹری گٹری کر گڑ گڑانے لگے۔
اور میر صاحب جو بیان ہوا نہار تواتے لگے جو جاتے جا رہے ہیں اور نواب صاحب
اس طرح کل دو سال ہو گئے۔
نواب ا ساعالی ہو گئی ہم نے میر صاحب سے یہ کہا کہ کیسے کی حال جانیں اور ملی
لی سال ایک
مرزا (کبوتر آسمان کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر) واقعی اس وقت غلام کو بھی خیال آتا
تھا کہ میر صاحب نے جیسا دور آنکھوں سے دیکھا ہے
میر وہیں ہے وہ طاق ، کہیں گیا نہیں آتا
سو اب ایسا ہے کہ وہ شہر وہ جاگیر میں اس جگہ کوئی آدمی بھی نہیں دیکھے گئے۔
مرزا۔ مہربانی ہے جو حضور کا دربار ہے حضور بادشاہوں کی اولاد ہیں۔
یہاں ایسے ہی خدا کا کام ہے۔ اس دربار میں تو وہی دخل پا سکتا ہے۔ جاگیر
کو ٹھیک اٹھا سکے۔ وہ جانتے ہیں کہ مرغ اڑا
سکے۔ بلکہ اڑا سکے۔ اور فلسفہ کا آدمی ملنا کوئی حالہ کی بات نہیں۔ حضور
تو پرستار ہیں۔
نواب صاحب سمجھ گئے کہ کوئی ہے اور مرزا کو کہا کہ اسی دم مرزا کو
ریشمی انعام دیتا ہوں۔
مرزا۔ (آداب بجا لا کر) حضور فرما رہے ہیں۔ ہم حاکم ہیں۔ مجھ جیسوں اور
ہاروں دو ماہ ہیں مگر چھوٹ موٹ دوکر اچھے ہم
نواب۔ میں آپ ہی رو رہے ہیں؟
مرزا۔ حضور حضور ۔ کچھ نہیں۔

شیخ جہاں ۔ قربان جاؤں حضور سے پوچھئے مرزا صاحب بہادر شاہ کے خاندان ہی میں سے ایک بار ان کا شجرہ نسب دیکھا تھا ۔ افسوس کہ یہاں سے وہاں چوری ہوئی تو وہ بھی جاتا رہا ورنہ حضور دیکھ کر حیران ہوتے ۔ آپ اور سب اسی کی اولاد سے ہیں سوداگروں سے آپ کا رشتہ نہیں تھا ۔ اسے یاد رکھیے بادشاہوں اور سلاطین ہر جہاں اُن کا خاندان رہا تھا ۔ گردش زمانہ انہیں یہاں لے آئی ہے ۔ ورنہ انہیں اقبال کا زمانہ یاد آتا ہے ۔ تو سب اختیار آپ کو مل گئے ہیں اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں ۔

نواب ۔ "کہو کہو"

شیخ جہاں ۔ یہ فقیر بھی جو اس وقت کسی سلیقے حضوری میں موجود ہے ۔ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے ۱۲ پشت ۲۰ نسل سے میرے جد امجد کا مہاراں کا سسر تھا اور شیخ مبارک میرے جد امجد کے ہم زلف تھے ۔

کالیداس ۔ اور یہ ایک خاندان اولاد چنگیز خان ہے ۔

نواب صاحب ہنس رہے تھے ۔ اور اُن کے مصاحب جی ہاں جی ہاں کئے جا رہے تھے ۔ کہ یکایک بازار میں شور مچ گیا ۔ نواب صاحب نے گھبرا کر کہا کہ بھئی یہ غل شور کی آواز کیسی ہے ۔ خبر لو ۔ آخر ماجرا کیا ہے ۔ مرزا جی آپ سلطانوں کی اولاد ہیں ۔ ذرا لپک کے جاؤ اور دیکھو بات کیا ہے ۔ کیا فساد آ ہوا ہے یہ کیسی کھلبلی مچی ہے ۔ یہ سنکر مرزا جی کی روح فنا ہو گئی ۔ بیچارے منحنی آدمی تھے ہاتھ پاؤں بہت چکرا گئے ۔ ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضور جس کا کام اُسی کو ساجے ۔ اس کام کے لئے خان صاحب بہت موزوں ہیں ۔ کیا عجب کہ چنگیز خان کی اولاد ہیں ۔ اور یوں تو بندہ درگاہ بھی عالم شباب میں سر کو ہتھیلی پر رکھ کر بھاگتا تھا ۔ اور بس ہاتھی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیتا تھا ۔ اب بال پک گئے ۔ سر کمان ہو گیا ۔ ع

وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

کالے خاں نے جب دیکھا کہ مرزا جی اسی لڑائی کے سر ڈالتے ہیں اور بہت بگڑے ہیں تو ملال ختم ہو گیا۔ طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے اٹھے۔

مرزا جی ۔ واہ رے میرے شیر شاباش اب ذرا اصفہانی سنبھال لیجئے اور کٹار باندھ کر اونچی سڑک پر سیدھا جائیے۔ اور فوراً اسے دیکھ کے آ کر اطلاع دیجئے کہ یہ فساد کیسا ہے کہاں دنگا ہو رہا ہے اور حضور اپنی جان سے تو میں اس قابل ہوں، انہوں نے جوان اور ملاؤں اس میں انگریزی میں ہمت ہے تو آئیے میدان میں نکلے تم ہی ہو حضور کے نمک کی کہ ایسی ادوں پلاؤں کہ تم حشر تک سلامت رہیے۔

کالے خاں دل ہی دل میں مرزا جی کو کوستے ہوئے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بازار میں کہیں سے پاگل کتا آ گیا تھا لوگوں نے لاٹھیاں مار کر مار ڈالا ہے جب تسلی ہو گئی کہ کتا مر گیا اور میدان صاف ہے تو آگے بڑھ کر تلوار سے مرے ہوئے کتے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور پھر اس کی دم اور سر جدا کر کے ہاتھ میں دبا کر اکڑتے ہوئے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا حضور ایسا

وہ کام کیا میں نے جو رستم سے نہ ہو گا

(ربانی بائی) منجانب ایڈیٹر (خان احمد حسین خان)



جب راجہ اُدین وتس یعنی الہ آباد میں راج کرتا تھا۔ تو اُس کے منتری یوگندرائن کی بڑی آرزو یہ تھی۔ کہ کسی طرح اس کا راجہ سرب بھومی راج ہو جائے۔ آخر ایک رشی نے اُس کو بتایا کہ لنکا کے راجہ وکرم باہو کی ایک بیٹی ہے۔ جس کا نام رتناولی ہے وکرم باہو تمہاری مہارانی واسو دتا کا ماموں ہے۔ اگر راجہ اُدین کی شادی رتناولی سے ہو جائے تو وہ سرب بھومی راج ہو سکتا ہے۔

سکندراد ن نے جھک کے اپنی سلوان بھیجا ہے۔ راجہ کرم امیت اُس کی
بڑی خاطر تواضع کی۔ مگر تیّ کو بھاگی کی سوکن بننا منظور نہ ہوا۔ سکندراد ن کی بیٹی بھی
اسامی بھاؤ ر سے لنکا میں بہتر سہو رکر دی گئی رانی وہ بدنامی کے ساتھ لنکا گئی
تھی۔ اور رانی جلکر خاک ہوگئی۔ کرم ماہو کو غش آگیا۔ اس انکار کی کوئی وجہ تھی رساولی
اُس کی اکلوتی بیٹی تھی اس لئے سب۔ ماتھے پر جھومر، کانوں میں موتیوں کی مالا تھی جس کا
ایک ایک دانہ ایک سلطنت کا خراج تھا۔ راجہ کا ملازم جاسوس واسو ناگ رساولی
کو لنکا جہاز میں سوار ہوا۔ راہ میں طوفان آگیا اور جہاز جس میں رانی سوار تھی ڈوب
گیا۔ مگر رانی بچ گئی۔ جس وقت وہ سمندر کے کنارے تھی۔ اتفاق سے ایک سوداگر
کا جہاز اُدھر آنکلا۔ اُس نے رساولی کو اپنے جہاز پر بٹھا لیا اور جب اُس کا حال
معلوم ہوا۔ تو اُسے سکندراد ن کے پاس لے گیا سکندراد ن نے رانی رساولی کو مہارانی
واسو دتا کے سپرد کر کے کہا کہ۔ لڑکی کل وہ سو رہے گی اسے گھر کی معلوم دیتی ہے
اسے ہم اپنی داسیوں میں رکھ لو واسو دتا نے مان لیا اور رساولی کا نام ساگر یکا رکھا ساگریکا
کے چہرے کی چمک دمک سے رخ تو مہرمار رہی تھی اس لئے واسو دتا نے راجہ کی نگاہ سے
بچا رکھی تھی۔ اتفاق سے ہولی کے دن جب مہارانی واسو دتا کے واکھی کی پوجا
کر رہی تھی۔ ساگریکا ایک درخت کی آڑ میں کھڑی تھی۔ سنا تو اس نے راجہ کو دیکھا
سمجھا کہ سماجا شاید آکر کیا اُچھا ہے۔ تو اُسے معلوم ہوا کہ جسے وہ دیوتا سمجھی تھی
وہ راجہ ادین ہے۔ اور اس سے اُس کی شادی قرار پائی تھی۔ ادین راجہ کی شکل
رساولی کے دل میں بس ہوگئی۔ اور وہ ہر وقت اُس کے خیال میں بیتاب رہنے لگی۔

ایک دن ساگریکا سیلی کے جھنڈ میں راجہ کے خیال میں تصویر کھینچ رہی
تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتی ہے کہ اس تصویر کے مقابلہ میں ایک اس کی تصویر
ساد آں ہے وہ حو ... کی حالت میں تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ایک اور کنیز جس
کا نام سوسنگتا تھا۔ وہاں آئی ساگریکا کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ اور تصویر ہاتھ میں لیکر
بولی دیکھوں تو کس کی تصویر بنائی ہے۔ ساگریکا نے کہا اری دیوتا ہیں جن کی آج

پوجا ہو رہی تھی۔ وسنتکا سے کہا کہ دیکھو مہاراج اکیلے گھبرا رہے ہوں گے اُن کے ساتھ دیوی کی تصویر بھی ہونی چاہیے۔ یہ کہا اور اُس نے پہلو میں ساگریکا کی تصویر بنا دی۔ یہ حال دیکھ کر ساگریکا کو شرم سے پسینہ آگیا اور اُس کا چہرہ کنول روپ ہو گیا پھر باتوں باتوں میں وسنتکا نے ساگریکا کے دل کا مقصد معلوم کر لیا۔ اتفاق سے اُس وقت شور ہوا کہ طویلے سے ایک بندر چھوٹ کر رنواس میں گھس رہا ہے۔ جو اُس کے سامنے آتا ہے اُسے نوچ لیتا ہے۔ یہ سنکر دونوں سہیلیاں گھبرا گئیں تصویر کو وہیں چھوڑ بھاگ کھڑی ہوئیں اور دُور کھڑی ہوکر تماشا دیکھنے لگیں۔ راجہ کے ندیم وسنتک بھٹکتے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے انھوں نے سمجھ رکھا تھا کہ آج ہم وہاں مال لیکر یہاں کے حسب ہاتھ لگے تو چمپیلی کے اس جھنڈ میں ہم لینے کے لیے جا بیٹھے۔ راجہ بھی ساتھ تھا پیاسا ہوا پہنچ گیا دراصل یہ ال لگی تھی۔ بندر کو پانا چاہتے تھے۔ مگر بانہ بندر چھوٹا تو رنواس ہی میں آیا۔ وسنتکا نے راجہ کو دیکھا تو جان میں جان آئی اور اوسان درست ہوئے تو سامنے کو دیکھ بیٹھ گئی۔ اور راجہ کو دکھائی۔ راجہ رتناولی کی تصویر دیکھ کر بہل آئینہ حیران رہ گیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اُس وقت وسنتکا آگے بڑھی اور کہنے لگی۔ کہ مہاراج میں نے بڑے جتن سے ابھی پہلی ساگریکا کی تصویر بنائی ہے وہ اُلٹا مجھ سے بگڑ رہی ہے اب سرکار ہی بیچ بچاؤ کرادیں۔ راجہ اور وسنتک سہیلیوں کی صلح کرانے چلے۔ ساگریکا کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا اور اُسے دیکھ کر وسنتک کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ چلا کر بولا "اس کے ہاتھ میں اس کیا حیران ہیں یہ اُس روپ سندری پر ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے اور یہ بنائی ہوئی تو ہیروں اشرفیاں تلے رہتے ہوں گے۔ مہارانی نہ دیوی بھی کو دکھائی دی۔ ہے اور برہمن کا پیٹ بھی خالی ہے کہیں تو بھوجن کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ ساگریکا نے چاہا کہ وہاں سے چلی جائے مگر پاؤں سو گئے اور راجہ کے ہزاروں سوالوں میں سے ایک کا بھی جواب نہ دے سکی یکایک رانی واسو دتا وہاں آگئی اور راجہ کے اشارہ سے وسنتک نے تصویر بغل میں چھپالی مگر تھوڑی دیر تک جدا جدا سے سوال ہے۔ ورتوس میں آکر ... اٹھاتے

تو وہ میں پر گر پڑی اور ایک داسی نے اٹھا کر رانی کو دے دی۔ اپنے سر تاج کے پہلو میں ایک تصویر اسی کی دیکھ کر رانی آگ بگولا ہو گئی۔ ترچھی نظر سے راجہ کو دیکھا اور وسدھک کو گھورنے لگی۔ مگر اُس نے جو سادہ لہجہ میں کہا۔ مہارانی آپ نے دیکھا سرکار کا ہاتھ کسقدر صاف ہو گیا ہے۔ ایسی تصویر کیا ساری اُتاری ہے۔ رانی نے کہا۔ یہ دوسری کون ہے۔ جو اُن کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ وسدھک نے جھپٹ اسے ہاتھ میں لیکر کہا مہارانی جی یہ تصویر خیالی ہے۔ اگر آج سے پہلے ایسی شکل دیکھی ہو۔ تو دیدے پھوٹ جائیں۔ رانی ساگریکا کو تو کہاں گئی مگر اُس وقت چپ ہو رہی۔ یا اپنی ہمراز کنیز دل سے مشورہ کر کے یہ تجویز کی کہ وسدھک سے کہا جائے کہ ساگریکا رانی کے کپڑے پہن کر پھولوں کے پچھلے حصہ میں راجہ سے ملنا چاہتی ہے۔ یہ چال پوری اتری۔ راجہ اس بات پر راضی ہو گیا جو جگہ ملاقات کی مقرر ہوئی رانی وہاں پہلے ہی پہنچ گئی۔ راجہ آیا اور رانی کو ساگریکا سمجھ کر محبت کا اظہار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تو رانی چپ سنتی رہی۔ آخر اُس نے گھونگھٹ اٹھایا۔ اور راجہ کی آنکھیں کھلیں۔ رانی بغیر بولے چپکے سے چلی گئی راجہ اُسے منانے کو ڈھونڈنے لگا۔

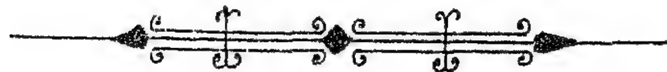
ادھر ساگریکا کچھ ایسی کٹ گئی کہ خودکشی پر آمادہ ہو گئی۔ اُس نے دوپٹے میں گرہ دیکر اُسے پیل سے لٹکا دیا اور گرہ میں گردن ڈالنے کو تھی کہ راجہ رانی کو ڈھونڈتا ادھر آ نکلا اور ساگریکا کو رانی سمجھ کر منانے لگا۔ پھر جب سمجھ گیا کہ وہ ساگریکا ہے تو پھر سر کا رُخ اُس کی طرف بدل دیا۔ رانی ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہوئی سن رہی تھی سامنے آ گئی اور یہ کہکر کہ مہاراج جو کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں۔ غصہ میں بھری ہوئی وہاں سے چلی گئی اور ساگریکا بھی کافور ہو گئی۔ اب راجہ حیران تھا کہ ساگریکا کو رانی کے غصہ سے کس طرح بچائے۔

صبح جب وسدھک منہ لٹکا کر راجہ کے پاس آیا تو راجہ نے پوچھا ساگریکا پر کیا بنی۔ وسدھک نے منہ ڈھیلا کر کے اور روتی صورت بنا کر کہا۔ بس کچھ نہ پوچھئے لٹیا ڈوب گئی۔ راجہ سمجھا کہ ساگریکا چل بسی۔ اور اُسے غش آ گیا۔

وسنتک کی کوشش سے جب اُسے ہوش آیا۔ تو وسنتک نے کہا کہ آپ ہر کام میں جلد باز ہیں۔ آپ یوں ہی بے صبر ہوتے ہیں۔ ساگریکا کو رانی نے اپنی بہن سمجھ لیا ہے۔ اور یہ مالا مجھے دی ہے۔ کہ ساگریکا آپ کے لئے چھوڑ گئی ہے۔ راجہ مالا دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ اُسے چوما آنکھوں سے لگایا۔ اور پھر گلے میں ڈال لیا۔ اتنے میں اچانک ایک جادوگر آگیا۔ جو بھان متی کے کھیلوں میں بے نظیر تھا۔ اُس نے کہا۔ مہاراج! اگر آپ کہیں تو چاند زمین پر اتر آئے۔ پہاڑ ہوا میں اُڑنے لگیں سمندر میں آگ لگ جائے۔ سورج چاند ایک ساتھ نظر آئیں۔ کہئے تو وہ سامنے آجائے جس میں آپ کا من بسا ہوا ہے۔ راجہ نے رانی کو بھی بلا لیا۔ اور تماشا شروع ہوا۔ برہما کنول پر سوار ہو کر آئے۔ اندر سفید ہاتھی پر بیٹھے ہوئے اپنے دربار کے ساتھ دکھائی دیئے۔ اتنے میں وکرم باہو کے نوکر واسو بھوتی کو لے کر آئے۔ جو رتناولی کی طرح سمندر سے زندہ بچ نکلا تھا۔ تماشا ختم ہوگیا تو واسو بھوتی نے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کی۔ ابھی شروع کی تھی۔ کہ شور مچ گیا کہ رنواس میں آگ لگ گئی۔ یہ سنکر رانی واسودتا بے تاب ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔ مہاراج میں ساگریکا کو ایک کوٹھری میں بند کر آئی تھی۔ اُس کو کسی طرح بچائیے۔ ورنہ میں اپنے کئے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ راجہ شعلوں میں گھس کر ساگریکا کو نکال لایا۔ یہ آگ کا شعبدہ تھا۔ اور یوگندرائن کے کہنے سے جادوگر ہی نے لگائی تھی۔ اب ثابت ہو گیا کہ ساگریکا دراصل رتناولی ہے۔ اتنے میں یوگندرائن بھی آگیا۔ راجہ اُس سے بگڑنے کو تھا۔ کہ وسنتک کی باتوں سے سب ہنس پڑے۔ واسودتا بھی مان گئی۔ اور راجہ کا بیاہ رتناولی سے ہو گیا۔

رسول

(ترجمہ)



کلام زاہدہ

(مس زاہدہ خاتون زاہدہ لکھنوی - دختر محمد ارتضا علی صاحب ارتضا لکھنوی

(خاص شباب اردو کے لئے)

معائنہ ہے رخ پہ نہ پردہ نقاب کا ظالم کہیں چھپا ہے فروغ آفتاب کا

ہوگا فضل اب تو زمانہ حجاب کا لو جوش پر آگیا ہے زمانہ شباب کا

ماتم ہے ہر طرف دل خانہ خراب کا شہرہ نہ کیوں ہو آمد فصل سحاب کا

کیا تھا بنے ابتدا میں ہو کیا رنگ اے فلک جب ابتدا میں حال یہ ہے اضطراب کا

ہونے تو دو ابتدا میں ابھی انتہا کی کچھ کیا نام تھا دل خانہ خراب کا

دیوانہ بنا دیا ہے مجھے اس نگاہ سے حسرت سے تک رہا ہے تشنہ سراب کا

پیدا ہوئے اداؤں میں ظلم و جفا کے طور نزدیک آگیا ہے زمانہ حساب کا

اے شیخ جی کلام سے سنبھلے رہیں ذرا اٹھتا ہے روئے دوست سے پردہ حجاب کا

[illegible] کم امید و انتظار ہے خط کے جواب کا

ظاہر ہے [illegible] نظام دہر نشانہ دل ہوا ہے ستم انقلاب کا

اس سادگی لباس سے ظاہر ہے زاہدہ

عالم ہے چرخ پر کو اسی سحاب کا

نیرنگ دنیا

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

۳

پہلے چھ سال گذر گئے بہار کے بعد موسم خزاں بھی آیا - رُت تبدیل ہو گئی

موریور کے انزار کا حصہ





قلعہ کانگڑہ کے مندر کی سیڑھیان

تساب اردو لاہور

تساب اردو



ہوریورکابارار

درخت عریاں ہو گئے۔ موت کا بازار گرم ہو گیا۔ گلشن برباد ہو گیا۔ لیکن یہ سماں آخر ٹل گئیں مگر
پھر موسم بہار نے اپنا تسلط جمایا۔ کھیت سرسبز ہو گئے۔ باغوں میں عجب دلچسپ سماں
نظر آنے لگا۔ دلوں سے غم و الم یکسر نابود ہو گئے۔ ہر طرف اطمینان و سکون تھا مسرت
و طمانیت کی لہریں لوگوں کے دلوں میں موجزن تھیں

امتحان بفضل خدا نے اسے پاس کر لیا تھا اور تعطیلوں میں والدین سے ملنے آیا
ہوا تھا۔ ظہیر و ثروت آرا بیگم چاہتے تھے کہ پرسکون زمانہ اور ایسی مبارک گھڑی میں ان
لوگوں کی دلی آرزو سے بڑی تھا اپنے اکلوتے چہیتے بیٹے کی شادی کے چند مراسم
ادا کر دیئے جائیں۔ نکہت آرا کا مورث سے ملالی گئی۔

میر ظہیر حسین نے نکہت کے چچا کو بذریعہ تحریر ان امور کی اطلاع دی۔ وہ بھی
آئے وہ اپنی گذشتہ غلطیوں کی وجہ سے سخت نادم و شرمسار تھے۔ جہالت سے معافی
چاہی۔ شریف تھا و بزرگ دلی خاندان ہونے کے نکہت کو اپنے مکان لے گئے اور دونوں
طرف سے منگنی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

میر ظہیر حسین ان لوگوں میں نہ تھے۔ جو حق کی آڑ میں ہر طرح کا ظلم کرنا روا رکھتے
ہیں۔ بلکہ میر صاحب کو اس نے زمانہ قدیم سے کمال ہمدردی تھی۔ وہ اپنی نو عمر حسین عقلمند
بھائی کا مزاج پہچانتے تھے۔ گو خاندانی کے خیال سے رسم زمانہ کے خلاف کرتے ہوئے
ثروت آرا بیگم کو کسی قدر تامل تھا۔ مگر میر صاحب نے یہی کہا کہ ارے دیتے سرلعب اُسے
حق حاصل ہے۔ میں لوگوں کی پروا نہیں کرتا جو گوئی سے گریز کرنا قابل تعریف روش ہے
میاں اعجاز کی رائے بذریعہ خط میں لی ہے۔ نکہت کی بھی مرضی اُس کی سہیلیوں
کے ذریعہ معلوم کر لو۔ اس لئے شہر کے گھرانوں میں اس ہونے والی تقریب کا چرچا ہونے
لگا۔ جس میں جانبین کی رضامندی خاص طور سے ملحوظ رکھی گئی تھی۔ ایک روز ثروت آرا
بیگم معہ چند رشتہ دار خواتین کے جب سلاح گئیں نکہت کی چچی اور اُن کی بہو بیٹیوں
نے نادر خانہ مستورات کی ہال میں مکلف فرش پر لا کر بٹھایا۔ ثروت آرا بیگم کے خاطر و مدارات
تعظیم تکریم میں کسی قسم کی فروگذاشت نہ کی گئی۔ نہ بھی ہر ایک سے نہایت خلق و انکسار۔

سیر میں جس سسرال والوں کو آج معلوم ہو گیا کہ سروت آرا بیگم کس شان کی بی بی ہیں۔ وہ عورت نہیں حور ہے۔ بیگم نہیں فرشتہ ہے۔ سب کو کھلانے کے بعد حسنہ بیگم اُن کو دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ یہاں اُن کی ننھی بھابی یا ہونے والی بہو سر جھکائے ہوئی بیٹھی تھی۔ گو اُن کے قدیم دستور کے مطابق ممکنت آرا کو زیور وغیرہ اُس وقت نہیں پہنائے گئے تھے۔ وہ صرف ہلکی آسمانی رنگ کی ریشمی ساڑھی اوڑھے عجب شرم و ادا سے گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کا معصوم اور نازنین اُس سے دلفریب خط و خال اُس کی بھولی بھالی صورت عجب سماں دکھا رہی تھی۔ وہ سادے سادے لباس میں بھی حسین و مہ جبیں معلوم ہوتی تھی کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر رنگ میں وہ حال خط و خال جس رخ روشن سارا

جیسے آفتاب ہلکے ابر کے نقاب میں آ جاتا ہے اُس کی روشنی چھپی نہیں رہتی اسی طرح باریک ریشمی گھونگٹ کے اندر سے اُس کے صاف شفاف رخسار درخشاں تھے سروت آرا بیگم نے ہونے والی بہو کو گلے لگا کر پیار کیا۔ پھر جڑاؤ طلائی کنگن جو کہ اس خاندان در خاندان بہوؤں کو دیے جاتے ہیں۔ ممکنت آرا بیگم کے پہنا دیے۔ اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیے۔ مبارک باد کے نعرے لگائے گئے۔ سب نے باری باری پیار کیا ؎

گلشن میں آج کس کے ہے شادی رچا ہوا
پھرتی صبا ہے عطر لیے بن بن ہوئی

شام سے کچھ دن [illegible] اپنے مکان میں واپس آ گئے

——— ۱۷ ———

منگنی کی رسم کو چار روز گزرے ہیں مگر [illegible] خبر سکون ہے۔ [illegible] سروت آرا بیگم کی طبیعت [illegible] ہو گئی اور [illegible] گھر والے مضطرب ہو گئے ڈاکٹروں [illegible] کسی طرح نہ گیا۔ آخر [illegible]

میں کسی قدر تقویت ہوئی۔ نکہت آرا بیگم محسوس کر رہی تھیں والی حالت کا یہ حال ہے تو کہاں کی شرم اور کہاں کی حیا۔ منصور کی حالت دگرگوں ہوتی آئی۔ اُس وقت بھی ہر لمحہ سے ہوش بھی ظہیر حسن اچار نکہت آرا اس کے پاس بیٹھے تھے۔ فکر و پریشانی نے سب کے چہرے مرجھا دیئے تھے۔ نکہت آرا کی رو رو کے آنکھیں سوج گئیں۔ بال پریشان تھے لباس بالکل میلا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر مارسول مرجی کو (جو کلکتہ سے ٹیلی گرام دے کر بلایا گیا تھا۔ اور دوسرے کمرے میں موجود تھا) مریضہ کی مخدوش حالت کی اطلاع دی تھی۔ ثروت آرا بیگم کے جسم میں حرکت ہوئی اور آنکھیں کھول کر بہت آہستہ شوہر سے کہا کہ ڈاکٹر کو یہاں سے ہٹا دو چونکہ میرا وقت آخر ہے میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ ظہیر حسن کے حکم سے لیڈی ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ثروت آرا بیگم "(نہایت کمزور آواز سے) میرے مالک مجازی میرے شوہر! خدا کے لئے آپ اپنے حواس درست کیجئے۔ اور جو کچھ میں کہتی ہوں غور سے سنئے۔ آہ! تم روتے کیوں ہو ہمیشہ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا موت ایک نہ ایک روز آنے کی، خدا کا شکر ہے۔ میں کس قدر خوش قسمت ہوں کہ تمہارے ہاتھوں ہی دم رخصت ہو گیا۔ ہاں مجھے معاف کر دینا ہوگا آپ نے کبھی مجھے رنج نہیں پہنچایا کوئی بات میری رائے کے خلاف نہیں کی۔ ہاں شاید تمہاری خدمت مجھ سے نہ ہو سکی۔ اور مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہے تو معاف کر دو۔ تم دعا کرو عاقبت بخیر ہو۔ دونوں بھائیوں تم میرے لئے دعا ہو۔

یہی سہی اور رہے گی دو جہاں میں اُن کی باتوں سے
یہاں بہتر آئے ہیں سے وہاں ہوگی نجات ان سے

آنسو روکو اور میری بات کا خیال دو

ظہیر حسن (ضبط کر کے) میری قدر میرے سرتاج، ثروت آہ میری وفا شعار بیوی! اگر تم اور ملنے کے خیال ہی سے۔ اور میری زندگی بار کہ اب ہونے والی ہے۔ تو اُس خدا کے حضور میں جو عالم الغیب ہے میری موت یا میری راحت کی التجا کرتا۔ تم معصوم ہو خوش خصال ہو۔ میرے لئے رحمت کی دیوی ہو۔ تمہاری غلطی تمہاری خطا کچھ نہیں

سرو آرا بیگم نے افتخار کو بلا کر سینہ سے لگا لیا۔ اور پھر شہپارا کو سامنے بلا کر اور
مادرانہ شفقت سے مشکبار آرا بیگم کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور افتخار کو مخاطب کر کے کہا میرے
لال افسوس تمہاری شادی کی بہار مجھے دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں
تمہیں دیکھ جاتی ہوں۔ جس کی تم جس قدر عزت کرو کم ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری زندگی
نہایت اطمینان سے گزرے گی دیکھو میرے پیارے بچو۔ تم دونوں پر فرض ہے۔ کہ
قرآن شریف کے اس حکم کا ضرور خیال کرو۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولہن مثل الذی
علیہن بالمعروف (عورتوں کے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں۔ جو مردوں کے عورتوں پر ہیں)
دونوں سر جھکائے روئے جاتے تھے۔ سرو آرا بیگم نے کہا "ہیں ہیں آپ سب روتے
کیوں ہو کھڑے ہو جاؤ۔ یہ کون بزرگ آتے ہیں؟ مجھے بھی تعظیم کرنی چاہیئے۔ مجھے سہارا
دو میں بھی اٹھوں گی۔ پھر کلمہ طیب پڑھنے لگیں۔ ہچکی آئی اور آنکھیں بند کر کے ہمیشہ
کی میٹھی نیند سو گئیں۔ ؎

اس طرف کچھ دیکھ کر وہ لگے کہنا ارے دانا
اس طرف میں درد سے کچھ کہہ سکے غافل ہوگیا

گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ مشکبار آرا بیگم سر کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگی جس
بیٹے کو لٹا کر ایک آہ سرد کے ساتھ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ آج سے چار روز پہلے جو
مقام عشرت کدہ تھا۔ وہ ماتم خانہ ہوگیا آہ موت جوان کی موت۔ نوجوان کی موت
کیسی غمناک ہے۔ کس قدر ہوش ربا ہے۔ کیسی دردناک ہے۔ آہ! سرو آرا بیگم جس
نے اپنے بیٹے کی رسم شادی ابھی ادا نہ کی تھی۔ جس کی اسے بڑی تمنا تھی۔ افسوس موت
نے۔ ارمان بھرا تمام آرزوئیں۔ کل امیدیں درہم برہم کر دیں۔ بادصرصر کے تند
جھونکوں نے اس کے زندگی کے چراغ کو گل کر دیا۔ افسوس بے اندری ہیں کوئی

نادان کارخانہ الٰہی میں کوئی۔ کل نہیں افسوس اے ؎

مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال
کارے کہ خدا کند فلک را چہ مجال

تجہیز و تکفین کا انتظام کیا گیا۔ اور شوہر کے سامنے بیٹے کی موجودگی میں عزیز و اقربا کے روبرو اس نیک نہاد خاتون کو قبر کی آغوش میں سونپ دیا گیا۔ جس کو دنیا ہمیشہ روتی رہے گی۔ جو علم، لیاقت، انکسار، ہمدردی و نیکی میں اپنا مثال نہ رکھتی تھی۔

(۵)

ثروت آرا بیگم کی موت کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے اخبار کی تعطیلیں بھی ختم ہو گئیں وہ والد کے گلے لگ کر اور رو رو کر علیگڈھ سدھار رہا ہے۔ بیکس ثروت آرا کا پھول سا خوبصورت چہرہ بالکل کملا گیا ہے اُسے اب کسی کی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں وہ پہروں سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے سوچا کرتی ہے۔ غذا بالکل چھوٹ گئی ہے۔ سب لوگ سمجھاتے ہیں۔ مگر اُس کے غم و الم کی وہی حالت ہے بار بار مسٹر ظہیر بہن بھائی کو سمجھانے آتے مگر جہاں اندر قدم رکھا خود بھی رونے لگے۔ لوگ بھی منیر صاحب کی ساری اُن کی بربادی سے بہت متاثر تھے۔ اور ملنے کی کوشش کرتے تھے ایکبار ثروت آرا بیگم کو ہوا خوری کی غرض سے لے گئے۔ دونوں قبر پر بیٹھے بڑی دیر تک قرآن شریف کی تلاوت کرتے رہے۔ واپس جب آنے لگے تو بڑی زور شور سے بارش ہونے لگی۔ ساتھ ہی رعد کی کڑک اور بجلی کی چمک سے دل دہلے جاتے تھے چونکہ مکان قبرستان سے چار میل دور تھا اس لئے اس قدر فاصلہ سخت بارش اور طوفان میں طے کرنا ناممکن سمجھکر وہیں ایک مکان میں ٹھہر گئے۔ دوسرے روز بارش میں کمی ہو گئی۔ اور طوفان بھی موقوف ہو گیا۔ مگر سڑکوں پر پانی ابھی پھر رہا تھا۔ مسٹر ظہیر حسن نے ایک غیر شخص کے مکان میں اور قیام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ صاحب خانہ روکتا ہی رہا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اللہ کا نام لے کر سامنے گاڑی پر سوار ہو گئے ابھی گاڑی مکان سے دو میل دور تھی۔ کہ پھر طوفان شروع ہو گیا۔ بارش بھی خوب ہونے لگی آہ وقت کا منظر نہایت ہولناک تھا۔ بجلی کا کوندنا بادل کی کڑک ہوا کی سنسناہٹ درختوں کا جھومنا۔ مضبوط دلوں کو تھرا رہا تھا۔ مسٹر ظہیر حسن کسی مکان میں پناہ لینا چاہتے تھے مگر وہاں گھر کیا جھونپڑی کا بھی نشان نہ تھا۔ کوچ مین گھوڑے کو آگے بڑھائے ہی جاتا

کوشش کرتا تھا مگر وہ بے بس تھا جانور پانی اور طوفان سے خوفزدہ ہو کر اپنی جگہ پر تھم گیا تھا۔ کہ زور سے بجلی چمکی اور ایک ہولناک آواز کے ساتھ گاڑی کے بالکل سامنے دس گز دور درخت پر بجلی گری۔ دونو طرف میں تمکنت آرا بیگم کے منہ سے چیخ نکل گئی گھوڑا اڑا اور گاڑی لیکر اچھلا راس ٹوٹ گئی حبشی کمال بدحواسی سے کوچ بکس سے کودا۔ اور گاڑی کے پٹ کھولدیے۔ گاڑی الٹ گئی اور ظہیر حسن و تمکنت آرا پانی میں گر رہے تھوڑی دیر بعد جب کوچمین سائیس۔ اور حبشی کے حواس کسی قدر بجا ہوئے۔ تو وہ لوگ اپنے آقا اور چھوٹی بیگم کو تلاش کرنے لگے۔ ایک آدمی شہر دوڑا گیا بہت سے آدمی مدد کو آگئے۔ گاڑی کھڑی کی گئی۔ اب طوفان بالکل موقوف ہو گیا تھا بارش بند تھی راستہ کا پانی بھی کم ہو گیا تھا۔ ظہیر حسن بے ہوش تھے۔ تمکنت آرا بیگم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ لوگوں نے بہت تلاش کیا۔ مگر وہ نہ ملی۔ مجبوراً واپس مکان میں آئے حبشی نے اعجاز حسن کو بذریعہ ٹیلیگرام اس ناگہانی سانحہ کی خبر دی۔

ظہیر حسن کو سر میں سخت چوٹ آئی تھی اس لئے دو روز تک بیہوش رہے۔ اعجاز بدحواس تحیر و پریشانی کے عالم میں گھر پہونچا۔ والدہ کا صدمہ، والد کی علالت لاحق حال اور محبوبہ کی گمشدگی ان سب دردناک حادثوں نے اس کی حالت خراب کردی تھی۔ بعد ازاں اس کے لئے جانکاہ تھے مسٹر ظہیر حسن کو جب ذرا غشی سے افاقہ ہوا تو تمکنت آرا کی گمشدگی کی سخت فکر اور صدمہ کی خبر ہوئی وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ بلا کسی کو اطلاع کئے ایک شب کو مکان سے غائب ہو گئے۔ اعجاز حسن نے بہت تلاش کی مگر پتہ نہ چلا آخر رو پیٹ کر خاموش ہو گیا وہ دنیا میں اپنے کو سب سے بڑا بدنصیب شخص تصور کرتا تھا اور اُسے اپنی زندگی سے موت بدرجہا اچھی معلوم ہوتی تھی۔

(باقی آئندہ)

ام المحلمہ (مسز طاہر جمیل)





مونٹ ایورسٹ کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی ہے جو سطح سمندر سے ساڑھے پانچ میل بلند ہے۔ ایورسٹ کی چڑھائی بہت خطرناک ہے کچھ دور جاکر سردی سے انسان شل ہو جاتا ہے چڑھائی کے وقت لازمی ہے کہ بدن کو موٹے موٹے کپڑوں سے اچھی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ ہاتھوں پر دستانے ہوں۔ پاؤں میں گرم موزے ہوں چہرے پر نقاب ہو۔ اور آنکھوں پر چشمہ ہو۔ ورنہ بصارت جاتی رہیگی۔ چہرے میں ناقابل برداشت درد ہوگا۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں جھڑ جائیں گی۔ اور انسان برف کی طرح جم کر رہ جائیگا۔ اس پہاڑ پر پانی نہیں ملتا ہے جب پیاس لگے۔ تو برف کو گرم کر کے پانی بناتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کس طرح پانی بنائیں۔ کسی درخت کا کہیں نشان نہیں اس لئے برف پگھلانے کو لکڑی بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی ناچار لکڑی کا کام مٹی کے تیل سے لیا جاتا ہے۔ برف میں بیٹھنا بھی خطرے سے خالی نہیں انکا بیٹھ کر اٹھنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اور اگر سو جائیں تو پھر شاید ہی آنکھ کھلیگی۔

مسافروں کے لئے صرف برف ہی آفت نہیں بلکہ برف کے علاوہ اس میں بے شمار خندق اور غار منہ کھولے ہوئے ہیں۔ ذرا پاؤں پھسلا اور سیدھے تحت الثریٰ میں پہنچے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ برف کی بڑی بڑی چٹانیں پھسلتی ہوئی آتی ہیں۔ جو کچھ سامنے آیا۔ وہ گھن کی طرح پس جاتا ہے۔

مگر خدا نے انسان کو عجیب دل اور گردہ دیا ہے کسی خطرے میں ڈر نہیں۔ آگ بجلی آندھی طوفان۔ دریا۔ سمندر۔ پہاڑ سب سے مقابلہ کے لئے تیار ہے۔ انسان نے کوہ ایورسٹ پر چڑھنے کی باوجود مذکورہ بالا خطرات کے کوشش اور ایک حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

پہلی کوشش ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اسکے بعد

۱۹۲۲ء میں دوبارہ کوشش ہوئی۔ پہلے ۱۹۲۱ء میں سات پہلے سیاح یورپ سے
گوہ الور سٹ دیکھنے آئے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ معلوم کریں کہ کونسا راستہ بہتر ہے اور
چڑھائی کے لئے کونسا موسم موزوں ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ شروع سال میں برف
کی شدت مانع ہے۔ اور پھر برسات کی وجہ سے چڑھائی ناممکن۔ پھر ۱۹۲۲ء میں کچھ
آدمی آئے اور سامان رسد لیکر پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ مگر وہ بھی زیادہ دور نہ جا سکے۔
نو بارہ آدمی تھے۔ تین بار کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ یہ پانچ میل سے زیادہ
اوپر نہ جا سکے اور جب پھسلے تو سات جان سے گئے۔ صرف پانچ بچے۔

اس کے بعد دوبارہ وہی آدمی کچھ اور آدمی ساتھ لیکر آئے۔ یہ ۱۹۲۴ء کا ذکر ہے
پہلے دن جب وہ خیموں سے نکلے تو تیز ہوا چلنے لگی۔ پالا کا پالا پڑنے لگا۔ اور برف زور و
شور سے گرنے لگی۔ ناچار وہ خیموں میں واپس آ گئے۔ دو دن لگاتار آندھی چلتی رہی
اور پھر تھم گئی۔ ہوا تھمی تو یہ خیموں سے پھر نکلے۔ دن اچھا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ تمام دن
چڑھائی جاری رہی لیکن دوسرے دن پھر آندھی آ گئی۔ برف گرنے لگی اور یہ وہیں
رک گئے۔ [illegible] ہوتی [illegible] ہر وقت بادل گھرے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اوپر
[illegible] جس وقت بادل اوپر ہوں تو چوٹی
دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ [illegible] اور برف باری [illegible] سب بادل ہو رہے تھے۔
تو دو شہسواروں میں سے ایک کا نام مالوری اور دوسرے کا ارواِن تھا۔ ہمت
کر کے پہاڑ کی چوٹی کا حال معلوم کرنے روانہ ہوئے۔ یہ دونوں پہاڑ پر چڑھنے لگے۔
اور ان کے ساتھی ان کے انتظار میں قیام پذیر ہوئے۔ مگر بڑی دیر ہو گئی اور ان
بہادروں کا کچھ حال معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں۔ آخر جب نا امید ہو چلے تو ایک شخص
جو ان دونوں کے ساتھ گیا تھا واپس آیا۔ اور انہی بہادروں کا ایک کاغذ دیا۔ جس پر لکھا
ہوا تھا کہ ہم فلاں وقت فلاں چٹان پر ہوں گے۔ معینہ وقت پر جب ان لوگوں نے
اس طرف دیکھا تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ کیونکہ بادل چٹان پر گھرے ہوئے تھے۔ تھوڑی
دیر کے بعد جب بادل پھٹے۔ تو چٹان صاف نظر آنے لگی۔ اور انہیں دو چھوٹے

سیاہ دھبے سفید برف پر دکھائی دیئے۔ یہ کالے داغ ہمارے جان پر کھیلنے والے بہادر تھے۔ اس کے بعد بادل پھر چھا گئے۔ اور وہ سیاہ داغ نگاہوں سے غائب ہو گئے۔ پھر رات ہو گئی۔ رات گذری اور دن چڑھا دن چڑھا اور سورج غروب ہوا مگر مالوری اور اروائن واپس نہ آئے آہ وہ کبھی واپس نہ آئیں گے۔ خدا جانے وہ کہاں گئے۔ اور کس طرح مرے وہ مر چکے ہیں مگر دراصل زندہ ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ جو شوق جستجو میں جان پر کھیل جاتے ہیں کبھی نہیں مرتے۔

مبارک بیگم



کوہستان شملہ کے حالات ہم گذشتہ اشاعت میں درج رسالہ کر چکے ہیں اب ہم ناظرین رسالہ کی ضیافت طبع کے لئے وادیٔ کانگڑہ کا قصہ سناتے ہیں

کانگڑہ کے دلفریب مناظر روح افزا قدرتی نظارے۔ اُنکی دلکش فضا رعنائی اور زیبائی واقعی جنت نگاہ اور فردوس نظر ہے۔

کانگڑہ کی وادی ہمالیہ کے سلسلہ دہولا دھار کے دامن میں لاہور کے شمال مشرق کی مشرقی جانب تقریبًا سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے کانگڑہ اور کلو کی وادیاں شملہ سے شمال کی جانب مسلسل واقع ہوئی ہیں۔ ریاست منڈی ان وادیوں اور ضلع شملہ کے درمیان حائل ہے۔ ڈلہوزی وادی کانگڑہ کے شمال جنوبی کونے کے ذرا اوپر واقع ہے۔ یہاں سے ٹھیک شمال میں دہولا دھار کے سلسلہ کہسار نے ایک قدرتی حد قائم کر رکھی ہے۔ اس سے آگے چلکر ریاست چمبہ واقع ہے جو وادی کشمیر کا جنوبی علاقہ ہے۔ علاقہ کانگڑہ کے جنوبی دروازے کے قریب شہر پٹھانکوٹ آباد ہے۔ اور یہی مقام ہے۔ جہاں سے کانگڑہ ویلی ریلوے شروع

ہوئی ہے۔ "کانگڑہ ویلی ریلوے" ہندوستان کی وہ اولین ریلوے لائن ہے جو ہمالیہ عظیم الشان پہاڑی نظاروں میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ ہندوستان بھر میں کوئی لائن برف پوش پہاڑوں کے سلسلے سے اس قدر قریب نہیں۔ اکثر مقامات پر یہ لائن ان پہاڑی چوٹیوں سے جو پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں۔ دس میل سے بھی کم فاصلہ پر ہو کر جاتی ہے۔ اور یہ چوٹیاں نصف سال سے زیادہ عرصہ تک برف پوش رہتی ہیں۔

دھولا دھار سے آگے بڑھ کر دوسرے پہاڑ آ جاتے ہیں۔ ان پہاڑوں کے جو سطح سمندر سے بیس ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہیں اگر قدرتی نظاروں کی خوبصورتی کو دیکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ مقام دنیا کے خوبصورت ترین نظاروں کا ملک ہے۔ اور یہاں کے سرسبز اور شاداب کھیت اور چہرہ پر دار جمال کی ضو فشانی سے مرصع ہو کر جنت کشمیر کو شرما رہے ہیں

وادیٔ کانگڑہ صدیوں تک سیاحوں کی نگاہ لطف اندوز سے حجاب میں پڑی رہی اور آج جب سیاحوں کا نشاط اور فرصت گذار پہلا ہمالیہ کے ان مقامات کی دلفریب ساعت گنتے ہیں جنکی دلکشا فضا اور مناظر کی دلفریبی وادیٔ کانگڑہ کی روح پرور دلربائی سے لگا نہیں کھا سکتی

اس ریل کی بدولت اس وادی میں آمد و رفت کی راہیں کھل گئی ہیں۔ موجودہ مورخین کا یقین ہے کہ یہی وہ ملک ہے جو زمانہ سلف میں دیس ترگرت کے نام سے مشہور تھا اور مہابھارت کے زمانہ میں واقعات کا مظہر قرار دیا ہے جو سوانح بیان کرتے ہیں۔ درحقیقت اس سرزمین پر وقوع میں آئے۔

اس وادی کے شمالی حصوں میں بے شمار ایسے مقامات ہوتے ہیں جن سے برہمن دھرم اور بدھ مت کے ابتدائی زمانہ کا پتہ چلتا ہے۔ اور ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کی نسبت صدیوں سے حکایات مشہور چلی آتی ہیں۔ مثلاً مہابھارت میں پہاڑ کی چٹانوں پر کتبے کندہ ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مسیح کی پیدائش سے پہلے یہاں کندہ کئے گئے ہیں۔

یہاں بہت سے قدیم کھنڈر اور مندر بھی ہیں۔ جو زبان حال سے زمانہ گذشتہ داستانیں سنا رہے ہیں۔ مقام جیسر دیہیں جو کانگڑہ دہرم سالہ سڑک پر واقع ہے ایک قدیم سلطنت کے آثار موجود ہیں۔ فتح پور تحصیل نور پور میں مہا کا مندر کا ایک نہایت نایاب بت دستیاب ہوا ہے۔

ہیون سانگ مشہور چینی سیاح اپنے سفرنامہ میں اس امر کا ذکر کرتا ہے کہ ساتویں صدی کے پہلے نصف حصے میں جالندھر کی راجدھانی میں جس میں کانگڑہ بھی شامل تھا مذہب کے بھکشوؤں کی پچاس خانقاہیں تھیں اور ان میں ایسے دو ہزار راہب مقیم تھے جو بدھ مذہب کے کبیر و صغیر یانوں کی تعلیم پھیلانے میں خاص فضیلت رکھتے تھے۔ مسرور میں پتھر کی پہاڑیوں کا جو سلسلہ ہے اس کی چوٹی پر قدیم زمانہ کے مندروں کا ایک نہایت دلچسپ مجموعہ موجود ہے۔ یہ مندر پہاڑ کی چٹانوں کو تراش کر کے تعمیر کئے گئے ہیں معابد کی اس نمونے کی عمارتیں شمالی اور جنوبی ہند میں بکثرت ملتی ہیں مگر ہمالیہ کے پہاڑوں میں اور کسی جگہ دیکھنے میں نہیں آتیں۔ مسرور میں ان مندروں کے آس پاس پتھر کا بہت سا سامان پڑا ہے۔ اور اس پر نقش و نگار کندہ ہیں۔

نور پور کا قلعہ نور پور روڈ اسٹیشن کے مشرق میں تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے یہاں کھودنے سے غیر معمولی وسعت اور عظمت والے ہندو مندر کے آثار نمودار ہوئے ہیں۔ اس مندر کی بیرونی دیوار پر بے شمار نقش و نگار کندہ ہیں جن میں گائیوں اور گوالوں کی مورتیاں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک ایسی مورتی بھی ہے جو غالباً کرشن بھگوان کی ہوگی۔ ہری پور میں امکیسور کا مندر ہے جو نقش و نگار کے لحاظ سے قابل دید ہے۔

ان قدیم مندروں اور شوالوں سے بڑھ کر مشہور راجپوتوں کے وہ قلعے ہیں۔ جو طوائف الملوکی کے زمانہ میں یہاں پہاڑوں کی چوٹیوں پر تعمیر ہوئے۔ اور اس وقت ناقابل تسخیر سمجھے جاتے تھے۔

کلو بھی قدرتی خوبصورتی کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ شمال کی طرف دھولا دہار کا سلسلہ ہے۔ جس کی اونچی چوٹیاں دس ہزار سے سولہ ہزار پانچسو فٹ تک بلند ہیں۔ کانگڑہ کا رقبہ ۹۹۷۸ مربع میل ہے۔ اور تبت کی سرحد سے جا ملتا ہے۔ سب سے بڑا قصبہ دھرمسالہ ہے جہاں کی آبادی جس میں چھاؤنی بھی شامل ہے، ۹۰۴ نفوس پر مشتمل ہے۔ تمام ضلع میں ۷۶۶۰۶۵ باشندے آباد ہیں۔ نومبر تا اپریل تک پہاڑوں کی چوٹیاں برف پوش رہتی ہیں۔ اور جب نظر اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ شمالی افق میں ایک سر بفلک برف کی دیوار کھڑی ہے۔ دھولا دہار کا مہیب سلسلہ جس حیرت ناک جرأت و شوکت کے ساتھ اس وادی پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی کیفیت کچھ دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اگر وادی میں کھڑے ہو کر دیکھا جائے۔ تو زیریں پہاڑیاں ایک دوسرے کے بعد ایسے اٹھتی دکھائی دیتی ہیں جیسے سمندر کی لہریں آپس میں لہرائیں اور کھیلتی چلی جاتی ہوں۔ چنانچہ نگاہ کسی رکاوٹ کے بغیر پہاڑوں کے ایک ایسے سلسلے پر پڑتی ہیں۔ جو ان کے دامن میں پھیلی ہوئی وادی سے سترہ ہزار فٹ کی بلندی تک اٹھتا چلا جاتا ہے۔

یہاں کے لوگ ہمیشہ اپنے سادہ اور دیہاتی طرز زندگی پر قائم رہتے ہیں داب یاب کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ دیہات میں براہمنوں کو حسب معمول سب سے زیادہ اقتدار حاصل ہے۔ لیکن راجپوت قبائل کے لوگ بھی اپنے حقوق کی وجہ سے غلبہ رکھتے ہیں۔ یہاں کی اقتصادی بنیاد زیادہ تر زراعت ہے۔ دھان اور گیہوں کی فصل بکثرت ہوتی ہے۔ اگر کسان موجودہ ایجادوں کی طرف متوجہ ہوں۔ تو ترقی کی بہت گنجائش ہے چاء کی کاشت کے لئے یہ جگہ بہت موزوں ہے۔ دیگر اجناس ہیں جو بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔ گنا۔ مکی۔ اور ہر قسم کی ترکاریاں شامل ہیں۔

ضلع کانگڑہ میں کئی مشہور ہندو تیرتھ استھان ہیں۔ جن میں کانگڑہ بھون۔ اور جوالا مکھی کے استھان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کانگڑہ اور بیجناتھ تک ریلوے لائن براہ راست پہونچ چکی ہیں۔ اور تیسرے استھان سے جوالا مکھی کے بھی کافی نزدیک پہونچ جاتی ہے۔ بیشتر ازیں جاتریوں کو پیدل یا موٹر لاری کے ذریعہ سفر کرنا پڑتا

تھا۔ کانگڑہ شہر کا قدیمی نام حقیقت میں نگرکوٹ تھا۔ اور قلعہ کو کانگڑہ کے نام سے پکارتے تھے۔ ۱۹۰۵ء کے بھونچال نے قلعہ اور مندر کو اسی بری طرح تباہ کیا۔ کہ سوائے چار دیواری کے کچھ نہ چھوڑا۔ ماتا دیوی کا مندر مقام کلیوں میں ہے۔ اب سرِنو تعمیر کیا گیا ہے اور ایک کتبہ جو محفوظ رہ گیا تھا۔ نئے مندر کے دروازہ پر نصب کیا گیا ہے۔

جوالامکھی میں جلنے والی گیس کی پرستش ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ یہ شعلے جالندھر نامی دیو کے منہ سے نکلتے ہیں۔ جس کا سر تو کانگڑہ میں اور جسم کا باقی حصہ قدیم بیاس اور ستلج کے دوابہ میں مدفون ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ جب اکبر بادشاہ جوالامکھی دیکھنے آیا تو پہلے اُس نے یہ کوشش کی کہ ان درازوں کے منہ پر آہنی دروازے لگا کر شعلوں کو بند کر دے لیکن جب یہ کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی تو ایک چھوٹا سا نالہ بنوایا۔ مگر اُس سے بھی کامیابی نہ ہوئی۔ نالے کے آثارات تک موجود ہیں۔ شعلے ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ پھوٹ نکلے کھڑک سنگھ نے اس استھان پر نہایت خوشنما دروازہ چڑھایا۔ جو چاندی کے ورقوں سے منڈھا ہے۔ لارڈ ہارڈنگ نے اُس کی خوبصورتی دیکھ کر اُس کا ایک نمونہ بنوایا تھا۔

بیجناتھ کا مندر شمالی ہندوستان کے ہندو مندروں میں بہت خوشنما ہے۔

کانگڑہ شکاریوں کے لئے ایک دلچسپ مقام ہے۔ جنگلی جانوروں میں سے کالے اور بھورے ریچھ کی کافی کثرت ہے۔ کالا ریچھ یہاں کے کسانوں کے کھیتوں کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ اور بھورا ریچھ خصوصاً چھوٹے جنگلوں اور بڑے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہاں گلدار کثرت سے ہیں۔ جو مویشی اور دیگر جانوروں کے لئے بہت خطرناک ہیں۔ جنگلی بلی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ جو بہت نڈر ہے۔ بعض اوقات چیتا بھی مل جاتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی شیر بھی وہاں کسی خوش قسمت شکاری کی بندوق کا نشانہ بننے کے لئے آنکلتا ہے۔ گلدار ہرن صرف شولک کی جھاڑیوں میں ملتے ہیں۔ مشک آہو آٹھ ہزار فٹ سے زیادہ بلند مقامات پر ملتے ہیں۔ چیتل اور نیل گائے ہر جگہ نہیں ملتے۔ گورل جانور شکاریوں کی چیرہ دستی سے قریب قریب معدوم ہو چکا ہے۔ جنگلی سور بکثرت پایا جاتا ہے۔ سیرو اور پہاڑی بکرے

اور خرگوش بکثرت موجود ہیں۔ اس وادی میں شکاری کے لئے پرندوں کی بہت افراط ہے جھیلوں اور نالوں پر بگلے، سفید گدھ، لق لق، چیل، کوٹ تیتر، بھورے تیتر، کالے تیتر، چکور، مرغابی، جنگلی مرغ، بٹیر بکثرت دستیاب ہوتے ہیں مانند طاؤس، برفانی مرغ اور پھر پائے جاتے ہیں۔ ندی نالوں میں سینکڑوں قسم کی مچھلیاں ملتی ہیں جن میں مہاشیر بہت مشہور ہے۔

وادی کانگڑہ وہی لالہ زار ہے، جس کے متعلق عالی مقام مہاراجوں نے باغ پر بہار لگا کر جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ اور یہی مقام ہے جہاں بڑے بڑے عالیشان بادشاہوں اور مہاراجوں نے اپنے دور حکومت میں خوبصورت محل اور سنگلاخ قلعے تعمیر کرائے۔ چنانچہ یہ سرزمین ہمیشہ راجپوت بہادری اور شجاعت کا گہوارہ رہی لیکن باوجود ان سب رنگ آرائیوں کے وادی کو یہاں کا کوئی اس گوشہ بہار کا پتہ باہر ہموار نہ ہو سکی جس پر دوری کا پردہ پڑا ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ بیرونی سیاح تو درکنار اکثر ہندوستانی اس دلفریب مقام سے ناآشنا رہے۔ لیکن آج کی کیفیت ہے۔ اس وقت تمام وادی ایک عظیم الشان صنعتی کا امید افزا منظر پیش کر رہی ہے۔ اس وادی کے کسانوں، زراعت اور کوہساروں کے بیچ میں سے نکلی بہار ہی ہے۔ اس لئے اس ضلع کی شہرت اور اقتصادی خوشحالی کے لئے ایک نئے دور کا دروازہ کھول دیا ہے۔ سرسبز پہاڑ اور گھاٹیاں دریا اور چراگاہیں، برفانی چوٹیاں اور جنگل کے سبزہ زار۔ یہ سب ہم زبان ہو کر مسافر کو دعوت دے رہے ہیں کہ "آؤ اور قدرت کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھو" اب ریل کی بدولت اکثر اہل ذوق اس دعوت کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ اور دھولادھار کے سلسلہ کوہسار کے سایہ میں وقت گزارنے کی آرزو کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں زعفرانی لباس زیب تن کئے پہاڑوں کی آغوش میں لہلہا رہی ہیں۔ اور ننھی ندیاں اور جھرنے جوش انگیز نغمہ رقص و سرود میں ہو کر سیاحوں کو مخمور کر رہے ہیں۔

طاہر حسین خان بی۔ اے

نمکدانِ ظرافت

بجلی گھر کا انسپکٹر۔ بہت کم اور مدھم روشنی کی شکایت ہر وقت ہوتی ہو گی۔
صابر گاہک۔ جی نہیں جناب۔ انسپکٹر۔ اچھا میرا بھی یہی خیال تھا ہفتہ میں تو کسی کسی وقت ہوگا گاہک۔ ہاں سورج غروب ہو جانے کے بعد۔

بیعلم صدر۔ محکمہ صحت کے افسر کی رپورٹ سن رہا تھا ایک ممبر نے پوچھا۔ کہ جناب صدر یہ جو شرح اموات کے متعلق ۹ ر ۱۲ لکھا ہے اس کا مطلب آپ نے کیا سمجھا؟ صدر نے کہا "مطلب کیا"؟ یہی مطلب ہے کہ ہر ہزار [illegible] میں سے ۹ مر گئے ہیں اور ۱۲ [illegible] ہیں۔

ڈاکٹر۔ آپ بھی ہسپتال کو کچھ دو۔ مریض دوں گا اور ضرور دوں گا
ڈاکٹر کیا عنایت ہوگا۔ مریض۔ امداد [illegible]

ایک [illegible] سے معلوم ہوا کہ [illegible] ہو گیا۔
ایک شخص ایسی [illegible] ہوا کرتا ہے

مریض مرد [illegible] پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لمبے بال
والے لڑکوں سے آپ [illegible] آسانی ہو جاتی ہے

[illegible] اور کم نہیں دیتے۔
[illegible] کے بعد ہم نے مجھے اُدھار دیا تھا۔

شرابی ۔ چھ ہفتوں میں یہ پہلا پیالہ شراب کا ہے ۔ جو میں پی رہا ہوں ۔
مولوی ۔ ناممکن مجھے یقین نہیں آتا ۔
شرابی ۔ چھ ہفتے آج سے شروع ہوتے ہیں ۔

اماموں ۔ میری بیوی نے مجھے بڑا دھوکا دیا ۔ فیضو ۔ دھوکا کیا دیا ؟
اماموں ۔ کہنے لگی کہ اگر تم رات کو دیر سے آئے ۔ تو میں خودکشی کر لوں گی ۔
فیضو ۔ اس میں کیا دھوکا ہوا ۔ اماموں ۔ اُس نے خودکشی نہیں کی ۔

مریض ۔ میری صحت ہمیشہ اچھی رہی ہے ۔ میں نے بیس سال نوکری کی ہے ۔ اور ہمیشہ خوب نیند آجاتی تھی صرف اس دوران سے نیند نہیں آتی اور چوروں کا خیال رہتا ہے ۔
ڈاکٹر ۔ تمہاری نوکری کیا تھی ۔ مریض ۔ چوکیداری ۔

انتخاب کا وقت قریب تھا امیدوار دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے ۔ ایک دن ایک امیدوار نے گرما گرم تقریر کی ۔ پرجوش ووٹروں نے اُسے کاندھوں پر اٹھا لیا ۔ اور لے چلے ۔ امیدوار نے کہا کہ میں آپکا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ لیکن میں اپنی موٹر کار کی طرف چلکر جاؤنگا ووٹروں نے کہا " موٹر کار ! ابھی آپکو تو نہر کی طرف لیجا رہے ہیں ۔

رشیدہ سلطانہ اسسٹنٹ اڈیٹر



گمشدہ قطرہ ۔ حالت میری　　جون مخفی ہے طبیعت میری
گندی سندی عادت میری　　دیوانوں کی حالت میری
خاکی پتلے او طماع　　کس برتے پہ تتا پانی
روتا دھوتا عوں عاں کرتا　　اندھا دھندا پھرا گو رنگا
نے جس سے بس سدھا الٹا　　چاہا جس سے پھینکا پچھانکا
اس پر اتنی آفت ڈھالی　　کس برتے پہ تتا پانی

سارا سارا گھول نکالا　　عنبروں کا منہ تکنے والا
دل کا رحم اور پاس کا پالا　　خوں بہا کر حسن کو پالا
اس نے پھر یہ اچھا مانا　　کس برتے پہ تتا پانی
اُن میں سے جو اپنے ہوں آکر　　آپ سے تو ہو گیا باہر
کس کی بہن؟ اور کس کی مادر　　سب کو لگائی ایک ہی ٹھوکر
لاکھ سمجھائی ایک نہ مانی　　کس برتے پہ تتا پانی
نیچی نظر کا کس کو مارا　　اوپر اوپر چڑھ گیا پارا
اِس کو چھانا اُس کو مارا　　بھول گیا سب قول ہمارا
[illegible] پہ اک دل سے کو آئی　　کس برتے پہ تتا پانی

آغا شاعر دہلوی

دیوانہ

لوگ کہتے ہیں کہ میں دیوانہ ہوں۔ بیشک میں دیوانہ ہوں ایک وقت وہ تھا کہ اس [illegible] الفاظ کے سننے سے میرا دل دور دور سے دھڑکنے لگتا خون سر کی طرف گردش کرنے لگتا معلوم ہوتا تھا کہ میرے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جا رہا ہے [illegible] آنے لگتی ہیں ایک چکر سا آتا اور دھندلا سا میری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتی تھی۔ جی ہی چاہتا تھا کہ کہنے والوں کی زبان اُن کے منہ میں سے کھینچ لوں اور اُن کے گوشت میں اسے داب دباؤں

ہا ہا ہا! دیوانگی بھی کس قدر شاندار مرض ہے۔ لوگ دیوانہ کو دور ہی سے دیکھتے ہیں اور اس قدر احساس کرتے ہیں [illegible] کی جھنکار ایک [illegible] ترنم باتیں کرتی ہے جس سے کہ روح میں ایک وسیع [illegible] تلاطم برپا ہو جاتا ہے اور [illegible] اور [illegible] کو بھی [illegible] ان سلاخوں دار کمروں میں رہتے ہو اسے ایک [illegible] ہمارا [illegible] کرتے ہیں اور ہم کو

دیوانہ بتاتے ہیں ہم اُن کے مبہوت چہروں کو دیکھکر ہنستے ہیں۔ اور اُن کو دیوانہ سمجھتے ہیں یہ ہم کو غلطی پر بتاتے ہیں حالانکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ کیا صحیح العقل ہونے کی یہی دلیل ہے۔



دیوانگی میرا خاندانی مرض ہے۔ ہر دوسری پشت میں اس کا ایک نہ ایک شکار ضرور ہوتا ہے۔ اسکو میری خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ اب کے میری باری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرے دادا بھی اسی مرض میں مبتلا تھے۔ انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنا اور اپنے مرض کا خاتمہ کیا۔ لڑکپن ہی سے بخار میرے گلے کا ہار رہا۔ دماغ میں ایک شعلہ بھڑکا ہوا تھا۔ اور دل میں آتش سوزاں شعلہ زن تھی۔ بڑے بڑے طبیبوں نے مرض لاعلاج بتایا اور اُس وقت کا بھی اندیشہ ظاہر کیا جبکہ یہ میرا بخار دیوانگی یا جنون کی صورت اختیار کرلے گا میں اُن کی اس تشخیص پر ہنستا تھا۔ اُن کا علم کس قدر ناقص اور محدود ہے کہ زیادہ تر امراض کو لاعلاج قرار دیتے ہیں۔

والد کا شفیق سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ قانون کی نظر نگاہ میرے مرض کی تہ کو نہ پہنچ سکی۔ اور اُنکی کل ملکیت مجھے ورثہ میں ملی۔ اب میں لاکھوں کا مالک تھا۔ جوان تھا خوبصورت تھا۔ ایک بڑی دولت کا مالک تھا۔ حرص کے سبب طمع کے غلام میرے ہوا خواہ بن گئے۔ مغرور حسینائیں میرے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے لگیں۔ جوان اور بوڑھے میرا دم بھرنے لگے۔ ایک بوڑھا تو گویا میرا کلمہ ہی پڑھتا تھا۔ اُسکی ایک لڑکی تھی اور ایک لڑکا یہ دونوں بہت تنگدست تھے۔ اکثر کئی کئی وقت فاقہ گذر جاتے تھے۔ بوڑھا تو گرگِ باراں دیدہ تھا مگر میری اتنی دولت دیکھتے ہی اُس کے منہ میں پانی بھر آیا چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کردے۔ لڑکی پیکر حسن تھی۔ مجسم خوبصورتی تھی۔ حسن و عشق کی روح رواں تھی۔ میں نے اُس سے شادی کرلی بڈھا اور اُس کا لڑکا اپنی کامیابی پر مسکرا رہے تھے۔ میں قہقہے لگا رہا تھا کہ اُن کو اس بات کا سان وگمان بھی نہیں کہ ایک مخبوط الحواس کے پلّے لڑکی باندھ دی گئی ہے۔ تجربہ کار عیار جہاندیدہ بڈھا میری دیوانگی کو نہ

تاڑ سکا۔ وہ اسی خوش فہمی پر نازاں تھا۔ اور میں اُسکی بد فہمی پر ہنس رہا تھا۔

میری بیوی ایک گلاب کا پھول تھی مگر اب دن بدن کملائی جا رہی تھی اُس کا شریخ چہرہ اب زرد پڑ گیا تھا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ وہ ہمیشہ خاموش و متفکر رہتی تھی۔ اور مجکو دیکھکر سہم جاتی۔ وہ شمع سان گھلی جاتی تھی۔ اور اُس کو یوں خاموشی کی موت مرتے دیکھکر میرے دل میں ایک نوشمندہ خوشی محسوس ہونے لگتی تھی اُس کا مظلوم چہرہ دیکھکر میری باچھیں کھل جاتی تھیں اُس کی ملتجی نگاہیں میری وحشیانہ و خونخوار نظروں سے جب چار ہوتی تھیں تو وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔ اور اُسکی سرد آہ میرے مہیب قہقہے میں جذب ہو جاتی تھی۔

ایک شب کو میری آنکھ کھل گئی۔ وہ بے چین پڑی سوتی تھی مگر عالم خواب میں اپنے ماں باپ پر لعنت ملامت کر رہی تھی اور اپنے آتشین عاشق کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی۔ اس کا راز دل اب مجھ پر ظاہر ہو گیا تھا۔ میری رگوں میں بجائے خون کے آگ دوڑنے لگی غیبی صدائیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور مجھے اُس کے قتل کرنے پر مجبور کر رہی تھیں میرے دل میں ایک عجیب وحشت سی محسوس ہوئی میں نے چھری اٹھا کر اُس کی طرف جھپٹا وہ بدحواس ہوئی اور خوف زدہ و حیرت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی اُس کے چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اُس کی نظریں مایوسی و معصومیت کی ترجمانی کر رہی تھیں قوت ناطقہ گو اُس کی سلب ہو چکی تھی۔ تاہم اُس کی ایک خاموشی ہزار زبانوں سے اپنی بے گناہی بیان کر رہی تھی میری دیوانہ وار حالت دیکھکر دروازے کی طرف بھاگی مگر میں نے ایک چھلانگ میں اُس کو جا لیا۔ اُس نے خوف سے چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ آواز باہر پہنچ چکی تھی کئی راہیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اور یہ آوازیں میرے کمرے کے متصل آکر موقوف ہو گئیں میں نے دروازہ کھولکر آنے والوں سے کہا کہ یہ کسی وجہ سے بیہوش ہو گئیں ہیں ڈاکٹر آئے۔ طبیبوں نے معائنہ کیا مگر یہ جانبر نہ ہوئی صبح کو اُس کی نعش سپرد خاک کی گئی۔ جوان بیٹی کے صدمہ نے بوڑھے ماں باپ کو لب گور کر دیا

اور وہ بھی چند دنوں میں ملک بقا کو سدھارا۔

میرا دل پر سرور و شر طرب تھا جنگل کا راستہ لیا اور اس قدر ہنسا کہ سارا جنگل گونج گیا جب میں گھر آیا تو فرط مسرت سے میرے آنسو جاری تھے۔ شب کی تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی اور لوگ مجھکو تلاش کر رہے تھے۔ گھر پہنچکر معلوم ہوا کہ میرا سالا بہت دیر سے میرا انتظار کر رہا ہے۔

یہ شخص فوج میں ملازم ہو گیا تھا میرے ہی روپیہ نے اس کو یہ ملازمت دلوائی تھی۔ میں سیڑھی سے گھر میں داخل ہوا۔ ملازم کو رخصت کیا اب کمرہ میں صرف ہم دونوں تھے سنگین خاموشی چھائی ہوئی تھی کچھ عرصہ تک ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر اُسی نے اپنی مردہ بہن کے ذکر کو چھیڑ کر اس سکوت کو توڑا میں بے حس ساکت ہو کر اُسے سنا کیا کہ وہ خود اپنی بہن کا قاتل تھا۔ یہ جانتے ہو۔ جبکہ اُس کے دل کا مالک ایک آہو چشم ہو چکا تھا اس نے اور اُس کے مذہبی باپ نے لڑکی کو اس امر پر مجبور کیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کر لے تاکہ میرے روپے سے اُن کا افلاس دور ہو جائے۔ خواہ ایسا کرنے میں وہ جیتے جی جہنم ہی میں کیوں نہ پہنچ جائے۔ میری غصہ کی حالت دیکھ کر وہ خوف کا سہا گیا۔ میرے جوان میں ایک جوش پیدا ہوا اور عجیب صدائیں فضا میں گونجنے لگیں۔ چاروں طرف خون ہی خون نظر آنے لگا اور میں اس پر جھپٹا۔ اُس نے گھبرا کر ایک کرسی اٹھائی اور میری طرف پھینکی۔ مگر میں جھپٹ کر اُس سے لپٹ گیا۔ وہ طاقتور جوان تھا۔ مگر ہم دیوانوں میں طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ دیکھو میں کس آسانی سے اس دروازے کی سلاخ کو توڑ سکتا ہوں۔ ایک لمحہ کی کشمکش کے بعد میں اُس کے سینے پر سوار تھا۔ اور میرے ہاتھ اُس کے گلے کو دبائے ہوئے تھے۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ میرے قابو سے نکل جائے۔ مگر میری آہنی گرفت اُس کے گلے کو دباتی ہی چلی گئی۔ اُس کی آنکھیں باہر ابل پڑیں۔ اور زبان منہ سے باہر لٹک آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرتے وقت بھی مجھکو منہ چڑا رہا ہے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور موٹی موٹی سیاہ رگیں اُس پر ابھر آئی تھیں۔ پیشانی پر موت کا پسینہ نمودار تھا۔ ناگاہ دروازہ

زور سے کھلا اور لوگوں کی ایک بھیڑ اندر گھس آئی۔ کسی کی زبان پر پاگل اور کسی کی دیوانہ تھا میں اس نے حسن سکار کو چھوڑ کر دروازہ کی طرف لپکا۔ لوگوں نے مجھے روکنے کی ناکام کوشش کی دو چار دھکوں میں راستہ صاف تھا۔ میں گلی سے نکلکر جنگل کی طرف دوڑا۔ انھوں نے میرا تعاقب کیا۔ مگر میں ہوا پر سوار تھا سینکڑوں روحیں مجکو اڑائے لئے جا رہی تھیں اور میری کامیابی پر مجھکو مبارکباد دے رہی تھیں۔ قدموں کی آوازیں اور شور و غل کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بالکل موقوف ہو گیا میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی کامیابی پر خوب ہنسا۔

یکایک میرا سر چکرایا زمین و آسمان گردش کرنے لگے۔ ستارے ناچ رہے تھے۔ اشجار رقص کر رہے تھے مجھ پر ایک گہری بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہوئی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اپنے کو یہاں پایا۔ عوام اس کو پاگل خانہ کہتے ہیں مگر میں اس گوشۂ تنہائی میں خوش ہوں کیونکہ یہاں دنیا کی طرح بغض عناد بدمعاشی مکر و فریب کے سینکڑوں پھندے پھیلے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم دیوانے تارک الدنیا اولیاؤں کی سی زندگی گذارتے ہیں۔

ساجد احمد دہلوی بی اے آنرز

سننے والے (دی لسنرز)

رات کا سماں تھا کہ ایک سوار　　جس کا شبدیز [illegible]
سڑک پر گھوڑے [illegible] آیا　　[illegible]
اور گھوڑے [illegible]　　[illegible]
بولا "گھر میں ہے کوئی [illegible]　　[illegible]
سب کی خاموشی چھائی تھی گھر پر　　[illegible]

پر نہ اُس گھر میں سے کوئی بولا — نہ تو جھانکا نہ آ کے در کھولا

اُن سے دوبارہ کھٹکھٹایا در — گھر کے پیچھے سے پھڑپھڑایا پر

اس کے اک جانور نکل کے اُڑا — ایسا غائب ہوا کہ پھر نہ مڑا

گو نہ بولا نہ جیسا کوئی انسان — وہ مسافر ہوا بہت حیران

[illegible] سوار — گھر کے رہنے کے اب سے محرم راز

سنتے آواز [illegible] آئی تھی — خالی گھر میں تو بیچ کہانی تھی

تھی جہاں تہاں کی نہ آواز — [illegible] سفلہ نواز

زور سے سارے [illegible] پھر سوار — اور چلا [illegible] پھر کہا اک بار

[illegible] میں آیا تھا — صادق القول ہوں میں اور سچا

[illegible] مایوس [illegible] چلا — پھر نہ کوئی [illegible] آیا

پھر بھی کوئی نہ بولا [illegible] — باوجود کہ اک تھا سب بیدار

[illegible] ہوا میں اور [illegible] — گونجی آواز [illegible]

[illegible] — [illegible]

(مترجمہ) خان احمد حسن خان چیف ایڈیٹر

بس حد ہو گئی

(ڈاکٹروں سے دانت نکلوانے بند کردو)

یہ نسخہ جناب خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خان صاحب مرحوم آنریری مجسٹریٹ ڈسٹرکٹ اعظم لاہور پروفیسر میڈیکل کالج کا ہے
ڈاکٹروں سے دانت نکلوانے بند کردو کیونکہ انوری منجن کے استعمال سے کلی صحت ہوتی ہے
اگر آپکے دانتوں کو سب ہو رہا لگ گیا ہو تو انوری منجن استعمال کریں ۔ اگر آپکے دانتوں سے خون آتا ہو تو انوری منجن استعمال کریں
اگر آپکے دانتوں سے بہت بو آتی ہو تو انوری منجن استعمال کریں ۔ اگر آپکے دانتوں میں کیڑا لگ گیا ہو تو انوری منجن استعمال کریں
اگر آپکے دانت ہلتے ہیں تو انوری منجن استعمال کریں ۔ اگر آپ چاہتے ہیں آپکے دانت موتی کی طرح چمکدار ہو جائیں تو انوری منجن استعمال کریں
اگر آپکے دانت درد اور رسیلے ہیں تو انوری منجن استعمال کریں تو آپکو انوری منجن کے استعمال سے [illegible]
نجات حاصل ہو جائیگی اس منجن کو بلا خوف مسلسل استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ اس کوئی چیز خلاف [illegible]
فی شیشی (۸) علاوہ محصولڈاک جو شیشی کے خریدار کو اگر نصف درجن کی [illegible] ارسال کریں تو محصول معاف ہے

تازہ شہادتیں

مکرم جناب منیجر صاحب دام برکاتہٗ السلام علیکم مزاج شریف آپکا ارسال کردہ انوری [illegible] مریض کو استعمال کرایا بہت مفید ثابت ہوا ہے براہ کرم ایک درجن شیشی منجن انوری [illegible]
فرما کر مشکور فرماویں زیادہ آداب راقم الحروف حکیم دوست محمد جالندھر شہر محلہ کمار ان
جناب ڈاکٹر اسلم ریاض خان [illegible] جناب منیجر صاحب السلام علیکم [illegible] آپکی تیار کردہ منجن کی مجھے اپنے کسی دوست کی معرفت ملی شیشیوں سے کئی ایک مریضوں پر آزمایا [illegible]
تحفہ بھی بالعد استعمال سے آپکے منجن کی تعریف کی [illegible] خود بھی سکو حملہ [illegible] براہ کرم ایک درجن
شیشی انوری منجن بذریعہ وی پی بہت جلد ارسال فرمائیے ڈاکٹر اسلم ریاض خان [illegible]
جناب حکیم سیف الرحمٰن رحمانی دواخانہ [illegible] تحریر فرماتے ہیں کہ میرے پاس [illegible]
آپکے منجن انوری کے استعمال سے وہ صحت یاب ہو گئے [illegible] بذریعہ وی پی ایک درجن شیشی [illegible]
[illegible] آپکا ایجاد کردہ انوری منجن استعمال کیا [illegible] مفید ثابت ہوا [illegible] استعمال کیا وہ [illegible]
[illegible] عام لوگوں کو دانتوں کی پرواہ کرنا [illegible]
[illegible] بذریعہ وی پی ارسال فرماتے [illegible]

ملنے کا پتہ: ڈی الور جنرل سپلائنگ ایجنسی وطن بلڈنگ [illegible]

جناب خانصاحب احمد حسین خانصاحب چیف ایڈیٹر شباب اردو کی

مشہور عالم تصانیف

رانیاں اور شہزادیاں

تازہ ترین تصانیف

جسمیں ساٹھ رنگین تصویریں ہیں۔ اور جو ہز ایکسلنسی لیڈی ہیلی بالقابہ کے نام نامی پر اُنکی اجازت سے معنون ہے۔ اس کتاب کو شروع کرکے ختم کئے بغیر چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا نہایت دلکش ہے۔ قیمت مجلد سنہری بالتصویر دو روپے (عہ) معمولی جلد عہ

لالہ زار - لالہ زار - لالہ زار - لالہ زار

یعنی

خانصاحب کے حیرت انگیز اور دلچسپ مختصر افسانوں کا مجموعہ جو جناب گورنر پنجاب بالقابہ کے نام نامی پر انکی اجازت سے معنون ہے۔ قیمت حصہ اول و دوم مجلد سنہری بالتصویر چار روپے آٹھ آنہ علاحدہ جلدیں دو روپیہ۔

سیرۃ احمدی

یعنی

سوانح حضور اقدس سرور عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

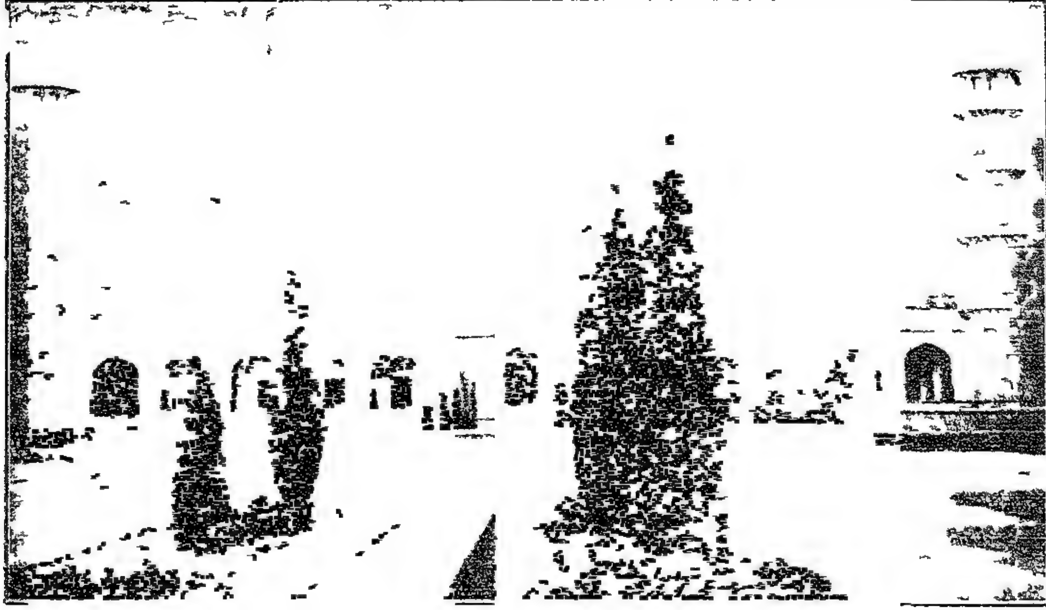
اس کتاب میں حضورؐ کی سوانح عمری کے علاوہ اولاد و ازواج کا تذکرہ بھی ہے حصہ دوم میں حضورؐ کی تعلیم اور اسکی فلاسفی نبوت و معجزات اور اُنکی فلاسفی مسئلہ ازواج طلاق غلامی اسلام [illegible] ان سوالات پر مفصلاً علیحدہ علیحدہ باب قائم کرکے بحث کی ہے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے خانصاحب نے اسے دلکش پیرایہ میں لکھی ہے۔ اور علامہ شبلی کی کتاب کے بعد بہترین سیرت ہے قیمت درجہ اول (عہ) درجہ دوم (عہ)

نوٹ: آرڈر آنے پر ہر قسم کی انگریزی فارسی اردو کتابیں مہیا کی جاتی ہیں اور ڈاک کے ہمراہ بھی منگائی جاسکتی ہیں۔

ملنے کا پتہ: **منیجر شباب اردو لاہور**

23/11/19

شاہدرہ، لاہور



مقبرہ جہانگیر۔ شاہدرہ



رام سیتا اور لکشمن جی بن باس کو
جا رہے ہیں

جلد ۸ نمبر ۶ بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء

شذرات

ہم نے نہایت رنج اور صدمہ کے ساتھ اس خبر کو سنا ہے کہ رسالہ اردو کے ممتاز معاون جناب مولوی ڈاکٹر محمد احمد صاحب سبحانی ایم اے ایل ایل ایم بی - ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا جو شعبہ عربی اور تاریخ اسلام [illegible] مقرر ہوا کر [illegible] ریل سے سفر فرما رہے تھے لیکن ایک فلسطینی کی حرکت [illegible] آپ کے واصل بحق ہونے سے رسالے اردو کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچا ہے ہم حیران تھے کہ وہ گذشتہ آٹھ ماہ سے کیوں خاموش ہیں اور کیوں [illegible] آتا ہے [illegible] مضامین لکھے ہیں آخر یہ عقدہ اب حل ہوا ہے۔ اور ہم سب ان کے غم میں سوگوار ہیں آپ کی تصویر مع [illegible] سالہ میں موجود ہے۔ اور ہم مشکور ہوں گے اگر کوئی صاحب ہمیں ان کی زندگی کے حالات سے آگاہ فرمائیں گے۔ خدا انکو جنت نصیب کرے۔

رسالہ اردو بفضل خدا پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے۔ یوم اشاعت ہر ماہ کا آخری دن ہے اگر ڈاکخانے والے اس وقت رسالہ کو راہ میں لوٹ لیتے ہیں اگر کسی سرپرست کو [illegible] تاریخ کو رسالہ نہ ملے تو اطلاع فرما کر دوبارہ منگایا جا سکتا ہے۔

اپریل کا شمارہ [illegible] موجود ہیں جو اصحاب دسمبر تا مئی [illegible] کے درخواست [illegible] اور ان کا سال اگست سے شروع ہوگا۔

افسوس کہ غلطی سے [illegible] لکھا گیا ہے [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شباب اردو

[illegible]

برسوم لعل [illegible] ہوا پچاس سال کا [illegible] مگر اس عمر میں بھی شراب کا رسیدہ تھا۔
بادہ گساری کو وہ [illegible] سمجھتا تھا دن رات [illegible] ہر وقت بادہ پرست
[illegible] دیکھو مخمور [illegible] اگر کسی [illegible] آ [illegible] ہوا کرتے تھے
بار برسوم لعل کو [illegible] انسان [illegible] شرابی ایسا
لالو جی کہاں [illegible] کی تھی۔

انگریز [illegible] جا چکے ہیں آج برسوم
[illegible] کی تھی روپئے اور
[illegible]
[illegible]

چوک کو ترمار ہے کے بعد ٹھہر گیا دوکان کے باہر تختی کا سائن بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر جلی حروف میں ریسٹورانٹ لکھا ہوا تھا مگر یہ ریسٹورانٹ تھا نہ ہوٹل نہ ہندوستانی بار تھا۔ جس میں رات کو وہ لوگ جو ہندوستانی سفرا کہلاتے ہیں جمع ہو کر جوا کھیلتے تھے اور مٹھائیاں چکھتے کباب کھاتے۔ شراب پیتے اور گانا سنتے تھے

پرشوتم لعل کی آمد و رفت عموماً ہوٹل اور کم حیثیت کے جوا لوں میں بھی یہ پہلی رات تھی کہ اس نے اس ہندوستانی ہوٹل میں قدم رکھا وہ دیسی شراب۔ گلوار کی کچوں اور ٹھرے کا عادی تھا۔ آج اسے شامپین اور سیری کا سودا دامنگیر تھا۔ جس وقت اس نے بڑے ہال میں قدم رکھا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں ہال کا فرش سنگ مرمر کا تھا بجلی کے جھاڑ اور بڑی فانوس جگمگ کر رہے تھے بیسیوں گول میز اور طلاکار شامیاں قرینے سے دھری تھیں جن کے گرد مہمان بیٹھے ہوئے برف کی قلفیوں اور انگریزی مٹھائیوں پر روپے نثار کر رہے تھے۔ اور بادۂ احمر کے جام لنڈھا رہے تھے

جس وقت پرشوتم لعل نے جھجکتے جھجکتے ہال میں قدم رکھا تو اس نے دیکھا کہ خدام جن کی وردیاں سرخ پٹکے زرد اور پگڑیاں سنہری تھیں۔ ادھر ادھر مصروف اہتمام ہیں۔ کوئی بوتلوں کی پلیٹ کوئی گلاس کوئی رکابی کوئی مٹھائی کی طشتری لیے ہوئے ہے کسی کے ہاتھ میں [illegible] اور [illegible] جس کا جمگھٹا ہو [illegible] ہے پرشوتم کو دیکھ کر خدام کا جمعدار اس کی طرف بڑھا بڑے ادب سے جھک کر سلام کیا۔ اور اسے ایک درمیانہ میز کے رو برو بٹھا دیا۔ اور پھر نہایت مہذب پیرایہ میں دریافت کیا کہ حضور کس چیز کا شوق فرمائیں گے۔ پرشوتم کے سر سے جو یہ ٹھاٹھ دیکھ کر [illegible] اتر گیا تھا [illegible] دم بھر دل میں میرے پاس سامان بس تھا [illegible] لیے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا دماغ گرم اور احساس کم ہونے لگی اسے ایسا معلوم ہوا کہ یہ جگہ ہوٹل نہیں۔ بلکہ مسلمانوں کا بہشت اور ہندوؤں کا سورگ ہے [illegible] شراب [illegible] اس وقت اس کے لئے [illegible] بڑھ کر بیٹھی تھی اور [illegible] تھا اس کے خیال میں راجہ اندر کے

اکھاڑے کے راگ پر اُوس برس رہا تھا پرسوتم نے بےخودی کے عالم میں کئی گلاس خالی کر دیئے یکایک اُس کا دماغ اور جسم بوجھل پڑتا ہوا سا اُس نے دلبر ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مہمان بظاہر جلیل القدر مہمان جو بس پوتر مہمان اپنے اپنے حال میں مست تھے ایک کو دوسرے کی پرواہ نہ تھی۔ وہ پرستش شراب راگ رنگ اور کباب میں دنیا و مافیہا سے اس وقت غافل تھے۔ یکایک پرسوتم کو یہ معلوم ہوا کہ ایک شخص قریب اندام۔ سیاہ رنگ سیاہ پوش سرخ جسم کی رنگت جو ٹھیک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اُسے گھور گھور رہا ہے۔ پرسوتم کو اُس کا ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ جب آنکھیں چار ہوتی تھیں تو ایک عجیب قسم کی سنسنی اُس کے جسم میں پیدا ہو جاتی تھی۔ اور وہ منھ پھیر لیتا تھا۔ ایک بوتل جب ختم ہو گئی تو اُس نے دوسری منگائی اور دوسری میں ایک قطرہ نہ رہا تو تیسری کی باری آئی اُس کے بعد اُسے یاد نہ رہا کہ تیسری آدھی رہی کہ تمام خالی ہو گئی۔ اب پرسوتم نے یہ محسوس کیا کہ آدھی رات بیت چکی ہے۔ اب ہوٹل بند کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ جھاڑ اور فانوس گل ہو رہے ہیں مہمان جا رہے ہیں۔ ہال قریب قریب سونا ہو گیا ہے۔ پھر اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے جمعدار سے بل مانگا ہے مگر یہ یاد نہیں کہ کیسے روپے ادا کئے ہیں۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی اسی جگہ سے اٹھا ہے۔ پاؤں قابو میں نہیں ہیں قدم ڈگمگا رہے ہیں چند قدم چل کر وہ نصف دائرہ کا چکر کاٹتا ہوا پھر ہال میں واپس آگیا ہے۔ اور ایک کونے میں ایک نقلی درخت کے نیچے جو آرائش کے لئے وہاں سجائی ہوئی رکھی ہوا تھا ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا ہے پاؤں کھول کر پڑا ہے۔ آرام کرسی پر کمر ٹیک کر وہ پاؤں پھیلا رہا ہے۔ کہ اُس کی نگاہ سامنے کی طرف اُٹھی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ایک اونچے چبوترہ پر ایک میز ہے۔ میز پر ایک بجلی کا لیمپ۔ ہال کے تمام لیمپ اور قمقمے گل ہو چکے ہیں صرف یہی ایک لیمپ روشن ہے اور اس میز کے سامنے وہی دیوانہ۔۔۔ فیل جسم سرخ جسم یہاں بیٹھا ہوا اب بھی اُسے گھور رہا ہے۔ یکایک آدھی رات کے گھڑیال کی آواز اس کے کان میں آئی ہے۔ اور پھر اسے حال و استقبال کا اُسے کچھ ہوش نہیں رہا

~~~~~~~~
~~~~~~~~

غالباً ایک گھنٹے کے بعد ہرسوم نے آنکھ کھولی - اور اٹھکر کھڑا ہوگیا - لیکن سر میں درد تھا - پاؤں سو سو سے کے ہو رہے تھے اور اُن میں حرکت کی طاقت نہ تھی حیران ہو کر پھر آرام ہو کی پر گر پڑا - اور دہشت پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر تکنے لگا - ہال میں تاریکی تھی صرف ایک لیمپ مدہم روشن تھا - ہرسوم کے گرد چوکیوں پر بہت سے زن و مرد بیٹھے ہوئے تھے - سب سادہ پوش تھے ان میں بوڑھے بھی تھے اور بڑھے بھی خوبصورت جوان عورتیں بھی تھیں اور ادھیڑ بد شکل بھی - کمیٹی سو رہی تھی - اور کمیٹی کا صدر وہی شخص تھا جس [illegible] ان سب زن و مرد کے چہروں پر ایک عجیب قسم کی وحشت ہویدا تھی [illegible] ہرسوم کا سینہ لگا سب سے سکتے صدر اپنی کرسی سے اٹھا - اور کچھ تحفہ [illegible] تو ہرسوم کو یک لخت یوں لگا کہ گویا درخت کی آڑ میں چھپا بیٹھا تھا - [illegible] اور وہ سن رہا تھا کہ صدر کیا کہہ رہا ہے - مگر صدر کا چہرہ ہنگامہ [illegible] ہو گیا - اس کے بعد نذام کا [illegible] اس کی [illegible] اٹھا اور [illegible] کا مطلب ہرسوم اگر [illegible] معلوم ہوتی [illegible] دیکھتے دیکھتے جمعدار [illegible] اور سوم کی [illegible] ہی جب اُس نے دیکھا کہ وہ اُس [illegible] جہاں [illegible] اور یہاں سے اب وہ پنشن لیکر [illegible] جمعدار کی [illegible] بعد [illegible] ہرسوم کا ایک [illegible] ڈاکٹر تھا - ڈاکٹری [illegible] - وہ کہہ رہا تھا کہ صرف ایک گو [illegible] مالی [illegible] آس [illegible] اللہ [illegible]

[illegible] ڈاکٹر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دہن اور ہونٹوں پر بھی وہی وحشت نمودار تھی۔ جو شکاری درندوں کے چہروں پر دیکھی جاتی ہے۔ اس عورت نے کہا کہ جس غذا کی جناب ڈاکٹر صاحب نے تعریف کی ہے وہ واقعی لاثانی ہے۔ لاجواب ہے بے نظیر ہے۔ لیکن وہ نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ اس وقت نایاب کہا جا سکتا ہے۔ میرے علاقہ میں پولیس کی شرارت اور بڑے سن کے لوگوں کی حماقت سے اس کا دستیاب ہونا قطعی ناممکن ہے۔ افسوس ہے کہ آج میں خالی ہاتھ آئی ہوں ہماری انجمن میں ڈاکٹروں کا کال ہے۔ صرف ایک ہی ڈاکٹر ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس غذا کا کال نہ ہو تو جہاں تک ہو سکے ڈاکٹر مہیا کیجئے۔ آج میری باری تھی۔ لیکن میں نے کہہ دیا ہے کہ میں خالی ہاتھ آئی ہوں۔ آپ کو بھوکا رہنا ہوگا میں نے بہت دوڑ ماری لیکن مجھے . . نہیں ملی۔

جس وقت عورت نے تقریر ختم کی تو اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ اور اُسکے ہونٹ اور چہرہ بوجہ ناکامی ملتانی مٹی کے ہم رنگ تھے۔

اس کی تقریر سنکر اراکین انجمن کی تمام مسرت یک قلم زائل ہو گئی۔ سب کے چہرے مکدر ہو گئے۔ بعض نے صریحاً ناراضگی کا اظہار جلے کٹے فقروں میں کیا۔

آخر ایک مدور وا دھیڑ عورت جس کے چہرے پر سیاہ سیاہ داغ تھے۔ غضبناک ہو کر اٹھی اور بولی۔ کہ کیا رام گلی کی جلاوطن دار خالی ہاتھ آئی۔ تب تو ہم سب بھوکے گھر جائیں گے۔ حاضرین نے یک زبان جواب دیا۔ کہ ہاں یہی ہوگا اس پر وہ جوش میں آکر بآواز بلند چلائی۔ کہ پھر میری تجویز ہے کہ مرد سے تو خدا ایک سکیٹی اسی وقت قائم کی جاسکے اور وہ ہمارے قانون کے بموجب سزا تجویز کرے۔ اس تجویز کی تائید ایک ممبر جمال شخص نے کی اور وہ اتفاق رائے سے پاس ہو گئی۔

مسٹر سوم لعل درخت کے پیچھے بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ اُس وقت اس پر سکتہ کی حالت طاری تھی۔ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں اس کے دیکھتے دیکھتے انجمن کے جملہ اراکین اپنی جگہ سے اٹھے۔ دو میں سے ایک اُس

مارٹن کو پکڑا۔ اُس کے ہاتھ رسیوں سے باندھے۔ ایک نے بجلی کا چولھا گرم کیا۔ دوسرے نے اُس پر ایک کڑاہا رکھا۔ تیسرے نے صندوق کھولکر اُس میں سے لمبی لمبی چھریاں اور کلہاڑیاں جو قصائی استعمال کرتے ہیں نکالیں اور پرسوہم سمجھ گیا کہ یہ آدم خوروں کی انجمن ہے اور ملزمہ کے خلاف جو جرم ثابت کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ آج شب کی دعوت کے لئے مردہ مہیا نہیں کر سکی اس لئے بروئے قانون انجمن وہ مستوجب ہے کہ اُسے ذبح کرکے طعام دعوت قرار دیا جائے۔

کہ نگار حسینہ جو اس وقت ایک مایوسی کی تصویر بنی ہوئی تھی اور نسبتاً ایک ایک کا منہ دیکھ رہی تھی۔ یکایک بولی "بروئے قانون مجھے رہا کیا جائے اور مجھ سے نعم البدل لیا جائے آپ مردہ چاہتے تھے زندہ موجود ہے" یہ کہا اور اُس نے پرسوہم کی طرف اشارہ کیا ناگاہ اراکین انجمن میں ایک بجلی کی لہر دوڑ گئی سب بھوکے بھیڑیوں اور بڑے بھوتوں کی طرح پرسوہم کی طرف لپکے اور ملزمہ کے بند کھول دئے پرسوہم کا تمام نشہ ہرن ہو گیا۔ اور ضعف و نقاہت کافور۔ وہ شعلہ جوالہ کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ اس جدوجہد اور تگ و دو میں اُس کا دھکا جو بجلی کو لگا۔ "بلب" نیچے سے ٹوٹ کر گر پڑا۔ اور تمام کمرے میں تاریکی ہو گئی لیکن آدم خور نہایت سرگرمی سے اُس کا تعاقب کر رہے تھے ایک ان میں سے "سوئچ" کے قریب کھڑا تھا جس شخص کے پیچھے پرسوہم جاکر کھڑا ہوتا تھا وہ فوراً روشن ہو جاتا تھا۔ دوڑتے دوڑتے اور کودتے پھاندتے پرسوہم کا سانس پھول گیا۔ قریب تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے۔ کہ اُس کی نظر ٹیلیفون پر جا پڑی۔ حسن اتفاق سے اُسے کوتوالی کا نمبر یاد تھا اُسنے ایک جست کی اور اپنے آپکو ٹیلیفون تک پہونچایا اور جلد جلد ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پیغام دیا کہ آدم خور بلائے بے درماں کی طرح اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور وہ زمین پر گرکر بیہوش ہو گیا۔

پھر ڈاکٹر پرسوہم کو ہوش آیا تو رحمت علی شاہ ہیڈ کانسٹیبل جن کی طرح اُس کے

سر پر سوار تھا سو وہ اُسے سیشن مجسٹریٹ کی عدالت میں لے گیا۔ اور جب اُس کا مقدمہ مسمر فیصل ہوا۔ تو اُس کی جیب جس میں سب گذشتہ روپئے اور نوٹ تھے اب خالی تھی روپئے تو بدمستی کا جرمانہ سرکار نے لیا اور نوٹ ہوٹل کے مالک کی نذر ہوئے جسکی کئی کرسیاں اور لیمپ پرسوں کی بدمستی کی وجہ سے ٹوٹ گئے تھے۔

چیف ایڈیٹر (خان احمد حسین خان)

لمعاتِ اثر

(۱)

اگر ہے شوق کامل برق اُسکی جستجو کر دے　　بہار عاشقی کو بے نیاز آرزو کر دے
ترے جلووں کا منشا دل کو آئینہ بنا دینا　　تمنا دل کی اک آئینہ تیرے روبرو کر دے
نہیں ممکن اگر دیدار اسے دل یہ تو ممکن ہے　　کہ گردش رہ گذر میں اک چراغ آرزو کر دے
کبھی تو غور کر غافل مآل زندگانی پر　　کبھی تو محو دل سے یہ طلسم رنگ و بو کر دے
مذاق عاشقی رسوا نہ ہو جائے زمانے میں　　کمر تک آ گیا خنجر ہے اب اسکو تا گلو کر دے
ابھی تو کفر ٹھہرا اور ابھی اسلام جنوں سے　　یہ دل چاہے جسے دم بھر میں رسوا کو بکو کر دے
دل صد چاک و جیب پارہ پارہ ایک ہو جائے　　رفو ہے چارۂ وحشت تو ناصح یوں رفو کر دے
رواں آنکھوں سے جوئے خوں رہے گی اے اثر کب تک　　مناسب ہے یہیں ترجمہ دل کی گفتگو کر دے

(۲)

عشق سے حاصل ہوا جب دیدۂ بینا مجھے　　زندگی کا ہر ورق سادہ نظر آیا مجھے
کس قدر رحم کے قابل ہر اک سمجھا مجھے　　اس طرح پامال کر ڈالا اسی دنیا نے مجھے
شوق نے جب گم کیا اور رشک نے پایا مجھے　　جو نظر آتا مرا ہوتا نظر آتا مجھے
دل میں ہمت ہو تو اس ناکامیاں بھی کام کی　　ہر قدم منزل ہے اور رستہ نہ ملتا تھا مجھے

نقش نقش سجدہ ہے اک بوستان جمال
لو یہ سوز جبہ سائی کر دیا رسوا مجھے

دل کی دل میں رہ گئی اور دم لبوں پر آ گیا
اُس نے دیکھا اور اس انداز سے دیکھا مجھے

اک ذرا گردن جھکائی اور دل خالی ہوا
کاش مل جاتے خلوص سجدہ سا مجھے

میری طینت ہے جہاں آسودۂ حسن عمل
دوش بھولا جو اب ہے آشنا ہے فردا مجھے

بے نیاز وصل ہجراں محرم اسرار عشق
لو یہ سب کچھ دے دیا جب دل نا آشنا مجھے

سنگ جب ہوتی ہیں دلبر دو جہاں کی وسعتیں
پوچھ جاتا ہے وہ میرا لو مجھے دالا مجھے

غمزۂ ناز و ادا کا ایک جسم ہمراہ تھا
اور رکھنے کو ملا سیدا دگر تنہا مجھے

دم بخود دیکھو کہ ہوں حیرت سے تماشا جہاں
موج بھی آئی نظر لب تشنۂ دریا مجھے

ساز و مرگ عاشق تم کو مبارک ہو اثر
اور اک عالم کی ہے تنہا یہ دنیا مجھے

جعفر علی خاں اثر بی۔ اے

خونِ آرزو

(۱)

آج سے کچھ سال پیشتر مشرقی فرانس کے ایک گوشہ میں قدیم درختوں اور بوسیدہ دیواروں کے درمیان ایک مکان تھا جو عام گذر گاہوں اور شاہراہ سے اس قدر دور واقع ہوئی تھی کہ وہاں کے رہنے والوں کی نسبت سکون اور خلوت پسند ہونے کا گمان ہوتا تھا اُس کے چاروں طرف ایک عمر رسیدہ اور کار رفتہ باغ احاطہ کئے ہوئے تھا۔ جو سال بسال اُس باکرۂ صحرا کی ہیئت اختیار کرتا جاتا تھا جو انسان کی جرأت دستبرد سے ملوث نہ ہوا ہو درختوں کی شاخیں دیواروں سے بلند تھیں اور بعض سے بھری ہوئی جھاڑیوں سے جا بجا فرش سبزہ گانا پیدا کر دیتے تھے جھاڑیاں پھولوں کے تختوں سے ہم آغوش تھیں اور ایک شفاف پانی کا چشمہ سایہ دار درختوں

سے سرگوشیاں کر اٹھا کرتی تھیں مگر اب تو یہ عالم تھا کہ بیچ پتھروں کے ٹوٹ جانے سے تالاب سے پانی نکل کر ایک جھیل کی صورت بنا چکا تھا — اور اُس کی خاموش و درخشاں سطح آئینہ کی طرح ستونوں سے ڈھلکتے ہوئے وسیع صحرا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے معلوم ہوتی تھی دوسری طرف ایک بوسیدہ کشتی جو خود بخود اپنی جگہ سے دبی جا رہی تھی سطح آب پر تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ سرکش بیل جس نے مکان کی اینٹوں، پتھروں اور دیواروں پر اپنی زلف گرہ گیر کا طلائی جال پھیلا رکھا تھا اور مکان کی انتہائی بلندی تک پھیل کر ریشمی جھولوں کی طرح پر پیچ حلقے بنائے ہوئے اب پھر نیچے کی جانب آ رہی تھی۔ نسیم صبح کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سے اس طرح لہراتی تھی گویا کسی مست سانپ کی طلائی زلفیں ہوا سے دست و گریباں ہو رہی ہوں۔ تختہ ہائے گل کی جگہ اب ہری ہری گھاس کا فرش زمردیں بچھا ہوا تھا۔ اور جن مقامات میں پہلے گلاب و یاسمین کی سرسبز ٹہنیاں لہراتی تھیں اب وہاں صحرائی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

باغ کے دروازہ سے ایک سنگی راستہ اُس مکان تک گیا تھا۔ راستوں کے پتھروں کے جوڑوں میں کائی کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اب اُن دو فرشتوں کے خوبصورت مرمریں مجسموں میں سے جو دروازہ کی دونوں جانب ایستادہ تھے صرف ایک اپنی جگہ نظر آتا تھا۔ دوسرا نصف سے زیادہ زمین کے اندر دھنس گیا تھا اور باراں کی غارتگری نے اُسکی ساری دلآویزی مٹا دی تھی اور اب وہ زمین پر سر بریدہ سنگیں نعش کی طرح پڑا ہوا نظر آتا تھا۔

مکان کے اندرونی احاطہ میں ایک وسیع صحن تھا۔ جس کے وسط میں ایک گہرا کنواں بنا ہوا تھا جس کے چاروں طرف انگور کی پُرپیچ بیلوں نے اپنا تسلط جما رکھا تھا۔ خوبصورت مربع پتھر کائی کے سبز جاموں میں ملفوف تھے۔ اور بارش کے سبب آہنی سرپوش میں جابجا سوراخ پڑ گئے تھے۔

اس مکان میں جہاں کبھی اسباب آرائش و تجمل کی فراوانی رہی ہوگی اب صرف اُن کے افسردہ آثار باقی رہ گئے تھے۔ اطلس و دیبائے زرنگار کے پردوں اور بیش قیمت

فانوسوں میں بند رکھنے پر صرف کیا گیا ہوگا۔ کھڑکیوں اور دروازوں میں لٹکی ہوئی نفیس جھالریں جو سالہا سال سے اُن پردوں میں جو کسی وقت بہت قیمتی رہے ہوں گے۔ اب بوسیدہ ہو چکے تھے اور سب پردے زمانہ کے ہاتھوں اپنی ساری آب و تاب کھو چکے تھے دیواروں پر آویزاں سرخ اطلس کے پردوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ آرام کرسیوں کے کپڑوں کا تارو پود بکھر گیا تھا۔ تصویروں کے چوکھٹوں کا رنگ و روغن بھی رخصت ہو چکا تھا۔ دروازوں کی چولیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اور بوسیدہ دروں کے بیچ سنگ مرمر کی اسٹولوں کے تمام جوڑ علیحدہ ہو چکے تھے۔ غرضیکہ ہر چیز سے دیرینہ روزی کے آثار ہویدا تھے۔ اور ہر سے بہت خاموشی سے زمانہ کے ہاتھ کی اثرات نمایاں تھی۔ اور عجیب پژمردگی اور اُداسی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ گذشتہ صدی کے طرز و انداز میں ڈوبی ہوئی اس چہار دیواری کے اندر ایک حسین دوشیزہ رہتی تھی۔ جسکا نام ہورٹنشا تھا

(۲)

کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کون ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور اس ویران مقام میں اس کا قیام لوگوں کے لیے وجہ حیرانی تھی۔ اور وہ خود اُن کے لئے معمہ لاینحل۔

یہاں کی ہر ایک چیز سے رنگ اضمحلال ٹپکتا تھا۔ نہ یہاں پھولوں کی بستیاں تھیں نہ طائران خوشنوا کی زمزمہ سنجیاں۔ حتی کہ ابابیلیں بھی اس مقام کے قریب آنے سے گریز کرنے لگی تھیں اور اس مکان کی سیاہ پتھروں سے چھائی ہوئی خمیدہ چھتوں کو چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ ناہموار جھاڑ جھنکاڑ نے اسکو سنبھال لیا تھا۔

اس دوشیزہ کی حالت اور اُس کی قیام گاہ میں زبردست یکسانیت تھی مکان اسکا اور اطراف میں پھیلے ہوئے کھنڈروں سے اداسی برستی تھی جو اُس کی حرماں نصیب طبیعت کے بالکل موافق تھی۔ اس کی الم زدہ رفتار اور درختوں کی نیم مردہ شاخوں کی مسلسل حرکت ایک دوسرے سے مشابہ تھیں اس کے چہرے کی زردی اور ابر آلود آسمان کی حسرت ناک اُداسی میں عجیب یکسانیت پائی جاتی تھی۔ جس میں اس ملک کی شاعرانہ حرماں نصیبی اور اُس دوشیزہ کی خاموش متانت باہم گھل مل کر ایک معلوم ہوتی ہیں دکھائی

نشستگاہ کے اطراف میں پھیلی ہوئی روشنی اور اُس کی نگاہیں دونوں یکساں طور پر مبہم تھیں۔ کیونکہ اگر فضائے بسیط میں بچھی ہوئی گہری وسیع چادر ایک گواہی آغوش میں لیتی اُس کا حسن دوبالا کر لیتی تو دوسری پر آنسوؤں کا نقاب پڑا ہوتا جو اُس کی جولاں دور سے آنکھوں کی رنجیدگی میں اور اضافہ کر دیتا ہر شخص اپنی اپنی پرواز تخیل کے مطابق حور سیما کی نسبت جداگانہ رائے رکھتا تھا۔ کوئی سمجھتا تھا۔ کہ وہ کوئی جانثار سیاحہ ہے جو دنیا کی سیر سے اکتا کر کنج عزلت میں پُرسکون زندگی بسر کرنا چاہتی ہے کسی کا خیال تھا کہ وہ کوئی حسرت نصیب بیوہ ہے جو اپنے محبوب خاوند کی دائمی مفارقت میں دنیا کو خیرباد کہہ چکی ہے۔ اور چند خوش خیال لوگوں کا خیال تھا۔ کہ وہ کسی دلیر و خوبرو نوجوان کی معشوقہ ہے۔ جو اپنے محبوب کے لئے سرگرم انتظار ہے۔ اور اُس کی واپسی کی مہمل امید پر ہجر کی صبر آزما گھڑیاں کاٹ رہی ہے لیکن اُس کے راز ہائے دلی سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ حور تمثال اپنے جانکاہ رنج و غم کو متانت و سنجیدگی کے پردہ میں اس طرح چھپائے ہوئے تھی جس طرح کوئی عظیم الشان سایہ دار درخت اپنے سینہ کے اندر اُن مہلک جراثیم کو پوشیدہ رکھے جو اندر ہی اندر اُسے کھوکھلا کئے دیتے ہوں۔

(۳)

۱۸۷۱ء کا پر آشوب زمانہ آپہنچا۔ اور جرمن و فرانس کے درمیان جنگ چھڑتے ہی زمانہ میں بھاگڑ مچ گئی۔ حکومت فرانس کو پے در پے ہار ہزیمت اٹھانی پڑی اور جنگ کی ابتدائی چند [illegible] دنوں میں شہر گویا ایک مقتولوں کی صورت اختیار کرلی شاہ راہیں اُن مظلوموں سے بھر گئیں جو اپنے مویشیوں اور گھروں کو چھوڑتے ہوئے کسی امن گوشہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ انسانی درندوں کا غول چاروں طرف سرسبز و شاداب کھیتوں کو پامال کر رہا تھا۔ جابجا شکستہ گاڑیاں پڑی ہوئی نظر آتی تھیں۔ جن میں اسباب خانہ داری نہایت بے ترتیبی سے ٹھونس ٹھونس کر بھرا ہوا تھا۔

دھوئیں کے دل بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے جن میں دور سے چلنے والے

مکان کی چنگاریاں بھی اڑتی نظر آتی تھیں

ہورتنسا کے گھر سے مشرق میں واقع تھے۔ قریب ہی میں دو پہاڑ ان لطیمہ اٹھائے اس منظر کو خاموشی سے تک رہی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک سادات وادی تھی، جس کی بہت مضبوطی سے قلعہ بندی کی گئی تھی۔ اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جسے جنگ کے لحاظ سے بہت اہمیت حاصل تھی۔ یہ قلعہ پہلے ہی سے جرمن حملہ آوروں کے نظروں پر چڑھی ہوئی تھی۔ مشکل سے حملہ شروع ہوا ہوگا کہ ہورتنسا نے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر قریب و جوار کے میدانوں کا جائزہ لیا۔ دھوئیں کے اٹھتے ہوئے بادلوں کے پیچھے جنگی طیارے مشین گنوں اور بندوقوں کے منہ سے نکلنے والے شعلے رہ رہ کر توڑ رہے تھے۔ دو پہاڑوں کی قطار در قطار نظر آتی تھی مسوار رہتی) سات روز تک گولہ باری ہوتی رہی جو جرمنوں نے اپنی انتہائی قوت سے اس پر حملہ کیے کے اکٹھی بستی کرو! وہ وقت بہت ہی دردناک تھا جبکہ جو فرد لڑکی ایک عجائب سا کر بیٹھا۔ قصبہ کو مٹھی بھر محصور فوجی وہ انکا وقت رخصت مضطرب تھا وہ انکار کر کے اسے سر بپا مال دیکھ حسرت ناک نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر ایک لمحہ ٹھہرتے ہوئے عالم سراسیمگی میں آگے بڑھا۔ اٹھ بیٹھے۔ وہ دلدوز مناظر جو ہورتنسا کے پیش نظر تھے۔ شام تک اسی طرح جانے والے مقتولین کا تانتا بندھا رہا۔ اور جو لوگ نکل سکے تھے۔ اسی جان بچا کر نکل گئے۔ اس کے بعد شام کے دھندلکے میں جس کی تاریکی میں راہ گیروں کے قدموں سے اڑتی ہوئی خاک اور اضافہ کر رہی تھی۔ ہورتنسا کو دور میں ایک متحرک سیاہ نقطہ سا نظر آیا جو لمحہ بلمحہ اس سے قریب تر ہو رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اسکی ہیئت سمجھ میں آنے لگی۔ یہ دو سپاہی تھے جو ایک زخمی شخص کو کھاٹ پر ڈالے ہوئے لا رہے تھے۔ ہورتنسا سمجھ گئی کہ وہ لوگ اسی کے مکان کی طرف آ رہے ہیں چنانچہ بالاخانہ سے اتر کر اس نے نوکروں سے فوراً ہی جولانگاہ کو درست کرنے کے لئے کہا۔ اور خود صدر دروازہ میں ان کے استقبال کے لئے کھڑی ہو گئی اور جب وہ اس کے قریب پہنچ گئے۔ تو اس نے ایک خندہ بہ مسکراہٹ کے ساتھ

اپنے زینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہاں اس طرف سے اوپر" اُس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

(۴)

اُس زخمی نوجوان کے بعد چند زخمی اور لائے گئے۔ اُن کے بعد کچھ اور پھر تو اُن کا سیلاب امڈ آیا۔ پہلے والوں کو اچھے کمروں میں ٹھہرایا گیا لیکن بعد میں ہر چھوٹے بڑے کمرے بلا امتیاز اُن کے تصرف میں تھے تاہم زخمیوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی۔ کہ اس کے بعد انھیں نوکروں کے کمروں کمرہ ملاقات۔ برآمدوں اور اصطبلوں میں ٹھہرانا پڑا۔ ہورتینسیا کا مکان ایک جنگی ہسپتال بن گیا اور انجمن صلیب احمر کی ایک چھوٹی سی شاخ وہاں قائم ہوگئی۔ ہر طرف زخمی سپاہیوں کی درد بھری آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اور جنگ دور چلنے والی توپوں کی آواز ماند پڑنے لگی تو ان جاں سپار بہادروں کی کراہنے کی مشترکہ آوازیں اُسے بالکل فنا ہو جانے سے روک لیتیں۔

ہورتینسیا نے اپنے کپڑوں میں سے قیمتی اطلس کا ایک سُرخ جوڑا نکالا۔ اور اُس کی چار پٹیاں کاٹ کر سفید ریشم کے ٹکڑے پر سی دیا اور اس علم کو مکان کے بلند ترین حصہ پر آویزاں کرا دیا۔

(۵)

پسپا ہونے کے بعد فرانسیسی سپاہ نے اُس وادی کو بچانے کا عزم صمیم کر لیا گو جرمنوں کو فرانسیسی وادی پر گولہ باری کرنے کا اچھا موقع حاصل تھا لیکن دقت یہ تھی کہ اُن کی آتش بار توپوں اور قلعہ کے درمیان ہورتینسیا کی کوٹھی حائل ہوتی تھی جس پر صلیب احمر کا نشان لہرا رہا تھا۔ جرمن سپہ سالار نے اُس مکان کے خالی کئے جانے کا حکم صادر کیا چنانچہ ایک جرمن آفیسر فوراً تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوا اور تقریباً آدھ گھنٹہ میں باغیچہ کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ اُس کا قیاس تھا کہ شاید وہ یہاں کسی سہمے ہوئے بزدل الماعت پیر کسان سے دو چار ہوگا۔ لیکن اُسے قدرے تعجب ہوا۔ جبکہ اُسے اس امید کے خلاف وہاں ایک حسین و خوددار دوشیزہ کو کھڑا پایا جس کے چہرہ پر خوف و ہراس کا سایہ تک

نہ تھا اور حسن کے وقار حسن سے وہ خود مرعوب ہوئے بغیر نہ رہا۔

پہلے تو دوسرے نے اُس کی خواہش کے خلاف اُسے اُن جان بلب سپاہیوں کا معائنہ کرایا۔ جو اُس کے ہم قوموں کی بے پناہ توپوں اور بندوقوں کا شکار ہو کر دم توڑ رہے تھے۔ بعد ازاں اُن ٹوٹی ہوئی دیواروں کو دکھلائی ہوئی جو دشمن گولوں کی زد میں آ کر شکستہ ہو گئی تھیں۔ اُسے صدر دروازہ پر واپس لائی۔ اور اُسے ان الفاظ کے ساتھ رخصت کر دیا: "کہ اگر آپ کی مشین گنیں اور بندوقیں اس مکان کو اپنی گولیوں کا آماجگاہ بنانا چاہتی ہوں تو شوق سے بنائیں۔ میں کسی حالت میں اس مکان کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ان بہادر زخمیوں کی رفاقت میں مجھ پر جو کچھ گذرے گی اُسے میں خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں" ——— جرمن آفسر اُس کی صاف گوئی اور عزم توجہانہ گفتگو سے کھسیانہ ہو کر چلا گیا۔ تاہم وہ اُس کے رعب حسن اور نسوانی وقار سے اس حد تک متاثر ہو چکا تھا کہ سپہ سالار کو اپنی سرگذشت سناتے وقت وہ زیادہ تر ہورتنسا کے جمال جہاں آرائی کی تعریف کرتا رہا۔

جرمن سپہ سالار ایک خوبرو نوجوان تھا اور سیاست کی خامیوں سے بالاتر۔ اُس نے بذات خود اس پیچیدہ معاملہ کو طے کرنے کا ارادہ کیا اور دو محافظوں کے ہمراہ ہورتنسا کے مکان کی طرف چل کھڑا ہوا۔

جس وقت جرمنی کا وائس سپہ سالار ہورتنسا کے مکان پر پہنچا شام ہو چکی تھی درختوں کی ٹہنیاں ہر دو جانب سے جھک کر تمام راستوں میں گہرا سا سایہ کئے ہوئے تھیں۔ نیلگوں آسمان میں افق مغرب کی جانب نارنگی بادلوں کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔ جو لمحہ بلمحہ تاریک تر ہوتے جاتے تھے۔ شفق کی بے ڈول تصویر تالاب کی مدھم و تاریک لہروں پر رقصاں تھی۔ دیواروں پر پھولنے والی بیلیں خاموش تھیں۔ صحرا کے خودرو پودوں کی دھیمی دھیمی خوشبو سے ساری فضا مہک رہی تھی۔ ہورتنسا کی کوٹھی شام [illegible]ھی ہوئی تاریکی میں مبہم نظر آ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے نکلنے والی زردی مائل روشنی [illegible] چمگادڑیں مکان کے گرد منڈلانے لگی تھیں۔ احاطے کے پھاٹک کے

کتاب اُردو لاہور



لارڈ رپن

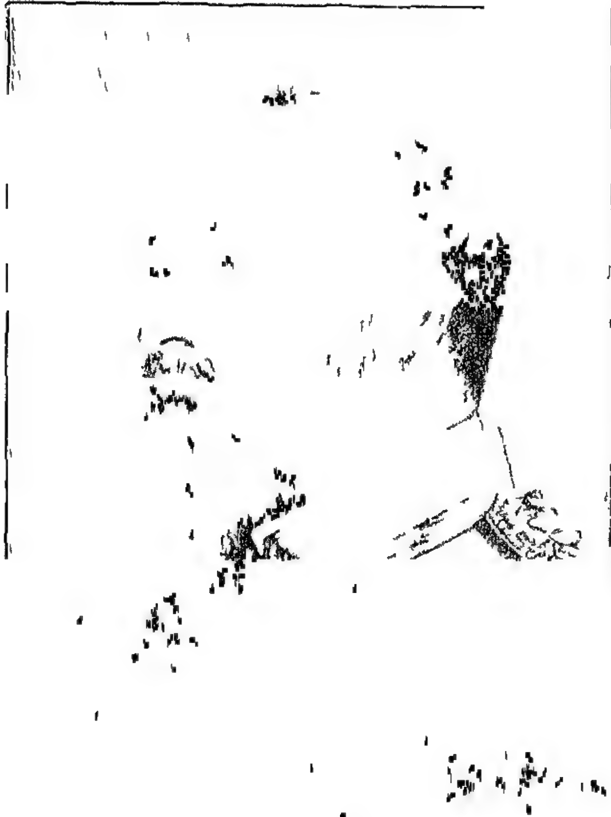
کتاب اُردو لاہور





لارڈ ڈفرن

شباب اردو لاہور



لارڈ کرزن

فرش فاتح و مفتوح افواج کے اسلحہ کا انبار بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا۔

ہورٹینسا دہلیز پر کٹہرے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ یہیں سے اُس نے نو وارد سپہ سالار کا خیر مقدم کیا۔ سالار فوج نہایت وجیہہ اور خوبصورت نوجوان تھا۔ اور چونکہ وہ خاندان شاہی سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اُن کی پوری زندگی میں اب تک کوئی شے خارج نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی پُرشکوہ مردانہ وجاہت اور طبعی لطافت کسی بھی عورت کو اپنے دام الفت میں گرفتار کرنے کے لئے کافی تھیں لیکن تاہم جب اُس کی نگاہیں ہورٹینسا کے حسن عالم سوز پر پڑیں تو اُسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کسی فوج کا سپہ سالار ہے۔ بلکہ خود کو ایک معمولی درجہ کا نیک طینت شریف انسان سمجھتے ہوئے اُس نے نہایت احترام سے اپنی ٹوپی اتاری اور آہستہ آہستہ اُسکی طرف بڑھا۔

اُنکی مہذب و شائستہ گفتگو کا سلسلہ دیر تک قائم رہا جس میں سپاہیانہ جلال و نوجوانی بے رحمی کا شائبہ تک نہ تھا۔ دوشیزہ کی دلبرانہ انداز گفتگو سے آفیسر کے قول کی حرف بحرف تصدیق ہو رہی تھی۔ ہورٹینسا کٹہرے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی کوئی روحانی ہستی معلوم ہوتی تھی۔ برآمدہ کی مدھم روشنی اُس کے سرمائی لباس میں جذب ہو رہی تھی۔ ہر ایک شے تاریکی میں ڈوب رہی تھی۔ اُس کا سایہ بھی حسن و دلکشی کا بے نظیر مرقع معلوم ہوتا تھا کھڑکی کے ایک کانچ سے منعکس ہونے والی روشنی سے اُس کے سر کے پیچھے فرش پر ایک سنہری حلقہ بنا ہوا تھا۔ جس میں کھڑکی کے چھوٹے چھوٹے چوکھٹوں کے سایہ سے جا بجا صلیب مقدس کے نشانات بنے ہوئے نظر آ رہے تھے فرش کے نالوں میں مینڈکوں نے ایسا شور اور ایک چھیڑ رکھا تھا اور دور جنگل میں کہیں سے لگل کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن نوجوان سپہ سالار کے کانوں میں صرف ہورٹینسا کی شیریں و مترنم آواز گونج رہی تھی اُس کے دل میں نہ تو وطن عزیز کا خیال تھا۔ نہ بادشاہ کی اطاعت کا نہ فرانس کی لوٹ کا جذبہ باقی تھا۔ نہ جنگ و فیروز مندی کا خیال مملکت شمال کا جو نقار وحشی لاطینی حسینہ کے قدموں پر سر گویا کھڑا تھا۔ ہورٹینسا نہایت خاموشی و متانت اور شائستگی سے ساری تیزی سے ساتھ اُس سے مصروف تکلم تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ

اسکا حسن بے ساختہ اس مقام سے آنکھوں کے لئے کافی عذر ہے

"سنیئے" اس نے سپہ سالار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کل آپ اس وادی پر حملہ آور ہوں گے۔ لیکن میری اس التجا پر توجہ فرمایئے کہ اگر آپ کی آتش بار توپوں کا ایک بھی گولہ اس مقام پر نہ گرا اور آپ کی بندوقوں نے اس مکان کی دیواروں کو اپنا ہدف نہ بنایا اور ان مصیبت زدہ اشخاص کی تکلیفوں میں آپ کی غلطیوں سے کوئی اور اضافہ نہ ہوا تو آپ کل شب کو یہاں دوبارہ آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں ——— شاید آپ کی فتح کی خوشی دوبالا ہو جائے ———

تھوڑی دیر بعد جس میں سپہ سالار نے اپنے کیمپ کا راستہ لیا۔ لیکن وہ تمام رات اسی سوال میں غلطاں و پیچاں رہا کہ یہ بات کیونکر تمام سپاہیوں کے ذہن نشین کر دی جائے کہ اس مکان کی حفاظت کس قدر ضروری ہے ———

دوسرے دن پہلے کی طرح فرانسیسیوں پر بڑے زور شور سے حملہ کیا۔ انگریزوں نے کئی گھنٹوں تک جو آتش فشانی کی لیکن تاریخ کے صفحات اس بیان سے بالکل خالی ہیں کہ اس اثنا میں جبکہ افواج میں کیا کیا احکامات صادر ہوتے رہتے تھے۔ یا کس شخص نے میدان جنگ کا نقشہ اور منصوبہ تیار کیا۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ بندوق کی ایک بھی گولی اس مکان کی چہار دیواری سے نہیں ٹکرائی۔ نہ ایک گولہ باغیچہ کی سرحد میں گرا حتیٰ کہ ہورسٹ کی معصوم بچیوں کے اندر بارود کا ایک ذرہ بھی نہیں گرنے پایا توپوں کے گولے وہ باغ کے اوپر دائرہ بناتے ہوئے فرانسیسی کیمپ میں پہنچتے رہے۔ وہاں کا گولہ اس مکان کی چھتوں اور درختوں کی پھنگوں سے اوپر ہی اوپر [illegible] اس مقام پر سوائے کانس کی کوئی اینٹ اپنی جگہ سے نہ کھسکی نہ کوئی بالی گری اور نہ ہی دروازے کی کسی کنڈی کو کوئی گزند پہنچا۔

(۴)

اس کے بعد جس دن شام کی تاریکی اور خاموشی مسلط ہوگئی دور افق میں کرۂ آتش کے مانند سرخ چاند نمایاں ہوا اور آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا پہلے

پہلی اُس کی آتشیں روشنی سے مکانات کی بلند برجیں جو شاں اور جنگلوں کے درخت منور ہوئے۔ بعد ازاں جوں جوں وہ آسمان میں بلند ہوتا گیا۔ اُس کی زردی زائل اور زردی صاف اور تیز ہوتی گئی۔ گویا زمین سے علیحدہ ہونے کے بعد اُن میں فلکی لطافت اور پاکیزگی سرایت کر گئی ہو۔ آخر میں آسمان کی انتہائی بلندی پر پہونچکر وہ اسی حملہ شوکت و رعنائی کے ساتھ زمین کی لامحدود وسعتوں پر حکمرانی کرنے لگا۔

جون کا موسم گرما کی اُس سہانی رات کے اسد ساکت تھا آہستہ آہستہ (؟) رواں تھے

سمیں میں ملفوف تھے ہوتے بھی جاند کی مرمریں دیوار پر ایک شخص ٹیکے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پر کان لگائے اسمانی سپہ سالار کا انتظار کر رہی تھی۔ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اُسے دور سے گھوڑے کے سموں کے پتھروں سے ٹکرانے کی آواز سنائی دینے لگی تھوڑی دیر میں جرمن سپہ سالار وہاں آ پہنچا اور گھوڑے کی باگ اردلی کے سپرد کر کے زینہ کی طرف بڑھا۔

جون نے بے نہایت ساکت سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اور ایک ہاتھ اُسکی طرف بڑھایا جسے سپہ سالار نے نہایت احترام سے بوسہ دیا اس کے بعد اُس نے آہستہ سے دروازہ کو کھولا اور صحن میں داخل ہوئے۔

جون نے آہنی اسٹول پر رکھی ہوئی قندیل کو اٹھا کر بلند کیا اور اسے پھر سے ایک دروازہ کو کھول کر روسی کا بڑے کمرے کی طرف کر دیا۔ جہاں میں حسب حال حال سپاہی جٹائی اور لباس پر دراز تھے ان میں سے ایک سپاہی ہوئے دیوار سے ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا اُس کے سر پر بالوں کی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں جسکی درازوں میں سے سیاہ جوں سے نکر رخساروں پر بہتا ہوا ڈاڑھی کے تاریک بالوں میں گم ہو رہا تھا۔ دوسرا شخص گہری نیند میں سے پڑا ہوا تھا اور چہرہ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی وزنی پتھر اُس کے سر پہ دھرا ہوا ہے۔ اور تیسرا اسے لبادہ کی تہ میں جس سے وہ اس وقت تکیہ کا کام لے رہا تھا سہ کھانسنے نہایت درد انگیز آواز میں کراہ رہا

تھا۔ اور اُس کی دلفگار مسکان لبادہ کی پیرپیچ شکنوں میں غرق ہو رہی تھی۔

(۴)

جب جرمن سپہ سالار کی نظریں اس کمرہ کے منظر جومن سے سیر ہو چکیں۔ تو ہورتنسیا اُسے لیکر سامنے کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ جہاں ایک فرانسیسی افسر مخملی گدوں پر سیر پھیلائے صوفہ پر لیٹا ہوا تھا اُس کی تسکین آلود پیشانی سے اُس کے اندرونی تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ جس سے وہ درد کی تکلیف کو برداشت کرنے میں کوشاں تھا۔ جھلملاتے ہوئے ایک شمع سے لیمپ کی زردی مائل روشنی کمرہ کی الم ریزی میں اور اضافہ کر رہی تھی۔ ایک کونے میں چھوٹی سی میز پر کسی سرجن کے بھولے ہوئے چند آلات جراحی منتشر پڑے ہوئے تھے۔

مشکل سے سپہ سالار اس کمرہ کا جائزہ لے چکا ہوگا کہ ہورتنسیا نے دوسرے کا رخ کیا۔ مرمریں زینوں پر گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ اور منجمد خون کی ایک ہلکی سی قطار کسی خوں چکاں زخمی کے اوپر جانے کا پتہ دے رہی تھی۔ زینہ کے دروازہ پر ایک شخص اسٹول پر بیٹھا بائیں ہاتھ سے پانی بھرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کے داہنے ہاتھ میں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اب وہ مکان کے سب سے زیادہ آراستہ کمرے میں داخل ہوئے جو عموماً خاص خاص موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ لیکن جو کہ اب جنگی ہسپتال کے ایک وارڈ کا کام دے رہا تھا۔ درمیان میں ایک خوبصورت میز کے نیچے چھوٹے صندوقچے پڑے ہوئے تھے دود گاہ کے قریب معمولی پتھر کا ایک کٹورہ رکھا ہوا تھا۔ جو گرد و غبار اور گندے پانی سے لبریز تھا بلکہ کمرے میں پڑے ہوئے سفید اور رنگین دوشالوں سے زخموں کے سر ڈھکے ہوئے تھے جن میں سے چند جانکنی کے عالم میں مرغ بسمل کی طرح لوٹ رہے تھے۔ دیواروں پر دو متوازی قد آدم آئینہ لگے ہوئے تھے۔ جنہیں درمیان میں پڑے ہوئے زخموں کے لامحدود عکس نظر آ رہے تھے لیکن یہ فریب نظر بھی اسی الم ناکی میں واقعہ سے کم نہ تھا۔

اسی طرح وہ مکان کے ہر چھوٹے بڑے کمروں کا معائنہ کرتے ہوئے بڑھتے

گئے۔ ہورٹنسا نے ایک بھی کمرہ سپہ سالار کو بغیر بتلائے نہ چھوڑا۔ آخر ش وہ اس کمرہ کے دروازہ پر پہونچے جو خود ہورٹنسا کی خوابگاہ تھا۔ ہورٹنسا نے قریب جاکر مسہری کے پردے الٹ دیئے۔ لیس دار مخملی گدوں میں ایک بچی جس کے چہرہ سے طفلانہ معصومیت ٹپکتی تھی بخار کی بیہوشی میں بیخود پڑا تھا۔ لبوں پر ایک خفیف حسرت آگیں تبسم لرزاں تھا۔ شاید وہ عالم خواب میں اپنی محبوبہ کے بوسۂ وداعی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جرمن سپہ سالار نے ایک نگاہ غلط انداز اُس بستر رسیدہ سپاہی پر ڈالی۔ اس کی نگاہیں دردو تاسف کے تاثرات سے یکسر خالی تھیں البتہ وہ اس حالت میں بھی اُسے رشک آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت ہورٹنسا کے بستر خاص پر قابض تھا۔ وہ ہورٹنسا کی جانب مڑا۔ اور ایک عجیب استفہامیہ انداز میں اُسے دیکھنے لگا گویا وہ دریافت کرنا چاہتا تھا۔ کہ ان صبر آزما مراحل کا اختتام کب ہوگا؟ اور موقعہ العام کے حصول میں ابتک کونسی شئے حائل ہو رہی ہے لیکن ہورٹنسا نے اسے حمام باقیماندہ کمروں کو بھی دیکھنے پر مجبور کیا۔ اور گھما پھرا کر اُسے پھر اُسی دہلیز کے زینہ کے قریب لے آئی جہاں سے پہلے دونوں روانہ ہوئے تھے۔

اور پھر اُس نے قندیل کو اپنے رخساروں تک بلند کیا جسکی افسردہ روشنی حسن سوزاں کے انعکاس نور سے شمع سحرگاہی کی طرح آخری مرتبہ بھڑک اٹھی گویا کہ اب اُس کی ہستی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے ہورٹنسا نے باغ کے پھاٹک کی جانب اشارہ کیا جو باہر جانے کے لئے تنہا راستہ تھا اور پھر وداعی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے اپنے مخصوص دلربایانہ تبسم کے ساتھ آہستہ سے کہا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس مکان میں ہم لوگوں کے لئے ذرہ برابر بھی جگہ باقی نہیں تھی۔

اس کے الفاظ میں ایک دلکش لوچ تھا۔ جس میں اس خوبصورت رات کی لطافت شامل تھی۔

(اسپینی لٹریچر)　　سید مختار اشرف قادری



رمضان مبارک کا مہینہ کس کا نام آتا ہے کہ میرے تعلق سے ایسے میری زبان کے لئے
[illegible] [illegible] ان حیران [illegible] آبادی سے دور [illegible] ایک چار پائی
[illegible] ہوا تھا۔ میرے خیالات سے میری دلگیری میں اور اضافہ کیا۔ اگرچہ منظر قابل دید
تھا یعنی آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی [illegible] کا دل کس رہا تھا کبھی بوندیں
پڑ رہی تھیں [illegible] [illegible] کالی [illegible] کھڑکیوں سے [illegible]
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا [illegible] [illegible] رنگینی بھی ضرور تھا کہ میں [illegible]
لیکن یہ معلوم نہیں کس نے میرے دل کو کھینچ رکھا تھا ان کی یاد تھی جو مجھے بیقرار کر رہی
تھی کو [illegible] [illegible] ہو رہی تھی [illegible] کہ خیالات کو [illegible]
[illegible] انکار اور [illegible] لیکن [illegible] تھا اور [illegible] دماغ [illegible] ہو گیا
[illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] خیالات کی [illegible]
[illegible] قلم دوات سنبھالی اور کچھ لکھنے کے لئے تیار ہوا اس روکی
[illegible] [illegible] [illegible] دل کا بوجھ [illegible] دماغ ہلکا ہوا۔ دل کو سکون اور
راحت [illegible] ہوئی قلم ہو سکے [illegible] سوار تھا لیکن جب دیکھا کہ خیالات اسکو ایک
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

سبحان اللہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آنکھوں کا نور [illegible] سے
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] علام الغیوب نے
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

دنیا کو نیست و نابود کر دیا۔ اسنے آپکو ایک ایسا نمونہ بنا کر رکھا جس سے تمام دنیا کے معلموں نے سبق حاصل کیا۔ اس معلم پر ہزار ہزار درود اور سلام ہو جو ع

ہزار بار بشویم دہاں ز مشک و گلاب　　ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

اُس معلم کا پیارا نام محمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) جسے سب امیؐ کہتے ہیں لیکن کیا امی کے معنے ان پڑھ کے ہیں؟ اور ایک ان پڑھ جاہلوں کو علامہ دہر بنا سکتا ہے؟ کیا دنیا میں ایسی کوئی مثال موجود ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر یہ کیا معمہ ہے۔ دراصل امی کے معنی کیا ہیں جسے قلم کو یہ الہام ہوا ہے۔ امی کے معنے عالم ماکان وما یکون ملہم من الرحمٰن۔ وہ جس نے خدائے پاک کے کسی کے سامنے زانوئے شاگردی نہیں کیا اُس نے دنیا کو یہ سبق دیا ہے۔ (اطلبوا العلم ولو کان بالصین) علم حاصل کرو خواہ اُسکے حصول کے لئے دنیا کی خاک چھاننا پڑے۔ کیونکہ انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز علم ہی ہے۔

ہندوستان کے معلم بھائیو! آپکو بھی تو اسی نام سے پکارا جاتا ہے کیا آپ اسکے اہل ہیں؟ کیا آپ نے کبھی اپنے مقدس فرض کا احساس کیا ہے آپ اپنی اخلاقی قوت سے بھی مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں نہ صرف پولیس کا ڈنڈا لیے اور کچہری کے اختیارات حاصل ہونے پر؟

ذرا ان سوالات پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ آپ اس مقدس اسم سے موسوم کئے جانے کے مستحق ہیں یا نہیں۔

آپ کے سپرد نہایت لطیف اور پاکیزہ روحیں کی گئی ہیں انھی بچوں کو معصوم کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے آئندہ انکا نیک و بد ہونا آپ کے ہاتھ منحصر ہے [illegible] کچی مٹی کی مانند ہیں جسکو جس طرح مروڑیں لیکن اُس وقت کے گزر جانے کے بعد یہ حالت نہیں رہتی بلکہ جیسا اُس پر نقش ہوگا ویسا ہی رہیگا

معصوم بچے کانشنس کو بیدار کرنا [illegible] آئندہ کے بچوں اور بزرگوں کا دارومدار ہے [illegible]

ملک کی عزت و دولت کا انحصار ہے۔ اور جسکی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر یہ بات قابل تسلیم نہیں تو خیال فرمائیے اپنے جگر کے ٹکڑوں یا رکے بالوں بچاروں کو ایک غیر شخص کے ہاتھ میں کیوں دیا اور کس کو ضرورت تھی کہ اپنے گھر کے چراغ اور دل کی مراد کو قصبوں کی مدد کر رہا وہ بیچارے اس پر ہی صبر اور اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان تمام باتوں کو جانتے ہوئے صدق دل سے کہتے ہیں۔ کہ ماسٹر صاحب اس لڑکے کا گوشت آپکے حصے میں ہے اور ہڈیاں ہمارے گھر سے ہیں۔

کبھی ان مائی کے لال کو کاندھے پر ہاتھ رکھکر سمجھاتے ہیں۔ کہ برخوردار! استاد کی مار ہمارے سامنے بھی افضل ہے۔ بہ جہت معلم۔ بیٹا یوں پڑتا ہے جو ہاتھ کہ سر سے بیچ کے روحانی باپ ہیں اس ... قوم اور اولاد لے کو آج آپکے حوالے کرتا ہوں ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

ان حالات پر غور کرتے ہوئے ملک کا نقشہ جہالت میں پھنسے رہنا ہمیں قصور وار ثابت کرتا ہے کیونکہ ملک کی جہالت کو دور کرنے کا بیڑا اسی ایک گروہ نے (جسکو معلم یا مدرسین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) اٹھایا ہوا ہے پس اسکے لئے ضروری ہے کہ وہ پبلک میں علم کی بھوک یا اشتہا پیدا کریں اسکے جذبات کو بھڑکائیں۔ اور قولاً و عملاً انکو ثابت کر دکھائیں۔ کہ ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت   کہ بے علم نتوان خدا را شناخت

اب میں مضمون کو ختم کرنے کے لئے قلم کی باگ کو کھینچ لونگا مگر یہ معاملہ سے بے ادب لیکن پُر زور الفاظ میں یہ ضرور التجا کرونگا کہ وہ اپنے ملک کی خیر خواہی قوم کی ہمت اور بے علمی کی تربیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ملک میں ایسے چراغ روشن کر ڈالیں جن سے ہمارا ہندوستان جگمگا اٹھے یہ امر کچھ محال و ناممکن نہیں ہے صرف ہمت و استقلال چاہیئے۔

مجھے امید ہے کہ عام تعلیم یافتہ اور رسالہ بھی اس طرف توجہ مبذول فرمائینگے ؎

مشکلے نیست کہ آساں نشود   مرد باید کہ ہراساں نشود

اے لو امید بھی آ بھی۔ جو ہونے سو ہوتے ہی ہی مالک کون و مکاں سے دعا کرتا ہوں خداوندا ملک ہندوستان بھی دیگر تعلیم یافتہ ممالک کے ساتھ جلد صف اول میں کھڑا ہو آمین ثم آمین

شیخ اقبال لال

غلط فہمی

یوں تو اس چھوٹے سے جس ہوس - بوسیدہ و بیٹھ سے کی بساط ہی کیا تھی مگر اُس کے آس پاس اونچے اونچے درختوں کی قطاروں - پہاڑی ناہموار زمین - سبزہ و شاداب گھاس اور دریائے کابل کی شفاف لہروں نے اُس کو بڑی حد تک بلکہ فرحت اور رونق بنا دیا تھا - نصیر خاں ابھی ڈور اور بنسی لئے کرتا سلوار پہنے - یہاں سے کچھ فاصلہ پر لب دریا بیٹھا شکار کھیل رہا تھا۔ دفعتہً فضائے آسمانی پر اُودی اُودی گھٹائیں چھا گئیں - بات کی بات میں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو کر طوفان بارش کے آثار نمایاں ہو گئے نصیر خاں چونکہ ابھی سخت بیماری سے اٹھا تھا اُس کو سرد اور بارش سے محفوظ رہنے کی خاص ہدایت کی گئی تھی اور چونکہ اس پاس سوائے اس کے کوئی دوسری اُتے موجود نہ تھی جس سے عناصر کی رطوبت کو بچایا جا سکے۔ اس لئے وہ گھبرا کر اٹھا - اِدھر اُدھر جائے پناہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ اُس کی نظر اس جھونپڑے پر پڑی - وہ بے تحاشا بھاگ کر اس طرف آیا - اور قبل اس کے کہ بارش کا پہلا قطرہ زمین پر گرے - دروازہ کھول کر بے تکلف اندر داخل ہو گیا -

اب وہ ایک وسیع اور خوشنما کمرہ میں تھا جس کا سازوسامان دیکھ کر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی - بجنسہ جا بجا فرش پر قرینے سے مختلف جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں - میز کرسی وغیرہ بوسیدہ اور قدیم وضع کی تھیں مگر صفائی بھی تھی اور صفائی کا بہترین نمونہ دیواروں پر دو چار دری تصاویر لٹکی ہوئی تھیں - انگیٹھی پر دو پھول کے خوشنما گلدان اور کچھ سیپ چینی کے برتن رکھے تھے ایک طاق کھڑکی میں مصوری کے تختہ پر ہوائی جہاز کی مکمل تصویر چسپاں تھی - جس کا دریائی جلوس اور گرد و پیش کے نظر فریب مناظر - درختوں کا سلسلہ - روانی آب - بچوں کا حیرت و استعجاب سے جہاز کی طرف دیکھنا - ایسی دلکش - دلفریب اور مسحور کن باتیں تھیں - کہ نصیر خاں کی حساس طبیعت متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں - کمرہ کا سازوسامان بلکہ ہر شے کے حسن و انتخاب اور اُس کی آراستگی سے نسائی ذوق اور سلیقگی اس درجہ نمایاں تھی کہ نصیر خاں کو بار بار اسے دل میں بھی قیصہ

کرنا پڑا کہ اس مکان کی مالکہ ضرور کوئی صنعت لطیف اور فن مصوری کی شیدائی و ماہرہ ہے۔ نصرجہاں نے کھڑکی کے باہر نظر کی تو دیکھا کہ موسلا دھار بارش پڑ رہی تھی۔ ہوا کے تیز تھپیڑوں سے درختوں پر ایک پرلطف وجدانی کیفیت طاری تھی۔ ندی نالے اُبلے پڑ رہے تھے۔ وہ اس فرحت بخش منظر کا لطف اٹھانے کے لئے کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ تو گیا لیکن دل ہی دل میں اس خیال سے متردد اور پریشان تھا کہ مالک مکان اس کی دیدہ دلیری اور ناجائز دخل اندازی پر خدا معلوم دل میں کیا کیا خیال کرے۔ اسی طرح اپنے خیالات کی ادھیڑ بن میں وہ ایک بار کرسی سے اٹھا ڈھونڈ ڈھونڈھ کر انگیٹھی میں کچھ کوئلے و غیرہ ڈالے اور دیا سلائی لگا کر پھر بیٹھ گیا۔ ابھی چند لمحے ہی گذرے تھے کہ دفعۃً جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ کسی نے باہر سے ایک ہلکا چھوٹا سا سٹول۔ تصویر بنانے کا تختہ رنگ کی تشتری۔ اور کاغذوں کا بنڈل ایک ایک کرکے اندر پھینکا اُسکے بعد ایک دوشیزہ عمدہ قسم کی برساتی اوڑھے سر سے پاؤں تک سراپا پانی کا بنی داخل ہوئی۔ جسکو دیکھتے دیکھتے ہی نصرجہاں کی ہمت جواب دے گئی۔ اُس کے قلب کی پُر زور حرکت نے جسم میں رعشہ پیدا کر دیا۔ ایک طرف نور حسن اور دوسری جانب اپنی ناجائز موجودگی کی ندامت نے اُسکو مجبور کیا۔ کہ خود ہی اپنا سر نیاز جھکا کر اقرار جرم کر لے مگر ان ایام میں لڑکی نے اُسے دیکھ لیا اُس کی متبسم نظروں اور سرمگیں آنکھوں نے بتلا دیا۔ کہ نصرجہاں کے اطمینان وامن کا ثبوت دیا بلکہ نصرجہاں کے اطمینان کا سبب ہو گئیں۔ وہ جلد جلد اپنا سامان قرینہ سے رکھنے لگی ما گینٹی پر نظر پڑتے ہی اُس نے خندہ پیشانی سے پوچھا۔ "کیا یہ آگ آپ نے سلگائی ہے

ناحق زحمت فرمائی۔ میں شکریہ ادا کرتی ہوں"

نصرجہاں کو اس قدر شائستہ اخلاق کا گمان تک نہ تھا۔ اُسکو توقع تھی کہ بجائے سخت کلامی اور دشنام کے وہ ان شکریہ آمیز الفاظ کا کیا جواب دے۔ جو اس نے سنے۔ الفاظ کا ذخیرہ لیکر وہ مؤدب کھڑا ہوا تھا۔ اُسکی زبان سے ایک بھی ادا نہ ہو سکا گھبراہٹ میں اُس نے صرف اتنا کہدیا "محض اس وجہ سے کہ شاید آپ بھیگی آئیں اور آگ کی ضرورت ہو"

"جی نہیں میں بھیگی نہیں ہوں۔ برساتی نے مجھے بچا لیا۔" یہ کہکر اُس نے برساتی اتار کر لٹکا دی اور اپنے دوپٹے کا بھیگا ہوا پلو آگ کے سامنے پھیلا کر پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور

بولی "مجھے نہایت مسرت ہے کہ آپ میری عدم موجودگی میں بے تکلف یہاں تشریف لے آئے آپ جانتے ہیں کہ دنیا مافیہا سے بے تعلق ہو کر دلوں کا منتظر کسیکو یاد رہ سکتا ہے۔ اور پھر بھلا میری سی کمبخت یاد کو مجھے آج بڑا سرور تسمہ کا خیال رہا آپ کو ڈالیٹار یاد دہ رہی ہوگی مجھے آپ نے ابھی تشریف آوری سے حد درجہ ممنون فرمایا محمد اسمعیل خاں صاحب اتفاقاً آپ جیسے مشغول آدمی کا عین وقت اسے دوسرا اگر اسفر میں سکا پھر بھوا جسکا مجھے افسوس ہے مگر کیا کروں۔ مجبور تھی۔ ورنہ خود جلال آباد حاضر ہو جاتی۔ آپ تشریف رکھیں میں چائے تیار کرتی ہوں۔"

نصیر خاں عالم تحیر و تسویش میں لڑکی کو بار بار حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور پھر سوال کے جواب میں یا تو محض سر ہلا دینے پر اکتفا کرتا۔ یا کبھی عالم بیخودی میں اس کی زبان سے ہاں، نہیں نکل جاتا۔ محمد اسمعیل خاں صاحب کا نام سنتے ہی وہ ایک بار اچھل پڑا مگر یہ ہی سمجھ گیا کہ یہ کوئی صاحب ہیں جنکی آمد کی لڑکی منتظر تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس نے انکو کبھی دیکھا نہیں ہے۔ چنانچہ اس دوران میں متعدد بار ارادہ کر چکا تاوقتیکہ اسکی زبان سے ایک حرف نہ نکل سکا اور وہ سراسیمہ اور پریشان اسی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔

مگر لڑکی پر اس کا اثر یہی دیکھا ہوا۔ وہ اس کی حالتوں اور کم سخنی کو حیرت و مسرت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ان دیہاتوں کا ہر فرد کی طبیعت خاموش طبعیت اور استقلال پسند ہوتا ہے۔ گھنٹوں جب بیٹھکر دوسروں کی داستانیں سنتے رہنا بس ان ہی کا کام ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے قصداً از راہ تمسخر پوچھا۔ "کہئے جلال آباد میں آج موسم کیسا تھا؟"

"موسم کے اعتبار سے جو سنگ" نصیر خاں نے پوری احتیاط سے کام لیا۔ تاکہ اسکا ہر جواب مختصر اور مزید سوال کی گنجائش سے بہت دور ہو۔

لڑکی کو اس پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اور بولی۔ "سبحان اللہ کس قدر قابوی اور نپاتلا جواب ہے۔ یہی تو گنوار کی خصوصیت ہے کہ اس کے لئے بھی اس قدر احتیاط کی ضرورت تھی۔

ضرورت تھی۔

یہ سنتے ہی نصیر خاں کے اور کان کھڑے ہوئے اُسکو اب صاف معلوم ہوگیا کہ محمد اسمٰعیل خاں صاحب جس کا لڑکی نے ابھی نام لیا تھا کوئی جلال آباد کے وکیل ہیں اور وہ اس پر اُنکا پورا شبہ کررہی ہے۔ وہ پریشان تھا کہ کس طرح اس مخمصہ سے نجات حاصل کرے۔ گو اس کے وکیل بننے اور اُس کے بتانے میں چنداں پس وپیش نہ تھا مگر صورت معاملات اس درجہ پیچیدہ ہوتی جاتی تھی کہ اُسکو اپنی ندامت اور شرمندگی کا فسانہ بہت نزدیک آتا دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے ایک بار پوری ہمت کرکے ارادہ کرلیا کہ جس طرح ہو لڑکی کو اپنی اصلیت سے آگاہ کردے مگر اسی اثنا میں لڑکی نے کہنا شروع کیا۔ "میں جسقدر جلد آپکو اپنے معاملہ سے کماحقہٗ واقف کردوں اُسقدر جلد آپ کسی مناسب نتیجہ پر پہونچنے میں کامیاب ہوں گے اور شاید آپ بھی بطیب خاطر نوٹس فرما سکیں گے۔ یہ نوٹس آپ کو لکھ چکی ہوں کہ سارا معاملہ میرے چچیرے بھائی سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے بھائی فریدالدین سے

نصیر خاں نے گھبراہٹ میں اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر لڑکی کو خاموش کرنے کا اشارہ کیا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا "اس کے متعلق اب آپ کچھ نہ فرمائیں۔ میں نہیں سمجھا کہ آپ مجھکو کیا خیال کررہی ہیں۔"

لڑکی (بات کاٹ کر) "ممکن آپ واقعات سے ناواقف ہیں آپ اسوجہ سے پریشان ہوں مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی تحریر میں آپکو مفصل حالات سے مطلع نہ کرسکی اب آپکو مختصر الفاظ میں سارا قصہ سنائے دیتی ہوں جس کے بعد آپکی صائب رائے سے مستفید ہونا میرا واحد مقصد ہوگا۔"

نصیر خاں ایک ٹھنڈی سانس لیکر بالآخر خاموش ہوگیا۔ گناہ اور لذت گناہ انسانی ضمیر کو گمراہ کر بیٹھے لیکن [illegible] اور [illegible] کرسکے میں [illegible] کامیاب نہ ہوسکا [illegible] نصیر خاں کو [illegible] ضمیر بار بار ملامت کرنے کے باوجود سوال کرنے کے سر تسلیم خم کرلینا پڑا کہ اُس نے حتی الوسع لڑکی کو کوشش کرلی کہ لڑکی پر اپنی اصلیت کا اظہار کرکے اُس کی "غلط فہمی" کو رفع کردے۔ مگر بظاہر طور خدا یہی معلوم ہوتا ہے

کہ لڑکی اپنی داستان جاری رکھے اور وہ ہمہ تن سراپا گوش ہے۔ اگر اسکو ناحق ارجاؤ وش کرتا ہے تو لڑکی بلا شبہ خوف زدہ ہو جائیگی۔ اس بیچارے کو اس وقت ایک ہمدرد کی تلاش ہے کہنا ہرج ہو کہ وہ ایک ہمدرد بنکر اسکی داستان غم سن لے۔ اور کوئی ایسی مقصد بر آرانہ صلاح دے جس سے اُس کا غم غلط ہو اور مطلب برآری ہو جائے۔

وہ ابھی خیالات کی ادھیڑبن میں تھا کہ لڑکی نے بڑھکر نامہ شروع کیا "میں اپ سے صاف صاف عرض کرتی ہوں کہ میرے بھائی کچھ عرصے بُری صحبت کا شکار ہو کر گمراہ ہو گئے ہیں۔ شراب اور قمار بازی کا ان کو چسکہ پڑ گیا ہے۔ اور مزید برآں میں نے اب سنا ہے کہ وہ کسی پر فریفتہ بھی ہیں۔ انھوں نے پوشیدہ طور پر جملہ زر و زیور سب لیکر برباد کر دیا ہے۔ قرض داروں نے تنگ آکر نالش وغیرہ کی دھمکی دی ہے۔ اس سے وہ ڈر کے مارے روپوش اور لاپتہ ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ بجز ذلت و رسوائی کے کوئی ذریعہ انکی خلاصی کا نہیں اور سب سے بڑا ڈر تو یہ ہے کہ اگر ان واقعات کی اطلاع کانوں کان ہمارے چچا صاحب کو ہو گئی۔ تو ان کو اپنے ورثہ سے ضرور محروم کر دیں گے۔ اس وقت ہم دونوں کی آمدنی کا ذریعہ وہی جائداد ہے جو ہمارے چچا صاحب نے ہمارے نام وقف کر دی ہے۔ وہ ان سے یوں بھی ناخوش رہتے ہیں اگر خدانخواستہ یہ باتیں سن پائیں تو پھر ہماری تباہی یقینی ہو جائیگی۔ وقف نامہ کی ایک شرط یہ ہے۔ کہ جب تک انکی عمر پوری تیس برس کی نہ ہو جائے وہ جائداد کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اور مجھکو بھی یوں پابند کر دیا گیا ہے کہ جب تک تیس برس کی نہ ہو جاؤں اپنی جائداد پر اختیار کلی حاصل نہیں کر سکتی۔ بجز اس کے کہ اس سے قبل میں کہیں مناسب جگہ شادی کر لوں۔ قرضہ کی رقم تقریبًا چار یا پانچ ہزار کے درمیان پہنچ گئی ہے ہم دونوں کی جائداد کی آمدنی فقط چار سو سالانہ کی ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت میری اس تھوڑی سے ہمارا نبھ تو سکتا مگر اداۓ قرض کی مشکل ہو جاتی۔ میرے بھائی بار بار اسی پر زور دیا کرتے ہیں اپنے چچا صاحب کے پاس جا کر درخواست کروں مگر میری ہمت نہیں۔ آپ انکو ... وہ سمجھے اور فریدالدین کو خوب جانتے ہیں۔ تھوڑا سمجھ جائیں گے کہ ضرور کوئی نہ کوئی اس کی ناجائز ضرورت ہو گی آپ دیکھتے ہیں میری مشکلات

یہ کہکر اُس کا دل بھر آیا۔ اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

نصیر خاں اچانک چپ بیٹھا لڑکی کے ایک ایک حرف کو بغور سن رہا تھا۔ اسکے اسطرح ایکدم رو دینے پر بولا "آپ گھبرائیں نہیں۔ میں سنتا رہا ہوں۔ ۔ غالباً آپ یہ چاہتی ہیں کہ کسی ذریعہ سے روپیہ قرض مل جائے۔ اور آپکے چچا صاحب کو خبر نہ ہو۔

لڑکی۔ (آنسو پونچھکر) جی ہاں! اگر کوئی ایسی صورت ممکن ہو جائے تو عمر بھر بار احسان سے سبکدوش نہ ہو سکوں۔ میں ہر مناسب شرط ادائے رقم پر رضامند ہوں۔

نصیر خاں۔ مگر۔ ۔ ۔ میرے خیال میں یہ آسان کام نہیں۔ روپیہ کسی طرح بھی لیا جائے بغیر کافی ضمانت کے کوئی نہیں دیگا۔

یہ سنتے ہی لڑکی کے چہرہ پر مایوسی کے آثار نمایاں ہوگئے۔ اُس نے ٹھنڈا سانس لیکر کہا۔ وکیل صاحب ضمانت کے لئے تو میری جائداد موجود ہے اگر آج نہیں دو چار برس کے بعد تو مجھے اپنے حصہ پر پورا اختیار حاصل ہو ہی جائے گا۔ اُس وقت مجھ سے ہر طرح روپیہ وصول کیا جا سکتا ہے۔

نصیر خاں۔ افسوس یہ ہے کہ آپ مہاجنوں کی کج خلقیوں اور ریشہ دوانیوں سے ناواقف ہیں۔ میری رائے میں آپ اس خیال سے درگذریئے اور جس طرح ہو اپنے چچا صاحب ہی کو رضامند کیجئے۔

لڑکی۔ آہ! یہ بھی تو ناممکن ہے۔ ۔ (ذرا سے توقف کے بعد) اچھا تو مجھے اب یہی کرنا پڑیگا۔

نصیر خاں۔ وہ کیا؟

لڑکی۔ "شادی"

نصیر خاں۔ شادی؟

لڑکی "جی ہاں! کیا یہ بھی آپ کے خیال میں کوئی مشکل کام ہے؟"

نصیر خاں۔ "نہیں میرا مطلب یہ نہ تھا بلکہ ۔ ۔ ۔"

لڑکی۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔ ایک صاحب کا پیغام آچکا ہے۔

نصیر خاں۔ ایک کیا صدہا آئے ہوں گے۔ مگر کیا آپ یقین کرتی ہیں کہ یہ صاحب آپ کے موزوں شوہر ہوں گے۔

لڑکی نے کرسی پر اس طرح پہلو بدلا کہ نصیر خاں اُس کے چہرے کی گھبراہٹ محسوس نہ کر سکے۔ کچھ تامل کے بعد اُس نے جواب دیا۔ "جی نہیں سچ پوچھئے تو موزونیت کا کوئی شائبہ بھی نہیں مگر یہ صاحب میرے مصائب اور تفکرات سے واقف ہو چکے باوجود شادی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب مجبوراً مجھکو شادی کرنی ہی پڑیگی۔

نصیر خاں۔ فقط اس لئے کہ آپ اپنی جائداد پر اصل اور سود پورا اختیار حاصل کر سکیں۔

لڑکی۔ جی نہیں۔ بلکہ اپنے بھائی کو موجودہ مصائب سے نجات دلانے کے لئے۔

نصیر خاں پر اس جواب سے ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ بےساختہ کھڑا ہو کر کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اُس کی نظریں گو نیچی تھیں۔ مگر چہرہ سے عزم و فکر کے آثار نمایاں تھے۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔ خدا کے لئے آپ اس ارادے سے باز آجیے۔

لڑکی نے تعجب سے پوچھا "شادی کے متعلق"!

نصیر خاں۔ "جی ہاں۔ شادی بلا لحاظ موزونیت محض کسی مقصد کو مدنظر رکھکر کرنا ظاہر ہے۔ کہ زن و شوہر کے تعلقات کو آئندہ زندگی میں ہرگز خوشگوار نہ رہنے دیگی۔ اس کے علاوہ بھلا آپ سی شریف طینت فرشتہ سیرت خاتون سے یہ کیا خودکشی سے کم ہوگا۔ کہ آپ دیدہ و دانستہ اپنی زندگی کو دائمی مصائب و آلام کی بھینٹ چڑھا دیں۔

لڑکی نے شرم سے نگاہیں نیچی کر لیں اور ایک ٹھنڈا سانس لیکر بولی۔ مجھ [illegible] خانصاحب آپ اپنی قسم کے نئے وکیل معلوم ہوتے ہیں۔ میری مجبوری کو مسترد کر دیا۔ آخر آپ ہی بتائیے مجھے کیا کرنا چاہئے؟

نصیر خاں۔ "صبر"۔

لڑکی۔ اور اگر اس اثنا میں کوئی موزوں اور مناسب پیغام آجائے۔ تو مجھے شادی

کر لینا چاہئے۔

نصیر خاں۔ میرے خیال میں ---- نہیں۔ کیونکہ آپ اس قدر جلد کسی معقول فیصلہ پر ہرگز نہ پہنچ سکیں گی۔

چھوٹی سی مختصر سی پگڈنڈی پار ہو گیا۔ دونوں آہستہ آہستہ ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے چلنے لگے۔ مگر پھر ایک ان، ساتھ ٹہلنے میں بھی خود وہ دی تھا لڑکی کو مصائب و آلام کی یاد نے اور رنج میں غرق کر دیا تھا۔ مزید براں مستقبل حال صاحب کی آمد اور ان کے مشوروں سے جو کچھ امیدیں اور آسرے وابستہ کر رکھے تھے۔ ظاہراً شکست ہو چکے تھے۔ ناکامیوں نے اُس کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی تھی اور روش نے اُس کو اتنا بھی احساس نہ تھا۔ کہ وہ چل بھی رہی ہے

نصیر خاں کو یہ خیال تھا اگر دیکھے لڑکی اب آگے کہاں کہاں ہے۔ وہ سر اسر اسی ادھیڑ بن میں پڑا تھا کہ کسی طرح کوئی مناسب موقعہ ہاتھ آئے۔ اور وہ لڑکی کو اپنی اصلیت سے آگاہ کر دے چنانچہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نصیر خاں نے ایک مرتبہ پہلو بدلا۔ باہر نظر ڈالی ایک لمبی سانس لی اور بولا: "اللہ غنی! آج بارش ہے یا طوفان۔ خدا رحم کرے۔"

لڑکی نے اُس کی طرف نہ نظر اٹھا کر دیکھا۔ اور نہ کوئی جواب ہی دیا۔ بلکہ اُسی طرح ایک کہنی میز پر رکھے اپنے رخسار کو ہتھیلی کا سہارا دئے رہی دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ اور اُس کی نظر اُس پر اس طرح جمی ہوئی تھی۔ گویا اُس کی کامیابی کے سارے راز اُسی میں پوشیدہ تھے۔

نصیر خاں نے اپنی رو میں پھر کہنا شروع کیا۔ "بعض اوقات ایسے موقعوں پر عجیب اہم واقعات پیش آتے ہیں۔ ابھی تھوڑے روز کا ذکر ہے۔ کہ میرے ایک دوست نصیر خاں صاحب ایسی ہی آفت ناگہانی میں پھنس گئے۔ مہلک بیماری سے نجات پانے کے بعد معالج نے اُن کو یہ ہدایت کی تھی۔ کہ کچھ عرصہ تک دساوری مقاموں سے علیحدہ ہو کر سیر و تفریح میں بسر کریں۔ چنانچہ گھر سے دور ایک کھلے مقام پر وہ لب دریا بیٹھے شکار کھیل رہے تھے کہ دفعتہً بارش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اُن کے پاس اپنی حفاظت کا چونکہ کوئی سامان نہ تھا

اس لئے وہ گھبرا کر اٹھے۔ اور جائے پناہ تلاش کرنے لگے۔ اتفاق دیکھئے کہ قریب ہی اُن کو ایک خس پوش جھونپڑا نظر پڑا۔ جہاں پہونچکر انہوں نے کئی بار دستک دی مگر کوئی جواب نہ پاکر مجبوراً دروازہ کھولکر اندر داخل ہوگئے۔ ہر چند کہ ان کی یہ حرکت [illegible] مگر اُن کو محض اپنی جان کی حفاظت کے لئے ایسا کرنا پڑا۔ اُس گھر کی آرائش اور سامان مفقود [illegible] اُن کو [illegible] ہوئی۔ اور کچھ دیر بعد اُن کو یقین ہوگیا کہ اس کی مالکہ کوئی [illegible] اس خیال سے کہ شاید وہ بھیگتی ہوئی واپس آئے۔ انہوں نے انگیٹھی میں [illegible] تلاش کرکے آگ سلگادی"۔

لڑکی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔ نصیر خاں [illegible] لگا لڑکی خوفزدہ ہوکر اُسکو سر سے پاؤں تک مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگی [illegible] ذرا سخت لہجہ میں کہا "اچھا پھر آگے چلئے۔"

نصیر خاں۔ اتنے میں مکان کی مالکہ بھیگتی ہوئی واپس آگئی جس کو دیکھتے ہی نصیر خاں کے رہے سہے حواس جاتے رہے۔ اُس کو یقین تھا کہ دوشیزہ اُس کی بیجا موجودگی سے ضرور ناخوش ہوگی اور ضرور اس کو اسی حالت میں مکان سے باہر نکل جانے پر مجبور کریگی۔ مگر واقعات اس کے بالکل خلاف پیش آئے لڑکی [illegible] نصیر خاں کو وہی آنے والا شخص سمجھکر اُس سے خاطر مدارات شروع کردی [illegible] مگر اُس کو مجبوراً [illegible] کام لیکر خاموش رہنا پڑا۔ لڑکی نے اس کو [illegible] سمجھکر اپنے متعلق ایسے واقعات بیان کرنا شروع کردیئے [illegible] مگر وہ بیچارہ کیا کرتا۔ اُس نے بار بار کوشش کی کہ لڑکی کو اپنی [illegible] مگر اُس کی معصومیت اور بھولا پن دیکھکر نصیر خاں [illegible] ساتھ اس کی داستان سننے پر مجبور ہوگیا [illegible] اُسکا [illegible] ہوگا اور [illegible] ہوگا۔

لڑکی کھڑی ہوگئی۔ غصہ سے اُسکی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ چہرہ تمتمانے لگا اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "نصیر خاں صاحب"

نصیر خاں بھی مؤدب کھڑا ہو گیا۔ خجالت کے مارے اُس کا سر جھکا جاتا تھا۔ اُس نے اپنی نظریں نیچی قائم رکھکر کہا۔ "محترم خاتون میں اپنی خطا پر بیحد نادم ہوں سب سمجھ گیا ہوں آپکے وکیل محمد اسمٰعیل خاں صاحب اگر آ جائیں تو کل ہی آ جائیں گے۔"

لڑکی۔ آپکی یہ حرکت بہت نازیبا تھی۔ آپ نے بہت برا کیا کہا

نصیر خاں۔ بیشک میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اس کی تلافی کیونکر کروں مگر اتنا عرض کرتا ہوں کہ خدا کے لئے آپ وصول فرمائیں اور ماموروں سے ادائی پر درگذر رہیں۔ رقم مطلوبہ کل صبح تک پہنچ جائیگی۔ (خدا حافظ)

یہ کہتا ہوا نصیر خاں دروازہ سے باہر نکل گیا ہوتا مگر کسی کی نازک انگلیوں نے اُس کا دامن تھام کر روک لیا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا لڑکی کی پشیمان نظریں اور دست نازک کی گرفت زبان بے زبانی سے کہہ رہی تھیں کہ وہ نادم ہے نہیں بلکہ دعوت محبت کی دے رہی تھیں۔

(لوامہ (بریلوی))



از جناب حکیم صاحب محمود علی خاں عرف آغا ... صاحب

طرب انگیز ہیں سادا ... گلشن کی ہر سو
دوا غوں کو معطر کر رہی تھی پھول کی خوشبو

مناظر وہ کہ جس سے آنکھ تک ... تھی
ہوا ... رنگ ایک بار کی ہوتی تھی

لدا پھولوں سے تھا ... پاؤں رکھنے سے
... جاتی تھیں ... پھول کھلنے تھے

زمیں سے آسماں تک ... فرش پھولوں کا
... ہوتا ... پھولوں کا

چمن کا گوشہ گوشہ ...
...

سحر کو ... جاتی ...
...

چٹائیں اتنی میں چکی لگہ شبیر چمبیلی بھی
جدھر دیکھو اُدھر جدھر نظر تک سرسبز مصلی تھی

محبت امداد سے یوں مرقد کے جسم آ ملے تھے
کہیں رک رک کے چلتے تھے کہیں چل کر مچلتے تھے

سماں آنکھوں میں تھا گلزارِ جنت کی بہاروں کا
وہ نغمہ طائروں کا وہ ترنم آبشاروں کا

وہ بہنا اک ستم امداد سے ہر ایک جسموں کا
وہ اُن کا مست ناگن کی طرح اٹھکھیلیاں کرنا

کہیں پانی سے چادر کی جو سبز لہریں سنہری تھیں
تو گویا آسماں سے سنگ لڑیوں جو رہی اُترتی تھیں

یہ کچھ احساس ہوتا تھا کہ گویا دیر سے ہوئی [illegible]
[illegible] سحر ہوئی تھی

تصور سے بساط برف کے دل [illegible]
مسلسل اُس پہ مجلس جان کی سب کو یاد ہے اسکا

وہ کہنا سب کا چلا کر وہ زہرا ہی ہے [illegible]
[illegible] جاتے ہیں گھوڑے کی مہری

یہ بھولی ہے کسی کی یاد سے اسکا [illegible] لگی
کہاں آنکھ ہاشم علی کی کہف انگشتری

انگیٹھی سامنے ہوئی اگر احسانی [illegible]
سحر ہو جاتی تھی اگر [illegible] باتوں ہی باتوں میں

[illegible]
[illegible] کو لگتے تھے

[illegible]
[illegible] کی کلی کھلی تھی

کبھی دامن سے [illegible] آتی تھی
تو دل [illegible] کا پیغام لاتی تھی

[illegible] کی اک [illegible]
[illegible] سے دل [illegible] کی اک لہر اٹھی تھی

[illegible] کی یاد [illegible] ملتا [illegible]
کوئی [illegible] عشق کو [illegible] مسلسل تھا

[illegible]
[illegible] ساتھ میں

[illegible]
[illegible] رنگ [illegible] تھا

[illegible]
[illegible] کا [illegible]

[illegible]
[illegible] کوئی بات

۱۔ [illegible] آباد

۲۔ [illegible] آباد۔

۳۔ [illegible] ہاشم علی [illegible] آباد

نکلتے ہی خزاں کے چمن سے بہاروں کا دور آیا
بہاروں چمن کو پھول لیے کھلنے کا طور آیا

چمک سے مہر تاباں کے ہوئی کم برف کی سردی
ہر اک گلشن سے بھرا بہاری کی ہوئی رحمت

ہر اک ہستی ہے شاداں کیف اک بہاری کی دل آئے
کہ جو شبنم کے اب پھول لیے کھلنے کے بس آئے

نسیم سے مرجھائے کہ ناکوئی کلی بھی نکھرالی
مگر شاد پھول ہوا تھا ہاں دل کا لہو پانی

ہوئی جوشیں ہوگی اور دریا میں فراوانی
لبا سیں تو ملا جانی رہی گلشن کی عریانی

نمایاں پھول ہیں فطرت نے جو حول سے کہاں کے
رہیں دستے و ورق جڑے ہیں لگے رہے گلستاں کے

صبا کو دیکھتے ہی مسکرائیں ہر طرف کلیاں
گلے مل مل کے سب ساحل چمن کی ہو گئیں شاداں

رہاں پر طائروں کے نغمہ ہائے شاد مانی کے
دلوں سے مٹ گئے سب داغ ناکامی زمانہ کے

سما منظر آیا ہے مہری نسیم ردش میں
کہ گویا ہر لباس ہر روں سے رنگیں پھول دامن میں

عجب اور سے منظر ہیں عالم آرائیں
قبائیں سبز ہے ہر طرف ساحل نکل آئیں

چمن میں ہر سے ہر نکھری گل کی نکہت ہے
عروس گل مگر سبزہ میں آ کر سنورتی ہے

چمن میں رہنے والوں کی یہ گاتی ہے
تو سہاروں سے طائر کو دہتی نئی بار جہو کے

زندگی

زندگی ایک مشہور چیستاں ہو کیا ہے۔ بس اتنا معلوم ہے کہ تو مجھ سے لطفی اور لامی طور پر جدا ہو جانے والی ہے۔ تو مجھے کہاں کب اور کس طرح ملی۔ یہ بھی میرے لئے معمہ ایک ہے جو حل نہیں ہے۔

زندگی اہم دونوں۔ نور اور ظلمت ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ صبح امید کی نورانی دلکشی میں اور شام ظلمت کی اہر آلود فضاؤں میں اور اسی طرح خوشی کا نغمہ اور غم بر دوستوں کی فلسفہ ہے ... کا حکم رکھی ہے۔ اور ساتھ ساتھ ایک آنسو ... ایک قطرہ ... رہا ہے۔

مگر جا۔ آہستہ آہستہ دبے پاؤں جا۔ چوروں کی طرح اپنے مہمان میزبانوں کی آواز نہ ہونے دے اپنا وقت خود معین کر لے۔ اور چپکے سے نکل جا اور مجھے ہاں مجھے اس کی اطلاع نہ ہونے دے جا اور بعد الوداعی سلام کے ملاقات ختم کئے جا۔ مگر دیکھ! اس شور و غوغا سے ہٹ کر۔ اس بے ترتیب ہنگامے سے دور۔ کسی بہتر فضا میں کسی زیادہ پُرسکون ماحول میں، میرے جسم مدہم کو سمار رہ۔

(ترجمہ) سید محمد اشرف قادری



(۱)

صبح دم اٹھتے وقت طلائی لاکٹ کے اندر ایک تصویر پر نظر ... ہوئے اس پر ... کے لبوں پر گلابی مسکراہٹ اور ... کے علاوہ ایک ... حالی کا اظہار ہے۔ آنکھوں کی ... کی طرح خاموش ... سوچ کی وجہ سے ... سانس ... اور ... کی ... داری ... بھنویں چڑھی ہوئی۔ ... کی تصویر میں حسن کی زندگی ... پُراسرار ہے۔

(۲)

سمندر کے پار لاکھوں کوس دور لندن میں ... اور ... امتحان ... ارادہ ... سمندر کا ... ہیں کہ ... ستارہ ... ہم ... (۳)

ستاروں سے ہمکنار ہو کر نشیبی راہوں سے جو سرگوشیاں قدرت الٰہی کے متعلق کرتی ہیں۔ کیا ہیں؟ زرین بالوں کی سمنبر ساتھ جھی لوک سے ٹھکرایا ہوا پھول اپنے کیک رفتار مارک گلچیں کا دامن اپنے محافظ حارست کیوں کھو رہا ہے۔ بلبل ہر جھی و بھالے سے محصور اور پھول حیرانی میں منہ کھولے کیا گفت و شنید کر رہے ہیں۔ گل بلبل اور گلچیں کا تانا بانا ایک مسلسل لطف خیالات کے موتیوں کی مالا ہے۔ جس کا ہر ایک دانا مختلف رنگیں مادہ کا معنوی مرکز ہے۔ قدرت کی کہانی بے زبان کی زبانی ادا ہوتی جاتی ہے۔ پردہ حقیقت چاروں طرف سے کھلا ہے۔ مگر صرف چشم دوربیں اُسے دیکھ سکتی ہے۔

(۴)

سمندر کی تلاطم خیز لہروں کے درمیان ڈگمگاتے جہاز پر ساون سب چاند کا منہ اسی لا اتھاہ رہ مگر سے آراستہ ستاروں کی جگمگاتی فوج کا کھلے منہ دیکھا ہوا بندہ مسافروں کو بھلا بدستے ہوئے حالانکہ کسی رنجش و ملال کا اظہار ہے۔ سطح آب پر چاندنی کی موج سے مانا رقص کرتی اور تالیاں بجاتی کس کی شادی کا سہرا گا رہی ہے وہیل نیلے ناہموار فرش پر بساط کے سواروں کی طرح پانی کی پچکاریاں چھوڑتی کس حیرت زدہ سرگشتہ آنکھ کی انتظار میں ہے اور کیوں؟ تمام مناظر لطف خیالات کے جواہرات کا ایک ڈھیر ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے سمندر کی انتہا سے دوربیں آنکھ۔ دل پر درد۔ روشن دماغ اور اُداس طبیعت کی ضرورت ہے۔ دل سے درد اٹھتا ہے۔ دماغ میں ٹھوکر لگتی ہے۔ اور چشم حیرت ہستی کرتی ہوئی لہروں سے سوالات کے نتائج و خواب کی تعبیر پوچھتی ہے۔ [illegible] کار [illegible] صرف اُداس طبیعت کی وجہ سے صحبت یا [illegible]

(۵)

[illegible] بھری [illegible] غروب آفتاب پر [illegible] اپنے [illegible] کی گانٹھ ٹٹول ٹٹول کر [illegible] آنکھوں میں [illegible] قدم کس کی محبت

و ملاقات کی خیالی تصویر ہے۔ اُدھر بوسیدہ جھونپڑی کے سامنے سبز گھاس کے مخملی فرش پر کھیل میں مشغول ننھے ننھے بچوں میں وہ پانچ سالہ لڑکا بسیرا ٹہنیاں اٹھا اٹھا کر منتظر آنکھوں سے حویلی سڑک کی طرف کیا دیکھتا ہے۔ اور کیوں؟ بسمر کی اماں جان بھی ہر چند مدت بعد کسی نہ کسی بہانہ سے کیا دریافت کرتی ہے؟ زندگی کی حقیقت اس طریقہ سے فانوس خیال مگر ہر مرحلہ پر اپنی رازافشائی کر کے دنیا کو معرفت و طریقت کا راستہ بتاتی ہے۔ لطیف خیالات کا اظہار چہرے کی رنگت و اعضائے کی حرکت سے نمودار ہوتے ہوئے پایا جاتا ہے۔

اُفق پر ڈوبتے آفتاب کی سنہری روشنی سے دریائے جہلم کا پیر ... [illegible] پر ٹہلنے والے کی سیمابی بلوری آنکھوں میں رنگت کی جھلک ... [illegible] پروانہ وار حیات کی موثر آمد و رفت کا اظہار کرتا ہے۔ قدرت کا سہرا آئی۔ آفتاب روشنی پانی ... [illegible] کہ حسرت زدہ انگشت بدنداں آہنی جنگلے کے سہارے ... اکثر اوقات انسان لطیف خیالات پر سوار قدرت سے صانع قدرت تک ... [illegible] ہے۔ ہر ذرہ ... [illegible] ناموس قدرت کی ورق گردانی میں مصروف ... [illegible] قادر مطلق کا سلسلہ ساحلوں اور رستوں کی ... [illegible] فرق ... ہے کہ سوائے گوش ہوش کے کوئی ... [illegible]

ساون میں گھنگھور گھٹا میں ... [illegible] ... ہوا کی ... [illegible]

تسکین اور خوشحالی ہے۔ اور کوئی مجبور عزلت ہے۔ تمام نفسہ جات تصوری اور خیالی ہیں۔
دم کی آمد و رفت۔ خیالات کی یاد ہے۔ بعد فنا نہ دم ہے نہ خیال

بر لوح چند درد و کسل جہلم



۱۔ گنگا جی ہندوستان کے دریاؤں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ سنسکرت ہندی میں اس کے نام کے گیت گائے جاتے ہیں جن میں سورگ کی شوبھا اور گنگا جل کا ذکر ہے۔

۲۔ گنگا کا پانی صاف ستھرا ٹھنڈا اور میٹھا اور مفید صحت ہے۔ شیریں ایسا کہ شاید ہی کسی چشمہ کا پانی ایسا ہوگا جیسا کہ اس کے آس پاس۔ صفائی کی ضرورت نہیں صاف ایسا کہ دور دور گز کی گہرائی تک ایک ایک کنکری تہ میں پڑی ہوئی صاف نظر آئے۔ ہاضم ایسا کہ سوڈا واٹر کو مات کرے۔ ہلکا ایسا کہ جاہے جتنا پیو ثقیل نہ معلوم ہو۔ اگر احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں خراب نہیں ہوتا غالباً اسی وجہ سے ہندو اس کو مقدس مانتے ہیں۔ اور اسکی تعظیم کرتے ہیں۔

۳۔ اہل ہنود نے اس کے سواحل کے مختلف مقامات پر میلے قائم کئے ہیں جو مختلف اوقات میں ہوتے رہتے ہیں اُن میں شامل ہونا موجب ثواب سمجھا جاتا ہے۔ تاکہ جو لوگ دور دراز مقامات کے رہنے والے ہیں۔ سال میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور اس دریا کا درشن اور گنگا جل پی کر اور اس میں اشنان کر کے اُس کے خواص مفیدہ سے مستفید ہوں۔ اور نئی آب و ہوا تبادلہ خیالات۔ تجربات مشاہدات۔ وسعت معلومات اور فوائد سفر سے بہرہ ور۔ ان میلوں میں داناؤں نے مذہب کا رنگ دیکر انکو معمول عام کر دیا ہے۔ چنانچہ لاکھوں آدمی بلا لحاظ اوقات

تیرتھ یاترہ کی وجہ سے گنگا جی کے درشن کرتے اور سیکڑوں کوس سے مردوں کے پھول اُس میں ڈالتے ہیں۔

۴۔ گنگا جی کیلاس کے پہاڑوں سے نکلی ہے۔ جو ملک تبت میں جھیل مان سرور کے قریب ہیں اور ہردوار کے قریب دیس سے نکل کر پردیس میں قدم رکھا ہے۔ یعنی پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان کا راستہ اختیار کیا ہے۔ منبع کی طرف پانی بہت صاف اور سرد ہے مگر دہانہ کی طرف ان دونوں صفتوں میں کچھ کمی ہو جاتی ہے۔

۵۔ مذہبی روایات کے بموجب اس دریا کی طاقت اور اجرا کے متعلق عجیب وغریب قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں ایک راجہ تھا۔ جس کا نام راجہ بل تھا ایک دفعہ اُس نے بڑا بھاری یگ کیا۔ دُور دُور سے لوگ آکر اس میں شامل ہوتے۔ ایک غریب برہمن بھی آیا اور اشیرباد دیکر یوں ارداس کی کہ ایشور تیرا تمام راج اور مہاراج کو سکھی رکھے۔ لاکھوں کروڑوں کا دان پن ہو رہا ہے۔ مجھ پر بھی دیا ہو جائے۔ راجہ نے کہا پنڈت جی جو تمہارے من میں آئے لے لو۔ برہمن نے کہا تمہارا راج میں کچھ اور نہیں چاہتا۔ ایک ساڑھے تین قدم دھرتی اپنے راج سے دیدو۔ بڑی کرپا ہوگی۔ اُس وقت راجہ کا گرو بھی موجود تھا۔ اُس نے کہا یہ برہمن نہیں ہے۔ کوئی چھلیا ہے تجھے چھلتا ہے۔ راجہ اس کے چھل میں نہ آیئو ایک چپہ بھر زمین نہ دیجیو۔ راجہ نے گرو کا کہا نہ مانا۔ اور سنکلپ کر کے برہمن سے کہا۔ پنڈت جی تم شوق سے تین قدم زمین لیلو۔ برہمن نے پہلا ہی قدم جو رکھا وہ زمین سے آسمان پر پہنچا۔ وہاں برہما نے فوراً اُس کو دھوکر اُس کا پانی اپنے کمنڈل میں رکھ لیا۔ کیونکہ اس قدم میں پدم تھا۔ اور یہ پدم سوائے خدا کے اور کسی کے قدم میں نہیں ہوتا۔ وہی پانی گنگا جی کی اصل ہے۔ یعنی وہ خدا کے پاؤں کا دھوون ہے۔

۶۔ ایک اور روایت ہے کہ اگلے وقتوں میں ایک راجہ تھا جس کا نام راجہ سگر تھا وہ بڑا اچھا تھا تمام شام سویرے اجالے اندھیرے تو جاپ میں لگا رہتا تھا اُس کو ایشور مہاتما نے یہ شکتی عطا فرمائی کہ جس کو آنکھ اٹھا کر دیکھ لے وہ فوراً بھسم ہو جائے کئی ہزار برس کے بعد اس کے خاندان میں ایک راجہ راجہ بھگوت کے نام سے پیدا ہوا۔ وہ بھی نہایت

جلا کر بھسم کر دیا تھا۔ اُس نے سو یگ کئے اور آخر میں ایک اسومیدھ یگ کیا۔

راجا اندر کو یہ فکر ہوا کہ کہیں اس یگ کا اثر اس پر نہ پڑ جائے۔ سوچتے سوچتے اُسے ایک تدبیر سوجھی۔ اُس نے گھوڑے کو پکڑ کر راجہ سگر کے پاس ایک درخت سے باندھ دیا۔ جو فوج گھوڑے کی حفاظت کے لئے مامور تھی۔ اُس نے راجہ کو خبر دی کہ گھوڑا ایکا یک غائب ہو گیا۔ بہت تلاش کیا نہیں ملا۔ ساٹھ ہزار آدمی گھوڑے کی تلاش میں نکلے۔ مگر کچھ سُراغ نہ چلا۔ جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاتال میں پہنچے تو دیکھا ایک بوڑھا آدمی آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے اور مالا جپ رہا ہے۔ راجہ سگر کے آدمیوں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ اور ڈانٹا کہ او مکار یہ کیا جال پھیلا رکھا ہے۔ گھوڑا تو چرا کر لا رکھا ہے۔ اب ہم کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے رام رام کر رہا ہے۔ یہ بڈھا راجہ کپل تھا۔ جو کئی ہزار سال سے راج پاٹ کو تیاگ کر اور راج دھانی سے نکل کر یہاں پرماتما کی عبادت میں مشغول تھا۔ راجہ سگر کے آدمیوں کی آواز سن کر آنکھ اٹھا کر دیکھا اٹھاتے ہی سب جل کر راکھ ہو گئے۔ راجہ بھور کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت پریشان ہوا۔ بہت ڈھونڈی پہاڑوں میں جا کر گنگا جل ڈھونڈنے لگا تاکہ جو لوگ بھسم ہو گئے ہیں اُن کی آتما کو ٹھنڈا کرے۔ دس ہزار برس عبادت کی مگر ناکام رہا اور دنیا سے [illegible] کوچ کر گیا۔ پھر اس کے بعد اُس کے خاندان میں راجہ بھاگیرت جی ہوئے [illegible] گنگا جی نہیں پڑی [illegible] بھاگیرت کی تپسیا [illegible] تاکہ گنگا تم کو ملیگی۔ لیکن زمین میں اتنی سکت نہیں کہ اسے سہار سکے تم شو جی سے پرارتھنا کرو۔ بھاگیرت نے عرصہ دراز تک شو جی کی عبادت کی۔ انھوں نے خوش ہو کر کہا کہ میری جٹا پر گنگا سہار لیں گے۔ چنانچہ گنگا بیکنٹھ سے اتر کر اُن کی جٹا میں مدت تک رہی۔ بھاگیرت نے جب دیکھا کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا تو بہت گھبرائے۔ اور پھر شو جی کی تپسیا کی آخر انھوں نے اپنی جٹا کا ایک بال توڑا۔ اور گنگا بہہ نکلی۔ اور اب تک بہہ رہی ہے۔ اور جب تک بھگوان کی مرضی ہے یونہی بہتی رہیگی۔

ر سول

میر تقی میر کی نازک مزاجی

میر تقی میر دورِ سوم میں اردو زبان کے بہت بڑے شاعر گزرے ہیں ہندوستان میں یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی کہ بسا اوقات ان کی غزلوں کو تحفے کے طور پر شہر بہ شہر لیجاتے تھے خاقانی ہند ذوق آپ کے متعلق لکھتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

قدردانی نے میر صاحب کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہ سے دیکھا اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اڑایا۔ مگر ان کی بد دماغی اور نازک مزاجی کا یہ عالم تھا کہ دنیا کی کوئی بڑائی اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انھیں نظر ہی دکھائی نہ دیتی تھی اس صفت نے نازک مزاج بنا کر انھیں ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا۔ ۱۔ سنہ ۱۱۹۰ھ میں جب آپ نے شاہ عالم کے دربار میں گذارہ کی صورت نہ دیکھی تو ناچار دلی چھوڑنی پڑی۔ جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہوگئے۔ اور دلی کو خدا حافظ کہا تھوڑی دور آگے چلکر اس شخص نے کچھ بات کی۔ میر صاحب اس طرف منہ پھیر کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک گاڑی میں بیٹھئے مگر باتوں سے کیا تعلق۔ اس نے کہا حضرت کیا مضائقہ ہے راہ کا شغل ہے باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔

۲۔ جب آپ دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تو نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا نواب صاحب نے سنا اور دو سو روپیہ مہینہ کر دیا آپ بھی کبھی کبھی نواب صاحب کی ملازمت میں جاتے تھے۔ ایک دن ایک شاعر مرزا علی اکبر جو شاگرد جرأت تھے اور آداب محفل سے واقف تھے۔ میر صاحب کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ میر صاحب

گھر میں تھے۔ آپ نے اپنا نام و نشان کہلا بھیجا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میر صاحب تشریف فرما ہوئے۔ مرزا نے دست بوسی کی اور عرض کیا کہ کچھ تازہ کلام سنائیے۔ مطلب یہ تھا کہ اُدھر سے بھی کچھ فرمائش ہو گی۔ میر صاحب ایک نازک مزاج آدمی تھے۔ ایسے ویسوں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ کہنے لگے کہ ہمارے شعر سے کچھ شعر فہمی نہیں معلوم ہوتی مجھے اپنا کلام ضائع کرنا منظور نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی بیچارے خجل اور محجوب واپس آئے۔

۳۔ شاہ قدرت اللہ قدرتؔ کہ مشّاق شاعر تھے۔ اتفاق سے میر صاحب کے ساتھ ایک کشتی میں سوار تھے۔ آپ نے چند غزلیں اپنی میر صاحب کو سنائیں۔ میر صاحب خاموش سنا کئے۔ کچھ تعریف نہ کی۔ ناچار قدرت نے پوچھا۔ ان اشعار بے مثال کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ میر صاحب نے فرمایا "صواب بہتر تو یہ ہے کہ آپ اس کلام کو دریا برد فرمائیں۔"

۴۔ ایک دن نواب صاحب اپنی کسی جاگیر کی سیر میں مصروف تھے۔ ایک جلد میر صاحب کے قریب رکھی تھی۔ اور نواب صاحب کا ہاتھ وہاں تک پہنچنا دشوار تھا۔ میر صاحب سے اشارہ کر کے فرمایا معاف کیجئے گا وہ سامنے والی کتاب مجھے اٹھا دیجئے میر صاحب یہ کلمہ سنکر خشک ہو گئے۔ دل میں نہایت دربار کا فحش پڑا۔ اور سوچنے لگے کہ دہلی کے دربار میں تو کوئی بادشاہ اپنے مصاحب سے بھی ایسا خلاف تہذیب کلمہ نہ کہتا۔ آخر میر صاحب نے ایک ملازم سے کہا دیکھو کہار سے آ کر کیا فرماتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب نے فرمایا۔ کیوں میر صاحب سودا اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ میر صاحب نے کہا "ہر عیب کہ سلطان بپسندد ہنر است" نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔ کیوں صاحب ہم عیب پسند ہیں۔

۵۔ ایک دن نواب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور کہا میر صاحب کچھ فرمائیے۔

میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب صاحب سننے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب صاحب کہتے جاتے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے۔ اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کر لےگا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ ناگوار گزری غزل جیب میں ڈال کر گھر چلے آئے۔ اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے نواب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے تو بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے۔

۶ - میر محمد سوز دہلوی پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ اور وہ میں آ کر قیام کیا اور بادر [illegible] ہو گئے تھے۔ بہت سے ہنر جانتے تھے۔ تیر اندازی شہسواری۔ خوشنویسی۔ آ[illegible] صحبت و سلوک ظریف الطبع بھی تھے۔ جس زمانہ میں کلام میر کی شہرت زیادہ [illegible] ہونے لگی تو آپ نے پاس ادب سے اپنا تخلص بدل کر سوز کر دیا۔ نواب آصف الدولہ بہادر فن شاعری میں اسکے شاگرد ہو گئے ایک روز دربار میں [illegible] تشریف لے آئے کہ میر سوز بھی نواب کے حجرے کو جانے [illegible] کی۔ میر سوز نے دو میں [illegible] میر سوز کو اس امر کا خیال ہوا کہ [illegible] اجازت حاصل کر لے۔ آپ بہت کشیدہ خاطر ہوئے [illegible] دلبری پر بھی شرم نہ آئی۔ میر سوز نے عرض کیا [illegible] لو دہلی [illegible] ہوں۔ آپ نے شاعری کی ہے تو کیا [illegible] تمہاری بزرگی اور شرافت [illegible] نے موقع سمجھے ہم نہیں جانتے کہ تمام دہلی [illegible]
ما د سناہوں کہ [illegible]

تمہاری شاعری کا محل اور موقع نہ ہے۔ کہ جہاں چند کمسن لڑکیاں جمع ہوکر ہنڈ کلھیاں
لگاتی ہوں تم بھی اپنے شعروں سے اپنا دل بہلاؤ نہ کہ میرے سامنے علم شاعری بلند کرو
یہ کہکر نواب آصف الدولہ بہادر کی طرف مخاطب ہوئے اور جو شقہ نواب نے اُن کی
طلب میں ارسال فرمایا تھا جیب سے نکالکر سامنے رکھدیا۔ اور "خانہ آباد دولت زیادہ"
کہکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب صاحب نے کہنے کو تو زباں سے خدا حافظ کہدیا لیکن میر کے
خفا ہونے کا اُنکو بہت صدمہ ہوا ایک روز تحسین علی خاں خواجہ سرا سے نواب نے پوچھا
کہ میر صاحب کی بھی کچھ خبر ہے انھوں نے عرض کیا کہ خداوند کچھ نہ پوچھئے۔ بہت عسرت
اور تکلیف سے بسر ہوتی ہے۔ ایک تو غربت الوطنی دوسرے نازک مزاجی۔ ان دو مصاحبوں
نے فاقہ کشی سکھادیا۔ تو پوچھا کوئی صورت ہے کہ میر صاحب یہاں تشریف لے آئیں۔ عرض
کیا کہ اُن کی عالی دماغی سے خود بخود تشریف لانا غیر ممکن ہے۔ کہا ہماری طرف سے کچھ ہدیہ
پیش کردو عرض کیا معزولی کی حالت میں ہدیہ بھی قبول نہ کریں گے۔ نواب نے فرمایا اُن
کے خفا ہونے کا انداز بھی نرالا ہے ہمارے سامنے ہمارے استاد کی توہین کی۔ سودا کی تحقیر
کی ہم نے پاس اعزاز سے کچھ نہ کہا پھر اُلٹے خفا بھی ہو گئے۔ خیر دوسرے روز تحسین علیخاں
بلا لئے گئے تو میر صاحب بولے کہ نواب کو غربت خانہ پر قدم رنجہ فرماتے شرم آتی
ہے۔ تو فقیر بھی کسی وساطت سے اُن کے در دولت پر جانا ننگ آبرو سمجھتا ہے۔
ے ۔ سماں کے آخر زمانہ میں میر صاحب دہلی میں تھے۔ اور نواب عماد الملک غازی
الدین فیروز جنگ وزیر شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں زمرۂ شعرا ملازم تھے۔ اور شاہ
عالم کے دربار سے ملک الشعرا کا خطاب حاصل کر چکے تھے۔ ایک دن میر صاحب تشریف
لائے تو نواب صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جس میں سوائے ایک کرسی کے
کوئی دوسرا فرش بھی نہ تھا۔ میر صاحب نے کچھ دیر تو کرسی اور مونڈھے کا انتظار کیا
آخر اپنا دوپٹہ زمین پر دوتہ کرکے بچھایا۔ اور ٹیلیں مار کر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے
فرمایا۔ میر صاحب کچھ تازہ فکر کی ہو تو سنائیے۔ کہا ہاں رات کو ایک قطعہ کہا ہے
عرض کرتا ہوں ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو جا پڑا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا
تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

تو آپ سمجھ گئے کہ یہ ہمارے فکر پر چوٹ ہے۔ بیزار ہو کر سر جھکا لیا۔ آپ سلام کر کے گھر واپس چلے آئے۔ نواب نے ہر چند طلب کیا پھر نہ گئے اور کہنے لگے ہماری شہرت کا قدرداں شاہ عالم بادشاہ ہے۔ مشاہرہ بھی قبول نہ کیا آخر شاہ عالم ضعیف ہو گئے اور میر صاحب نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ لکھنؤ کا حال لکھا جا چکا ہے وہاں بھی نازک مزاجی نے میر صاحب کو سرسبز نہ ہونے دیا دربار سے منہ موڑ کر گھر میں بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں گزارا کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ء میں فوت ہوئے۔ اور سو برس کی عمر پائی ناسخ نے تاریخ کہی ہے

واویلا مرد شہ شاعراں

حسن آرا

نظم بہاریہ

از مس راہیدہ خاتون راہیدہ لکھنوی دختر حاجی محمد ارتضا خاں صاحب ارتضا لکھنوی تلمیذ اسد لکھنوی

فصل بہار آئی ہوئیں [illegible] ہوائی چلے
مے کدے سے [illegible] بادہ پیمائی چلے
جوش موسم سے زمانہ عالم گل ہو گیا
[illegible] عیاں [illegible] ہو گیا
ہو رہا ہے عام فیض [illegible] گلزار میں
[illegible]

شرح اسرار خدائی کے لیے آئی ہے بہار
معرفت کا ایک دفتر ساتھ لائی ہے بہار

ذرہ ذرہ ہے ہوائے معتدل کا باغ میں
ہر نفس ظاہر ہے اعجاز مسیحا باغ میں

کالی کالی اودی اودی گھر کے آئی ہے گھٹا
باغ کو اک جان تازہ دے کے جاتی ہے گھٹا

رونق گلزار جنت ہے گلستان جہاں
اہل باطن کو قیامت ہے گلستان جہاں

پھر میں پانی کہ سکر میں زمیں کی جان ہے
پھر دی روح اب نہ سمجھے کوئی بے جان ہے

پھول ہی پھول اب نظر آتے ہیں تا حد نظر
اپنے آپے سے ہے باہر بلبل شوریدہ سر

رنگ ہیں ایک ایک پتے میں ہزار اندر ہزار
آئینہ جس سے طلسم قدرت پروردگار

مست و مدہوش اس قدر ہیں یعنی بلبل سے گل
اپنی حالت میں ہوں جیسے رند پی کر جام مل

معجزہ اسکا ہے یا باد بہاری کا اثر
فکر میں مردے ہوئے حالت سے اپنی بے خبر

رنگ گل اڑ کر ہوا میں جس کے شامل ہو گیا
خاک کا ہر ذرہ گویا خوں چکاں دل ہو گیا

سیر کرنے کو چلے گھر سے سب اہل جہاں
آرہے ہیں سوئے گلشن کارواں در کارواں

دشت و صحرا ابر کے دم سے جس آباد ہے
جوش موسم کے سبب سے جو ہے وہ دلشاد ہے

سبزہ ہے تا حد نگاہ وہ کہ دیکھا کیجیے
ہر ادا پر جان اور ایمان صدقہ کیجیے

پڑ گئے جھولے درختوں میں ہوئی دل بے قرار
مل کے سب گانے لگے یہ آئی ساون کی بہار

مینگ سے لیتے ہیں جوانی کا جو کام آتا ہے زور
کھا کے جھولے کی ہوائیں اور بڑھ جاتا ہے زور

راہبرہ آؤ ذرا دیکھیں تماشا سے حسن
عکس میں معشوق کے ہے شکل رسائی حسن

صنعتوں میں ہم کو مل جائیگا صانع کا پتہ
منفعل سجدہ جھکا کر لیتے ہیں نام خدا

راہبرہ

وولف گینگ موزارٹ

وولف گینگ موزارٹ جسے راگوں کا شہزادہ ولایت والے کہتے ہیں ۱۷۵۶ء

میں مقام سالزبرگ پیدا ہوا۔ اُس کا باپ لیوپولڈ موزارٹ بھی بہت بڑا راگی اور اول درجہ کا وائلن بجانے والا تھا۔ اور ستار نواز تھا۔ ابھی وولف تین برس کا تھا کہ اُسے راگ کا شوق ہو گیا۔ اور وہ اپنی بہن سرل کے ساتھ جس کی عمر سات سال کی تھی علم موسیقی کا سبق لینے لگا۔ وولف نے بہت جلد حیرت انگیز ترقی کی۔ اور رباب کامیابی سے بجانے لگا۔ پانچ سال کی عمر میں اُس نے چند راگنیاں بنائیں۔ ایک دن کسی نے اُسے ایک راگنی کے متعلق کہا کہ یہ بہت مشکل چیز ہے۔ تو اس ننھے بچے نے کہا کہ اگر مشکل ہے۔ تو پھر اس کی اچھی طرح مشق کر لی چاہیئے۔ یہ کہکر وہ ساز لیکر بیٹھ گیا۔ اور اسطرح بجایا کہ لوگ تصویر حیرت بن گئے۔

وولف گینگ کی بہن جس کا ذکر اوپر آچکا ہے بھائی کی طرح قابل تھی۔ دونوں بچے اپنے شہر میں ایسے مشہور ہو گئے۔ کہ اُنکے باپ نے اس امید سے کہ شاید کچھ آمدنی ہو جائے گرد و نواح کے علاقوں میں دورہ کرنیکا قصد کیا۔ وہ پہلے میونچ گئے اور بویریا کے شاہی دربار میں اپنا کمال دکھلایا۔ میونچ سے وہ وائنا گئے۔ اس وقت اس بچہ کی عمر سات سال کی تھی۔ اور لوگ اُسے پیار سے ولفرل کہتے تھے۔

وائنا کے شہنشاہی محل میں جب اُس نے قدم رکھا۔ تو وہاں کا زرق برق لباس طمطراق اور شان و شوکت دیکھکر وہ کسقدر بے چین سا ہو گیا۔ لیکن جب اُس نے ساز اٹھایا تو تمام بے چینی کافور ہو گئی۔ وہ راگ میں محو ہو کر جلیل القدر سامعین کو بھول گیا۔ اور لوگ حیران رہ گئے جب نغمہ سرائی ہو چکی تو شہنشاہ بہت شفقت سے ملنے آئے اور کہا کہ یہ میرا ننھا جادوگر ہے۔ ملکہ مریا تھریسا۔ اس روشن چشم بچے کو دیکھکر مسکرائی اور اسے اپنے قریب بلایا۔ اُسے آداب دربار کی کیا خبر تھی۔ وہ اچھل کر ملکہ کی گود میں بیٹھ گیا اور اپنی باہیں اُسکی گردن میں ڈالکر اُسکا منہ چومنے لگا۔

اب ولفرل ہر روز دربار میں حاضر ہونے لگا۔ وہاں کی حسین شہزادی میری انٹوئنیٹ جو بعد ازاں ملکہ فرانس ہوئی۔ اس سے بہت مانوس ہو گئی۔ ایک دن ولفرل کا پاؤں صاف اور شفاف فرش پر پھسل گیا۔ اور وہ گر پڑا۔ جب شہزادی نے اُسے اٹھ

میں مدد دی تو اُس نے موزارٹ سے کہا۔ تم بہت اچھی ہو بڑا ہو کر میں تم سے شادی کروں گا۔

وائنا میں دلفرل کی بہت قدر ہوئی۔ مگر مالی امداد حسب توقع نہ ملی۔ یہاں تک کہ ایک دن اُس کے باپ نے تنگ آکر کہہ دیا کہ دلفرل کو ۔ جتنے تو سے دیئے جاتے ہیں اگر وہ طلائی سکوں میں تبدیل ہو سکیں تو پھر ہمیں کوئی شکایت نہ رہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ یہ ہوٹل والے روپئے کی بجائے تو سے لینا نہیں چاہتے۔ ہمارے پاس تلواریں لیس بلاس کی ڈبیاں اور طلائی کیس۔ اس کثرت سے ہیں کہ ان سے دوکان کھل سکتی ہے۔ لیکن روپیہ عنقا ہے اور میں بہت غریب ہوں۔

وائنا سے یہ پیرس آئے اور پیرس سے لنڈن پہونچے۔ لنڈن میں انکی مالی حالت بہتر ہوگئی انگلستان کے دربار میں انھوں نے جارج سوم اور انکی ملکہ کے روبرو سرود سرائی کی۔ اور ہر موقع پر انھیں بہت انعام دیئے گئے۔ اس کے علاوہ ولفرل نے چھ چال مرتب کئے اور انھیں ملکہ معظمہ کے نام سے معنون کیا اور پچاس گنی انعام لیا انگلستان میں موسیقی کے عام جلسے ہوا کرتے تھے۔ جن میں یہ بچے اپنا کمال دکھاتے تھے انگلستان میں ایک سال ٹھہرے اور پھر فرانس اور ہالینڈ ہوتے ہوئے آخر کار اپنے وطن میں واپس آگئے۔

کمسن موزارٹ نے تین سال بڑی کامیابی سے یورپ کی سیر کی۔ لیکن اس عرصہ میں وہ تعلیم کی طرف دھیان نہ دے سکا اور لگاتار محفلوں کی حاضری اور محنت سے اُس کی صحت میں فرق آگیا وہ بالکل کمسن تھا مناسب تھا کہ وہ کھلی ہوا میں آرام اور آزادی سے سات گھنٹوں سویا کرتا۔ بجائے اس کے وہ مجالس سرود میں جہاں کمرے کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے موجود رہکر اپنی طبیعت پر زور ڈالتا رہتا تھا۔

گھر واپس آکر اُس کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور تیراں سال کی عمر میں وہ اٹلی چلا گیا جسے موسیقی کا گھر کہتے ہیں دو سال وہ اٹلی میں رہا۔ روما میں اُسے کلسا سسٹائن میں دعوت شرکت دی گئی تاکہ وہ گرجا کے جالئہ کو " مسرر " گاتے ہوئے سنے اس

راگ کا صرف ایک نسخہ تھا اور یہ اس قدر بیش قدر عام تھا کہ کسی کو اُس کے نقل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی اُسے نقل کرتا تو مجرم قرار دیا جاتا تھا۔ مگر موزارٹ کی اس کی نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی اُس نے دو مرتبہ یہ راگ سُنا۔ اور اُسے تمام حفظ ہوگیا اور قوتِ حافظہ سے تمام لکھکر اُس نے لکھ لیا۔ اور انگلستان بھیجدیا اور وہاں یہ شائع ہوگیا تاکہ روم پر موزارٹ کے کمال اور حیرت انگیز حافظہ کا اتنا اثر ہوا۔ کہ اُس سے نہ صرف نقل کرنے کا جرم معاف کردیا بلکہ اُسے گولڈن سپر یعنی مہمیز طلائی کا منصب عطا کیا۔ جو وہ پندرہ سال کی عمر میں ہر راگیوں کا شہزادہ مانا جانے لگا۔

کہتے ہیں کہ وہ تعلیم سرائی سے فارغ ہوکر پھر بچہ بن جاتا تھا اور دوسرے بچوں کی طرح کھلونوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ حیرت انگیز راگ مرتب کرکے وہ اکثر بستر پر لیٹ جاتا اور کسی کو کہتا کہ تم فوجی مارچ بجاؤ۔ تاکہ میرے کھلونے فوجی جلوس بنا کر کوچ کریں بچپن کے زمانہ میں اُس کی مرغوب تفریح یہ تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں کے درمیان ایک چھڑی رکھکر کمرے میں ادھر اُدھر بہت اکڑ کر چلتا تھا گویا گھوڑا دوڑا رہا ہے۔

موزارٹ نے روپیہ پیسہ کی کبھی پروا نہیں کی وہ ہمیشہ کسی امیر کے لوگوں کو سبق پڑھاتا رہا۔ اُس نے نہایت حیرت انگیز راگ لکھے۔ اُس کا قاعدہ تھا کہ راگ مرتب کرکے ردی کاغذ کی طرح ادھر اُدھر پھینکدیتا اور راگی اُنہیں اٹھا کر نقل اتار لیتے۔ اور اُن سے روپیہ کمالیتے تھے۔ یہ حضرت مصنف اُس نے خود کبھی کچھ نہ کمایا۔

اس کی مالی حالت نقطہ نگاہ سے مفلس تھا۔ کہ اُس نے ۲۶ سال کی عمر میں شادی کرلی اور اسٹرائک دربار میں شاہی راگی مقرر ہوگیا۔ نام بڑا تھا اور تنخواہ ۷۵ [illegible] اس اثنا میں اُسے انگلستان اور [illegible] جانے کا بلاوا آیا جہاں اُسے [illegible] تنخواہ کا وعدہ دیا گیا وہ [illegible] ہونے کو تھا۔ لیکن جب [illegible] نے انکار کیا کہ [illegible] موزارٹ تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے تو اُس کے دل پر چوٹ لگی اور فوراً بول اٹھا کہ نہیں آقا میں نہیں رہوں گا۔ [illegible] نہیں جاؤں گا۔ غرض وہ [illegible] تنگدستی [illegible]

اُس کی بیوی نہایت فضول خرچ تھی۔ اور گھر کا انتظام اُس سے نہ ہو سکتا تھا جس سے مرض بڑھتا چلا گیا اور اُس کی صحت دن بدن بگڑنے لگی۔ ایک دن ایک شخص جسے وہ نہ جانتا تھا۔ اُس کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے مرثیہ درکار ہے۔ لکھ دو۔ اُس اجنبی نے نہ بتایا کہ کس شخص کا ماتمی ترانہ لکھنا ہے۔ اور اپنا نام بھی ظاہر نہ کیا۔ موزارٹ نے ہامی بھر لی۔ لیکن اس پُراسرار معاملہ کی کیفیت نے اُس کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنی موت کا ترانہ لکھ رہا ہے۔ اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس کی طاقت جواب دے رہی ہے۔ پھر بھی اُس نے بہت دوڑ دھوپ و محنت کی اور کمزور ہو کر صاحب فراش ہو گیا۔ اور آخر کار صرف چونتیس سال کی عمر میں ۵ دسمبر ۱۷۹۱ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ جب وہ مرا تو گھر میں گور و کفن کے لئے بھی کچھ موجود نہ تھا۔

جب اُس نے جان دی تو اُس کی بیوی بیمار تھی۔ اور جنازہ کے ساتھ بھی نہ جا سکی۔ صرف چند دوست اُس کی میت کو گور لے گئے۔ اور جب دفن کر کے واپس آ رہے تھے۔ تو موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ اور سب کے سب بھاگ دوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ خدا کی شان دنیا کا ارفع اور اعلےٰ راگی ایک بے نوا کی طرح سپرد زمیں ہوا۔ اور جب چند دن کے بعد اُس کی بیوی اُس کی قبر دیکھنے گئی تو کوئی نہ بتا سکا۔ کہ اس کی قبر کہاں ہے۔ وہ گور کن جس نے موزارٹ کو دفن کیا تھا دو دن بعد مر چکا تھا۔ اور اُس کی قبر کا علم اُس کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ اِسمیں شک نہیں کہ اہل دنیا نے بعد ازاں اُسکی یاد میں ایک ستون تیار کیا۔ لیکن اُسکی حقیقی یادگار اُس کا کام ہے جس پر شہرت عام اور بقائے دوام کی مہر ثبت ہے۔

مسز حبیب بیگم





آجکل ہمیں چاروں طرف ہوائی جہاز کرۂ ہوا میں منڈلاتے نظر آتے ہیں لیکن ہم میں ایسے بہت کم ہیں۔ جنہیں یہ معلوم ہے۔ کہ ہوا میں پرواز کی باقاعدہ کوشش اول اول ۱۷۸۳ء میں ہوئی۔ پہلا غبارہ ایک قسم کا تھیلا تھا جسے موٹ گلفیر نے گھاس پھوس کو آگ لگا کر اُس کے قریب رکھا۔ جب دھوئیں سے تھیلا پھیلتا چلا گیا اور بالکل پُر ہو گیا تو وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ اور جب ہوا چلی۔ تو یہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ اڑتا رہا اور آخر کار میل ڈیڑھ میل پرے زمین پر اتر آیا۔

جسے لوگ دھواں سمجھتے تھے یہ دھواں نہ تھا۔ یہ ہوا تھی جو آگ سے گرم ہو کر غبارہ کو اڑا لے گئی۔ سرد ہوا سے گرم ہوا ہلکی ہوتی ہے۔ اس لئے غبارہ جس میں گرم ہوا تھی فضا میں اس طرح تیرنے لگا جیسے پانی پر کاگ۔ اب یہ سوال پیش ہوا۔ کہ گرم ہوا جو کچھ عرصہ بعد سرد ہو جاتی ہے اسے کس طرح گرم رکھا جائے۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے غبارہ کے نیچے ایک چھوٹی سی انگیٹھی باندھ دی گئی اور اس طرح ہوا میں سفر کا وقفہ بڑھا دیا گیا۔ مگر غبارہ پر کافی ایندھن مہیا کر کے رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسلئے سوچتے سوچتے یہ سوجھ گیا کہ ہائیڈروجن ہوا سے خود ہی بہت ہلکی ہے اور اسطرح ہائیڈروجن گیس کے غبارے اڑنے لگے لیکن ابھی تک ایک نقص باقی تھا کہ غبارہ تمام ہوا کے رحم پر تھا اور غبارے کو موڑنے یا اُس کی رُخ گردانی کے لئے چپو استعمال ہوتے تھے۔

اس کے بعد سگار نما غبارے بنائے گئے۔ اور اُن میں چھوٹے چھوٹے انجن اور آلات سیر کے لگائے گئے۔ تاکہ آندھی میں بھی اڑ سکیں۔ ۱۹۱۱ء میں ہوا باز سنٹوس ڈومونٹ نے پیرس میں سگار نما غبارے پر سوار ہو کر ایفل ٹاور کے گرد ۱۹ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑایا۔ جرمنی میں کونٹ زیپلن نے اپنی ساری زندگی ہوائی جہاز کے مکمل کرنے میں صرف کر دی کونٹ زیپلن نے ایلومینیم کا ایک سگار نما ڈھانچہ بنایا کیا

اور اُسے چند کمروں میں تقسیم کر دیا۔ اور پھر ہر کمرہ میں علیحدہ علیحدہ گیس کے اسی قسم کے تھیلے بھر دیے گئے۔ جو ڈبوں کی طرح تھے اور پھر اُس نے تمام ڈھانچہ کو روغنی ریشم سے ڈھانپ دیا۔ جائے نشست عمارہ کے نیچے رکھی اور آلات حرکت کو خاص عمارہ کے ساتھ جوڑ دیا۔

ہائیڈروجن میں گو ایک نقص یہ تھا کہ یہ بڑے درجہ کی آتش گیر ہے۔ اس لئے انجن کی حرارت سے ہمیشہ آگ لگ جانے کا اندیشہ رہتا تھا آخر ۱۹۱۷ء میں حضرت انسان نے معلوم کر لیا کہ ہیلیم گیس نہ صرف ہلکی ہے بلکہ سستی ہے اور آتش گیر بھی نہیں اسلئے ہائیڈروجن کی جگہ ہیلیم استعمال ہونے لگی۔

۱۹۱۹ء میں انگلستان کا ایک بڑا جہاز آر ۳۴ اس موسم کا سوار ہوا اور اس جہاز نے پہلی مرتبہ بحر اوقیانوس عبور کیا۔ اور اڈیسرا سے نیویارک صرف ۴۸ گھنٹوں میں پہنچا۔ ایام جنگ میں طیارہ کے مختلف نمونے مثلاً بائی پلین مونوپلین سی پلین یعنی بحری طیارے وغیرہ تیار ہونے لگ گئے تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں تو ہوائی جہازوں اور طیاروں نے جہاں بانی اور حیرت انگیز پرواز کا ثبوت دیا ہے۔ بحر اوقیانوس کے سفر میں کولمبس کے کئی ہفتے صرف ہوتے تھے۔ اور آج سے ساٹھ سال پہلے بادبانی جہازوں کو اس سفر کے لئے پانچ چھ ہفتے درکار تھے۔ اور جس فاصلہ کو آج دخانی جہاز (اسٹیمر) پانچ دن میں طے کر لیتے ہیں وہی فاصلہ آجکل ہوائی جہاز کے ذریعہ ۱۶ گھنٹہ کے قلیل عرصہ میں طے ہو جاتا ہے۔

اب ہوائی جہاز سفر سے دکھا رہے ہیں۔ وہ افریقہ کے دشت اور بیابان اور ریگستان صحرا عبور کر چکے ہیں۔ ڈرینک کی طرح بجائے خشکی اور تری کے آسمانوں سے ہوا میں اڑ کر دنیا کے ارد گرد چکر لگاتا ہے۔ نیویارک سے لندن تک کا فاصلہ تیز سے تیز بحری جہاز چھ ہفتوں میں طے کر لیتا ہے۔ لیکن ہوائی جہاز کے لئے صرف ۷ گھنٹے درکار ہیں

ایک دن وہ تھا کہ انسانی پرواز کا ذکر صرف افسانوں میں پڑھا جاتا تھا مثلاً

فسانہ نویس ہمیں بتلاتے ہیں کہ اکارس اور اُس کے باپ ڈیڈلس کو کریٹ کے بادشاہ منس نے ایک خوفناک بھول بھلیاں میں جو ایک ایسے دیو کے لئے بنائی گئی تھی۔ جس کا جسم نصف انسانی اور نصف بیل کا تھا۔ قید کر دیا تھا۔ جب وہ اس پیچ در پیچ سرنگ سے باہر نہ نکل سکے۔ تو اُس نے اپنے اور اپنے لڑکے کے لئے موم اور پروں کے بازو بنائے۔ اور جب یہ تیار ہو گئے۔ تو انہوں نے اڑ کر اس سرنگ سے مخلصی پائی۔ ڈیڈلس تو بخیریت جزیرہ سسلی میں پہونچ گیا۔ لیکن اکارس بہت اونچا چلا گیا۔ حرارت آفتاب سے موم پگھل گئی۔ اور وہ گر کر سمندر میں ڈوب گیا۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ سب چیزیں موجود تھیں پُرانی سائنس نے سب کچھ معلوم کر لیا تھا مثلاً غباروں کا حال رامائن میں موجود ہے۔

سیال آگ اور زہریلا دھواں جنگ عظیم کے دوران میں جرمنی نے ایجاد کئے لیکن لوسیان خیال اور پرانے افسانوں میں اُن کا ذکر موجود ہے۔ ساحروں کے عیار ان چیزوں کو برابر استعمال کرتے تھے۔ اگر یہ چیزیں موجود نہ تھیں تو ان کا ذکر کیسے ہو سکتا تھا۔ پس نتیجہ یہ ہے کہ تمام نئی ایجادیں جن پر زمانہ حال کے دانا فخر کر رہے ہیں نئی نہیں ہیں ہمارے بزرگوں کو معلوم تھیں۔ درمیانی زمانوں اور انقلابوں نے کچھ عرصہ کے لئے انہیں دنیا کی نظروں سے پنہاں کر دیا ہو گا۔

قیصرہ

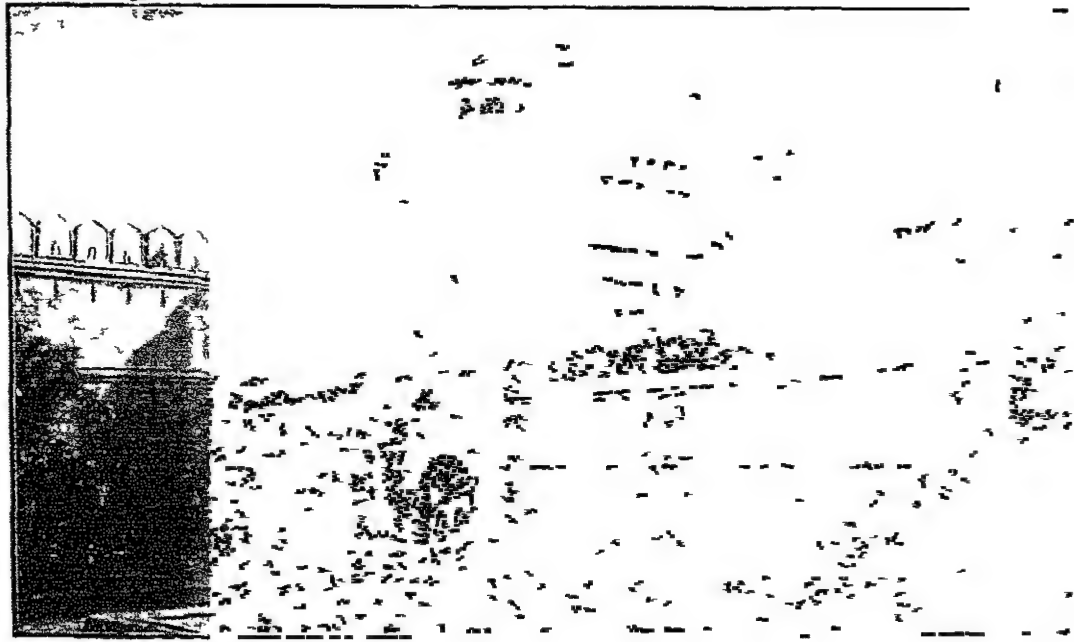


میں نے ماہ اگست کے شہاب میں محترمہ مبارک بیگم کا مضمون پڑھا جو انہوں نے کوہ ایورسٹ پر لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ مضمون کسی پرانی کتاب سے

سنا ہے ورنہ وہ ضرور لکھتیں کہ اس سطح زمین کے بلند ترین پہاڑ کو مقامی باشندوں نے "چومولنگ مو" کا نام مرے رکھا ہے جس کے معنے ہیں۔ "پہاڑوں کی دیوی ماتا" یہ دنیا کے دو علیحدہ ملکوں نیپال اور تبت کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ یہ پہاڑ نہایت دشوار گذار ہے۔ اسے بڑے بڑے برفانی تودے گھیرے ہوئے ہیں ۱۹۱۳ء تک کوئی یورپین بیس میل سے زیادہ قریب نہیں پہنچ سکا۔ اور گرد و نواح کے باشندوں کا عقیدہ ہے۔ کہ اس پہاڑ کے خاص گنبد پر جسے سنال کول کہتے ہیں۔ جو بچار کتے رہتے ہیں۔ جو کوہستانی دیوی کی نگہبانی کرتے ہیں اور آنے والوں کو خوفناک آواز سے خبردار کر دیتے ہیں کہ اس پاک اور پوترا استھان سے دور رہو۔

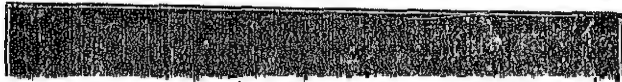
پہلا شخص جس نے اس چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کی وہ جنرل بروس تھا۔ وہ بیس برس تک کوہ ہمالیہ میں گھومتا رہا مگر ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم نے اُس کا منصوبہ پورا نہ ہونے دیا پھر ۱۹۲۱ء میں رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے الپائن کلب نے اس معاملہ کو از سر نو اپنے ہاتھوں میں لیا اور کرنل ہاورڈ بری کے ماتحت ایک گروہ تیار ہوا جنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان یا نیپال کی طرف سے چڑھنے کے بجائے شمالی سمت سے چڑھائی کی جائے۔ یعنی تبت کی طرف جانا چاہئے۔ لیکن تبت میں اہل یورپ کو دلائی کی اجازت کے بغیر قدم رکھنا منع تھا کرنل ہاورڈ بری کی رپوٹ پر ۱۹۲۲ء میں پھر جنرل بروس اس کام پر مامور ہوئے۔

یاد رہے کہ کوہ ایورسٹ کی چڑھائی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ یہ پہاڑ شہروں سے بہت دور ہے۔ راستہ نہایت دشوار گذار ہے۔ کوہستانی دروں سے گذرنا پڑتا ہے اس لئے بار و سامان اور خوراک کا ہمراہ لیجانا نہایت مشکل ہے۔ دوسری دقت یہ ہے کہ وہاں سردی اس بلا کی پڑتی ہے۔ کہ باوجود بڑوں کے گدیلوں کے انسان کے ہاتھ پیر سے نہ صرف زخمی بلکہ سو جاتے ہیں۔ آندھیاں بلا اطلاع آتی رہتی ہیں۔ لیکن ان سب مشکلوں سے بڑھکر مشکل یہ ہے۔ کہ اس قدر بلندی پر ہوا اس قدر ہلکی اور لطیف ہو جاتی ہے۔ کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ قدم قدم پر ٹھہر ٹھہر کے بیٹھنے



دہلی کا لال قلعہ

شباب اُردو لاہور





لگے ہیں اور انسان سانس لینے کی کوشش میں زمین پر گر پڑتا ہے۔ اس سفر میں انسان کو آکسیجن کی بھری ہوئی چار ٹنکیاں پیٹھ پر اٹھانی پڑتی ہیں۔ اور آلہ تنفس منہ اور ناک پر چڑھا لیا جاتا ہے اور نلکی کے ذریعہ آکسیجن استعمال کرتے ہیں۔ بیس ہزار فٹ کی بلندی کے اوپر آکسیجن کے بغیر جانا ناممکن ہے۔ جنرل بروس کا گروہ صرف اکیس ہزار فٹ کی بلندی تک گیا اور ناکام واپس ہوا۔

ملوری کرافورڈ اور سومرول جب کیمپ سے روانہ ہوئے تو موسم خراب تھا ان کے روانہ ہوتے ہی برف کا سخت طوفان آیا۔ اور چھتیس ۳۶ گھنٹہ رہا دوسرے دن یہ خود قلی ہمراہ لیکر چار رسیوں پر چڑھائی کرنے لگے۔ آلۂ آکسیجن کی وجہ سے وہ چھ ہزار فٹ اور اوپر چڑھ گئے لیکن یک بیک انھوں نے اپنے پاؤں کے تلے ایک خوفزدہ آواز سنی۔ اور جس برف پر وہ کھڑے تھے۔ یکایک پہاڑ کے پہلو پر پھسلنے لگی۔ اور وہ زمین پر گر کر گہرائی کی طرف ہولناک تیزی سے لڑھکنے لگے۔ زندگی باقی تھی کہ پہلی رسی کا سرا جس کے سہارے ملوری۔ سومرول کرافورڈ اور ایک قلی چڑھ رہے تھے برف کے متحرک تودے کے عین کنارے تک پہنچ گیا۔ اور وہ کوئی ڈیڑھ سو فٹ تک پھسل کر رک گئے وہ بال بال بچے اور اٹھکر اپنے ہمراہیوں کو ڈھونڈنے لگے آخر انکو معلوم ہوا کہ دوسری رسی والی پارٹی تو رک گئی ہے۔ لیکن باقی قلیوں والی دو رسیاں ٹوٹ کر گہری غار کا نوالہ ہو چکی ہیں۔

دوسری پارٹی کی مدد کے لئے انھوں نے برف کو نہایت تیزی سے کھودنا شروع کیا مگر صرف دو آدمی زندہ نکلے باقی سات مر چکے تھے۔ اس مہم میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد پھر سنہ ۱۹۲۴ء میں ایک اور مہم تیار ہوئی۔ اس دفعہ ستائیس ہزار فٹ کی بلندی پر کیمپ قائم کئے گئے۔ جہاں سے چوٹی صرف دو ہزار فٹ کے فاصلہ پر تھی ۸ جون کو ملیوری اور ارون نے چار قلی ساتھ لئے اور [illegible] فیصلہ ہوا کہ نارٹن اور اوڈل جنہوں نے اس آخری مہم کا حال لکھا ہے۔ ان کے پیچھے نیچے کیمپ سے پہلے آئیں تاکہ واپسی پر بہادران جستجو کو ہر طرح کا آرام مل سکے۔ ملوری اور ارون

کی روانگی کے بعد بادل اور دھند چھا گئی۔ اور بارہ بجے کے قریب دھند دور ہوئی۔ تو مسٹر اوڈل نے چوٹی پر ایک چھوٹا سا سیاہ دھبہ نظر آیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک اور دھبہ بڑھتا ہوا دکھائی دیا جو پہلے دھبے کے ساتھ چوٹی پر جا ملا۔ لیکن یکایک پھر بادل آ گئے۔ اور وہ بہادر سیاح پھر دکھائی نہ دیئے۔ اتنے میں آندھی بھی چلنے لگی۔ اور جب وہ تھمی اور مسٹر اوڈل نے دوربین لگا کر دیکھا۔ تو پھر کچھ دکھائی نہ دیا۔ اب رات آ رہی تھی وہ گھبرا گیا اور بڑے انتظار کے بعد مایوس ہو کر کیمپ کو واپس آ گیا۔ صبح ہوئی اور پھر بھی وہ دونوں بہادر نظر نہ آئے۔ بڑی تلاش کی گئی مگر اُن کا پتہ نہ ملا۔ قیاس یہ ہے کہ وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ اور واپسی پر اندھیرا چھا گیا۔ وہ سو گئے۔ اور پھر آکسیجن ختم ہو گئی۔ اور وہ مر جاگئے۔

طاہرہ

اچھے نواب

گزشتہ سے پیوستہ

اچھے نواب بلا کے ضعیف الاعتقاد تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بس اعلیار تک محل سرا میں پرورش پائی تھی۔ اتفاق سے جس خدمت گار کے ہاتھ میں مرے ہوئے بکرے کا سر اور دم تھی۔ وہ نیا ملازم تھا۔ نواب صاحب نے اُسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ بس کبھو جو سامنے آیا اُسے جادوگر سمجھا۔ دیکھتے ہی بولا گئے۔ اور کھڑے ہو کر ایک چیخ ماری "اوئی اماں" اور پھر کالیجان کو دیکھ کر جان میں جان آئی بیٹھ گئے اور ہنسنے لگے۔ مگر آپ کی چیخ کی آواز بڑی بیگم کے کان تک پہنچ چکی تھی۔ خدا کی طرح حرم سرا کے دروازہ پر آ پہنچیں اور گھبرا کر بولیں ارے یہ کیا ہنگامہ ہے۔ میرے بچے کی خیر۔ مصاحبین بیگم صاحبہ سے بہت ڈرتے تھے۔ ہاتھ جوڑ کر کہا حضور ان کی تسلی فرماویں ورنہ ابھی چشم بددور بیگمے سر پیٹتی ہوئی باہر نکل آئیں گی اور پھر ہم غلاموں کی کھال کی خیر نہیں۔ نواب صاحب

سمجھ گئے۔ اٹھکر اندر تشریف لے گئے۔ اور والدہ کو سمجھا کر آپ نے ناحق تکلیف فرمائی یوں ہی ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ بڑی بیگم نے چٹ چٹ بلائیں لیں۔ لخت جگر کو سینے سے لگایا اور ناد علی دم کرکے واپس تشریف لے گئیں۔ اور نواب صاحب پھر دربار میں تشریف لائے اہل محفل نے پھر سرو قد کھڑے ہو کر تعظیم دی۔ تھوڑی دیر کے بعد شیخ چھٹن نے از راہ خوشامد پوچھا۔

شیخ چھٹن۔ حضور والا اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں

نواب۔ شوق سے کہئے۔

شیخ چھٹن۔ حضور کے دشمن چھینکے کیوں تھے۔

نواب۔ اتفاق کی بات ہے ہم نے سمجھا کوئی جادوگر آ گیا۔

مرزا فہیم بیگ۔ واللہ ہم نے ابھی تمام عمر میں ایسی چیخ نہیں سُنی چیخ کیا تھی صور اسرافیل تھی۔ میں نے سمجھا کہ قیامت آ گئی ہے۔

شیخ چھٹن مگر ساتھ ہی اُس میں زیر و بم اور ہم آہنگی جو صرف موسیقی والوں کا حصہ ہے موجود تھی۔

مرزا۔ ہاں یہ تو میں بھی مانتا ہوں۔ ہر کہ شک آرد کافر گردد

نواب۔ کالیجان بیٹھ جاؤ یہ کس جانور کا سر ہے تم کھڑے کیوں ہو؟

شیخ چھٹن۔ حضور خانصاحب نے آج بڑے معرکہ کا کام کیا ہے انعام کے منتظر ہیں۔

نواب۔ انعام تو دیا جاویگا۔ مگر میں پوچھتا ہوں کیا یہ کتے کا سر اور دم نہیں ہے۔

کالیجان۔ کیا۔ ہو نہہ۔ آقائے نامدار اسے سگ صحرائی کہتے ہیں۔ یہ معمولی کتا نہیں ہے۔ البتہ خاندان ایک ہی ہے اس پر چڑیل سواری کرتی ہے۔ پنجابی ڈھگے اسے "درگ" کہتے ہیں۔ یہ سگ صحرائی اسقدر خونخوار ہوتا ہے۔ کہ ٹوک سا مانی اسے دیکھکر دم دبا کر بھاگتا ہے۔ آپ کے نمک کی قسم یہ ملعون ہر سپاہی کے کان کاٹتا ہے۔ آج یہ کہیں سے دربار میں گھس آیا بس کیا عرض کروں وہاں ایک ہنگامہ محشر برپا تھا آدمی پر آدمی گر رہا تھا۔ سب کا رنگ فق اور خون خشک تھا عورتیں چلا رہی تھیں

اور سچے رو رہے ہیں۔ بھلے کو حضور کے اقبال سے میں وہاں پہنچ گیا ورنہ لکھنؤ آج
ویران ہو جاتا علام نے جاتے ہی ایک وار میں ڈھیر کر دیا۔ کیا کیا تھا گھنٹا اٹھا۔

نواب۔ شاباش مگر تم میں سے کسی نے کبھی چڑیل بھی دیکھی ہے۔

شیخ چھٹن۔ اے حضور اگر چڑیل نہیں دیکھی تو کیا یوں ہی دھوپ میں سر سفید کیا ہے مدت کی بات ہے۔ ابھی میرا جوانی کا عالم تھا کہ میرا بیابانوں کے بن میں گذر ہوا۔ میں تھکا ہوا اور ماندہ تھا ایک بڑے سڑک کے نیچے بیٹھ گیا۔ تکان کی وجہ سے نیند آ گئی اور غافل سو گیا پھر جو آنکھ کھلی تو آدھی رات گذر چکی تھی۔ یکایک میرے کان میں پازیب کی آواز آئی۔ آنکھیں مل کر جو دیکھا تو سامنے ایک عورت کھڑی تھی چوٹی ناساف اور پیچھے کا موباف میں حیران ہوا۔ کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ اس سنسان بیابان میں ایسی نار میں حور سمجھ جیسے آسمان سے آ گئی۔

مرزا لغیم بیگ۔ واہ شیخ جی آپ نے غلطی کی پریاں بیابان میں نہیں تو اور کہاں ہوتی ہیں۔

نواب۔ بات کرنے دو بیچ میں نہ ٹوکو۔

شیخ چھٹن۔ بس حضور وہ پری آگے بڑھی۔ ہاتھ میں مٹھائی کا دونا تھا۔ میرے پاس بیٹھی اور لگی میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں بھی رسیلہ خلطی ہو گیا۔ قسمت اچھی تھی۔ اگر کہیں اس دونے کے گلاب جامن چکھ لیتا۔ تو اُلّو بن کر یا کرگس بن جاتا۔ سب سے بڑھ ہوئی۔ میرے ماموں جان بڑے عامل ہو گذرے ہیں اُن کی روح نے مدد کی مجھے اُن کا سکھایا ہوا ایک عمل یاد تھا اُس وقت خود بخود یاد آ گیا۔ اُس کا پڑھنا تھا کہ وہ بالکل کانپنے لگی۔ اور پھر جو دیکھتا ہوں۔ تو ایک کالی کلوٹی بھجنگ موٹی گندہ دہن پرولیدہ مو زرد چشم چہل پیری۔ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ جس کے پستان اگر سنگ نہیں تو مشکیزے ضرور تھے۔ یہ صورت دیکھ کر میں تو یکدم وہاں سے بھاگا۔ اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ آخر گھر آ کر دم لیا سچ عرض کرتا ہوں [illegible] کی مٹھائی دیکھتے دیکھتے لید بن گئی۔ نواب۔ اور پیچھے مڑ کر کیوں نہ دیکھا۔

کالیجاں۔ واہ اگر شیخ جی پیچھے مڑ کر دیکھتے تو وہ ڈائن کلیجہ نکال لیتی۔

مرزا نعیم بیگ۔ خیر کلیجہ تو کیا نکالتی۔ شیخ جی کے ماموں بڑے عامل تھے۔ اُنکی روح اُس وقت مددگار تھی مگر شیخ جی کو نسائی ضرور دکھاتی۔

نواب۔ نسائی کیا بلا ہوتی ہے۔

مرزا۔ یہی کہ ایک تھپیڑے سے شیخ جی اندھے یا گونگے یا بہرے ہو جاتے۔

شیخ جی۔ اس میں کیا شک ہے۔

اتفاق سے سابق داروغہ جی جو اس خاندان کے پرانے نمک خوار تھے اور بڑے نواب صاحب کے مدار المہام رہ چکے تھے۔ آ گئے۔ انھوں نے بھی یہ لوچ اور لچر گفتگو سنی اور آگ بگولا ہو گئے۔ یہ مہینہ میں ایک بار نواب کے سلام کو آتے تھے۔ اب بھی انھیں مرحوم نواب کی وصیت کے موجب وظیفہ ملتا تھا۔ اور یہ نواب کے مصاحبوں سے بہت جلتے تھے۔

داروغہ۔ حضور یہ سب عیب ہے۔ اس [illegible] نے تو جھوٹ کے کان کتر دیتے۔ ان لوگوں سے خدا بچائے۔ بات کا بتنگڑ۔ رائی کا پہاڑ۔ [illegible] کا مالا۔ بیر کا کوّا تنکے کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔

شیخ چھٹن۔ داروغہ جی آپ بزرگ ہیں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ اگر چڑیل دیکھو تو ساری چوکڑی بھول جاؤ۔ زبانی جمع خرچ کے تو ہم قائل نہیں ہیں۔

داروغہ۔ اجی رہنے بھی دو اگر مجھے چڑیل دکھا دو تو ٹانگ کے راستہ نکل جاؤں۔ میں سب پاپڑ بیل چکا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ آپ کیسے پانی میں ہیں۔

شیخ چھٹن۔ داروغہ جی زبان سنبھالیے۔ میں بھی خاندانی ہوں کوئی ایسا ویسا نہیں ہوں۔ کیا کروں پاس ادب مانع ہے ورنہ اس [illegible] کا مزہ چکھا دیتا۔

داروغہ۔ ایسے وہی ہوا ہے۔ لو اب مزہ چکھاتے ڈھائی گھڑی کہیں کا

مرزا۔ چھوڑئیے انھیں سمجھاتے ہیں تو یہ طرح [illegible]

داروغہ۔ ہم سب ایک ہی محفل کے [illegible] ہو۔ تو اور [illegible] یہ حوتا بھی پانی میں جانے لگا۔

شیخ چھٹن۔ (جھنجھلا کر) بس حضور اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا اسے حکم دیں کہ جوتے سنبھالے ورنہ ابھی گدا دونگا۔

کالیخاں۔ اور مجھ سے بھی ایک معزز دوست کی تضحیک دیکھی نہ جائیگی۔ اور ناچار مجھے جوتا سنبھالنا پڑیگا میں جہانگیر خانی ہوں مجھے ایسا ویسا نہ سمجھنا۔

نواب۔ داروغہ جی آپ ناحق بیچ میں بول رہے ہیں۔ چڑیل اور بھوت ضرور ہیں۔

داروغہ۔ سرکار کیسی چڑیل اور کہاں کا بھوت پریت یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ اور یہ لوگ جو حضور کے روبرو بیٹھے ہیں ایک ہی کائیاں ہیں۔ ملا کے جھنجھالے یہ تو کالے ناگ ہیں جنکے کاٹے کا نہ منتر ہے نہ جنتر اگر اس نمکخوار کی سنیں تو ابھی ان سب کو نکال باہر کریں۔

نواب۔ خبردار داروغہ جی آپ اس وقت تشریف لیجائیے۔ میں ان لوگوں کو اچھا جانتا ہوں یہ میرے حقیقی خیرخواہ ہیں۔ میرے اشارے کی دیر ہے۔ ابھی آسمان کو تھگلی لگا دے اور پاتال تک کی خبر لانے کو تیار ہیں آپ نے انھیں سمجھا ہی کیا ہے۔ آئندہ میرے روبرو انکو بُرا نہ کہنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

یہ سنکر بیچارے داروغہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ اور مصاحبین بغلیں بجانے لگے۔

نائی نائی چیف اڈیٹر (خان احمد حسین خان)

کلام شوکت

غیر از لقائے شانِ فنا دل بسیں نہ ہو
جز لامکاں ہوا ہے مکاں و مکیں نہ ہو

کیوں دل سے ہر نگاہ میں منزل گزیں ہو
یعنی وہ جلوہ کیا کہ کہیں ہو کہیں نہ ہو

کٹتے ہیں ہاتھ حرص کے سکل لب فسوس
محل طلسم دہر سے تو میوہ چیں نہ ہو

گر کچھ بھی قرب منزل عرفاں کا پاس ہے
غیر از نفس تو نفس سے ہر گز قریں نہ ہو

ہو محو سیر حسن لطافت رخ جمال ‏— شبلی وہ کیا ہے آنکھ کی جو حور عیں نہ ہو
عرفان حق کا عقل سے ہے اور سد باب ‏— کنجی ہے شیخ قفل در آہنیں نہ ہو
آلودہ گر نہ لب ہوں رشوت و رس سے ‏— ابتک جو آگہیں ہے وہ سرنگیں نہ ہو
پس پروراں خاک سے گر روح کو نہ خوف ‏— آمادگاہ طعنہ گردوں زمیں نہ ہو
لے عہد لیس کیا سنی صرصر فنا ‏— اوراق گل کی گرد جگر کب سے حزیں نہ ہو
قتل اللہ نسخہ کہہ دار نشک ہے ‏— کہتے ہیں جس کو گلشن جنت حسیں نہ ہو
سملا کے ماؤں سوئے ہیں سینے مدت کے بعد ‏— نہ جھرح کی حریف محمد کی زمیں نہ ہو
تمیں نہ حسین رہا ہے یہ کیوں نقش بوریا ‏— ڈر ہے خراب سجدہ طاعت زمیں نہ ہو
حاصل ہے اسکو خلد حساب اللہ کی سیر ‏— ماسد عم اسیر شہو رو سس نہ ہو
بھا سحد میں سوال بہ تپلی سے قیس کا ‏— محمل نشیں وہ کیوں ہے جو محفل نشیں نہ ہو
باد صبا حریف ہے مست غبار کی ‏— نقش حرام یار تو چیں بر جبیں نہ ہو
ہوتے ہیں کامیاب مردوں سے طفل سک ‏— کب وصل حور عیں ہو جو شیطاں لعیں نہ ہو
گھس جائے تارس کے بلا سے ہوں سو لقاب ‏— رونا نگاہ کا ہے اگر دوربیں نہ ہو
گم ہیں نگاہ یار میں گم رہ عہب سے ‏— اسے لاغری خدا کے لئے مازمیں نہ ہو

التماس بھی ہو کوئی تو سوکت ہو پاس اُسے
جسکو کہ اسماع ستہ یاد سس نہ ہو

مرسلہ غلام عباس ایم اے

قانونی فیصلہ

دھوپ بہت تیز تھی گیہوں اور چنے کے کھیت جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی زردی مائل

نظر آتے تھے فصل پک چکی تھی۔ کاٹنے کی دیر تھی گاؤں کی تمام آبادی ہرپال کے کھیت کی طرف جوق جوق چلی جاتی تھی۔ کیونکہ وہاں ایک قتل ہو گیا تھا۔ لاش کے آس پاس ایک ہجوم تھا بڑے بڑے پتھر آس پاس پڑے تھے۔ جن سے شاید مقتول کے سر کو کچلا گیا تھا۔ یہ پریم کی لاش تھی جو گاؤں کے ایک بڑے کاشتکار کا لڑکا تھا۔ اس کے ماں باپ رشتہ دار سب ہی کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ ابھی پھیروں پر اُس کی بیوی نے ہاتھ پٹک پٹک کر چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں پریم کی ننھی سی لڑکی آپ ہی آپ رو رہی تھی۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ لیکن اپنی دادی دادا۔ ماں سب کو دیکھکر اُسے بھی رونا آتا ہوگا۔ کھیت کا مالک ہرپال بھی اس مجمع میں موجود تھا وہ بہت افسوس ظاہر کرتا تھا کہ نہ جانے کس پاپی نے جس کا ستیاناس ہو جانا چاہئے۔ نوجوان پریم کو رات کے وقت مار ڈالا۔

دیہات کی وہی بولی ہے اگر ہرپال کے کھیت میں قتل ہو گیا۔ تو وہ قاتل کس طرح ہو سکتا ہے۔ خاصکر جبکہ پریم کے ساتھ اُس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ کوئی پیشہ ور ڈاکو نہیں تھا جو زیور چراتا۔ جو پریم کے کانوں میں تھا خدا کے دیئے اس کے پاس کافی دولت ہے گاڑی بیل ہیں بھینس ہیں گائے ہیں وہ ایسا گناہ کس کے واسطے کریگا اسکی تو دلی تمنا یہ ہے کہ اپنی زندگی امن اور چین سے گذار دے۔ اسی سال فصل آجانے پر گاؤں کے مارواڑی کے ہاتھ اپنا تمام غلہ بیچکر وہ تیرتھ کرنے جائیگا گنگا اشنان کریگا جو کچھ اُس سے بچے گا وہیں گنگا جی کے کنارے غریب برہمنوں کو کھلا پلا کر خیرات کر کے واپس چلا آئیگا ایسے دھرماتما آدمی پر کسی کے قتل کا شبہ رکھنا کہاں کی انسانیت ہے۔

لیکن لوگ ہیں ہی کہے جاتے ہیں کہ ہرپال ہی نے قتل کیا۔ اچھا اگر اُس نے قتل نہیں کیا تو اُس کی آنکھیں لال کیوں ہیں۔ وہ لاش کے پاس کھڑے کانپتا کیوں ہے۔ یہ سب سالق اُس کی صورت پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ وہ نظر ملا کر کیوں بات نہیں کر سکتا۔ لیکن ایسے صحیح الاعتقاد لوگ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ

کیا کسی بیماری کی وجہ سے اُس کی آنکھیں لال نہیں ہو سکتیں۔ رات کے وقت جو جاڑے کے ساتھ اُسے بخار چڑھا تھا جس کی وجہ سے اُس نے دودھ اور کونین کی گولی بھی کھائی تھی۔ آیا اس سبب سے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اُس کا دل بہت نرم ہے۔ وہ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتا۔ اسی وجہ سے اُس کی رنگت بھی فق ہے۔ منہ پر بھی ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ یہ کوئی ایسی علامتیں نہیں ہیں کہ جو وہ خواہ مخواہ اسی کو قاتل تصور کر لیا جائے۔ بہر حال اگر قاتل ہوتا تو اُس کے بدن پر جو کپڑے ہیں۔ ان پر کہیں تو خون کا ایک آدھ چھینٹا پایا جاتا لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اب جو قمیص وہ پہنے ہوئے تھا اس سے لیکر دھوتی۔ سر کا صافہ۔ ہاتھ کا رومال کہیں ایک لال قطرہ بھی نہیں تھا جو خشک ہو کر سیاہ ہو چکا ہو۔ پھر اگر یہ قاتل ہوتا تو ایسے ہی آپ کو کیسے گالی دیتا۔ جیسے کہ کھڑے ہو کر اُس نے بھرے مجمع میں دی۔

(۲)

شام کو داروغہ صاحب اپنے مخصوص اعلیٰ گھوڑے کو اڑاتے ہوئے موقعہ واردات پر آ پہنچے۔ داروغہ صاحب کو مرزاجی کہتے ہیں۔ وہ جب کسی سے ہم کلام ہوتے ہیں تو یہ جانئے کیوں تو تپ دست بردہ ہو جاتے ہیں خدا نخواستہ وہ کوئی ہاتھی تو ہیں نہیں جن کی چنگھاڑ سے رعد ہی نہیں جن کی گرج سے بجلی کی سیٹی ہی نہیں جن کے شور سے آدمی کا دل دہل جاتا ہو۔ اُن کی آواز محض مشہور و معروف کا سوالی ماسٹر لیکچروں سے تھوڑی بلند ہے اور صرف اسی کی وجہ دہار بہ تم کا کوئی پردہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا مرزاجی جب کسی سے ہم کلام ہوتے ہیں تو نہایت موزوں الفاظ میں نہایت فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرماتے ہیں جسے پولیس کی اصطلاح میں، اخلاقی مطالبہ فہمائش کہا جاتا ہے

مرزاجی نے آتے ہی لاش کا معائنہ کیا۔ ان سب لوگوں کو جو خواہ مخواہ کی بھیڑ لگائے کھڑے تھے مرزاجی کے بردلی نے "دو جاؤ کیا کوئی تماشہ ہے" کہکر وہاں سے بھگا دیا صرف مقتول کے شوہر اور چند خاص خاص آدمی وہاں رہ گئے۔ چونکہ مرزاجی کا مطالبہ فہمائش کے کا [illegible] حاصل نہیں ہو [illegible] اور [illegible] نہیں سکے۔ مرحوم کے گھر سے

سب سامان منگا لیا گیا اسی جگہ بیٹھ کر کچھ شہادتیں قلم بند کی گئیں بعد مقتول کے گھر جا کر مرزا جی اور اُن کے اردلی کے کھانے پینے کا سب بندوبست پرتم کے باپ نے کیا تھا اُن کے جانے پینے کے لئے سیر بھر دودھ دونوں وقت پاؤ بھر گھی کھانے کے واسطے روزمرہ اسی کے ہاں سے آتا تھا اُس نے مارواڑی سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ داروغہ صاحب اور اُن کے سپاہیوں کے لئے نمک مرچ لانے کا بنیل اور جس سامان کی ضرورت ہو میرے کھاتے میں لکھ کر دے دیا کرنا۔

لاش اُسی دن بیل گاڑی پر لاد کر جو سور بھیجدی گئی تھی تاکہ وہاں ڈاکٹر صاحب اس کا طبی معائنہ کر لیں۔ پرتم کا باپ اور اُس کا سالا لاش کے ہمراہ جو سور چلے گئے تھے۔

داروغہ صاحب نے پورے پانچ دن تفتیش کی اور آخر کار اُسی بیچارے ہرپال کو ہتھکڑیاں پہنا دیں جو اپنی دانست میں بالکل بے قصور تھا۔ لیکن بقول اس کے داروغہ صاحب نے اس کے دشمنوں سے کچھ لے لیا۔ اور اسے پھانسی پر لٹکانے کی کوشش فرمائی ہے ایک سوائے ہرپال کے نوکر کے جس کا نام لوٹا جی ہے کوئی بھی معتبر و صحیح شہادت نہیں مل سکی۔ لوٹا جی کی عمر بائیس برس کی ہے اس کا کوئی اور نام ہے لیکن چونکہ اللہ میاں نے اپنی مرضی سے اس کا بہت چھوٹا کیا ہے جیسے کوئی جھاڑ سے ہی نیچے پھیل رہا ہو۔ اسی لئے گاؤں والے لوٹا جی کہہ کر پکارتے ہیں اور جب سب لوگ اسکول کے لڑکے تک اُسے لوٹا جی کہنے لگے۔ تو وہ بھی اسی نام سے جواب دیتا ہے۔

لوٹا جی نے پولیس میں کیا بیان دیا؟ پہلے تو وہ کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہرپال نے اُسے ڈرا دیا تھا "یاد رکھنا تجھے مار ہی ڈالوں گا" لیکن داروغہ صاحب نے جب بہت دم دلاسا دیا تو اُس نے کہا کہ رات کے دو بجے میں اپنے مالک کے ساتھ کھیت دیکھنے گیا تھا اندھیری رات تھی کئی دن سے اس چور کا پتہ نہیں لگتا تھا جو رات کے وقت اپنے مویشی مالک کے کھیت میں چرا لیا کرتا تھا اور صبح ہوتے اجڑی ہوئی فصل اور مویشیوں کے سموں کے نشان کے کچھ نہیں نظر آتا تھا مالک نے ایک دو وقت مجھے مارا بھی تھا

کہ اچھی رکھوالی نہیں کر سکتا۔ اور بدمعاش چور یہ جانتے رات کی کونسی گھڑی میں فصل اجاڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اُس دن سے ہم دونوں کھیت میں ہیں۔ مجھے دیکھا مویشی بڑی آزادی سے جیسے کہ کھیت میں چرتے پھر رہے ہیں اور کوئی آدمی اکڑوں بیٹھا ہوا اونگھ رہا ہے ہرپال سے ضبط نہیں ہو سکا اور اُس نے اپنی لمبی لاٹھی کا بھرپور ہاتھ اونگھنے والے آدمی کے سر پر مار دیا۔ وہ "ارے باپ مار ڈالا رے" کہتا ہوا زمین پر لوٹنے لگا اور تھوڑی دیر میں اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ میں اُس کے پاس نہیں گیا دور کھڑا رہا اور وہیں سے کہتا رہا "مالک بس کرو، مالک بس کرو" لیکن ہرپال الٹا مجھی کو گالیاں دیتا رہا۔ اور ڈرایا کہ اگر کسی سے بولنے سنا یا تو یاد رکھنا تجھے بھی اسی طرح مروا ڈالوں گا لوٹا بھی نے یہ بھی کہا کہ ہرپال نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بیہوش آدمی کے پاس گیا دیا سلائی سے اُس کے سر کے بال جلا کر دیکھے کہ آیا اس میں کوئی جان باقی ہے یا نہیں اس کے سر پر مجھ سے بڑے بڑے پتھر پٹکے۔ جس سے اُس کا سر پاش پاش ہو گیا پھر وہ اُسی وقت اسے گھر واپس چلا آیا ہرپال نے راستہ میں کئی دفعہ کہا کہ خبردار کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ لوٹا بھی نے اُسے ہر طرح اطمینان دلایا اور اپنی بھری جوانی کی قسم کھائی تھی۔ کہ وہ کسی سے نہیں کہے گا۔

اسی دن شام کو انسپکٹر صاحب نے ہرپال کو ایک بات پوچھنے کے لئے بلایا اور ہتھکڑی ڈال دی ہرپال کا یہ کہنا جھوٹ نہیں تھا کہ مجھے دھوکے سے بلا کر گرفتار کیا گیا ہے داروغہ صاحب نے اُس کے گھر کی تلاشی بھی لی۔ کونا کونا چھان مارا۔ لیکن سوائے ایک دھوتی کے جس پر ایک ٹین کے پاس خون کا ایک تل کی برابر داغ تھا اور کوئی جرم کا ثبوت اگر سوالی سے برآمد نہیں ہوا البتہ کچھ کپڑے اس کے گھر کے ایک کونے میں جلے ہوئے پڑے تھے جنھیں اُس کی بیوی نے جلایا تھا۔ تاکہ وہ بات جو کبھی اُس کے گھر میں نکلا کرتا ہے بھاگ جائے یہ جو دھوتی پر بھی جو خون کا داغ تھا وہ مچھر کے کاٹنے کے سبب زور سے کھجلانے سے جو ہرا جس کا خون اُس کے پسینے میں لگ گیا تھا اُسی کا داغ تھا

اس دن جبکہ ہرپال کو پولس کے دو سپاہی پکڑ لے گئے بستی میں بڑی سنسنی پھیلی رہی۔ کوئی گھر خالی نہیں تھا جہاں ہرپال کی گرفتاری اور رہنم کے قتل کا ذکر نہ ہو لیکن ہرپال کی لاولد بیوی اپنے سر کو ہاتھ لگائے ہوئے ایسی پُر درد آواز سے بین کر رہی تھی اور رلونا بیجی کو کوستے دے رہی تھی کہ اُس کی پڑوس والی عورتیں بھی جھمیں رونا نہ آتا تھا "جل جیب رہ نگوال کرے گا جھوٹ جائے گا دیوانی ہوگئی ہے" کہکر اُسے ڈھارس بندھا رہی تھیں

(۲)

مرزا جی جاگ اٹھے انگڑائی لی جمائی لیتے وقت اُنکے کھار نگ کے واسطے صاف نظر آنے لگے۔ انہوں نے آواز دی "منشی"

جو چوکیدار بہیرہ کی حرجت مالگزاری اور گاؤں کی فوتی پیدائش کا بیان درج کرانے اپنے اپنے گاؤں سے تھانے میں آتے تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے اور "سرکار سلام" کہتے ہوئے جھک کر آداب بجا لاتے۔

مرزا جی نے ڈپٹ کر کہا "ابے ہری کے بچے کم بخت ہو رہے جاؤ منشی کو بھیجو" تمام چوکیدار اپنے حرامی جی دان جن میں اُن کی روٹیاں کھانا رہی ہے بغل میں لٹکائے لٹکاتے اُلٹے پیروں تھانے کے اندر واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں محرر صاحب آئے۔ سلام کیا مرزا جی نے گردن ہلا دی اور پوچھا "دیوان جی صاحب کا کوئی تار تو نہیں آیا یاد ہو تو رستے تھانے سے ہرپال کی گرفتاری کا حال جلن کے کاغذ اب تو نہیں آسکتے"

منشی نے اپنے پوجا کی کوٹھی کی جیب میں سے چشمہ نکالا جسے باوا آدم کے دوست کے ایک کباڑی اخطڑ سے اُس نے ساڑھے تین روپئے میں اصلی پتھر کی نقل کر کے ایک پہیلے خریدا تھا چشمہ لگا اور جو کاغذ اپنے ساتھ پلندہ ۱۰ پیپر ہمراہ لایا تھا انہیں پڑھ پڑھ کر "نہیں یہ نہیں ہے ہوں یہ نہیں ہے" کہکر الٹ پلٹ کرنے لگا۔

مرزا جی گرج کر کہنے لگے "اماں تم دن رات کو نہیں پڑھتے ہو۔ یہ نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کے کیا معنی پہلے سے نہیں دیکھ لیتے جلدی بتاؤ۔ ہاں یا نہیں۔ مجھے

ابھی مستعد ہو جاتا ہے۔

منشی نے آہستگی سے کہا، "حضور میں نے نہیں پڑھا کوئی معلوم نہیں ہوتا چوکیداروں کی رپورٹ لکھ رہا تھا اس لئے پڑھنے کی فرصت نہیں ملی۔"

مرزا جی بولے "چوکیداروں کی رپورٹ انھیں ابھی جلدی فرصت دیکر کسی بہانہ جھاڑے میں لگاؤ۔ ایک سے کہو وہ ہمارا گھوڑا ٹہلائے۔ برتن میلے پڑے ہیں ایک کو برتن مانجنے بھیجو۔ ہم ان دیہاتوں پر حکومت کرنا ہی نہیں جانتے۔ کیا جانیں سب انسپکٹری کا امتحان دو گے۔ ارے گنوار کی رکھ ایڑی میں ہوتی ہے۔ ارے لکڑیاں نہیں کٹیں ایک کو سرکاری کلہاڑی دیدو وہ ہمارے گھر کی لکڑیاں کاٹنے جائے وقت ان سب کو بتادینا کہ داروغہ صاحب کے لئے اگلی دفعہ ایک ایک مرغی لائیں۔"

منشی "بہت بہتر" کہکر مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

(۴)

بہرحال سمپس کے سپرد کردیا گیا۔ سنا گیا ہے کہ سمپس جج صاحب اُسے موت کی سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ لوٹا جی کی شہادت بڑے ماتے کی سمجھی جاتی ہے وہ اسے جی میں کہتا ہے بہرحال تو قصہ ہو جاتا۔ جنگل میں لٹا جھوٹی ٹانگ کر گاؤں گاؤں پھری لگا لیتا مگر عدالت میں روز سچ بولنے والے ہرگز کبھی نہ کرتا جس نے گلایا ہے جس کے سامنے سر اٹھا ہوا تو سدھا ہے اُسی پر سارا دھن کماؤں دولت دار کہتے ہے۔

مرکم کا باپ مقدمہ کی کارروائی میں بہت حصہ لیتا ہے لوگوں نے اس سے بہت کچھ کہا کہ ایسا ایک جان لگی وہ سزا پائیں جانے۔ ہر بار کو بچانے کی کوشش کر سکیں اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ایسی باتیں سنکر بڑے اچنبھے آجاتا ہے۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو امڈنے لگتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے جس نے میری بہو کو بیوہ کر دیا میری بار دیکھے میرا بیٹا کا سر دھڑوں سے الگ کر چکا اور کر ڈالا۔ کیا اس پاپی کو میں بچانے لگا۔ نہ کیا ایسا کہ اس پھر کوئی ستارہ سمپس نہیں کر سکے۔

(۵)

آج سیشن جج کی عدالت میں ہیرپال کے مقدمہ کی پیشی ہے۔ اُس کی موت اور زندگی کا فیصلہ آج ہی ہوگا پورے چار مہینے ہو گئے جب سے ہیرپال کی روح زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہی ہے۔ کیا ہونا ہے کیا نہیں ہونا۔ یہی ایسے سوال ہیں۔ جو اُس کی طبیعت کو جنجال میں ڈالے رہتے۔ اگر اسے پھانسی کے تختہ پر چڑھایا جائیگا تو کیونکر اُسکی جان نکلیگی آج اُس کے دل کے گوشے گوشے سے سچائی کے ساتھ خدا کا نام نکل رہا ہے۔ درخواست فریاد کی جگہ میں آواز نکل رہی ہے وہ اپنے گناہ کی معافی کا طلبگار ہے۔

الہ آباد کے مشہور بیرسٹر مسٹر اصغر کو پیروی کے لئے بلایا گیا ہے۔ وہ ڈھائی سو روپیہ روز کی فیس پر آتے ہیں ہیرپال نے اپنے تمام مویشی بیچکر اُنکی فیس کا روپیہ پہلے ہی ادا کر دیا ہے اُسکی طرف سے صفائی کے گواہ بھی طلب کئے گئے ہیں۔

لوٹا بھجی کی شہادت بالکل وہی ہوئی جو اُسکے پہلے سیشن سپرد کرنیوالے مجسٹریٹ صاحب کے روبرو گذر چکی تھی۔

مسٹر اصغر نے جب تمام مقدمہ کی تمام مسل دیکھی پولس کا روزنامچہ دیکھا ابتدائی رپورٹ دیکھی پھر ملزم کے کان میں کہا جو کٹہرے میں پا بجولاں کھڑا تھا "تمہارا اصلی نام کیا ہے"

اُس نے دھیرے سے کہا "ہیرپال"

پھر مسٹر اصغر کہنے لگے "ہیری پال تو نہیں ہے؟"

ملزم نے کہا "ہیری پال نام کا میری ذات کا ایک اور راجپوت ہے جس کا کھیت بالکل میرے کھیت سے ملا ہوا ہے"

ایسا سنکر مسٹر اصغر چپ ہو گئے۔

شہادتیں گذرتی رہیں وکیل سرکار جرح کرتے رہے۔ لیکن مسٹر اصغر نے کسی سے کوئی جرح نہیں کی وہ آنکھیں بند کئے گال کو ہاتھ لگائے اپنی کرسی پر بیٹھے رہے۔ جیسے کسی بہت گہرے خیال میں مستغرق ہوں

سیشن سپرد کرنے والے مجسٹریٹ صاحب کے سامنے جب لوٹا بھجی کے اظہار ہوتے

وکیل صفائی مسٹر مظہر نے اُسے پے در پے مغالطے دیے لیکن وہ ذرا نہیں بدلا۔

ہیرپال جیل میں ہے اُسے ہر پیشی کے روز گیارہ بجے پولس کے سپاہی ہتھکڑی لگا کر مجسٹریٹ صاحب کی اجلاس میں لے آتے راستہ میں جب ہمسائی اُسی کی جانب مخصوص انداز سے دیکھتے۔ تو وہ زبان حال سے کہتا کہ یہ سب مجھے قاتل سمجھتے ہیں میں قاتل کس طرح ہو سکتا ہوں کسی نے قتل کرتے ہوئے مجھے نہیں پکڑا۔ اُسے ابھی ہو ہی ہیرا کی یاد آگئی ہے۔ ہیرا اور اُس کا بھائی رحمت کئی مرتبہ اجازت لیکر جیل میں دیکھنے گئے تھے ہیرا اپنے شوہر کو دیکھکر آبدیدہ ہو جاتی ہے لیکن وہ اُسے سمجھا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ میرے بھاگ ہیں تو میں بچ جاؤں گا۔ ورنہ نہیں۔ میری تو بیڑا تمہارے لگی ہے۔ ناؤ کا پار لگانیوالا وہی ہے اُسی کا نام جپ اور اُسی کا آسرا لے۔

ہیرپال سے مرزاجی ایک دو مرتبہ مل آئے ہیں اور انھوں نے جیلر صاحب سے بھی کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ آپ سے سچ سچ بتادے کہ فلاں نے قتل کیا ہے۔ تو آپ مجھے بتا دیدینا میں اسے بالکل بچا دونگا۔ لیکن جیلر صاحب کو ابھی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی انھوں نے ہر چند پوچھا معافی کے وعدے کئے۔ لیکن ہیرپال نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں بالکل بے قصور ہوں نہ میں قاتل ہوں نہ میں نے قتل کیا ہے۔ وہ میرا دشمن نہیں تھا پھر لوٹا بھی کیوں گواہ ہوا؟ کیونکہ میں نے ایک دن اُسے مارا تھا۔ اور مرزاجی نے اُسے پولس میں معافی دلانے کا وعدہ کیا ہوگا۔ اُس نے یہ بھی کہا جیلر صاحب اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہی ہیں تو میں کہتا ہوں کہ آپ ہی نے قتل کیا ہے۔

ہیرا کے جو رشتہ دار ہمدردی کرنے دوسرے گاؤں سے آتے ہیں تو وہ سر ڈھانپکر گھونگھٹ نکال کر چیخ چیخ کر رویا کرتی ہے۔ اپنے شوہر کی ایک ایک بات یاد دلاتی ہے وہ کیسے گاڑھے [illegible] نکلا۔ [illegible] میں نکھر جاتا [illegible] دو بھینسیں تو پالا کرتے تھے کہ سال ہی بھر چھاچھ پیتے رہیں اپنے ہاتھ سے بھینسوں کا دودھ دوہا کرتے تھے اگر میں منع کرتی۔ تو سمجھا دیتے تھے مفت میں گوالوں کو یہ روپیہ کیوں دیا جائے۔ ہیرا اپنے شوہر کے کپڑے دیکھکر اُن کی یاد کرتی ہے اُس کی پیسے کی پیسا کو جو ایک پوٹلی میں باندھی رکھی ہے اُسکی

حلیم جو اپنے بھائی رحمت کو بھی پہننے نہیں دیتی اُن کے وہ جوتے جو ساڑھے میں ملے کے ہیں اور جنہیں ہر سال سو بار کے دن یا کسی بڑے آدمی سے ملنے جاتے وقت مانگوا رہوں کے انسپکٹر صاحب کو قتل کا حال سنانے جاتے وقت پہنا تھا یاد کر کے اُس کا سانس بہت ٹھنڈا اور لمبا آنے لگا۔ ساون کے دنوں میں ہر سال کیسا اُن کے یار دوست مٹھکے سمجھ گیا کرتا تھا ہر سال سے اُس کے لئے جو سونے کے کنگن بنوا دئے تھے اُنہیں دیکھ کر ہر وقت اُس کی تصویر ہریا کی آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے اُس نے اپنے کنگن چھوڑ کر باقی تمام زیور مارواڑی کی دوکان میں گرو رکھ دیا ہے اور شوہر کے مقدمے میں روپیہ خرچ کر رہی ہے گاؤں کے زمیندار اور بڑے آدمیوں نے کہہ کر ہریا سے لوٹا بھی سر پر دھروا لیا ہے۔ کہ وہ شمشیر جج کے سامنے کہہ دے کہ میں کچھ نہیں جانتا اس کے بعد بھی ہریا اُس کے نام اپنی تمام جائداد اور بیل گاڑی لکھے دیتی ہے۔ لیکن لوٹا بھی نہیں جاتا اگر وہ مال لے گا۔ تو مرزا جی اُسے پھانسی پر لٹکوا دیں گے۔ ہریا سب سمجھ جاتی ہے۔ کہ اگر اُس کا شوہر چھوٹ آئیگا تو وہ اسی برادری کے ہاتھ ایک دن ضرور دھلائیگی۔

قتل کا مقدمہ تھا اس لئے تمام مقامی وکلا تماشا دیکھنے جمع ہوتے تھے مظہر صاحب اور سب وکیل بہت تجربہ کار تھے کہ مسٹر اصغر کو آج فضول پیروی کے لئے کھڑا کیا گیا۔ ڈھائی سو روپیہ مفت کے گئے۔ اُس وقت اُن سب کی رال نہیں ٹپک رہی تھی۔ بلکہ وہ اس امر پر متحیر تھے کہ مسٹر اصغر نے کسی سے ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔ کوئی قانونی گرفت نہیں کی

جب تمام گواہ گذر چکے مسٹر اصغر نے صفائی کے گواہوں سے اور استغاثہ کے گواہوں سے بھی ثابت کر دیا کہ ہری مال نامی تاؤلی راجپوت اُس گاؤں میں رہتا ہے۔ اور اُس کا کھیت قاتل کے کھیت سے کچھ دور ہے مرزا جی نے بھی شہادت دی۔ اور کہا بیشک ہری مال نامی راجپوت رہتا ہے۔

مسٹر اصغر نے مسٹر جج اور اسیسروں سے خطاب کیا "ابتدائی رپورٹ اور پولیس کے روزنامچے سے ایک لفظ اس کی تمام مثل میں کہیں میرے موکل کا نام نہیں ہے

اس میں ہرپال کے بجائے ہری پال لکھا ہوا ہے۔ سرکل انسپکٹر صاحب یا سب انسپکٹر صاحب یا ہیڈ کانسٹبل یا کانسٹبل ان میں سے کیسے بیوقوف اور گدھا کہا جاتے جو اعلیحضرت انصاف کی سرکار میں ہری پال کے بجائے بے قصور ہرپال کو ماخوذ کر کے لے آئے ہیں ہو سکتا ہے کہ ہری پال نے ہرپال کے کھیت میں ڈال دیا ہو جو بالکل قرین سا ہے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ میرا مؤکل بے قصور ہے۔ اور اُس کا نام کہیں پوری مسل میں نہیں ہے۔

مسٹر اصغر اتنا کہکر پھر بیٹھ گئے۔

فاضل جج نے اسیسروں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اور وکیلوں کے باریک نکتہ کی بنا پر ہرپال کو بری کر دیا۔

آج ہرپال رہا ہو کر آگیا۔

اس کے گھر میں بڑی خوشی منائی جا رہی ہے۔ جب اُس کی بیوی نے جھک کر بڑی عقیدت کے ساتھ اُس کے قدم چومے تو ہرپال کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اُس نے رحمت کے چھوٹے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ اور کہا آج سے میں اسے اپنا بیٹا بنائے لیتا ہوں۔

از حسن عزیز جاوید

لمعاتِ مہر

خوں کس کا چھپائے بیٹھے ہو | آج مہندی لگائے بیٹھے ہو
یہ قیامت نہیں تو پھر کیا ہے | کب سے تم سر جھکائے بیٹھے ہو
کس نے ہنس ہنس کے جان دی تم پر | غم کی صورت بنائے بیٹھے ہو

آج کیا ہے کہ برشکل ہے حسن　　　کس پہ تیور چڑھائے بیٹھے ہو
کاش پوچھے کبھی تو وہ بت شوخ　　　کیوں یہ دھونی رمائے بیٹھے ہو
جیسا تو یاد ہے ہم کو　　　دل سے مجھ کو بھلائے بیٹھے ہو
پھر اک چپ سی لگ گئی ہے مجھے
کیا کہیں دل لگائے بیٹھے ہو

مہر جالسی

نقشِ ہستی

نقش ہستی ہے نقش بر سرور برو دیکھا کیے　　　اک طلسم تو بہ الوانِ دگر دیکھا کیے
ہم اُدھر دیکھا کیے اور وہ ادھر دیکھا کیے　　　آہ وہ ساعت کہ دونوں بیخبر دیکھا کیے
ناتوانی ناامیدی بے قراری بے کسی　　　کیا تماشہ تھا جسے ہم عمر بھر دیکھا کیے
نزع میں یکبار حسرت سے چارہ گر ہمیں　　　اور ہم بے چارگی چارہ گر دیکھا کیے
چلنے والے اول سب چل بسے پروانہ وار　　　اہل ظاہر شمع کا منہ تا سحر دیکھا کیے
یہ جا آ رہی ہے دل سے آواز جرس　　　محو ہو کر منزلوں ہم رہگذر دیکھا کیے
باغ الفت میں نہ دیکھی اک دن فصل بہار　　　ہم تو نخلِ آرزو کو سوئے ثمر دیکھا کیے
کیا سمجھے غافل ایسے منزل مقصود پر　　　گھر میں جو بیٹھے ہوئے دیوار و در دیکھا کیے
اک نگاہِ گرم سے آنکھ بھر کے رہ گیا
ہمنشیں یہ منظر عبرت اثر دیکھا کیے

سید گوہر علی اسے پیرور لوری

نمکدانِ ظرافت

ماں ۔ شاباش بیمار مجھے امید ہے ۔ کہا نا کہ تم نے احتیاط سے ہاتھ دھولئے سے صاف کئے ہیں ۔

بیمار ۔ ہاں اماں جان میں نے تھوڑی سی جگہ انگلی میں رضائی کے لئے سفید اور صاف رکھ دی ہے

مسٹر ۔ زمیندار نے مجھے احمق کہا ہے ۔

ارشد ۔ تم نے کیوں نہ کہا کہ میں سر پھوڑ دونگا ۔

مسٹر ۔ خیال نہیں رہا اب سپاہیوں سے کہتا ہوں ۔ کہاں ہے آپکا گاؤں ۔

لیڈی ۔ کوئلہ فروش دیکھو ہماری بوری کے کئی کوئلے بوری سے نکل کر میرے چھکڑے میں پڑے ہیں

کوئلہ فروش ۔ میم صاحب گھبراتی نہیں وہ بھی آپکے باورچی خانہ میں پہونچ جائیں گے ۔ ان میں سے ایک کوئلہ میری آنکھ میں پڑ گیا ہے آنکھ مل رہا ہوں جیسے ہی نکلا تو فوراً بھیجا دونگا ۔

چھوٹا لڑکا ۔ ابّا جان کہاں سے نکل جاتی ہے ۔ اور آدمی مرجاتا ہے ۔

باپ ۔ منہ کے راستہ سے ۔ کیوں ؟

چھوٹا لڑکا ۔ لوگ بھی کیسے احمق ہیں جب مرنے لگتے ہیں کیوں نہیں ناک اور منہ کسکر باندھ لیتے تاکہ جان اندر ہی رہے ۔ اور آدمی نہ مرے ۔

باپ ۔ اوہو دھواں کوٹھے پر آرہا ہے ۔

چھوٹا لڑکا ۔ اماں کو پکار دو کہ چولہے پر سے ہانڈی ہٹا دے تاکہ دھواں اوپر نہ چڑھنے پائے ۔

باپ ۔ میں یہ بوٹ واپس کرتا ہوں میرے پاؤں میں تنگ ہے اور یہ چھوٹا ہے ۔

چھوٹا لڑکا ۔ ابا کیا کرتے ہو رہنے بھی دو ۔ جب انہیں پہنو گے تو یہ بسبب بڑے بوٹ سے چھوٹے سے چھوٹا تو کم لگیگی ۔

چھوٹا لڑکا ۔ اماں میں ابھی شادی پر ماموں کو نہیں بلاؤں گا۔

ماں ۔ ارے خیر! تو کیا کہہ رہا ہے۔ کیوں نہیں بلائے گا۔

چھوٹا لڑکا ۔ پھر ابا نے اپنی شادی پر مجھے کیوں نہیں بلایا تھا۔

ڈوبتا ہوا آدمی ۔ ارے کوئی بچاؤ میں ڈوب رہا ہوں۔

راہرو ۔ بھلا یہ تو بتاؤ تم تالاب میں کودے کیوں تھے۔

ڈوبتا ہوا ۔ بھائی جلدی کی وجہ سے میں گیا

راہرو ۔ جلدی کا کام اچھا نہیں ہوتا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ کشتی لاؤں کہ خود تیر کر تمہاری مدد کو آؤں مگر تیرنا مجھے نہیں آتا۔ اور کشتی یہاں ہے نہیں بہتر ہوگا کہ کسی اور کو بلا لو۔

ماج ۔ اماں ایک پیسہ تو دینا۔ ماں ۔ بیٹی کیا کرو گی۔

ماج ۔ املی منگائیں گے

ماں ۔ املی کھانے سے معدہ بگڑ جاتا ہے۔

ماج ۔ اگر معدہ بگڑتا ہے تو تمہیں کیا آپ ہی تکلیف اٹھائے گا۔

جس میں چار تاجروں نے مل کر روئی کی دوکان کھولی۔ اور روئی کو چوہوں سے بچانے کے لیے ایک بلی پالی معاہدہ یہ ہوا کہ چاروں ایک ایک ٹانگ کے مالک ہیں۔ بلی کی ایک ٹانگ زخمی ہوگئی۔ اور اس زخمی ٹانگ کے مالک نے دھجی تیل میں تر کر کے اس پر لپیٹ دی اتفاق سے بلی جو آگ کے قریب چلی گئی۔ تو وہ دھجی جل اٹھی بلی گھبرا کر روئی میں گھس گئی۔ اور روئی سے شعلے اٹھنے لگے نالش میں حصہ داروں نے جو بلی کی ان ٹانگوں کے مالک تھے جو زخمی نہ تھیں ہرجانہ کا دعویٰ پیش کیا مگر کہا جج کا فیصلہ سنئے بلی کی زخمی ٹانگ قابل استعمال نہ تھی تندرست ٹانگوں کے فعل سے آگ لگی۔ اس لئے تندرست ٹانگیں مجرم ہیں۔ اور تندرست ٹانگوں کے مالک ہرجانہ ادا کریں۔

زبیدہ سلطانہ

آزاد پرند



بچوں کے لئے نظم

ایک چھوٹا سا دل نواز پرند — محرم سوز دل گداز پرند
تھا قفس میں اسیر بے چارہ — نیم بسمل ٹھہر بے چارہ
تاج سلطانہ نے اُسے دیکھا — جسم پر آب ہو قفس کھولا
دلِ نازک پہ اُس کے ٹھیس لگی — دی پرندے کو اُس نے آزادی
اُڑ کے اک پیڑ پر وہ جا بیٹھا — اور بشاش ہو کے گانے لگا
روح افزا وہ اُس کا گانا تھا — گویا شکرانے کا ترانا تھا

آج ایکم میری پیاری بیٹی ہو — سال کی پہلی گھڑی سنہری ہو
کہہ رہا ہے یہ کیا اچھی ہو — یا تو ہی فکر سے الجھی ہو
یاد کرتا ہے یاسمن کو — لالہ و گل کو اور سوسن کو
آشیانہ بنا تھا پچھلے سال — کیا خبر اُسکو کیا ہے اُسکا حال
کہر اور برف نے بگاڑا ہے — آندھیوں نے اُسے اجاڑا ہے
جھڑ گئے ہیں ساج ٹوٹ گئی — قسمت اُس جانور کی پھوٹ گئی
اُس کی ہمدم جو پیاری قالی تھی — آشیانے میں دل ستانے لگا
اس کی فرقت میں ہو گئی برباد — لے گیا اُسکو بھی کوئی صیاد

اور سب ہم نہ سمجھ سکے فاسٹ		ہاں کوئی سمجھا کر دانہ مجھ سے

پھر کبھی ملتی ہو تم بہت اچھی		تم رہو جبھی تم سے کی بستی
نہ سہی سیاسیتہ گا		ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھاتا گا
پھول گر پہ کر لگا نہ پروار		اور پھولوں میں ہو گا نغمہ لوار
وہ ہمدم مرا اِن گلشن اعتماد		جانِ احسان کا رہے آباد
ناج لی بی ہے ر سکت مدرسر
جس سے آزاد کر دیا ہے اسیر"

خدا بخش اسٹر (خان احمد حسین خان)

بس حد ہوگئی

(ڈاکٹروں سے دانت نکلوانے بند کردو)

یہ سرٹیفکیٹ جناب خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خان صاحب مرحوم آنریری سرجن [illegible] لاہور [illegible] میڈیکل کالج کا ہے

ڈاکٹروں سے دانت نکلوانے بند کردو کیونکہ الوری منجن کے استعمال سے کلی صحت ہوتی ہے۔

اگر آپکے دانتوں میں گوشت خورہ لگ گیا ہے تو الوری منجن استعمال کریں ۔ اگر آپکے دانتوں سے خون آتا ہے تو الوری منجن استعمال کریں
اگر آپکے دانتوں میں سستی ہے تو الوری منجن استعمال کریں ۔ اگر آپکے دانتوں کو کیڑا لگ گیا ہے تو الوری منجن استعمال کریں
اگر آپکے دانت ہلتے ہیں تو الوری منجن استعمال کریں ۔ اگر آپ چاہیں کہ آپکے دانت موتیوں کی طرح صاف ہو جائیں تو الوری منجن استعمال کریں
اگر آپکے دانت زرد اور میلے ہیں تو الوری منجن استعمال کریں ۔ آپکو الوری منجن کے استعمال سے دانتوں کے تمام امراض سے نجات
حاصل ہو جائیگی اس منجن کو ہندو مسلم استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ اس میں کوئی جز ناپاک نہیں ہے [illegible] قیمت فی شیشی
آٹھ آنہ علاوہ محصولڈاک جو شیشی کے خریدار کو [illegible] معاف

تازہ شہادتیں

میں نے آپکا ایجاد کردہ الوری منجن استعمال کیا اور [illegible]
امراض کو جو کہ عام لوگوں کو دانتوں کی بیماری [illegible] الوری منجن [illegible]
کرونگا [illegible] ارسال [illegible]

شہادت - ڈاکٹر اسلم [illegible] صاحب [illegible]
تیار کردہ منجن کی مجھے ایک کسی دوست کی [illegible]
بعد استعمال سب نے آپ کے منجن کی تعریف کی [illegible] امراض [illegible]
الوری منجن بذریعہ وی پی جلد ارسال فرمائیے [illegible]

شہادت - مکرم جناب منیجر صاحب دام برکاتہ السلام علیکم [illegible]
اور چند ایک مریضوں کو استعمال کرایا [illegible] الوری منجن [illegible]
فرما کر مشکور فرماویں زیادہ آداب [illegible]

شہادت - جناب حکیم [illegible]
گوشت خورہ میں مبتلا تھے [illegible] بذریعہ وی پی [illegible]
شیشی الوری منجن روانہ فرماویں۔

ملنے کا پتہ: دی الوری جنرل [illegible] لاہور

جلد ۱۹ نمبر ۱ بابتہ ماہ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ اس نمبر کے ساتھ انیسویں جلد کا آغاز ہوتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ سال ۱۹۲۸ء شباب کے لئے بوجہ جناب چیف اڈیٹر صاحب کی طویل علالت کے منحوس تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ جنوری ۱۹۲۹ء سے رسالہ باقاعدہ وقت پر جاری ہو رہا ہے ہم ہر وقت نا شناسدردی اور اپنے معاونوں کی نگاہ لطف کے امیدوار ہیں۔

ستمبر نمبر میں دفتر کی غلطی سے ایک نہایت قابل شرم غلطی دفتر شباب سے سرزد ہوگئی ہے محرر کی غلطی سے شہنشاہ اڈورڈ کی تصویر کے نیچے لارڈ کرزن لارڈ لٹن کی تصویر کے نیچے لارڈ ریڈنگ اور لارڈ ریڈنگ کی تصویر کے نیچے لارڈ ڈفرن لکھا گیا۔ ہم بہت ندامت کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے درخواست کرتے ہیں کہ خریداران صاحبان درستی فرمالیں۔

نہایت افسوس ہے کہ شباب کے جلیل القدر معاون جناب خانصاحب محمود علیخاں صاحب عرف آغا علی تعلقدار و سپیشل مجسٹریٹ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ خدا مرحومہ کو جنت نصیب کرے۔ خانصاحب نینی تال تھے۔ وہاں سے کشمیر تشریف لے گئے۔ ۵ اکتوبر کو وہاں مرحومہ کی بیماری کا تار پہنچا۔ واپس آئے تو مرحومہ رحلت فرما چکی تھیں۔ ہمیں خانصاحب سے اس صدمہ میں دلی ہمدردی ہے۔

شباب اردو کے لئے انعامی فسانے درکار ہیں۔ جو چار پانچ صفحوں سے زیادہ نہ ہوں انتخاب چیف اڈیٹر صاحب فرمائیں گے بشرط پسند فسانہ نگار کو پانچروپیہ نقد اور ایک سال کے لیے شباب مفت دیا جاویگا۔

غلام رسول علی جان دہلی

نوٹ۔ نومبر اور دسمبر کا خاص نمبر دسمبر کو شائع ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شبابِ اُردو

جوڑواں

(۱)

راجہ انوپ سنگھ تعلقدار تھا۔ یہ ایک بڑا انسان تھا مگر سے خیال میں اسے جھکی نسا چلتے تھے خدا کی شان کہئے قدرت کا تماشا کہئے اتفاق کہئے۔ اُن کے خاندان میں مورث اعلیٰ سے لیکر راجہ انوپ سنگھ تک کسی کے دو بیٹے نہیں ہوئے۔ انوپ سنگھ بھی باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اکلوتا انسان ہونے کی وجہ سے وہ یہ ہی چاہتا تھا کہ اُس کے ہاں ایک ہی بیٹا اور ایک ہی وارث ہو ہماری دنیا میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ جس بات کی بڑی تمنا ہو وہ اول تو پوری ہوتی ہی نہیں اور اگر ہو بھی تو اُس وقت نہیں ہوتی جس وقت کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہو راجہ انوپ سنگھ سے بھی یہ ہی کچھ ہوا۔ وہ ایک لڑکا چاہتا تھا مگر اُس کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ جو توام یعنے جوڑواں تھے۔ اُن میں سے جو پہلے ماں کے پیٹ سے برآمد

ہوا اُس کا نام سروپ سنگھ اور دوسرے کا روپ سنگھ رکھا گیا۔ باپ کو جس وقت یہ خبر ہوئی تو بہت ہی رنجیدہ ہوا اور سر پیٹ لیا گویا قصر ہستی کی بربادی دیکھکر اُس کی روح کو ناقابل برداشت صدمہ ہوا اس رنج سے وہ اندر ہی اندر گداز ہونے لگا اُس کے حواس میں رفتہ رفتہ نامعلوم طور پر فتور آنے لگا۔ اور جب یہ لڑکے دس (۱۰) سال کے ہوئے تو راجہ الوپ سنگھ بالکل دیوانہ اور خوفناک دیوانہ۔ ایک خاص مکان میں بند تھا کسی کسی وقت اُسے ہوش آجاتا تھا اور پھر ان درخشاں لمحوں میں ان بچوں کو بلا کر پیار کرتا۔ اور کہتا کہ یہ غلط ہے کہ تم دو ہو۔ تم ایک ہو۔ ہاں ایک ہو۔

(۲)

چھ سال گذر گئے اور آخرکار اس جسم و عصب نے جو اس محروم النصیب راجہ کے سینہ میں اندر ہی اندر گویا اس جسم کے بدنی مادے کی طرح کھول رہی تھی ایک دن رخت حیات جلا دی۔ مرنے کے وقت صحیح عقل بھی ہوئی تھی یکایک پھر روشن ہوگئی۔ اُس نے سروپ اور روپ کو بلوایا۔ اور بھاری آواز میں چلا کر کہا۔ کہ تم دو نہیں ہو ایک ہو۔ ایسا کہتا تھا کہ شمع عقل کے ساتھ چراغ زندگی بھی ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا اس وقت دونوں بھائی اپنے اتالیق کے ساتھ باپ کے سرہانے کھڑے تھے یہ سنکر دونوں کے جسم میں سنسنی سی پیدا ہوگئی سروپ نے کانپتے ہوئے روپ سے کہا۔ کہ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔ مجھے راجہ جی کے الفاظ سے۔(وہ باپ کو راجہ جی کہکر پکارتے تھے) سراپ کی بو آتی ہے۔ حیرت ہے کہ محبت کے پردے میں اُن کے دل میں کیوں اسقدر نفرت جاگزیں تھی روپ نے کہا میرا دل گواہی دیتا ہے جب ہم اکیس سال کے ہوںگے ضرور کوئی مصیبت آئیگی اگر راجہ جی خود نہ آتے تو کسی کو بھیجکر قیامت برپا کریں گے۔ اُن کے اتالیق نے جو ایک فاضل پنڈت تھا۔ کہا کہ جو کچھ ہوتا ہے پرمیشر کی اچھا سے ہوتا ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی ہل نہیں سکتا روحیں اچھی بھی ہیں اور بری بھی۔ لیکن سب اُس کے تابع فرمان ہیں۔ اور بھوت پریت راکھس اور ناگ جب تک اس کی اگیا نہ ہو کیا مجال کہ کسیکو نقصان

سمجھا سکیں۔

(۳)

راجہ انوپ سنگھ تعلقدار کو بیکنٹھ باس ہوئے پانچ سال ہوگئے آج سروپ اور روپ کی اکیسویں سالگرہ ہے۔ اُن کے عالیشان مکان میں جشن ہو رہا ہے زنان خانہ میں دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ عورتیں گا رہی ہیں ڈھولک بج رہی ہے۔ مکان کے مردانے حصہ میں مہمان جمع ہیں بزم رقص و سرود گرم ہے۔ محتاجوں کو کھانا تقسیم ہو رہا ہے۔ اور یہ دونوں بچے اپنے اتالیق کے ساتھ حویلی راجہ کے خاص کمرے میں بیٹھے ہیں اور باپ کے آخری الفاظ انہیں رہ رہ کر یاد آرہے ہیں اور پریشان کر رہے ہیں۔ اس کمرہ کا نام سبز کمرہ ہے۔ یہ تمام مکان سے ایک طرح پر علیحدہ ہے۔ اور وسعت کے لحاظ سے تو وہ ایک ہال ہے۔ اس کا نام سبز کمرہ اس لئے ہے کہ اُس کی دیواروں اور کھڑکیوں کا رنگ اُس کے پردے اُس کے قالین اُس کے پھولدان اُس کے صوفے۔ اُس کے جھاڑ۔ اُس کے فانوس سب سبز ہیں جسطرح سبز ہیں جب رات کے گیارہ بجے تو سروپ نے کہا بھائی روپ گذشتہ پانچ سال میں ہمیں راجہ جی کی روح کئی بار درس دے چکی ہے کئی بار اس نے ہمیں ڈرایا اور دھمکایا ہے۔ کئی بار اُس کی بدولت سے ہماری نیند حرام ہو چکی ہے۔ آج آخری دن ہے دیکھئے آج کیا ہوتا ہے۔ روپ نے جواب دیا کہ آج کا حملہ بوجہ حسب عمری سے کم نہ ہوگا میرے خیال میں ہولناک بھونچال آئیگا۔ اُن کے اتالیق نے کہا کہ تم ناحق گھبرا رہے ہو دیکھو گے کہ پرمیشر کی کرپا سے بارہ بجے تمہارا وہم ہمیشہ کے لئے دور ہو جاویگا۔ یہ کہکر اتالیق نے مؤدب ہو کر میز سے ایک کتاب اٹھائی۔ اور بلند آواز سے پڑھنے لگا یہ کتاب وہ گیتا تھی۔

(۴)

اب بارہ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں کہ اتالیق کے کان میں روپ کی آواز آئی۔ ماسٹر جی دیکھو تو بھائی جان کیسی میٹھی نیند سو گئے ہیں انہیں جگاتا ہوں مگر

نہیں جاگتے۔ اب بارہ بجے کو ہیں اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم تو ناحق پریشان تھے۔ یہ کہکر روپ نے قہقہہ لگایا۔ مگر روپ کی آواز اناتس کے کانوں میں پھٹی ہوئی اور فوق العادت معلوم ہوئی۔ اُس کے ہاتھ سے مقدس کتاب گر پڑی۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ ایک اچانک اور مہیب انقلاب ظہور پذیر ہے۔ بقول اُس کے ایک عجیب سناٹا یکایک چھا گیا۔ اس قسم کا سناٹا کہ اُس کے مقابل اُس کمرے کی پہلی خاموشی ایک دماغ شگاف شور تھا۔ پھر اس سناٹے کے لفافے سے فضا میں ایک برہنہ اور مکروہ حملۂ نامعلوم جو ملائم۔ محسوس و جری سا اور مہیب تھا۔ نمودار ہوا۔ یہ حملہ کیا تھا گویا ایک بجلی کا بے آواز اخگر مرعب تصویر کے ساتھ دباؤ ڈال رہا تھا۔ اور سیروپ اور روپ چکی کے پاٹ کے بیچ گیہوں کے دو دانے کی طرح پستے ہوئے تھے۔ اناتس کو ان تمام تجربہ سا ہوا کہ روپ اس اظہار یا اس کے اثر سے بالکل بے پروا اور نا آشنا تھا۔ اُس نے پھر قہقہہ لگایا۔ اور اناتس سمجھ گیا کہ سیروپ کی بے حد معمولی ہنسی نہیں ہے۔ اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔ یہ ہولناک مخفی اجنبی ارادہ اپنا کام کر رہا تھا۔ اور نہ صرف سیروپ اور روپ کی حالت بدل رہی تھی بلکہ کمرے کی ہر چیز اسی خاموش ہنسی سے زوال اور بوسیدگی کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ مگر دونوں بھائی بالکل بے خبر تھے۔ اس اثنا میں روپ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جمائی لیکر بولا کہ اب معلوم ہوا کہ یہ تمام ہمارا وہم تھا۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ ٹھنڈا پانی منگانا چاہتے۔ یہ کہکر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ مگر اناتس کی نگاہوں میں وہ پہلا روپ نہ تھا۔ اُس کی آواز اُس کے اطوار۔ اُس کا لب و لہجہ اُس کی رفتار اب پہلی سی نہ تھی۔ وہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی ہنسی اب اصلی نہیں ہے آواز میں لوچ مطلق نہیں اور اُس کے قد و قامت میں بہت فرق آگیا تھا۔ یکایک گھڑیال نے بارہ بجائے۔ اور سیروپ کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے چلاکر کہا کہ آہ۔ آہ میرے بدن میں درد ہے۔ مجھے سخت تکلیف ہے۔ یہ تو مجھ سے اٹھ نہیں سکتا۔ میں دبا جاتا ہوں آہ میری ہڈیاں پسکر سرمہ ہو رہی ہیں۔ پھر اُس نے کروٹ بدلی۔ اور اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملکر بولا۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا اس جھکی سے میری کایا پلٹ گئی۔ مجھ میں غیر معمولی

طاقت اور روحانی آگئی لیکن وہ کہاں ہیں۔ وہ . . بھائی کہاں ہیں . . .
. . اس وقت وہ سروپ کا نام بالکل بھول گیا وہ یاد کرتا تھا مگر یاد نہ آتا تھا سروپ اور رتا لبھی دونوں روپ کی تلاش میں گھر سے باہر گئے۔ وہ سیڑھیوں سے فرش اوندھا پڑا ہوا تھا۔ مگر اُس کی صورت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے شکنجہ میں کسا گیا ہے۔ اس کا رنگ اب سیاہی مائل زرد تھا۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ گال ہڈیوں کی طرح پچکے ہوئے تھے اور چہرے کی یہ حالت تھی کہ جیسے اُسے مالیخولیا کا مرض ہے۔

وہ دو تین دن زندہ رہا مگر اس عرصہ میں وہ نہ کچھ بولا۔ اور اُسے کسکو پہچانا حرارت غریزی کا اُس کے جسم میں نام نہ تھا۔ حیرت کا مقام ہے کہ روپ کی بیماری کا تمام کنبہ کو قلق تھا مگر سروپ بالکل شاد تھا۔ وہ ان دو چار دن میں نہ تو اُس کے قریب گیا۔ نہ خبر پوچھی۔ اُس کی وفات کے بعد ایک دن تنہا بیٹھے انسانی سے ایسا کہا کہ وہ جہاں ہے بہت خوش ہے۔

حسب اڈیٹر (خان احمد حسین خان)

موسم سرما

یہ سہانا سبزہ زار اور ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا — موسم سرما کی بھی کس درجہ دلکش ہے ادا
یہ وہ موسم ہے کہ جس میں ہے غضب لطف بہار — پھول پانی میں کھلے ہیں کنول کے جا بجا
ٹہنی ٹہنی جھک گئی ہے شدت سے سکر اس میں — کچھ عجب دلکش ہے ملو کے درختوں کی ادا
گود رسے بھرے ہیں بھو برے اب ری تو ہیں ساط — اور یہاں سرگرم ترنم طائران خوش نوا
اُجلی اُجلی کالیں سکر دستہ میں زلس سے سد — دی ہے برسات کی ہمراہ سانی کا سما
جسم سے بدلی ہے بساط دہر سے اپنی روش — آسماں ... سے الگ ہے شہیل بوسہ نا

راستوں کا ہوگیا ہے خشک پانی اسطرح
جیسے استغنا سے حرص دنیا کو ہوا

اس سے کیچڑ کا نشاں ہے اور نہ ہے گرد و غبار
پیاری رُت ہے اور سہانی ہے زمین و ہوا

جسطرح دلکش کسی کا دورۂ انصاف ہو
عدل گستر ہو رعیت پر کوئی فرماں روا

صاف ستھرا یوں ہے نالوں کا پانی جسطرح
قلب انسانی ہو کدورت سے کوئی نا آشنا

بادلوں کے اب وہ ٹکڑے ہیں نہ وہ ابر سیاہ
اب نہ وہ ساون کے جھالے ہیں نہ وہ کالی گھٹا

اب ہے مطلع آسماں کا صاف یوں جسطرح ہو
پاک و صافی ہوس سے قلب مرد پارسا

ہو چلا پانی جو چھوٹے چھوٹے چشموں میں ہے کم
مچھلیوں کا اضطراب درد دل بھی بڑھ چلا

جیسے ہو کم مائگی سے آہ کوئی حاجت دار
فکر روزی میں غریق بحر بیم و رجا

اب کبھی بڑھ جاتے ہیں یوں دو دریا بہتے گاہ گاہ
جیسے ہو امید کرم کوئی تلوّن آشنا

جھلملاں یوں گہرے پانی میں نگیں ہیں اسطرح
عاشق دل سوز کو اطمینان کامل ہو عطا

جوش غم سے مضطرب جو شوہر جانباز کا جوڑا ہو یوں
گم ہے نظارہ میں وہ دوست کا اسکے فدا

دیکھکر عمرو کی دولت کو دور رہ سکے ہے
جسطرح آزردہ ہو کوئی حسود نا سزا

سانس سکے مارے بیٹھے یوں - ہے سر گرم حرص تن
بالکس ہو جیسے کوئی مسکر دایہ خدا

ٹھنڈا ٹھنڈا چاند گرمی کی حرارت کے لئے
کر رہا ہے اسطرح جاڑے کی راتوں کو جدا

دور کر دے دل سے اوہام پریشاں مکمل
جیسے صحبت سے کوئی جسطرح پیر رہنما

چاندنی بکھری ہوئی ہے اور چکور دلکا گروہ
ٹکٹکی باندھے ہوئے یوں چاند کو ہے تک رہا

جیسے ہوں خلوت میں محو جلوۂ دیدار حق
عابدان باصفا اور زاہدان بے ریا

واہ جاڑے کا بھی موسم کیا نشاط انگیز ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی روح پرور ہے مجسم وا صبا

شاکر (میرٹھی)

خانہ بربادی

کتنا بھدا [illegible] ہوں [illegible] کہاں سے [illegible] میں [illegible] شکنے
ہنستے کہا تم بلاوجہ [illegible] کی کون سی بڑی
بات بھی کہ اس زور [illegible] پھر [illegible]
میں دیکھنا، [illegible] آنکھوں کو [illegible] رہا [illegible] کوئی
منحوس شگون نہیں ہوا [illegible] بھلا ان [illegible] کی حالت میں [illegible]
[illegible] آدمی کو دیکھا ہے۔ مخلص الصادق گروہ [illegible] محافظ کے [illegible]
اسے کتنے تھوڑے دن [illegible] وہ بھی اس صورت میں [illegible] زیادہ خاطب
لگا ہوں۔ اب رہا شادی کا سوال تو یہ کوئی نہیں۔ ہاں مجھے شادی
سے سخت نفرت ہے۔

اور پھر [illegible] کی طرف مخاطب ہو کر

[illegible] تمہیں بلاؤ کہ کاش میں میرے دوست احباب کہاں کہیں [illegible]
میں تمہاری بغل میں ہاتھ ڈالے [illegible] اور [illegible]
اُنہیں تو بس خدا سمجھے [illegible] دیکھیں گے، تو مجھے زندہ رہنے
دیں گے؟ — اور پھر یوں تمہیں کبھی نہ ہوگا میں اور [illegible] ساتھ اُسکے کھلانے
ملانے کی فکر۔ اُنکی بیماری [illegible] کا حال تو یہ کہ [illegible] کی دوا کی [illegible] کام
[illegible] ساری عمر تو [illegible] میں بسر ہوئی۔ جوانی [illegible] کار
میں گذری [illegible] لگا کر کھلاؤ لگا اُنکی چیخ پکار سنو لگا —
کوئی مذاق ہے؟ — اچھی، [illegible] ہم خود مجھ سے بیزار ہو جاؤ گی تو صبح
شام [illegible] شکر [illegible] کی [illegible]
[illegible] درخواست [illegible]

انکار ہی کر لی جاؤ ——"

"تم بھی عجب آدمی ہو" مہرباں نے کپتان کے لہجہ کی نقل کرتے ہوئے کہا "دیوانوں کی طرح آپ ہی سوال و جواب کر رہے ہیں بھلا میں نے تم سے شادی کی بات کچھ کہا بھی یا تو بھی سمجھ بیٹھے کہ میں تم سے شادی کرنے کے لئے مری جا رہی ہوں یہ بات یہ جب لگے بڑبڑ کرنے ۔"

کپتان (بہت لاپرواہی کے ساتھ) "اور یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے میں نے تو فیصلہ کر لیا اور فیصلہ نہ کرتا تو کیا کرتا ہو بھی سکتا ہے اس کے خلاف ۔ دیکھو اب تم کو مجھ سے محبت ہے اور مجھے تم سے جب تم میری طرف جھکتی ہو اور میں تمہاری طرف تو اس کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے تمہاری جیسی عورت اور مجھ جیسا مرد کہیں الگ الگ رہ سکتے ہیں ۔ میں ایسا بیوقوف ہوں کہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا ۔ اجی ان سب باتوں کو تو میں سمجھے بیٹھا ہوں ۔"

مہرباں خاموش رہتی ہے مگر ساؤتی غصہ سے اُس کی طرف گھور کر دیکھتی ہے ۔

کپتان ۔ "تم سمجھی ہو گی کہ میں تم سے بے رخی برت رہا ہوں ۔ بے رخی وہ رخی کی کونسی بات ہے اس میں میں تو ہوں صاف گو آدمی جو جی میں آئی ہو وہ جائے —— میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا کوئی صورت ایسی بھی نکل سکتی ہے کہ مجھے شادی کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے ۔ میں ابھی تمہارا حق تو خراب کر نہیں رہا ہوں کچھ سوچتا ہی رہا ہوں گا —— کہیں تم ابھی رنجیدگی نہ کرنے پر رضامند نہ ہوئیں اور تمہاری خاطر مجھے ایسا ارادہ فسخ کرنا پڑا تو کیا ہوگا ؟ ——"

مہرباں بات کاٹ کچھ بولنا چاہتی ہے مگر کپتان پھر اپنا سلسلہ کلام شروع کر دیتا ہے ۔

کپتان ۔ تمہارا کیا ۔ تمہاری تو جیت ہوئی اور میں مرا کیوں کی موت ۔

مہرباں ۔ یا اللہ میں کیا کروں کچھ بول بھی رہی ہوں میں ۔ کہ خواہ مخواہ بک بک کئے جا رہے ہو ۔ کہہ تو دیا کہ میں تیار ہوں گی —— خود کو کہیں کا افلاطون سمجھے بیٹھے ہیں دنیا میں بس تو

ایک آدمی رہ گئے ہیں اور باقی سب تو جہنم کے کندے بن گئے۔ اگر مجھے شادی ہی کرنا ہوا تو "

کسان کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر اس نے اپنی متانت قائم رکھتے ہوئے کہا: "مہرباں اب اس قصہ کو یہیں رہنے دو۔"

مہرباں۔ اور اب کیوں رہنے دو۔ اب تک کیوں ٹائیں ٹائیں کئے جا رہے تھے؟

کسان۔ اس لئے رہنے دو کہ تم سے دوسرے آدمیوں کا ذکر چھیڑنا محال ہے کہ میرے سنتے ہی کوئی تم سے شادی کا سوال کر دے جیسے میں نہ جاؤں مردود کا ——— ——— لاحول ولا مجھے ناحق غصہ آ رہا ہے۔ کچھ ایسا تو ہے نہیں کہ مجھے تمہاری کیفیت نہیں معلوم ———"

مہرباں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہے لیکن الفاظ صاف سنائی نہیں دیتے۔ کسان کی تقریر جاری رہتی ہے۔

بتاؤ نا میں؟ ——— تم کو مجھ سے محبت ہے۔ کیوں ہے نہ؟ ——— اجی رہنے دو۔ ناک بھوں سکوڑنا تو بہت آسان ہے۔ ذرا دل سے پوچھو ا ہے ——— میں تو بس کا سوتا دیکھتا ہوں کیوں دونوں سوت ؟

مہرباں۔ . . . . . . '

کسان۔ دیکھو اگر تم کو مجھ سے محبت نہ ہوتی تو میں تم پر کیوں جان دیتا۔ دونوں ہاتھ تالی بجتی ہے نہ ——— بس ہو گیا ثبوت۔

مہرباں غصہ سے ہونٹ چباتی ہے۔

"اوہ تم لاکھ نہیں کہو تو کیا ہوتا ہے۔ مرزا غالب تو کب سال میں کہہ گئے۔ ہاں۔ ع

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود

تو کیا یہ بھی جھوٹ ہے۔ لوگ تو کئی دیوانے والی دیکھا کرتے ہیں۔

اس [illegible] ڈالی پر مسز [illegible] کو سامنے ہی آتی ہے۔ کیسا اس ہنسی کا کچھ اور ہی مطلب سمجھتا ہے۔

کپتان۔ کیوں؟ [illegible] میں [illegible] گئی چوری۔ ــــ میں کہتا ہی تھا کہ تم [illegible] کی پکی ہو۔ [illegible] اس کو [illegible] ہیں ــــ یہ رہنے دو گی جس سے تمہیں۔

مسز [illegible] ۔

کپتان [illegible] ہم [illegible] اور یہ میں تھے دس سال کی مہلت دو ۔ دس سال [illegible] لوٹ کھسوٹ ہو جاؤں گا۔ اس وقت مجھے [illegible] یہ معلوم ہو گی کہ لوگ [illegible] ساتے ہیں۔ اس میں مسز [illegible] لگے [illegible] ملنے لگنے والا کون رہ سکتا۔ اور اس دوران میں ہم [illegible] طور پر ہم ہی آدمی [illegible] کرتا۔ مگر خبردار اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ہم [illegible] ایک دوسرے [illegible] کی طرح [illegible] ہوا کرتی [illegible] ہو گی۔ [illegible] اور ہم [illegible]

مسز [illegible] مسکرا [illegible] کی [illegible] آ [illegible] اس کے [illegible] رہی ہیں

مسز [illegible] لا [illegible] سوچنے کیا [illegible] ہوں [illegible] کھیل رہا ہے کوئی دوسری بات کیوں نہ کرو

کپتان (گویا اس ۔ نہ کچھ سنا ہی نہیں) ـــــ

وہ [illegible] ایک بات [illegible] مسز [illegible] ـــ

مسز [illegible] آ [illegible] [illegible] ـــ

کہاں) - ہائے - کیا کروں میں اب لٹ گئی میں تو بس بس میرا میں ہارا! اور پھر
کہ اپنے محبت سے بے اختیار ہو کر

"بیٹا ــ ری ــ آ" اور پھر بے ساختہ بری کے سامنے۔

کل شام کو - کل صبح - ابھی جس قدر جلد ممکن ہو سکے شادی کر ڈالو - اب تمہارے بغیر میں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا — مگر خدا کے واسطے ایک شرط میری مان لو — صرف ایک شرط میری ماننا ـــ خدا کے لئے ـــ

واقعی کشاں نے ان الفاظ کے ادا کرنے میں بڑی جوانمردی کا کام کیا تھا اسکے انعام میں جسمینہ نے اپنے ہونٹوں پر پر لطف و لگا ایک سر کھا کا

کشاں (حیران ہو کر "مگر" پر کیا کہہ رہا ہوں کہ بتا شرط ماننی پڑیگی۔ ضرور ماننی پڑے گی)۔

جسمینہ اُس کی جانب بے اعتباری سے دیکھتی رہی ہے۔

"دیکھو شرط یہ ہے کہ ــ کہ اگر ـــ ہاں تو یہ شرط ہے کہ ـــ نہ آئے ــ"

جسمینہ کو اس "اگر مگر" کی تکرار پر ہنسی آتے آتے رہ رہی اُس نے رومال سے منہ ڈھانپ لیا اور دوسری طرف نظریں پھیر دیں کشاں نے اُس کا شانہ ہلا کر کہا ـ

"ــ نہ ــ دیکھو جسمینہ ڈارلنگ ــ ہاں کہ اگر خدا نخواستہ ــ نہ نخواستہ اگر ــ دیکھو جسمینہ ــ آمین ــ"

جسمینہ ـ "آمین آمین ہی کروگے یا کچھ بولو گے بھی"

کشاں ـ "دیکھو اگر خدا نخواستہ ہمارے ہاں بچے ہوئے تو انھیں ایک دم تم جانے [illegible] ـــ اس کے خلاف صدمت کرنا۔ میں ہرگز نہ مانوں گا ـ ایکدم نہ ہونے لگا ـ ـ"

(جسمینہ نہیں ہم سٹر سی تو نہیں ہو گئی۔ پھر اُسے محبت سے گھورنے لگی تھی)

کہ ان کو [illegible] ہونے لگا کہ یا وہ خوشی سے مر جائیگا۔ اُسکی آنکھیں مسرت سے [illegible] تھیں۔ میں نے اسکو آغوش میں جکڑے ہوئے اس سے کہا

"تو میری [illegible] کا سامان پورا ہو گیا !"

میں [illegible] سے ساتھ نکل گیا۔ ہاں ہمیشہ کے لئے"

[illegible] کے پانچ سال کے بعد مجھے اس شہر میں پھر آنے کا اتفاق ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ [illegible] سے بھی ملتا چلوں۔ لمبی سی اچکن پہنے ایک بوڑھا پہرہ دار دروازہ [illegible] بیٹھا تھا میں نے اپنا گھوڑا [illegible] ہوئے دریافت کیا "کیوں بڑے میاں یہاں [illegible]"

[illegible] سے جھک کر مجھے سلام کیا۔ اور گھوڑے کی باگ تھامتے ہوئے [illegible] لائبریری میں ملاقات ہوسکتی ہے —— [illegible] —— نہیں کارڈ کی کیا ضرورت ہے اطلاع دینے کی [illegible] نہیں کیونکہ صاحب کا حکم ہے کہ اگر کوئی ملنے آئے۔ تو فوراً اوپر بھیجدیا کرو۔

بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں ہمارے صاحب۔ ہا ہا۔"

میں آگے بڑھا [illegible] لائبریری میں، میں نے دل ہی دل میں کہا "بھلا لائبریری کو [illegible] کیا [illegible]؟ کہیں اس دوران میں اُسے لکھنے پڑھنے کا بھی خبط تو نہیں ہو گیا ؟ ——"

[illegible] ایک [illegible] —— یہاں نہیں آ گئے —— لائبریری میں —— ہاں وہاں —— [illegible] —— چلے جاتے ——"

[illegible] میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پانچ برس کے بعد [illegible] خوب لطف رہیگا —— اب تو اور بھی جوڑی [illegible] ——"

میں نے آہستہ سے جو اٹھا کر اندر جھانکا، آہ کیا منظر تھا میری میں اٹھا [illegible]
حسرت ساماں بہت دیر تک باہر ہی کھڑا رہ گیا — آہ کیا سین تھا۔

کمرے کے وسط میں سطر جی پر ایک شخص آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل [illegible] رینگ رہا ہے۔ پیٹھ پر ایک چار سال کا لڑکا سوار ہے [illegible] ہوا ہے۔ اور ایک ننھی سی گڑیا —— ایک ڈھائی سالہ لڑکی —— [illegible] کھڑی ہے رومال تھامے سامنے کھڑی ہے۔ لڑکا زور زور سے پیٹھ پر [illegible] اس انسانی گھوڑے کو لاتیں مار مار کر کہہ رہا ہے —— [illegible] گھوڑے چل —

اور وہ ننھی جاگتی سی گڑیا رومال کو کھینچ کھینچ کر اپنے بھائی کے الفاظ دہرا رہی ہے۔

"چل بے گھوڑے چل۔ چل بے گھوڑے چل۔"

[illegible]

غزل

نہ اضطراب نہ عالم نہ اضطراب نہ تھا
تمھارے حسن کے جلوے [illegible]

بہت قلیل تھیں سرگرمیاں عناصر کی
مگر کتاب کا اک [illegible]

مرے لئے ہے عرفاں جہان کا ہر قطرہ
مرا لوہ رنگ [illegible]

مری نگاہ کی بس آسماں بھی غلط
اُسے کہیں بھی کہیں [illegible] کی [illegible]

ہوا ہے دوئی [illegible] اور بسر۔ معاذ اللہ
یہ قطرہ واقعی دریا [illegible]

[illegible] میں [illegible] دل نہ تھی طلب میری
[illegible] حضور میں کس دل میں [illegible] تھا

میری نظر بھی [illegible] ہم بھی
[illegible] کہاں وہاں [illegible]

سوتا ہے مری سوختی میں بے قرار رہا   گواہ ہیں۔ مرے جلوے میں محو خواب نہ تھا

وصال کے پاس ہیں حیدر ستم اسید

بہت لطیف تھا دلکش تھا کا شانہ تھا

جلال الدین حیدر دہلوی

شہیدِ محبت

ماریاں ایک پہاڑی لڑکی تھی۔ اُس کی تخلیق دست قدرت کا ایک بہترین نمونہ تھی وہ مساعیِ ربانی کا مظہر اور قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھی اس کا قد مثل سرو بستانی تھا وہ نرگسی چشم اور کنول کے مانند سفید اُس کے ہونٹ مثل گلنار تھے۔ پھولوں کا رنگ اُس کے آگے ماند پڑ جاتا اور وہ کملا کر رہ جاتے اور اس مجسمہ مرمریں کو دیکھ کر شرم و ندامت سے سرنگوں ہو جاتے وہ شوخ طبع اور زندہ دل تھی اور اور اُس کا نورانی جسم ایسا تھا کہ گویا آفتاب کی کرنیں جھلمل جھلمل کر رہی ہیں

وہ ایک پہاڑی لڑکی تھی اُس کے رہنے کی جگہ پہاڑیوں میں تھی ایک وسیع جنگل تھا اور ایک پانی کا چشمہ جو نہایت تیزی سے رواں رہتا تھا۔ وہ چٹانوں سے ٹکرا اور ٹکرا کے بہتا تھا اس طوفان شباب کی دلکشی اور دلبستگی کا سارا سامان وہ پانی کے چشمے سرسبز پہاڑیاں اور قدرتی مناظر تھے۔ دشت و صحرا میں پھرنا اُس کی فطرت ہو گئی تھی یہاں تک کہ وہ اپنے تئیں جنگل کی ایک مخلوق تصور کرتی۔ وہ ایک پہاڑی لڑکی تھی اور اُس کی ہر صبح ایک نئی حیات تھی

ایک دن غیبی پہاڑیوں میں سے ایک نوجوان آیا اور اس کے دلفریب و دلکشا سبزہ زار میں داخل ہوا۔ یہ اس گاؤں کا باشندہ تھا جہاں ماریاں بار کے دن اپنی

کے ساتھ بسر رہی کرتی - ذرا سا وقت گذارتی گاتے گاتے اسے لوری دیتے والے ہوا کے پُرکیف جھونکے سلا دیتے اور وہ اپنے سنہرے تصورات میں مستغرق ہو جاتی اپنے مستقبل کے خیالات میں محو ہو جاتی اور خواب میں مسرت اندوز مناظر سے محظوظ ہو جاتی نادان اپنے خیالات زریں کے بساط افراہم چلے طے کر رہی تھی - — +

بالآخر چار سال کی کشمکش و سر اتمام کو پہنچی - ہولناک اور ہلاکت خیز جنگ جس نے نوع انسان کو تباہ و برباد کر دیا ختم ہو چکی تھی - وہ رخصت پر اپنے گاؤں میں آیا اس کی واپسی ایک فتح مندانہ اور کامران واپسی تھی کیونکہ اس کی قوم جنگ میں فاتح کی حیثیت سے کامیاب رہی تھی وہ بھی فتح کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوا - اُس کے سینہ پر متعدد فوجی تمغہ جات و نشانات آویزاں تھے - وہ زرق برق وردی میں ملبوس اپنے چھوٹے سے گاؤں میں ایک سرتاج کی طرح داخل ہوا - گاؤں کے منتظروں نے ایک والہانہ جوش کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا ہجوم اُس کے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑا - وہ سب کے لئے آماجگاہ تماشہ و حیرت بن گیا - وہ ایک موسمی جاذبہ تھا - -

لیکن ماریان کو بھی اس کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی - اس کا دل مسرت و شادمانی سے بلیوں اچھل رہا تھا - اُس کی تمام آرزوئیں اور اُمنگیں مجسم ہو گئیں وہ ہر وقت اپنے محبوب کے خیال میں مست اور بے خود رہنے لگی وہ اپنے دل میں کہتی کہ وہ تمام کمال میرا ہی اور اُس کی ذات محض میرے لئے ہے

وہ انہی خیالات میں ڈوبی رہی اور اپنے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھا کرتی لیکن بے مہر آسمان اُس کی طرف دیکھتا - اور ہنس دیتا

اس پہاڑی لڑکی کی خیالِ معاشقہ پر طلوع ہونے والے آفتاب نے ابھی آخری تاسف انگیز شعاع ڈالی اور غروب ہو گیا -

نقش رنگا نہ بھلا دیں تھا۔ کہ اس میں یہ تغیر نظر آ رہا تھا۔ آج اُس کی زندگی کے ایک جدید باب کا آغاز ہوا تھا۔

ایک طویل مدت گذر گئی۔ ایک دن یاراں اُسی درخت کے لئے ملتفت مصروف مگر یہ تھی۔ اور اُن کی غم آلود آنکھوں سے آنسو جاری۔ یہی وہ درخت تھا جس کے سایہ میں وہ اپنی زندگی کے دلآویز خواب دیکھا کرتی۔ یہ درخت اُس کے اُن خوابوں کا خاموش شاہد تھا۔ جبکہ وہ اپنے محبوب کی صورت ایک ناقابل فراموش شاندار آرائش میں مزین ایک دور فاصلے پر بیٹھی دیکھا کرتی اور انہیں تصورات میں محو رہتی۔

ایک دن عالم وارفتگی میں وحشی دیوانوں کی طرح جو کڑیاں بھرتی ہوئی اپنے مسکن سے چلی اس کا سینہ جذبات و احساسات سے لبریز تھا وہ بحر متلاطم سی ہو رہی اس کے پاس پہنچی اور جاتے ہی اُس سے لپٹ گئی اُس کی چشم ہائے نم آگیں سے سیل اشک رواں تھے۔ مگر وہ اس سے کچھ متاثر نہ ہوا۔ اور نہ اُس نے کچھ گرمجوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُس نے دریافت کیا "ساری یاراں کیا بات ہے" مگر ایک ایسی آواز میں جو جذبات محبت سے خالی تھی اور اُس کی یہ پرسش بھی سرد مہری سے پُر تھی۔ یاراں نے کہا کیا تم مجھ سے میری داستان غم سننا چاہتے ہو۔ اور ایسی نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھا جو سراپا پیکر استدعا و التجا تھیں۔

اس کا چہرہ ایک نقش بے غم سا ہو رہا تھا اس کو اس کے چہرے پر محبت کے غیر فانی نقوش نظر آتے جو اپنی جلالت و عظمت کا اظہار کر رہے تھے۔

اُس نے کہا اُو سادہ لوح اور پیاری لڑکی !

یہ تو ایک مذاق تھا۔ اُس نے اپنے زہر آلود لبوں سے اُس کے ہونٹوں کو چوما۔ ہنسا اور زور سے قہقہہ لگا کر وہاں سے چلدیا ان قہقہوں کی آواز فلک بوس پہاڑیوں میں گونجی اس لئے اُس کی صدائے بازگشت جس میں ایک تضحیک و تمسخر شامل تھی۔

کھا کے مہمیز آگ بھار رہوار | شعلہ ساں جھاڑ تا ہوا لپکا
کاٹ ڈالا صفوں کو دم بھر میں | راستا صاف کر لیا اپنا
ایک ہی جست میں تھا ہاتھی پر | اور چپک ہو گیا الف تورا
شعلہ ساں دونوں رکھدیں مستک پر | اور زیں سے چلا ادھر سر تھا
جان بچی بھی شاہزادے کی | بیچ میں حائل ہو گیا ہودا
رن پکار اٹھا اس کو کہتے ہیں | واہ رے مرد واہ رے گھوڑا

اب نہ قسمت کی تھی کمی شاعر
ورنہ کام ایسا کر گیا رانا

افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی



تحفۂ دل

سرزمین اندلس اپنی گذشتہ عظمت و جلال اپنی تاریخی روایات پر جو اسکو سلاطین اسلام کے عہد میں حاصل تھیں۔ ایک زمانہ تک فخر و ناز کرتی رہی۔ غرناطہ اور قرطبہ کی شان و شوکت ایک افسانہ پارینہ بن چکی۔ الحمرا کے نقش و نگار جن صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکے۔ علم برداران توحید جن کی سطوت و جبروت کا ڈنکا بلاد یورپ میں بج رہا تھا فنا ہو گئے۔ صلیب نے ہلال پر غلبہ حاصل کر لیا۔ تاہم اُنکی یادگاریں اُنکے کارنامے صفحہ تاریخ پر اب بھی روز روشن کی طرح عیاں ہیں جو ہمارے لئے تازیانہ عبرت کا کام دیتی ہیں۔

اندھیری رات اور رات بھی کیسی بھیانک سنسان جنگل پہاڑی میدان۔ جہاں کوسوں تک انسان تو کیا وحشی اور درندوں کی آواز بھی مفقود ہے۔ پہاڑی کے دامن سے سمندر کی متلاطم موجیں ٹکرا رہی ہیں انسان روح فرسا منظر اور ایک عمر رسیدہ جسکو آبادی سے نفرت ہے جو سوسائٹی کے مصنوعی زندگی سے دور ہٹ گیا ہے۔ جس کے دل میں نا امیدیا

اندر داخل محبت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو نے اپنے ظالم چچا کے خوف سے اپنے نازک دل پر جبر کرکے علانیہ ملاقات ترک کر دی تو اپنے مرحوم باپ کے کثیر التعداد ذخیرہ کے حاصل کرنے میں چچا کو ناراضگی کا موقع دینا نہیں چاہتی تو نے میری محبت کا اعتراف کیا تو نے ہی مجبوری و معذوری ظاہر کی۔ تو نے محبت کے سادہ مرقع پر ناحق ہی ملمع کاری کا رنگ نہیں چڑھنے دیا تو یہ پرستش کے لائق ہے۔ کاش تو میری ہوتی میں تجھ کو ضرور حاصل کرکے رہوں گا۔ اور اُس وقت تک مایوس نہ ہوں گا۔ جب تک میرے دل میں ذرہ بھر بھی امید کی جھلک باقی ہے۔

(۲)

وسط چمن اور سلگوں بارود کی روشنی میں ایک مرمریں بیچ پر وہ حور جس کے تابدار سیمیں جسم کی دلاویزی پر نسرین و نسیم بھی طعنہ زنی کرتی ہیں جس کے رخسار صبیح کی سُرخی کو دیکھ کر شفق شام کا رنگ فق ہوتا ہے۔ وہ دوشیزہ نازنین جس کے ایک تبسم پنہاں کی آرزو میں سیکڑوں بیتاب دلوں پر بجلیاں گرانے کی منتظر۔ وہ پری پیکر جس کے زلف عنبریں کی ایک ایک تار پر ہزاروں ارسطو و افلاطون حواس باختہ۔

نہ معلوم کس خیال میں رخسار نازک پر پنجۂ نازک سے سہارا دیئے ہوئے خاموش بیٹھی ہے۔

کیا اب بھی یہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ یہی پیکر حسن و ملائک فریب حور ... ہے وہ کیوں اُداس ہے۔ اُس کی بوجھل جوانی اس کا سنہانی رنگ اُس کا سڈول جسم ان کی دلفریب تو ساکت۔ یہ تمام خوبیاں زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ دائمی عیش و عشرت کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ یہ کہ جوں جگر پیتے کو لیکن برعکس اس کے اس کی غمناک صورت کہہ رہی ہے کہ وہ کسی بڑے رنج و غم کے بحر ذخار میں غوطے کھا رہی ہے۔ کیونکہ وہ لب اُس کو سراپا تصویر بنا رہا ہے۔ اُس کے لب لعلیں کی خفیف جنبش اُس کے دلی حالات کی ترجمان ہے۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی ہے کہ اس وقت چچا جان نے بلاوجہ اُسے کیوں بلایا ہے۔ بلکہ کوئی بڑا اہم واقعہ درپیش ہے۔ جسکو اسکا دل خوب جانتا ہے۔

اکبر میں کوئی خوبی نہیں جیسا کہ تم چاہتی ہو۔ انتخاب کا میدان وسیع ہے۔ تمہارے خواستگار جو تم کو حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور میدانِ عمل میں اپنے جوہر دانائی و صفائی دکھا سکتے ہیں تم اُن میں سے کسی ایک کو انتخاب کر سکتی ہو یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ کہ تم کرنل القانسو کو پسند کرو یا کپتان اورتیو کو ترجیح دو۔ دولت مددگار نہیں تمہارا منظور نظر بہت لائق ہے۔ تمہارے فائدہ کی خاطر میں نے تمام نسبت و فرا۔ تم کو سمجھا دیا ہے اب تم غور کر کے جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہہ سکتی ہو۔

جمولیا۔ میں آپ کے نیک مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں آپ نے جو کچھ فرمایا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ میری سراسر دانائی و دوری مصلحت کو مدنظر رکھکر مگر آپ نے میری باطنی حالت کا اندازہ نہیں کیا آپ نے میرے مافی الضمیر کو غلط طور پر جانچا آپکی مشفقانہ گفتگو کا آخری حصہ ہرگز ہرگز میرے لئے تسلی بخش نہیں ہو سکتا۔

اکبر کے متعلق آپکی رائے ممکن ہے صحیح ہو۔ میرے دل پر اُس کی نیک نیتی و محبت اُس کی صداقت اور شرافت کا نقش ایسا بیٹھا ہے جس کو معمولی وجوہات یا صرف اثر انگیز الفاظ اور کمزور دلیلوں سے مٹایا جا سکے۔ مذہبی منافرت کا تذکرہ بھی اس موقع پر بے سود ہے مسلمانوں کا طریق عمل ہمارے ساتھ ہمیشہ سے بے تعصبانہ رہا ہے۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں بھی کبھی جب یہ سوال پیدا نہیں ہوا تو اب جبکہ مسلمان خود بے سرو پا ہو گئے ہیں اور ہمارے رحم کے محتاج ہیں اُنکی نسبت ایسا خیال ہی دل میں لانا مدار گناہ ہے اگر کوئی مسیحی لڑکی مسلمان شوہر منتخب کرلے تو یہ کوئی نئی رسم نہیں ابھی کچھ زیادہ مدت بھی نہیں گذری کہ مسیحی خاندان مسلمانوں سے تعلقات رشتہ داری پیدا کرنا اپنے لئے باعث فخر و مباہات سمجھتے تھے اور انکی عطا کردہ آزادی کو مسیح کی برکت خیال کرتے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت کے ساتھ کیا مسلمانوں کی شرافت اور نیک نفسی بھی رخصت ہو گئی ہے اور وہ مسیحیوں کے حامی نہیں رہے ممکن ہے کہ آپ کا خیال صحیح ہو لیکن اکبر کے متعلق ایسے معاندانہ خیالات کو میں ہرگز ہرگز دل میں جگہ نہیں دے سکتی اکبر نہایت نیک نفس اور بے غرض انسان ہے بہانہ بھی بغیر کسی تامل کے میں آپ کے حکم کی تعمیل کی

خواستگاروں کو کل اطلاع دی جائیگی کہ اُنکو کرسمس ڈے کے مبارک موقعہ پر اپنی محبوبہ کے منظور نظر بننے کے لئے اچھے سے اچھا کوئی تحفہ پیش کرنے کو تیار رہنا چاہئے جسکا تحفہ بہترین انتخاب حاصل کریگا وہی جوزا کے ہاتھ کا مستحق ہوگا۔

اس تجویز سے جوزا کے دل میں پھر مایوسی کی تاریکی پھیل گئی اُس کے لب الماس سپید دانتوں کی گرفت میں ایسی سختی سے آگئے کہ قریب تھا کہ اُن سے خون ٹپکنے لگے وہ کرب و بے چینی کے عالم میں پہلو بدلنے لگی آخر اُس سے نہ رہا گیا اور بے اختیار منہ سے نکل گیا آہ یہ تجویز نا انصافی ہے بڑا ظلم ہے - - - - اس کے آگے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کہ اُس کے چچا نے کھڑے ہوکر چلنے کے ارادے سے کہا - بس زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں یہ تجویز سراسر مکمل اور قرین انصاف ہے

جوزا کو اب اس کے آگے زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُس کے چچا کا یہ فیصلہ ناطق اور ناقابل ترمیم ہے۔ تاہم ایک امید موہوم کی بنا پر اُس نے دبی زبان سے سوال کیا۔

سوال۔ لیکن اُن تحائف کا انتخاب کون کریگا۔

جواب۔ ہم۔

وہ حیرت سے اپنے چچا کا منہ دیکھنے لگی کیونکہ اُس کو یقین نہیں آیا اُس نے خیال کیا کہ شاید میں نے سننے میں غلطی کی اور دوبارہ سننے کی منتظر رہی (اُس کو متعجب دیکھکر اُس کے چچا نے کہا) تم حیران کیوں ہوئے بیشک اُن تحائف میں سے بہترین تحفہ کے انتخاب کرنے کا ہمارے سوا دوسرے کو کوئی کام نہیں ہم ہی اُس کا انتخاب کرینگے

جوزا۔ (کچھ سوچکر) اور اُس انتخاب کی تائید کون کریگا

جواب اسقف اعظم (بڑا پادری)

(۳)

فن مصوری کا دلدادہ آرٹسٹ اپنے تصویر خانہ میں کسی گہرے خیال میں مستغرق کسی بارہ فا میں بیٹھا الاؤ کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ تمام آلات مصوری

اکبر - ممکن اور یقینی جب حضور اُمید ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں میرا زندہ رہنا غیر ممکن ہے۔ اس لئے میں عین انتخاب کے وقت موقع پر پہنچ جاؤنگا۔ اور

ارسلان - اور

اکبر - (خنجر دکھاکر) اور اس تیز خنجر سے اپنا سینہ چاک کر کے پھر میں تحفہ یعنی اپنا سینہ سے جدا دل (اپنی محبوبہ کی نظر کر دونگا جس کی اُس کو ضرورت ہے جس کو وہ پسند کریگی) آہ ایسا ہوتے ہی کیسی کامیابی ہوگی۔ جو اپنے محبوب کے قدموں میں نصیب ہو۔ دیکھوں اسکے بعد سب کے مقابلہ میں جرأت کس سے کون اسکا جواب دیگا۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان رنج دہ الفاظ نے ارسلان کے دل پر کیا اثر کیا مگر اُس کی غمگین صورت کہہ رہی تھی کہ اس کے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ اکبر بھی اپنے خیال میں محو خاموش بیٹھا رہا بہت عرصہ گذر گیا اور طلسم خاموشی نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا۔ سوائے اُن کی سانس کے آواز کے کمرہ میں ہر طرف خاموشی تھی ایک طویل عرصہ کے بعد ارسلان نے سر اٹھایا اور اکبر کو یوں مخاطب کیا۔ ہاں تم تحفۂ دل پیش کرنا چاہتے ہو بہت ٹھیک بہت مناسب میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ تم ضرور کامیاب ہوگے۔ بڑے دن کے آنے میں ابھی ایک ماہ کا عرصہ ہے اس مہلت میں میرے سارے دوست میں تمہاری خاطر سخت محنت کرونگا اور پھر میں نمونہ اپنی دستکاری اپنی صفائی کا تیار کر لونگا۔ کیا تم میرا مطلب سمجھ گئے۔ کہ وہ نمونہ کیا ہوگا

اکبر - میری سمجھ میں نہیں آتا۔

ارسلان - وہ نمونہ عاشق کا دل ہوگا۔ جس کو تم انتخاب کے موقع پر پیش کر سکتے ہو اور خدا کی ذات سے مجھے کامل امید ہے کہ شہزادی اندلس اس نایاب تحفہ کی نظیر پیش نہیں کر سکے گی میں اب زیادہ فکر کی ضرورت نہیں کھانے کی گھنٹی ہو رہی ہے۔ کچھ کھا لو۔

} اللہ اللہ واہ رے قوم مسلم یورپ آج جن اپنی صناعیوں پر نازاں ہے ہم نے آج سے آٹھ سو سال قبل دنیا کے سامنے پیش کر دی تھیں الحمرا کے عجائبات دیکھکر اب بھی بڑے بڑے فلاسفر سائنس دان یورپ انگشت بدنداں ہیں جن گذری ہوئی صنعتوں پر یورپ فخر و ناز کر رہا ہے وہ ہمارے ہی مکتبوں میں تعلیم حاصل کر کے اس عروج تک پہنچے

آہ ایک طلسم ہے کہ ایک ملائک فریب دوسرا ایسے حالانکہ صدمہ کو خموشی کیساتھ
برداشت کر رہی ہے اور اُف تک زبان سے نہیں نکال سکتی۔

اس جورس کے داخل ہوتے ہی کمرے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے

آصف اعظم ۔ (اسے مخاطب ہوتے) کیا اس تحریر میں لڑکی کی رائے بھی شامل ہے۔

جواب ۔ کیوں نہیں ہم دونوں نے متفقہ تحریر سوچی ہے علاوہ اس کے میں نے انتخاب کا حق تمام تر ہمشیرہ کو دیا ہے۔ تاکہ اُس کو کسی قسم کی کوئی وجہ شکایت باقی نہ رہے وہ اپنی پسند پر اپنے حق کو منحصر کر گئی ہے لیکن آپ بھی شرف قبولیت عطا فرماویں

آصف اعظم ۔ لیکن اسکے بعد آپ کو کوئی اعتراض کا موقع نہیں رہیگا

جواب ۔ جی نہیں (ایک کاغذ دیکر) لیجئے یہ میرا اقرار نامہ ہے اس اقرار نامہ کے ذریعہ میں نے اپنی بہن کو اس شخص کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی ہے جس کا نام اسکے انتخاب پر [illegible] حاصل کرے (دوسرا کاغذ دیکر) یہ میرے مرحوم بھائی کا وصیت نامہ ہے۔ [illegible] جو ترا ملا ہو ایک عرصے آج کی تاریخ سے اسی ہزار روپے کی مالک [illegible] [illegible] ہے

آصف اعظم ۔ (کاغذات کو نہایت غور سے دیکھکر) کاغذات سراسر مکمل ہیں معاملہ بالکل صاف ہے۔ تو پھر اب ہم کو اپنا کام شروع کرنا چاہئے۔ گھنٹی کے

اشارہ پر ایک ملازم صندوق کمرہ کے اندر لاتا ہے جس کا قفل نہایت احتیاط کے ساتھ بند تھا [illegible] ایک خوبصورت کنجی اپنی جیب سے نکالکر آصف اعظم کے پیش کی

آصف اعظم ۔ اچھا وہ سمجھنے والے یہاں موجود ہیں۔

جواب ۔ جی ہاں ملاقات کے کمرہ میں۔

آصف اعظم ۔ بہتر ہے سب کام مکمل ہیں اچھا میں اس بکس کو کھولتا ہوں ۔

ہمارا ۔ (بکس کو کھولکر) ایک بہت بڑا پارسل کاغذ میں ریشمی ڈوروں سے لپٹا ہوا ۔
(کاغذ کھولکر) ایک چوبی کٹہرا (کٹہرہ کو علیحدہ کرکے) آیا ایک ہاتھی دانت کا سنگھار دان (عدا)
[illegible] ہیرے جڑے ہوئے نہایت بیش قیمت اور اس کے [illegible] والے کا نام

ضرور یاس کے لئے جا ماکر لی تھی وہ کچھ زیادہ خوبصورت نہ تھا۔ لیکن اُس کا قد و قامت سڈول و صحیح قطع مناسب اعضا دلآویز اور دل کو مسخر کر لینے کے لئے کافی تھے وہ چکر سے الگ تھا اور اس مجسمہ قہر آفریں کو اسیر دام بنانے کے لئے ان اوصاف سے متصف جو ایک صنف لطیف کی کشیدگی و دلکشی کے لئے لازمی و لابدی ہیں۔ قسمت نے جسے اس کا ساتھ دیا اور بخت نے جس اُس کی یاوری کی وہ دنیا کا ایک تجربہ کار انسان تھا وہ ماراں کی الفت و محبت میں اسیر ہو گیا ایک تجربہ کار انسان معصومیت کو آسان مال غنیمت خیال کرتا ہے۔

وہ ایک پہاڑی لڑکی تھی — — — یہ نوجوان اسکی نسوانی معصومیت پر طوفانی موجوں کی مانند غالب آیا۔

جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ اور ہر قوم اپنے فرزندان وطن سے متوقع تھی۔ کہ وہ مادر وطن کی خدمات بجا لانے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ وہ بھی بطور رنگروٹ فوج میں بھرتی ہو گیا وہ اپنی محبوبہ دلنواز کو خدا حافظ کہنے کے لئے آیا۔ ماراں کی واردات قلبی اور جذبات دماغی کی کچھ عجیب حالت تھی۔ وہ آج مغموم ہونے کی نسبت مسرور اور شوق و انبساط سی ہوتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ جنگ بہت جلد ختم ہو جائیگی اور اسکا پیارا محبوب ایک بہادر سپاہی بنکر کامیاب واپس آئیگا۔

مدت گھنٹوں گھنٹے دنوں دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہونے لگے۔ اُس کی روح پر اشتیاق مسرت سے لبریز ہو چکی تھی کیونکہ اُس کی توقعات و تمناؤں امیدوں و آرزوؤں کا مبارک وقت قریب تھا۔ فلک کج رفتار نے اُس کی طرف دیکھا ہنسا اور مسکرا دیا۔

ماراں کی پہلے پہلے عجیب حالت ہو جاتی تھی۔ وہ ہر رنگ زار قدرت کی سرگرمیاں دیکھتی اور بعض اوقات دریا کے کنارے بیٹھ جاتی جہاں طیور نغمہ کناں تھے سارا سنگیت ایک شور زمزمہ اور طوفان نغمہ سناتے ہوتے تھے وہ بھی طوفانی موجوں

کے ساتھ نغمہ ریزی کرتی ذرا سا وقت گذار لی گانے گاتی کہ اُسکو لوری دینے والے ہوا کے ٹکیف جھونکے سلا دیتے اور وہ آہستہ شاندار تصورات میں مستغرق ہو جاتی اپنے مستقبل کے حالات میں محو ہو جاتی اور خواب میں مسرت اندوز مناظر سے محفوظ ہو جاتی باران اپنے حیات رس کے بساط اوامر چلتے طے کر رہی تھی۔ — +

بالآخر چار سال کی تکلیف دہ مدت اختتام کو پہنچی۔ ہولناک اور تباہ کن جنگ نوع انسان کو تباہ و برباد کر کے ختم ہو چکی تھی۔ وہ رخصت پر اپنے گاؤں میں آیا اُس کی واپسی ایک مجاہدانہ اور کامران واپسی تھی کیونکہ اُس کی تمام جنگ میں فاتح کی سمت سے کامیاب رہی تھی وہ بھی فتح کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوا۔ اُس کے سینہ پر متعدد فوجی تمغہ جات و نشانات آویزاں تھے۔ وہ زرق برق وردی میں ملبوس اپنے چھوٹے سے گاؤں میں ایک سرتاج کی طرح داخل ہوا گاؤں کے مطربوں نے ایک والہانہ ترانہ کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا ہجوم اُس کے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑا وہ سب کے لئے آماجگاہ نظر و حیرت بن گیا۔ وہ ایک موسمی جذبہ تھا . . .

لیکن باران کو بھی اس کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس کا دل فرط شادمانی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ اُس کی تمام آرزوئیں اور اُمنگیں مجتمع ہو گئیں وہ ہر وقت اپنے محبوب کے خیال میں مست اور بیخود رہنے لگی وہ اپنے دل میں کہتی کہ وہ تمام کمال میرا ہی اور اُس کی ذات محض میرے لئے ہے۔

وہ انہی خیالات میں ڈوبی رہتی اور اپنے مستقبل کے شاندار خواب دیکھا کرتی لیکن پھر آسمان اُس کی طرف دیکھتا۔ اور ہنس دیتا

اس پہاڑی لڑکی کی حیاتِ معاشقہ پر غروب ہونے والے آفتاب نے اپنی آخری مایوس انگیز شعاع ڈالی اور غروب ہو گیا۔

کئی ماہ گذر گئے ابھی تک اُس کے پاس اُس کا پیغام نہ آیا وہ سراپا انتظار بن [illegible] و تکمیل اضطراب بنی ہوئی تھی۔ اس طویل مدت میں ایک لفظ بھی اُس نے اپنے محبوب کی طرف سے نہ سُنا۔ اور نہ کوئی محبت آمیز پیام اُسے موصول ہوا۔ وہ ورطۂ حیرت و استعجاب میں غرق انتہائی رنج و غم کی تصویر بنی ہوئی تھی تفکرات اور پریشانیوں نے اُس کو محیط کر لیا۔ یاس و قنوط اُس پر طاری تھی۔ وہ اپنے دل سے سوال کرتی کہ اس کی یہ ناقابل توضیح خاموشی میری جانب کیوں ہے کیا اُس نے مجھے بالکل بھلا دیا؟ کیا میری الفت و محبت رائیگاں و بے سود ثابت ہوگی کیا میری مسرتوں اور ارمانوں پر پانی پھر جائیگا۔ کیا میری داستان محبت حسرت انگیز تبسم میں بدل جائیگی۔ کیا یہ ناکامی میرے حصہ میں آئیگی۔ جو خیالات اور تصورات میرے دل میں متلاطم ہیں کیا وہ سب ملمع انگیز اور تصنع آمیز ہیں۔



پاراں ایک پہاڑی لڑکی تھی۔ لیکن اب بعض اوقات اُس کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوتے کہ اُس نے محبوب سے دغا کی۔ مگر فوراً ان خیالات کو دور کر دیتی۔ پھر یہ گہرے غور و خوض میں پڑ جاتی کہ اُس کی عدم تشریف آوری کے کیا وجوہات ہیں شاید وہ اپنے ضروری کاموں میں مصروف و منہمک ہے۔ خود ہی سوالات اور اعتراضات پیدا کرتی اور خود ہی اپنی وکالت سے اُن کو مسترد کر دیتی کیونکہ وہ ان اثرات محبت کو جو اُن کی معاشقہ میں گھر چکے تھے زائل کرنا نہیں چاہتی تھی جنہوں نے ابھی تک اُس کے قلب حزیں کو بحر بموج سا بنا رکھا تھا لیکن اب اُس کی بے پرواہی و طرز ادائی میں فرق آگیا اُس کا سوچ سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے پھرنا موقوف ہو گیا اُس کی چلبلاہٹ کافور ہو گئی۔

بالآخر اس تصورہ سکمانی اُس کے ہاتھ سے جاتا رہا پیمانۂ صبر و تحمل لبریز ہو کر چھلک پڑا دل ناصبور نے آہ و زاری بلند کی اور وہ مصروف نالہ و فغاں ہو گئی۔ پاراں کی تسیم ہائے مژگاں سے غم و یاس محبت کے آنسو بہنے لگے ایک جانب

نقش راکا یہ پہلا دن تھا۔ کہ اس میں یہ نظر آیا تھا آج اُس کی زندگی کے ایک جذبات کا آغاز ہوا تھا۔



ایک طویل مدت گذر گئی۔ ایک دن باران اُسی درخت کے نیچے بیٹھی مصروف فکر نہ تھی۔ اور اُس کی غم آلود آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ یہی وہ درخت تھا جس کے سایہ میں وہ اپنی زندگی کے دلآویز خواب دیکھا کرتی۔ یہ درخت اُس کے اُن خیالوں کا جاسوس سا بن گیا تھا۔ جبکہ وہ اپنے محبوب کی صورت ایک ناقابل فراموش سا مدار آرائش میں ہر دن ایک دور فاصلے پر بیٹھی دیکھا کرتی۔ اور انہیں تصورات میں محو رہتی۔

ایک دن عالم وارفتگی میں وحشی دیوانوں کی طرح جو کپڑے پھاڑتی ہوئی اپنے مسکن سے چلی۔ اس کا سینہ جذبات و احساسات سے لبریز تھا۔ وہ بحر متلاطم بنی ہوئی اس کے پاس پہنچی اور جاتے ہی اُس سے لپٹ گئی اُس کی چشم ہائے غم آگیں سے سیل اشک رواں تھے۔ مگر وہ اس سے کچھ متاثر نہ ہوا۔ اور نہ اُس نے کچھ گرمجوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُس نے دریافت کیا۔ "پیاری باران کیا بات ہے" مگر ایک ایسی آواز میں جو جذبات محبت سے خالی تھی اور اُس کی یہ پرسش بھی سرد مہری سے پُر تھی۔ باران نے کہا کیا تم مجھ سے میری داستان غم سننا چاہتے ہو۔ اور ایسی نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھا جو سراپا استدعا و التجا تھیں۔

اس کا چہرہ ایک تصویر غم سا ہوا تھا اس کو اس کے چہرے پر محبت کے غیر فانی نقوش نظر آتے جو اپنی جلالت و عظمت کا اظہار کر رہے تھے

اُس نے کہا تو سادہ لوح اور ساری لڑکی !

یہ تو ایک مذاق تھا۔ اُس نے اپنے زہر آلود لبوں سے اُس کے ہونٹوں کو چوما۔ ہنسا اور زور سے قہقہہ لگا کر وہاں سے چلدیا۔ ان قہقہوں کی آواز مقبرے کی چٹانوں میں گونجی اس نے اُس کی صدائے بازگشت سنی۔ جس میں ایک تضحیک و تمسخر شامل تھی۔

اُس کے زہر آلود پیارے حسن میں مکر و فریب کی آمیزش تھی۔ اُس کے باریک و شیریں لبوں کو سوختہ کر دیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔ جب اُس نے اُس کی حرکات کو دیکھا۔ تو خیال کیا کہ مشیت ایزدی کو یہی منظور ہے۔ وہ بھی اس کی محبت سے دست بردار ہو کر وہاں سے چل دی۔ اب اُس نے نہ گریہ و زاری کی اور نہ کوئی فریاد و فغاں لیکن جب وہ اپنے مسکن پر پہنچی تو بیہوش ہو کر گر پڑی۔

ماراں کا آفتاب زندگی آج غروب ہو گیا۔ دوسری صبح جو رشید عالمتاب حسب معمول طلوع ہوا اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی ضیا پاش شعاعیں پہاڑوں دریا کی روانی ہرے ہرے جنگل اور ماراں پر ڈالی۔ مگر آہ! آج یہاں وہ پہاڑی لڑکی نہ تھی۔ اُس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اُس کی نعش ایک مرد کی بیوفائیوں اور بدعہدیوں اُس کی فریب کاریوں اور ملمع سازیوں پر ماتم کناں اور نوحہ زن تھی

راجہ غلام احمد خاں مرمل

رانا پرتاب

رانا پرتاپ یوں گھرا دل میں | چاند چھپ جاتے جیسے بادل میں
کٹ گئے صف بہ صف بیری کے پرے | جتنے ساتھی تھے سب کے کٹ رہے
نہ پتنگ کو اڑا کے جا سوجھا | عین اُس ہاتھی پر جو بیچ میں تھا
شاہزادہ سوار جس پر تھا | جس کو گھیرے ہوئے تھے اہل وفا
ایسی گھمسان کی لڑائی تھی | نہ کٹا وہ جھٹا وہ صاف ہوا
سنسنا لے گئے تیر کانوں میں | اور استھاپ بھی بیچ کی ہر جا
ڈرلے نہ جب لبوں سے سر | رکھا مارے ہوئے جو ہیں جھنڈا

کھا کے مہمیز آگ بھار ہوا ر سُلطان جھاڑتا ہوا لپکا
کاٹ ڈالا صفوں کو دم بھر میں سامنا صاف کر لیا اپنا
ایک ہی جست میں بھالا بھی پر اور جھٹک ہو گیا الف تو را
سُلطان دونوں رکھ دیں مسک پر اور رن سے چلا ادھر پر چھا
جان بچی بھی شاہزادے کی بیچ میں حائل ہو گیا ہو دا
رن اُکار اٹھا اس کو کہتے ہیں واہ رے مرد واہ رے گھوڑا

اب یہ قسمت کی تھی کمی شاعر
ورنہ کام ایسا کر گیا تر آنا

افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی



تحفۂ دل

سر زمین اندلس اپنی گذشتہ عظمت و جلال اپنی تاریخی روایات پر جو اسکو سلاطین اسلام کے عہد میں حاصل تھیں ابد الاباد تک فخر و ناز کرے گی غرناطہ اور قرطبہ کی شان و شوکت ایک افسانہ پارینہ بن چکی الحمرا کے نقش و نگار صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکے علم برداران توحید جن کی سطوت و جبروت کا ڈنکا بلاد یورپ میں بج رہا تھا فنا ہو گئے صلیب نے ہلال پر غلبہ حاصل کر لیا۔ تاہم اُنکی یادگاریں اُنکے کارنامے صفحہ تاریخ پر اب بھی روز روشن کی طرح عیاں ہیں جو ہمارے لئے تازیانہ عبرت کا کام دیتی ہیں۔

اندھیری رات اور رات بھی کیسی بھیانک سنسان جنگل پہاڑی میدان۔ جہاں کوسوں تک انسان تو کیا وحشی اور درندوں کی آواز بھی مفقود ہے۔ پہاڑی کے دامن سے سمندر کی متلاطم موجیں ٹکرا رہی ہیں اس نظارہ سے قریبا منظر اور ایک ستم رسیدہ جسکو آبادی سے نفرت ہے جو دنیا کے مصائب و آلام زندگی سے دور بھاگتا ہے۔ جس کے دل میں نا امیدی

کی پھانسیں ہر لحظہ کھٹک کھٹک کر ناسور ڈال رہی ہیں۔ جوانی زندگی کو پامال جان سمجھا ہو
سرد مہری کی چٹان پر اپنے خیالات میں بہک اپنے دل کی آنکھوں میں گرد سار سر جھکائے
بیٹھا ہے اس موقع پر یہ لکھ دینا بیجا نہ ہوگا۔ کہ یہی صاحبزادہ ہمارے قصہ کا ہیرو اکبر ہے
جو اپنے جنون عشق۔ اپنی بے تابی دل سے مجبور ہوکر شہر کی پُرکیف زندگی پر اس خاموش
اور سنسان مقام کو ترجیح دے کر زیادہ راتوں کا حصہ یاد دلدار میں بسر
کرتا ہے۔

اس کے عشق و محبت کی داستاں زباں زد خلائق ہو رہی ہے لیکن۔ اس کو دوستوں
کی معارف کا غم ہے۔ نہ پروا۔ اور نہ اس کو اپنی بے سر و سامانی کا احساس ہے۔ نہ علم اسکے
دل میں اس کے خیال میں اس کی نظر میں۔ اگر کسی کی یاد ہے تو جوزا کی پروا ہے۔ تو جوزا کی
شکل ہے۔ تو جوزا کی۔ کون جوزا؟ جس نے اس کے دل و دماغ کو معطل کر رکھا ہے جس کی
ملائک فریب صورت نے اسکو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ دیکھئے اسوقت بھی وہ اسکے خیال میں سرنگوں
ہے اُسکے الفاظ کسقدر درد بھرے ہیں۔

ہر ممکن کوشش ہر طرح کی خوشامد منت و زاری نے جب اس سنگدل کے دل پر اثر
نہ کیا میری سچی محبت کی قدر نہ کی۔ میری جانبازی و چاہت کی پروا نہ کی۔ میرے خطوط کا جواب
تو درکنار اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اس کی نظر پر نہیں۔ تو میری وہ چاہت میری
خوبصورتی کس کام کی اُسکو پروا نہیں تو میری ناکام محبت کس مصرف کی وہ حقیر سمجھی ہے تو
میری خاندانی عظمت میری شجاعت کس مطلب کی۔ میں غریب بیچارہ بے یار و مددگار کس شمار
اور کس قطار میں ہوں جس کی پرواہ کرے۔

اے زمانہ گذشتہ کی یاد تو کیوں بار بار آکر میرے مجروح دل پر خنجر چلاتی ہے میں پوچھتا
ہوں کیوں جلے دل کو جلاتی ہے۔ میں خاندان خلافت کی یادگار سہی۔ لیکن مٹی ہوئی میں قصر
الحمرا کا چراغ سہی لیکن بجھا ہوا۔ مجھ سے پوچھتے تو خود میری نظر میں اپنی وقعت نہیں عزت
نہیں آبرو نہیں حکومت در پردہ میری جان کی خواہاں مذہبی منافرت صلیب و ہلال کی
آویزش (دفعتہً چونک کر) جوزا پیاری جوزا مجھے تیری کچھ گلہ نہیں تو نے سکت

قدرداں محبت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو نے اپنے ظالم چچا کے خوف سے اپنے نازک دل پر جبر کرکے علانیہ ملاقات ترک کردی تو اپنے مرحوم باپ کے کثیر التعداد سرمایہ کے حاصل کرنے میں چچا کو ناراضگی کا موقع دینا نہیں چاہتی تو نے میری محبت کا اعتراف کیا تو نے اپنی مجبوری و معذوری ظاہر کی۔ تو نے محبت کے سادہ مرقع پر مذہبی تعارف کا رنگ نہیں چڑھنے دیا تو پرستش کے لائق ہے۔ کاش تو میری ہوتی میں تجھ کو ضرور حاصل کرکے رہونگا۔ اور اُس وقت تک مایوس نہ ہوں گا جب تک میرے دل میں ذرہ بھر بھی امید کی جھلک باقی ہے۔

(۲)

وسط چمن اور سیکڑوں تاروں کی روشنی میں ایک مرمریں بنچ پر وہ حور عین جس کے ساعد سیمیں کی دلاویزی نسرین و سمن پر طعنہ زنی کر رہی ہیں۔ جس کے رخسار صبیح کی سُرخی دیکھکر شفق شام کا رنگ فق ہوتا ہے۔ وہ دوشیزہ نازنین جس کے ایک تبسم پنہاں کی ادا سینکڑوں بیتاب دلوں پر بجلیاں گرانے کی منتظر۔ وہ پری پیکر جس کے زلف عنبریں کی ایک بندش پر ہزاروں ارسطو و فلاطون حواس باختہ۔

نہ معلوم کس خیال میں رخسار نازک پر پنجۂ نازک کا سہارا دیتے ہوئے خاموش بیٹھی ہے۔

کیا اب بھی یہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ یہی پیکر حسن و ملائک فریب شوکت آرا ہے آخر وہ کیوں اُداس ہے۔ اُس کی نوخیز جوانی اُس کا سہانا رنگ اُس کا سڈول جسم اُس کی دلفریب نزاکت۔ یہ تمام خوبیاں زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ دائمی عیش و عشرت کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ نہ کہ خون جگر پینے کو لیکن برعکس اس کے اس کی غمناک صورت کہہ رہی ہے کہ وہ کسی بڑے رنج و غم کے بحر ذخار میں غوطے کھا رہی ہے۔ کثرت اندوہ نے اُس کو سراپا تصویر بنا دیا ہے۔ اُن کے لب لعلیں کی خفیف جنبش اُن کے دلی خیالات کی ترجمان ہے۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی ہے کہ اس وقت چچا جان نے بلا وجہ اُسے کیوں بلایا ہے۔ بلکہ کوئی بڑا اہم واقعہ درپیش ہے۔ جسکو اسکا دل خوب جانتا ہے۔

یکایک ایک مردانہ آواز اُس کے پراگندہ خیالات کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

آواز۔ حورا کیا تم میری دیر سے منتظر ہو۔

حورا۔ نہیں چچا جان ابھی دیر تو نہیں ہوئی آپ کے حکم کی تعمیل میں وقت معینہ سے پہلے یہاں پہنچ گئی تھی۔

چچا۔ تم بڑی سعادت مند لڑکی ہو تمہاری طرف سے نافرمانی کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا (بوڑھا چچا سر کے بیچ پر بیٹھ جاتا ہے) حورا کیونکہ دن بھر کاروباری تعلقات سے فرصت نہیں ملی اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ تمہیں یہاں بلا کر تبادلہ خیالات کر سکوں۔ دیکھو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تمہاری بہبودی کے لئے۔ جو کچھ رائے دوں گا تمہارے مستقبل کو مدنظر رکھ کے۔ میں تمہارا ابا ابدلیس نہیں ہوں۔ باپ کی جگہ ہوں تمہیں چچا کی گفتگو سے بیزار نہیں ہونا چاہئے اگرچہ وہ کس قدر ناگوار بھی معلوم ہو۔

سنو ابھی تم ناتجربہ کار ہو لیکن دنیا سے قطعی ناواقف میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ تم سن بلوغ کو پہنچ چکی ہو۔ اور انتخاب شوہر کے لئے قانوناً آزاد ہو مگر اس سے یہ بھی جواز نہیں کہ تم اپنی مرضی کے خلاف اپنے پسند کردہ شوہر سے محروم رہو تم کو معلوم ہے کہ تمہارے والد کا کثیر التعداد سرمایہ بنک میں امانتاً محفوظ ہے جس کی تم واحد مالک ہو لیکن تم سے یہ بھی مخفی نہیں کہ تمہارے والد ایک وصیت نامہ بھی چھوڑ گئے ہیں جس کی شرائط تمہارے ارادوں کی سد راہ اور تمہارے خیالات کو باطل کرنے والی ہیں تاہم مجھے امید ہے کہ تم تسلیم کرو گی کہ اگر تم کو تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا جائے اور تم اپنی ناتجربہ کاری سے معاملہ کی اہمیت نظر انداز کر کے محض عشق و محبت کی بے سروپا داستانوں اور خیالی افسانوں سے متاثر ہو کر اپنی حماقت کا ثبوت دو اور ایک ایسے شخص کو جس سے ہماری قوم کو نفرت ہے جو اپنی مٹی ہوئی خاندانی عظمت پر مغرور اور ہمارے پاک مذہب کا دشمن ہونے کے علاوہ مفلسی اور فلاکت کے شکنجہ میں جکڑا ہوا مدرس حلالی ہے اپنا شوہر بنا کر ہماری قوم کو آماجگاہ صد لعنت و ملامت بنا کر دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ رکھو اور اپنے مرحوم باپ کی دولت سے مستفید ہو کر ہمیشہ کے لئے قعر مذلت میں گر جاؤ۔ (جواب کا انتظار کرتے ہوئے کہتا)

اگر ان میں کوئی خوبی نہیں جیسا کہ تم چاہتی ہو۔ انتخاب کا میدان وسیع ہے۔ تمہارے خواستگار جو تم کو حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور میدان عمل میں اپنے جوہر دانائی و صفائی دکھا سکتے ہیں تم اُن میں سے کسی ایک کو انتخاب کر سکتی ہو۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ کہ تم کرنل الفانسو کو پسند کرو یا کپتان اوریتو کو ترجیح دو۔ ولیم گاربٹ بھی تمہارا منظور نظر رہنے کے لائق ہے تمہارے فائدہ کی خاطر میں نے تمام نشیب و فراز تم کو سمجھا دیا ہے۔ اب تم غور کر کے جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہہ سکتی ہو۔

جمولیا۔ میں آپ کے نیک مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ میری بہتر بہبودی اور بہبودی منفعت کو مدنظر رکھ کر۔ مگر آپ نے میری باطنی حالت کا اندازہ نہیں کیا آپ نے میرے مافی الضمیر کو غلط طور پر جانچا آپکی مصلحت یہ گفتگو کا آخری جملہ ہر گز ہرگز میرے لئے تسلی بخش نہیں ہو سکتا۔

اکبر کے متعلق آپکی رائے ممکن ہے صحیح ہو۔ میرے دل پر اُس کی نیت لوٹ محبت اُس کی صداقت اور بہادری کا ایسا پایا ہوا نقش ہے جس کو معمولی وجوہات اور بے اثر الفاظ اور کمزور دلیلوں سے مٹایا جا سکے۔ مذہبی منافرت کا تذکرہ بھی اس موقع پر بے سود ہے مسلمانوں کا طریق عمل ہمارے ساتھ ہمیشہ سے منصفانہ رہا ہے۔ جہاں حکومت میں کبھی بھی جب یہ سوال پیدا نہیں ہوا تو اس حیثیت سے مسلمان خود بے بس و مجبور ہو گئے ہیں اور ہمارے رحم کے محتاج ہیں اُنکی نسبت انسانی ہمدردی دل میں لانا بہتر قرار دیا گیا ہے اگر کوئی مسیحی لڑکی مسلمان شوہر منتخب کرلے تو یہ کوئی جرم نہیں ابھی تک میرا مادہ دماغ بھی نہیں گذری کہ مسیحی خاندان مسلمانوں سے تعلقات رشتہ داری پیدا کرنا اپنے لئے باعث فخر و مباہات سمجھتے ہیں اور اُنکی عطا کردہ آزادی کو مسیح کی برکت خیال کرتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت کے سامنے کیا مسلمانوں کی شرافت اور بے نفسی کی رحمت بڑی ہے اور وہ مسیحوں کے بھائی دشمن بن گئے ہیں۔ یہ کہ آپ کا خیال صحیح ہو لیکن اکبر کے متعلق اپنے معصومانہ خیالات کو ہر گز ہرگز دل میں جگہ نہیں دے سکتی اگر بہادر ملک نفس اور بے غرض انسان ہے بلکہ بھی آخر کسی مائل کے میں نے آپ کی سکیم کی تعمیل کی

بہاٹ سنگھ کے سامنے اپنے دل پر جبر کرکے اُس سے سلسلۂ ملاقات ترک کیا اُس کے خطوط بغیر
پڑھے واپس کر دیئے۔ اُس سے کہہ دیا کہ میرے خیال کو اپنے دل سے نکال دے میں نے اُس پر
وہ ظلم کیا۔ جو کسی نے آج تک نہ کیا ہوگا میں نے اس سے یہ بھی کہہ دیا۔ کہ اب عمر بھر شادی نہ کرونگی
باوجود ان تمام باتوں کے جیجا جان کیا آپ مجھ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ میں اُس کی جو ہوں اُسکی
وفاؤں۔ اُس کے احسانوں کو بھی دل سے نکال دوں اور آپکی احسان مند ہو جاؤں ——

رہ گیا دوسروں کے انتخاب کا معاملہ۔ اُس کا تعلق دل کے ساتھ ہے۔ جب تک میرے دل میں کسی
کی جگہ نہ ہوگی اُس وقت تک میں کسی کے متعلق خواہ وہ کیسا ہی دنیا کا بہترین اور وجیہہ ہو ایک
حرف بھی زبان سے نہیں نکال سکتی اور نہ ہی کسی کو اپنی محبت دلا سکتی ہوں کہ میرے دل کی
معاملات میں دخل دے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) آپ میرے دل پر جبر ہونے کا حکم نہ کیجئے۔
آپ اکبر کے متعلق ایسے رنج دہ خیالات کو دل سے نکال ڈالیئے وہ شریف ہے۔ شرافت اسکے
چہرے سے ظاہر ہے وہ خلیق ہے۔ اُسکے خُلق کی دنیا مداح ہے وہ صاحب اقبال ہے دولت
اُسکے قدموں کے ساتھ ہے۔

چچا (شفقت سے سر پر ہاتھ پھیر کر) اٹھو اپنی اٹھو اتنی رنجیدہ اور پریشان
نہ ہو میں تم کو رنجیدہ اور پریشان دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تمہاری بے لوث لیکن تمہارے
باطنی جوش سے متاثر ہو کر میری رائے میں فوری انقلاب پیدا ہو گیا ہے میں تم کو شادی کی
لازوال مسرتوں سے محروم رکھنا نہیں چاہتا میں تمہارے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہوں
جس میں ہر شخص کو قسمت آزمائی کا موقع مل سکتا ہے اگر بقول تمہارے اکبر تمہارا
سچا عاشق ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ اور مبادا اس عمل میں بازی
لے جائے۔

ان کلمات نے جنورا کے مایوس دل میں ایک برقی رو کا کام کیا اور امید کی جھلک
پیدا کر کے اُس کو ہمہ تن گوش کر دیا وہ سوچ رہی تھی کہ اُس کا چچا ایسی کونسی تجویز پیش
کریگا جس سے اُس کی مردہ تمنائیں ا[illegible] زندہ ہو جائیں

چچا اس وقت بغیر کسی سوچ و فکر کے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ تمہارے

جو اسدگار وںکو کل اطلاع دیدونگا۔ کہ اُنکو کیمپس ڈے کے مبارک تہوار پر اپنی محبوبہ کے منظور نظر بننے کے لئے۔ جیسے سے اچھا کوئی تحفہ پیش کرنے کو تیار رہنا چاہیئے جسکا تحفہ شرف انتخاب حاصل کرلیگا وہی حورا کے ہاتھ کا مستحق ہوگا۔

اس تجویز سے حورا کے دل میں پھر مایوسی کی ارکلی جھل گئی اُس کے لب لعلیں سفید دانتوں کی گرفت میں ایسی سختی سے آگئے کہ قریب تھا کہ اُن سے خون ٹپکنے لگے۔ وہ کرب وبے چینی کے عالم میں پہلو بدلنے لگی آخر اُس سے نہ رہا گیا اور بے اختیار منہ سے نکل گیا آہ یہ سخت نا انصافی ہے بڑا ظلم ہے - - - - اس کے آگے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کہ اُس کے چچا نے کھڑے ہوکر چلنے کے ارادے سے کہا - - بس زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تجویز سراسر مکمل اور عین انصاف ہے۔

حورا کو اب اس کے آگے زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُس کے چچا کا یہ فیصلہ ناطق اور نا قابل ترمیم ہے۔ تاہم ایک امید موہوم کی بنا پر اُس نے دبی زبان سے سوال کیا)

سوال۔ لیکن اُن تحائف کا انتخاب کون کریگا۔

جواب ہم۔

وہ حیرت سے اپنے چچا کا منہ دیکھنے لگی کیونکہ اُس کو یقین نہیں آیا اُس نے خیال کیا کہ شاید میں نے سننے میں غلطی کی اور دوبارہ سننے کی منتظر رہی (اُس کو متعجب دیکھکر اُس کے چچا نے کہا) ہم حیران کیوں ہوئے بیشک اُن تحائف میں سے بہترین تحفہ کے انتخاب کرنے کا ہمارے سوا دوسرے کو کوئی کام نہیں ہم ہی اُس کا انتخاب کرینگے

حورا۔ (کچھ سوچکر) اور اُس انتخاب کی تائید کون کریگا

جواب اسقف اعظم (بڑا پادری)

(۳)

فن مصوری کا دلدادہ آرٹسٹ اپنے تصویر خانہ میں کسی گہرے خیال میں مستغرق کسی بارہ فکر میں سر برانو میز کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ تمام آلات مصوری

بے بسی کی حالت میں پھر اس انداز سے پڑے ہیں گویا اُن کے ساتھ انتہائی لاپروائی کو کام میں لایا گیا ہے۔ اُس کے قریب ہی دوسری کرسی پر اکبر بھی خاموش تصویر بنا ہوا نظر آتا ہے۔

آخر طویل خاموشی کے بعد آرٹسٹ نے سر اٹھایا اور کہا اکبر تمہارا خیال عبث ہے میرے حالات بہت سخت اور مایوس کن ہیں میں تمہارا بہی خواہ اور وقت پر کام آنے والا دوست ہوں اگر تمہاری مطلب برآری کے لئے اپنا تمام سرمایہ بھی صرف کر دوں پھر بھی مجھے امید نہیں کہ تم اپنے حریفوں کے مقابلہ میں جو نہایت دولت مند ہیں کامیابی حاصل کر سکو

میں جانتا ہوں کہ معاملہ اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہر شخص دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں انتہائی دولت خرچ کرنے میں دریغ نہ کریگا۔ اور دولت کے بغیر یہ سبقت ممکن نہیں ہو سکتا۔ مجھکو تمہاری حالت کا بھی اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسی لئے حضور کے سامنے قیمتی تحفہ پیش کرنے کے لئے یہ سوال اٹھایا ہے۔ کہ تم کم سرمایہ دار ہو اور اس لئے حضور کے پاس پیش کرنے میں ناکام رہو گے مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ تم اپنے حریفوں کے مقابلہ میں جو دولتمند اور ذی رتبہ ہیں ایسا تحفہ پیش نہیں کر سکتے جو بہترین کہلائے جانے کا مستحق ہو۔!

اکبر۔ تمہارا خیال بالکل درست ہے میں مانتا ہوں کہ ایسا تحفہ بغیر صرفِ کثیر کے حاصل نہیں ہو سکتا جو قابل انتخاب ہو لیکن کیا تمہارا مطلب ہے کہ میں اس زریں موقع کو ہاتھ سے دیکر رو رو کر اپنی تمام زندگی گذار دوں۔ اور حضور کو کسی اور کے پہلو میں دیکھوں

سنو اے دوست میں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ اور سوچا ہے کہ اپنی جان سے پیاری حضور کے لئے ایسا نایاب ہدیہ پیش کر دوں جس کی قیمت کا صحیح اندازہ طاقت بشری سے باہر ہو۔

امر ہیلا حیران ہو کر اور اُس تحفہ کا نام۔

اکبر۔ تحفۂ دل۔

ارسل قیاس میں نہ آنے والی بات جنون وحشت ... کی علامت ...

اکبر - ممکن اور یقینی جب حضور امیر کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں میرا رہنا ناممکن ہے۔ اس لئے میں عین انتخاب کے وقت موقع پر پہنچ جاؤنگا۔ اور

اسرسل - اور

اکبر - (خنجر دکھاکر) اور اس خنجر سے اپنا سینہ چاک کر کے بہترین تحفہ یعنی اپنا ٹوٹا ہوا دل اسی محبوبہ کی نظر کر دونگا جس کی اس کو ضرورت ہے۔ جس کو وہ پسند کریگی آہ اپنے ناکسی کا اسباب ہوگی۔ جو اپنے محبوب کے قدموں میں نصب ہو۔ دیکھوں اسے گراں قدر تحفہ کے مقابلہ میں حریفوں میں سے کون اسکا جواب دیگا۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان رنج دہ الفاظ نے راسنڈ کے دل پر کیا اثر کیا مگر اس کی نگاہیں ضرور کہہ رہی تھیں کہ اس کے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ اکبر بھی اپنے خیال میں محو خاموش بیٹھا رہا۔ عرصہ گذر گیا اور طلسم خاموشی نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا۔ سوائے ان کی سانس کے آواز کے کمرہ میں ہر طرف خاموشی تھی ایک طویل عرصہ کے بعد راسنڈ نے سر اٹھایا اور اکبر کو فوراً مخاطب کیا ہاں تم تحفہ دل میں کرنا چاہتے ہو بہت ٹھیک ہے مناسب ہے میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ تم ضرور کامیاب ہوگے۔ بڑے دن کے آنے میں ابھی ایک ماہ کا عرصہ ہے اس مہلت میں میرے سارے دوست میں تمہاری خاطر سخت محنت کرونگا اور بہترین نمونہ اپنی دستکاری اپنی صناعی کا تیار کر لونگا۔ کیا تم میرا مطلب سمجھ گئے۔ کہ وہ نمونہ کیا ہوگا

اکبر - میری سمجھ میں نہیں آیا۔

ارسل - وہ نمونہ عاشق کا دل ہوگا۔ جس کو تم انتخاب کے موقع پر پیش کر سکتے ہو اور خدا کی ذات سے مجھے کامل امید ہے کہ سپین اندلس اس نایاب تحفہ کی نظیر پیش نہیں کر سکے گی بس اب زیادہ فکر کی ضرورت نہیں کھانے کی گھنٹی ہو رہی ہے۔ کچھ کھالو۔

{ اللہ اللہ واہ رے قوم مسلم یورپ آج جن اپنی صناعیوں پر نازاں ہے تم نے آج سے آٹھ سو سال قبل دنیا کے سامنے پیش کر دی تھیں الحمرا کے عجائبات دیکھکر اب بھی بڑے بڑے فلاسفر سائنس داں یورپ انگشت بدنداں ہیں جن کو آج ہی ہوئی سمجھتا ہے یورپ کا فخرو ناز کرتا ہے وہ تمہارے ہی ملکوں میں تعلیم حاصل کر کے اس عروج تک پہنچے

کہ وہ ساؤں کا نام لے رہی ہے تمہاری بنائی ہوئی اسامہ اس وقت لندن … سٹریٹ ریگن کے عجائب خانوں کی زینت ورنہ علم سخاوت السامیہ … عناد … کسی حجر کی دنیا میں سے بڑھ کر مثال بیان نہیں کر سکتی … اسلام سے راضی ہو جاؤ ورنہ

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

(مسدری)

[illegible] باب

دسمبر کی پچیسویں ۲۵ تاریخ کو کرسمس ڈے (بڑا دن) بڑے دھوم دھام اور … سے منایا جا رہا ہے۔ عیسائیوں میں اس سے زیادہ کوئی سرور و انبساط کا دن نہیں … کرسمس کا جشن دھوم دھام سے جاری ہے۔

حضور الٰہی رسم دنیا کے مطابق بہت سے کرسمس کارڈز … اُس کے چاہنے والے اکبر کے ہوں سے … سب سمیں کو تہنیت مرحبا … ارادہ کر رہا … جب ہی وہ … کی طرف جھوکا ہی ہوتی … خاص کمرہ میں جس میں اُس کا بچھا اور … عرصہ سے اُس کے … ایک سکتے کے عالم میں آہستہ آہستہ قدم اٹھائی … دلفریب حال سے دل عشاق کو پامال کرتی چلی جا رہی ہے مگر کیا بات ہے کہ اُس کے رخ پر … چہرہ پر وہ … معشوق کا رنگ … اس وقت مدھم اور زردی ہے نظر نہیں آتی … کوئی باطنی کام … کوئی اندرونی خلش اُس کے … دلفریب سکتے ہو رہے … وہ جانتی ہے کہ آج کا دن کہ اُس کے … ملا ہے۔ اُس کو … گوشہ دل میں … آنسو … اُس کو یقین ہے کہ آج اُس کی قسمت کا فیصلہ اُس کی … کے خلاف … رہے گی … ایسا ہوگا تو یہی دن اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا …

آہ ایک طلسم ہے کہ ایک ملاقات فرست دوسرا ایسے حالات صدمہ کو خوشی کیسا سہہ
برداشت کر رہی ہے اور اُف تک زبان سے نہیں نکال سکتی۔

اُس حور کے داخل ہوتے ہی کمرے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے

اسعد اعظم۔ (اپنے مخاطب سے) کیا اس تحریر میں لڑکی کی رائے بھی شامل ہے۔

جواب۔ کیوں نہیں ہم دونوں نے متفقہ تحریر دی ہے علاوہ اس کے میں نے انتخاب کا حق
تو اپنی عزیزہ بچی کو دیا ہے۔ تاکہ اُس کو کسی قسم کی کوئی وجہ شکایت باقی نہ رہے۔ وہ اپنی پسند
مرضی سے تجھ کو منتخب کر گئی ہے اب کہ آپ بھی شرف قبولیت عطا فرماویں

اسعد اعظم۔ لیکن اسکے بعد آپ کو کوئی اعتراض کا موقع نہیں رہیگا

جواب جی کچھ نہیں (ایک کاغذ دیکر) لیجئے یہ میرا اقرار نامہ ہے۔ اس اقرار نامہ کے ذریعہ
میں اپنی لڑکی کو اُس شخص کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیتا ہوں جس کا میں ہو اسکے انتخاب
... حاصل کرے۔ (دوسرا کاغذ دیکر) یہ میرے مرحوم بھائی کا وصیت نامہ ہے۔
... جو آج ملا ہے ایک عرصے آج کی تاریخ سے اسی ہزار روپے کی مالک و
شامل ہے

اسعد اعظم (کاغذات کو نہایت غور سے دیکھکر) کاغذات سراسر مکمل ہیں معاملہ
... ہو گیا ہے تو پھر اب ہم کو اپنا کام شروع کرنا چاہئے۔ گھنٹی کے
... ایک عمل جو بدون کمرہ کے اندر لایا گیا جس کا قفل نہایت احتیاط کے ساتھ سر بمہر تھا
... ایک خوبصورت کنجی اپنی جیب سے نکالکر اسعد اعظم کے پیش کی۔

اسعد اعظم۔ اچھا وہ سمجھنے والے یہاں موجود ہیں

جواب۔ جی ہاں ملاقات کے کمرہ میں۔

اسعد اعظم۔ بہتر ہے سب کام مکمل ہیں اچھا تو میں اس بکس کو کھولتا ہوں۔

ہمارا۔ (بکس کو کھولکر) ایک بہت بڑا پارسل کاغذ میں ریشمی ڈوروں سے لپٹا ہوا۔
(کاغذ کھولکر) ایک چھوٹی کٹھرا (کٹھرہ کو علیحدہ کر کے) آہا! ایک ہاتھی دانت کا سنگھاردان
... ہیرے جڑے ہوئے نہایت قیمتی اور اس کے سمجھنے والے کا نام

اچھا کریں الفانسو۔

نمبر ۲۔ اور یہ دوسرا الفریڈ ڈبہ (کھولکر) او ہو ہیروں کے جڑاؤ کڑے۔ نہایت نفیس نادر الوجود اچھا یہ کس کے نام کا رہے ہیں۔ کیسا ان اور یہ نہایت خوب۔

نمبر ۳۔ اور یہ تیسرا نمبر ایک ساگار صندوقچی اس کے اندر (ڈھکنا ہٹاکر) او ہو! ہیروں کی مالا آنکھیں خیرہ کیے دیتے والی اظہار دو لہمیدن نگاہ زور گار نظر فریب۔ دل فریب تحفہ۔ نہایت بیش قیمت نہایت پسند قابل انتخاب۔ اچھا اسکا یہی کیوں لیے ایک میرا خیال صحیح نکلا۔ امیر الامرا کا رشتہ۔

اسقف اعظم کی ان توصیفی کلمات نے حوریا کے دل پر برق خرمن کا کام کیا اور اس کی رہی سہی موہوم امیدیں مردہ ہوکر رہ گئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا ستارہ زندگی لبریز ہو چکا ہے وہ پیکر غم بنی ہوئی اسقف اعظم کی پُرسرور آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو بار بار ہیروں کی مالا کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا آخر اس حیرت کو اس نے چھپا کے اس فہرست سے کہ (ابھی ایک نمبر اور باقی ہے) کھیٹر کے طلسمی پردہ کی طرح آنا فانا بدل دیا اور اسقف اعظم پھر کام کی طرف متوجہ ہو گیا

اسقف اعظم۔ اس سے اچھا ہونا غیر ممکن ہے۔ (ایک کاغذ کا پیکٹ اٹھاکر) اس محض کاغذ۔ قطعی ہلکا (حوریا کا رنگ زرد ہو گیا چہرہ پر مردنی چھا گئی) (پیکٹ کھولکر) معمولی لفافہ اور یہ اچھا اس کے اندر (لفافہ کھولکر) او ہو! ایک ایک تصویر (چشمہ لگاکر) ایک دن سیدا دل حسرت بھرا دل ایک عاشق کا دل ذرا ٹھہرو (تصویر سے دیکھکر) فن مصوری کا اعلیٰ مرقع آرٹ کا بہترین نمونہ سینہ میں رکھنے کے قابل نادرات عالم۔ بہترین تحفہ وہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں لگا سکتا دوسرے جس کے آگے عجائبات عالم بے حقیقت ہیں سب تحفے اس کے مقابلہ میں کچھ بھی زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

اس کے سمجھنے والا اوہو اکلر میں سمجھا

جانتا ہوں خلافت کی آخری یادگار حسن کی بیک نفسی اور یہ ناکساری کا ہر شخص معترف ہے

غالباً وہی اکبر ہوگا۔

الفاظ تھے یا روح بخش فقرے بلقیس کے ٹھنڈے جسم میں بجلی سی [illegible] کے ساتھ گرم گرم خون دوڑنے لگا اور وہ یاس کی جس نے اس کے پھول سے رخساروں پر کچھ دیر پہلے تسلط جما رکھا تھا آن واحد میں مفقود ہوگئی اس کے رخسار فرط شادمانی سے جگمگا اٹھے بے ساختہ کھڑے ہوکر وہ اس مربع کو آصف اعظم کے ہاتھ سے لیکر ایک گھبراہٹ کے عالم میں اسے بار بار ہاتھ میں لیکر غور سے دیکھنے لگی اس کی اس بیتابانہ حرکت کو اظہار پسند سمجھ کر ہنستے ہوئے آصف اعظم نے شفقت آمیز الفاظ میں کہا

پیاری لڑکی کیا تم بھی اس نادر الوجود تحفہ کو پسند کرتی ہو میرے خیال میں تم کو کسی قیمتی سے قیمتی چیز کی ضرورت نہیں تم کافی دولتمند ہو مجھے افسوس ہے کہ تمہاری رائے لئے بغیر میں نے بیخودی کی حالت میں اپنی پسند کا اظہار کر دیا درحالیکہ اس کا حق تم کو حاصل تھا اور اسکی تم آزادی کے ساتھ ان میں سے اپنی پسند کا بہترین تحفہ منتخب کر سکتی ہو [illegible] جلد [illegible] سخت نادم اور پشیمان ہوں اور معافی کا خواستگار۔

حضورا نہیں معاف فرمائیے بابا جان (آپ کو) کسی معافی کی ضرورت نہیں آپ بہترین تحفہ کا انتخاب فرما چکے ہیں اور میں آپ کی پسند کے موافق اس تحفہ کو خوشی کے ساتھ قبول کرتی ہوں باقیماندہ اسباب اُن کے بھیجنے والوں کو واپس کر دیجئے۔

آصف اعظم۔ خدا مبارک کرے تمہاری رائے بہت صائب ہے ہم چاہتے ہیں زیادہ دیر نہ ہو تمہارے چچا کا حق ہے کہ ان جواہرات کو ان کے مالکوں کے پاس بھجوا دیں اور اکبر کو بلا کر اس کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دیدیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ نیک کام اسی وقت میری موجودگی میں ہو جائے تو مناسب ہوگا۔

آصف اعظم کی اس گفتگو سے حور (بلقیس) شرم سے آنکھیں نیچی کر خاموش ہو گئی فوراً ملازم کو حکم ہوا کہ اکبر کو اندر بھیجو اکبر نے ادب و تعظیم کے ساتھ [illegible] کسی [illegible] کے جواہرات کے بجائے حور کا نازک ہاتھ اکبر کے ہاتھ میں دیکر کہا

اکبر۔ آج سے یہ تمہاری ہے

آخر میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اُسی سال آکاڈمی کی نمائش پر اُس نامانت تحفہ کی بدولت مصور عبدمایہ ارتسٹ نے اپنی صناعی کی قدردانی میں اول نمبر کا انعام حاصل کیا اور باوجود بیس ہزار رقم ملنے کے بھی جوہرشناس حضورانے اپنی محبت کی یادگار (تحفہ) کو اپنے سے علیحدہ کرنا گوارا نہ کیا

اس کا نام ہے بے غرض محبت حسن کے مقابلہ میں ہزار طرح کی دولت اور ثروت کو ٹھکرا دیا جائے اور صرف درد رکھنے والے دل کی قدر کی جائے۔

اسلوب

سہل ہے جان کا نکل جانا
مگر ارمان نکل نہیں سکتے

محمد دین جہلمی

ایک قصیدہ کی تشبیب

صباح عید ہے اور دلوں میں جوش سرور
کہ حسن کو دیکھتے وہ لے رہے ہیں نشہ میں چور

جمال مست نگاہ مست دیدہ و دل مست
حواس و ہوش ہیں مدہوش عقل میں ہے فتور

نگاہ پڑی ہے جس سے یہ لڑکھڑائی ہوئی
شعاع نار نظر میں ہے لغزش مخمور

وفور شوق میں آئی ہے کھنچ کے سینے سے
بجائے موج نفس موج بادۂ انگور

سواد دیدۂ بینا ہے نقش حیرانی
خیال پہ بر ہوا ہے دماغ اہل شعور

نگہ ہے پھر بھی تجلی کی یہ فدا دانی
نفس نفس میں قدرداں ہے اک شعلۂ طور

جبیں جبیں پہ وہی دو بدو یہ مستی
کہ مکو ہوس میں رہے کا اب نہیں مقدور

جو آنکھ ہے سرشار تو سرشار ہوا لا　　معلوم یہ ہوتا ہے کہ آنکھوں میں ہے ساغر
ہر لالہ جام کف ہے تو گل ایاغ بدست　　جھکتا ہے سنبل آئی ہے چشم نرگس مخمور
رہیں نہ نکھری ہوئیں یوں بسنت کی سکھیاں　　کہ جیسے جام کسی مست کا ہو چھلکا چور
جھکیں جو وجد میں ساحل تو جھوم کر اٹھیں　　یہ جا ہوئی کہ بہکنے لگی ہر ایک لب جو
ادھر صبا نے بھریں ہیں لبالب رنگ گل سے　　شعاع مہر ادھر لے اُڑی ڈُر مسرور
نسیم بھر گئی کچھ ایسے کان پھولوں کے　　جھکے جو شیشے گلے ملنے لگ گئیں دو دو
بکسا کے لیے میں راہ سنگار کرتا ہے　　تجاتے دانہ تسبیح دانہ انگور

جعفر علیخاں اثر

خونِ تمنا

مرزا مظفر دہلی کے ایک معمولی تاجر تھے آپ مجسم شرافت تھے خدا ترسی آپ کا طرہ امتیاز تھا۔ اور آپ کی آمدنی کا بیشتر حصہ غریبوں اور محتاجوں میں بٹتا تھا آپکی عمر تقریباً تیس سال تھی اور ابتک آپ نے شادی بھی نہیں کی تھی بلکہ والدین کے تقاضوں پر بھی آپ اس معاملہ کو ٹال دیتے تھے۔

مرزا صاحب موصوف کے پڑوس میں ایک شخص احمد نامی رہتا تھا وہ ایک ریلوے کے دفتر میں بمشاہرہ چالیس روپیہ ماہوار ملازم تھا اور سوائے ایک بیوی اور ایک گیارہ سالہ لڑکی (زاہدہ نام) کے کوئی اس کا عزیز نہ تھا اس قلیل تنخواہ پر بسر اوقات امر محال تھا اُس کو افلاس کی سختیاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ مگر کبھی حرف شکوہ زبان پر نہ لایا تھا

مرزا مظفر سے مسٹر احمد کا تعارف صرف رسمی سلام تک تھا اور اس سے بڑھ کر ہو بھی کیسے۔ وہ غریب اور مفلوک الحال سہی لیکن ایک ہی عمر بسلسلہ ملازمت جا کی تھی

گئے آ گئے۔ بس سوال یہ پڑھا یا تھا۔ اور اسی باعث سے وہ اسے مرنج الحال ہمسایہ کے سامنے لعاب سا کر بیٹھے اختیار کر لیا تھا

دہلی میں ابھی دنوں میں وبائے طاعون کا دور دورہ ہوا۔ اور میاں احمد اور اُسکی بیوی ایک ہی دن میں طعمۂ اجل ہو گئے تھے۔ زاہدہ عجب مشکل میں پڑ گئی کیونکہ اُس کے والدین ہی اُس کی زندگی کا سہارا تھے۔ نالہ و فریاد سے اُس نے آسمان پر سر اٹھا لیا ۔ سارا جہاں اُس کی آنکھوں میں تاریک ہو گیا۔ یہ صدمہ کہ عزیز کو دفن کر سوا بیٹی کوئی نہیں اُن کی لاش کو پاس تک کوئی دیتا تھا۔ محلہ کی چند ایک عورتیں اُس کی فریاد سننے آ گئیں اور ہوتے ہوتے یہ خبر مرزا مظہر کے کانوں تک بھی پہنچ گئی اور آپ نے فوراً احمد مرحوم اور اُس کی بیوی کے دفن کفن کا معقول انتظام کر دیا اور زاہدہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔

زاہدہ کی کس مپرسی کا اندازہ صرف اہل درد ہی لگا سکتے ہیں۔ اُسے آہ و زاری کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ مرزا صاحب اس کی دلداری کے لئے ہر وقت اُس کے پاس ہی بیٹھے رہتے تھے اور یہ کہہ کہہ کر دلاسا دیتے تھے کہ دنیا فانی ہے جو پیدا ہوا ہے وہ ضرور ایک نہ ایک دن فوت ہو کے رہے گا۔ مرنے والوں کے غم کو دل پر لگانے اور مصیبت میں اپنی جان کھونے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ تم ڈرتی ہو کہ تمہارا کوئی عزیز نہیں جس سے تم اپنے درد دل کا اظہار کر سکو مگر اس کا علاج ہی کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنا بڑا بھائی تصور کرو اور مجھی سے اپنا غم غلط کر لیا کرو۔ مرزا صاحب کے سمجھانے سے چند دن کے بعد اُس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی اور مرزا صاحب نے اُس کو مشغول رکھنے کے لئے تعلیم دینا شروع کی جس سے اُس کی ذکاوت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ معلمہ زاہدہ کو دن بھر پڑھنے لکھنے میں لگائے رکھتی تھی اور ایک دوسری ملازمہ اُس کے لئے کھانا پکانے اور دوسری ضروریات بہم پہنچاتی تھی کے علاوہ اس کو بھی اُس کے پاس رہتی تھی اب وہ بہت حد تک اسے غم کو فراموش کر چکی تھی۔ مرزا صاحب اب بھی دو تین دفعہ روز تشریف لاتے اور اُس کی خیر خبر لے جاتے۔ اور ان کی ہمدردی سے اُسے ایک فرحت قلبی حاصل ہوتی تھی۔

زاہدہ کی عمر اٹھارہ سال کی ہوگئی وہ انتہا درجہ کی حسین تھی۔ اس پر زری لباس نے اُس کے حسن کو چار چاند لگا دیتے تھے اُس نے تعلیم میں بھی کافی دسترس حاصل کر لی تھی مرزا صاحب اب بہت کم آتے تھے۔ یعنی ہفتہ میں ایک دو بار۔ اور بعض اوقات دو دو ہفتہ تک نہ آسکتے تھے کیونکہ انھیں کاروبار سے بہت کم فرصت ہوتی تھی۔ اور شاید وہ بھی زاہدہ کی شادی کے آخری فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے سوچ بچار کیا کرتے تھے آپ نے دو تین اچھے رشتے تجویز کر لئے۔ اور ایک دن زاہدہ کے پاس بیٹھ کر یوں فرمانے لگے۔

مرزا صاحب۔ زاہدہ اب تم ماشاء اللہ جوان ہو اور یہ وقت ہے کہ تمہاری شادی کا بندوبست کیا جائے اس لئے میری باتیں غور سے سنو۔ اور مجھے اپنی رائے دو تاکہ میں مناسب انتظام کروں

زاہدہ۔ مرزا صاحب مجھے شادی کی ہوس نہیں ہے۔ کئی سالوں سے میں رنج و غم کے نکاح میں آچکی ہوں۔ میری یہی مرضی ہے۔ کہ زندگی کے باقی دن بھی اسی حالت میں گذار دوں بشرطیکہ آپ کو میرا یہاں رہنا ناگوار نہ ہو میرے عزیز والدین کی وفات کے بعد جو جو احسانات آپ نے مجھ پر کئے۔ اُن سے میں قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرماویں۔

مرزا اظہر۔ زاہدہ شادی کرنا سنت نبوی ہے۔ بغیر اس پر عمل کرنے کے ہماری بہتری نہیں ہو سکتی میں نے جو کچھ تمہارے لئے کیا وہ صرف فی سبیل اللہ تھا۔ اُس کا تم پر احسان نہیں ہے اور اس بات کا ذکر کر کے تم مجھے شرمندہ کرتی ہو ہاں تو میں اب تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہاری شادی کے متعلق کیا سوچ رکھا ہے۔

زاہدہ۔ (آبدیدہ ہو کر) مرزا صاحب خدا کے لئے شادی کے سلسلہ کو یہیں رہنے دیجئے اور مجھے یہ تو بتائیے۔ کہ آپ نے میرے پاس آنا جانا کم کیوں کر دیا ہے سوائے آپ کی ذات کے میرے لئے دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں کسی طرح بھی آپ کے کاروبار میں حارج ہونا پسند نہیں کرتی۔ مگر میری حالت یہ ہے کہ جب آپ تشریف نہیں لاتے تو میں آٹھ

راستہ دیکھا کرتی ہوں اور کتنی دن اسی حالت میں گذر جاتے ہیں اور آپ کا دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ ابھی بہت ہی بچوں کی طرح پرورش کرکے اب مجھے تنہا چھوڑے دیتے ہیں۔ یہ کہکر اُس نے زار زار رونا شروع کردیا۔ اُس کے رونے سے مرزا صاحب کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں اور دل بے قرار ہوگیا مگر ضبط کرتے ہوئے آئندہ ضرور تشریف لانے کا وعدہ کرکے اور اُسکی دلجمعی کرکے واپس چلے آئے۔

زاہدہ مرزا صاحب کے احسانوں سے دبی ہوئی تھی اور اُن سے اُس کو بے اندازہ محبت تھی مگر آہستہ آہستہ اس محبت نے پاؤں پھیلائے اور ایک دوسرا رنگ اختیار کرلیا اب اُسے مرزا صاحب کے دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا جتنی دیر وہ اُس کے پاس ٹھہرتے تھے وہ خوش نظر آتی تھی مگر جونہی وہ اٹھکر چلے جاتے یہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتی تھی ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگی مرزا صاحب نے اُس کے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مگر ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی — مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ اور آخر میں طبیبوں نے مرض لاعلاج دق قرار دے دیا اُس کی بیماری کے عرصہ میں مرزا صاحب قریباً تمام وقت میں اُس کے بستر کے پاس رہتے تھے اور یہ کہکر اُسے تسلی دیتے تھے کہ اب تم اچھی ہوا چاہتی ہو صرف چند دن کی اور تکلیف ہے مگر وہ سر ہلا کر جواب دیتی مرزا صاحب میرا وقت قریب آ رہا ہے۔ میرا علاج بے سود ہے چند دنوں تک آپ کلی فراغت کے ساتھ اپنی حصہ میں حصہ لے سکیں گے۔

مرزا صاحب۔ زاہدہ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو مجھے تو یہ ہے کہ تمہارے مرض کی ابتدا کیسے ہوئی اگر اس کا پتہ چل جائے تو علاج میں مزید کوشش ہو۔ انشاء اللہ صحت کامل ہوجائیگی

زاہدہ مرزا صاحب مرض کے ابتدا کا حال قابل بیان نہیں [illegible]
[illegible] صاحب کے سامنے میں حد سے گذر گیا ہے میں اس [illegible]

آپ کو خواہ مخواہ کی تکلیف کیوں دوں میں حیرانی تحریر ہورہی ہوں - اور اس سے کچھ نہیں سکتا۔

مرزا صاحب - زاہدہ خدا کے لیے جانا ہو سب کچھ بن جائیگا ہم ڈر گئے ایسا سمجھا دو کہ اصل سکا سب کیا ہے۔ تاکہ جاہد مرض کو جڑ سے پکڑ کر اُس کا علاج کیا جائے

زاہدہ کا دم اکھڑ گیا آنکھیں بھر آنے لگیں اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُسکے منہ سے بے ساختہ نکل گیا

"مطلوب میرے محسن۔ میرے دل کے مالک"

دردِ سر اگر پرسند حسن و درد چہر اکسی
چہ خواہی گفت در باب سوم تا میں ہماں گوہم

حیدر علی

غزل

صبر و قرار اب کسی صورت نہیں مجھے
اے دوست رنج ہجر کی طاقت نہیں مجھے

جو رو ستم ست آپ کا منظور یوں ہے
لیکن گوارا رشک رقابت نہیں مجھے

کھلتا نہیں ہے درد دشت کا راز کچھ
رونے سے بھی فراق میں راحت نہیں مجھے

خاموش ہوں کہ واقف آداب عشق ہوں
کیا گیا کسی سے ورنہ شکایت نہیں مجھے

ہر حسن دلپسند ہے ہر جلوہ دل پسند
کچھ امتیاز معنی و صورت نہیں مجھے

کافر ہوں گر نہ ہو مرے وعدے کا اعتبار
لیکن کچھ اعتبار قیامت نہیں مجھے

اکبر وہ جانتے ہیں زبانِ نگاہ سوں
بس کہ عرض حال کی حاجت نہیں مجھے

جلال الدین اکبر

اُن کو بتوں سے ڈھانپنے کا طریقہ بتایا۔ جب ہم نے اس باغ میں گذار رہنے کا عزم مصمم کرلیا تو بہت سے ہمسائے لاٹھیوں وغیرہ سے مسلح ہوکر شکار میں شامل ہوگئے۔ اُن میں بہت سے صاحب بندوق بھی تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ بھیڑیے کا سر تو ہمیں مل جائے تمام عمر شکرگذار رہوں گا۔ ایک صاحب بھیڑیے کی آنتوں پر ہی مرے پڑے تھے۔ تو دوسرے کھال کے لئے عمر بھر مست مدیر رہنے کا وعدہ کر رہے تھے۔ ہمارا ملبر بھی بھولا نہ سماتا تھا بار بار تقاضا کرتا تھا کہ سرکار سے اسے انعام دلایا جائے

اسوقت ہمارا باغ نظارہ مائل سا ہوا تھا جا بجا لالٹینوں کی لو لٹکی جارہی تھیں کہیں قصہ گوئی ہو رہی تھی کہیں تاریخ پر بحث تھی۔ ایک جانب اشعار بھی بالٹکس پر گفتگو میں سرگرم تھے۔ کوئی اسی رام کہانی سنانے میں مصروف تو کوئی نکتہ چینی میں محو تھا کہیں حقہ گڑگڑایا جارہا تھا تو کہیں سگریٹ کے کش لگ رہے تھے ہمارے ایک دوست تو سگار منہ میں دابے دھواں اُگل رہے تھے غرض ہر ایک نے اسے وقت کاٹنے کا بہترین ذریعہ اختیار کر رکھا تھا۔ اس رات کے گیارہ بج چکے تھے سیاہ بادل محیط آسمان تھے۔ اور چاند اُن کے پیچھے چھپا ہوا تھا ہوا میں خنکی تھی سیاہ بادلوں سے [illegible] سے ہم سستی سے ہلکی ہلکی جھپکیاں لینے لگا تو بارش کا اظہار دلفریب تھا [illegible] باغ [illegible] بس جاتا اس میں سے ملتا کا عالم محسوس کیا۔ چارپائی پر دراز ہوگیا اور سوگیا ابھی تھوڑی دیر گذری تھی کہ گولی کی آواز اور لوگوں کے شور و غل سے میری آنکھ کھلی معلوم ہوا کہ بھیڑیا آگیا تھا۔ اور آفتاب سے بہت دن سرگردی کی تھی سامنے کاری لگا [illegible] بھیڑیا قلابازی کھا کر گرا اور ہمیشہ کے لئے سرد ہوگیا۔ اسوقت عالم تصور رہا تھا ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی مجمع بھاگ کر بھیڑیے کے قریب گیا مگر افسوس وہ ملبر کا [illegible] نامہ تھا لگ جانے سے وہ بے ہوش ہوگیا تھا

اچھے نواب

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۵)

اچھے نواب کا دربار دُربار حسبِ معمول گرم اور ہما کا ذکر چھڑ رہا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ خط لیکر آیا۔ یہ میر گلبار کا خط تھا نواب صاحب خط دیکھکر اسقدر خوش ہوئے کہ پوسٹ مین کو پانچ روپئے انعام دینے کا حکم صادر فرمایا وہ انعام لیکر اور سلام کرکے رخصت ہوا نواب صاحب نے بہ نفس نفیس لفافہ چاک کیا۔ خط عطر عروس میں بسا ہوا تھا مرزا نعیم بیگ کو پڑھنے کو دیا گیا۔ مرزا جی دو زانو ہو کر بیٹھ گئے پہلے سورۃ اخلاص کا ورد کیا پھر پڑھنا شروع کیا۔ خط میں لکھا تھا۔

خداوند نعمت آفتابِ نامدار دام اقبالہ کورنش۔

یہ غلام حضور کے قدموں سے جدا ہو کر بسواری ریل بمبئی پہنچا اس بندرگاہ کا حال کیا عرض کروں جنت ہے فردوس ہے۔ حسن کا بازار ہے اگر اس خانہ زاد کی جگہ کوئی اور ہوتا تو جانے کیا کیا گیا تھا ایک روز کا ذکر ہے کہ بندہ بھنڈی بازار میں کھڑا تھا۔ کہ ایک اُچکا مل گیا مردُود کہنے لگا کہ میں سیٹھ ہوں پھر اُس نے چاہا کہ سیٹھ بنکر عبا دے مگر اس جانب بھلا ٹھگوں میں کب آنے والے تھے فوراً بنر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ غصہ سے منہ لال بھبھوکا ہو گیا ادھر آنکھیں نیلی پیلی ہوئیں اُدھر وہ دم دبا کر بھاگا اور ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ اُسے بھاگتا دیکھکر مجھے بے اختیار ہنسی آئی اور ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے اگر حضور اُس وقت ہوتے تو یہ نظارہ دیکھکر بہت خوش ہوتے خیر حضور بمبئی سے خانہ زاد مدراس اور پھر مدراس سے کلکتہ آیا۔ اور اب ڈھائی ہزار کا ٹکٹ لیکر اگن بوٹ میں سوار ہے دوسرا ملک مصر ہے ایک سال میں خدمت عالی میں ہوگا حضور کے اقبال سے بہت اچھے دن گذر رہے ہیں، اگر غم ہے تو یہ ہے کہ حضور کے قدموں سے دور

بھول بھلیاں

نوٹس

میرے موکل خان افتخار احمد خان صاحب نے مجھے ہدایت کی ہے۔ کہ میں آپ کو اس امر کی اطلاع دوں کہ رات جناب نے یا جناب کے کسی آدمی نے خانصاحب موصوف کے کتے کو اسکے باغ کے قریب بندوق سے ہلاک کر دیا ہے۔ مہربانی فرما کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مبلغ پانصد روپیہ ہرجانہ ادا کیجئے ورنہ بعد انقضائے میعاد ہذا آپ کے برخلاف قانونی چارہ جوئی کی جائیگی اور ہر قسم کے خرچہ کے جناب ذمہ دار ہوں گے

میں ہوں آپ کا صادق اسحاق احمد بیرسٹر۔

یہ نوٹس تھا جو کل صبح کی ڈاک سے مجھے ملا۔ نوٹس میرے لئے کسی حیرانی و پریشانی کا باعث نہ تھا۔ چونکہ خانصاحب موصوف سے میرے تعلقات کشیدہ تھے۔ اس لئے میں مندرجہ بالا نوٹس کی آمد کا منتظر تھا میں نے اپنے وکیل کو مشورہ کے لئے طلب کیا واقعہ سچا تھا اور اُنکا کتا دیوانہ ہونے سے نشانۂ بندوق ہو گیا تھا۔ اور اب روپیہ کی ادائیگی کے بعد کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ آج پانصد روپیہ کا چیک بمعہ معذرت خان موصوف کے نام ارسال کر دیا ہے۔

ملیر بہت اچھا مالی ہے۔ لیکن اکھڑ مزاج بہت ہے۔ فوج میں ملازم تھا لیکن مالیخولیا کا شکار ہونے کے باعث برخواست ہو گیا تھا۔ اُسی وقت سے میرا ملازم ہے باغ کی آراستگی میں کمال حاصل ہے۔ ساتر باغ کو دیکھکر انگشت بدنداں رہجاتی ہیں دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ وہی حال ملیر کا حال ہے ایک دفعہ

جنگل میں ایک بھیڑیے سے اُسے کچھ ایسا حواس باختہ اور سراسیمہ کیا کہ آج بھی بھیڑیے کے نام سے چونک پڑتا ہے۔ دور سے کتے کو دیکھکر بھیڑیے کا گمان کرتا ہے۔ چند روز سے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ رات کو ایک بھیڑیا باغ کی سیر کو آتا ہے۔ اور بیلوں کے طواف کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بعض یہیں کبھی لوٹے کی گاڑی سے نمبر لو کبھی اتفاقات سب کے بعد غرض بھیڑیا کیا ایک بھلا سا اثر ہے۔ جب جی میں آتا سیر کے لئے آن دھمکتا تھا اور ہمارے مالی کا خواہ مخواہ دم خشک کرتا تھا۔ ہمارا مالی اُس کی اس حرکت سے بہت جانتا اور موجس لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ غرض ہر ایک کا زہرہ آب تھا۔

———

لمبر کی باتیں کچھ عجیب و غریب ہوتی ہیں لیکن دوسروں کو اُس کے دلائل کے سامنے سر تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ ہمیں بھی ہم نے بھیڑیے کی آمد کے قصے کو بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا۔ اور کبھی اُس کے عجیب و غریب بیانات پر توجہ نہیں دی لیکن ایک صبح جالی گملوں کو ہٹے ہوئے اور زمین پر اوندھے گھڑے پڑے دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا۔ کہ اُن کے نیچے بھیڑیے کے نقش پا ہیں۔ نشان بہت رہتے مگر دھندلے۔ یا جیسا اسی طرح نہ ہو سکی مدت تک بڑائی ہوگئی سادہ سادہ تمام قصبہ میں خبر پھیل گئی اور بعض اصحاب نے یہیں تک کہنا شروع کیا کہ صاحب بھیڑیے کو بندوق سے اڑا دو شہر قریب ہے کہیں بھیڑیا شہر میں نہ گھس آئے۔ ہماری عمر بھر کے لئے لمبر نے ہڈی مال وغیرہ جیسی بھیڑیا اٹھا بھی اٹھائے گیا پھر ہمیں ایک نالی میں اُس کے پاؤں کے نشان دکھائے۔ اور ایک جگہ کیچڑ میں کھدی ہوئی پائی۔ جہاں اُس کے بیٹھنے کے نشان موجود تھے۔ اس قصبہ میں اور بھی ہیجان پھیل گیا اور بے علمی کی آگ عام اور روڑگئی اور بھیڑیے کے شکار پر لوگوں کا اصرار بڑھ گیا۔ بعض سرآئی باتیں ہلاکت کی طرح سے بے شمار کہیں بیٹھیں ہوئیں جن سے اُن کے نزدیک بھیڑیا بہت آسانی سے مر سکتا تھا کسی نے صلاح کولی سے اڑانے کی صلاح دی کسی نے مکر یا بانٹنے کا مشورہ دیا تو کسی نے گڑھا کھود کر

مرزا کدھر! کہاں حضور۔

نواب۔ اتّاں مار! بڈھے ہو گیا نظر نہیں آتا ہے۔ اس دوکان میں کون بیٹھا ہے؟ ادہر دیکھو کیا یہ دوکان آگ میں لوٹا ہے

مرزا۔ یہ تو میر گلبار نہیں ہیں۔

شیخ چھٹن۔ نہیں حضور یہ میر صاحب نہیں ہیں۔

نواب۔ کیا بک رہے ہو جاؤ صاحب یہ کون بیٹھا ہے۔

کالے خاں۔ حضور میں اسے نہیں جانتا ایسا کہہ سکتا ہوں کہ میر گلبار سے شکل ملتی ہے۔

نواب۔ کیا یہ میر گلبار نہیں ہیں

شیخ چھٹن۔ اگر حضور کہیں تو حضور کے حکم سے ماننے کو تیار ہوں، ورنہ دراصل یہ کوئی اور شخص ہے میر صاحب کا ہم شکل ہے بھلا وہ یہاں کہاں۔

نواب۔ تم سب کیا عبث کر رہے ہو کوچوان گاڑی ٹھہراؤ۔

فٹن ٹھہر گئی اور نواب صاحب نے کالے خاں سے کہا کہ تم جاؤ اور اس شخص کو جسے تم میر گلبار کا ہم شکل کہتے ہو بلا لاؤ

کالے خاں حکم حاکم مرگ مفاجات جانتا ہے اور اسے بلا لاتا ہے مگر یہ مانتا ہے کہ یہ میر گلبار نہیں ہے ہاں ان کا ہم شکل ضرور ہے۔

حسب الارشاد (خان احمد حسین خاں)

غارہائے ایلورا (یا ایلوراکیوز)

مسلسل کیلئے ملاحظہ ہو رسالہ سب رس ماہ فروری و مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

خدا جانے سال گذشتہ کا آخری نصف کیسا تھا کہ تو وہ خشد ناظرین ــ کی خدمت مطبع نہ کر سکا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ درد قولنج کے متواتر حملوں سے اـ

بجاے ناکر اس اپنے مضمون کو لکھنے بیٹھا ہوں۔

عالمگیر کی قبر کے احاطہ سے نکل کر اور روضہ کی بڑانی بستی سے گذرتے ہوئے تھوڑے فاصلہ پر بائیں جانب ایک بلندی پر ایک چھوٹا سا دروازہ ہے جس کے سامنے ایک کھلی جگہ بھی ہے۔ اسی جگہ سالانہ عرس کے موقع پر بہت بڑا میلا لگتا ہے۔ جس میں عموماً خاص علاقہ نظام کے لوگ بہت ہوتے ہیں اب اس دروازہ سے گذر کر اندر احاطہ میں پہنچتے ہیں۔ پہلے ایک چھوٹا سا مقبرہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ حضرت برہان الدین کا ہے اور اسی سمت تھوڑے فاصلہ پر حضرت زین الدین زر بخش کا مزار ہے۔ یہ بھی سادہ ہے۔ دروازہ کے آگے چھوٹا سا برآمدہ ہے کہتے ہیں کہ آپ کے وصال کے بعد اسی برآمدہ میں ہر رات ایک چاندی کا چھوٹا سا درخت اُگا کرتا تھا جو مجاوروں کا حصہ ہوتا تھا جسے اُسے بیچکر اپنے صرف میں لایا کرتے تھے اور کوئی ذریعہ یا گاؤں درگاہ اور اُس کے مجاوروں کے لئے بہ صورت گذارہ کچھ نہ تھا۔ مگر جب سے درگاہ کے خرچ اور خادموں کے گذارہ کے لئے جاگیر مقرر ہوگئی وہ چاندی کا درخت نکلنا بند ہوگیا مگر اب بھی برآمدے کے فرش میں پھولوں کی سی کلیاں مگر چاندی کی آدھی دبی ہوئی اور آدھی نمایاں نظر آتی ہیں یہ اُسی وقت کی نشانی رہ گئی اسی احاطہ میں بائیں جانب آصف جاہ نظام الملک اول (۱۷۳۲ء سے ۱۷۴۸ء) جنکو محمد شاہ بادشاہ دہلی سے نظام الملک کا خطاب ملا تھا سنگ مرمر کے چبوترہ پر دفن ہیں انکا انتقال برہانپور میں ہوا تھا اور لاش حسب وصیت یہاں لاکر دفن کی گئی یہ محمد شاہ کے ایک دن در رہتے اور موجودہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے مورث اعلیٰ اگرچہ قبر پر گنبد وغیرہ کچھ نہیں مگر پھر بھی ایک شان برستی ہے پاس ہی آپ کی بیوی کی قبر ہے۔ قبروں کے گرد شرق ۔ رکی جالی لگی ہے۔ بڑے بڑے درخت قبروں پر سایہ کئے ہوئے ہیں جنکی شاخوں پر پرندے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کا نغمہ گا رہے تھے۔ قریب ہی ناصر جنگ پسر نظام اول کی قبر ہے اور بھی چند ایک قبور ہیں۔ جن کی بابت معلوم نہ ہوسکا بہرحال اس درگاہ کے احاطہ میں سب قبریں عمدہ حالت میں ہیں اور اچھی رونق ہے عُرس اور میلے کے

ہوں اور درد فراق بدتر از عذاب دوزخ ہے بقول شیخ سعدی کے

مرغ جاں کو قفس تن سے رہائی ہوئی
مگر اُس جان جہاں سے نہ جدائی ہوئی

ہاں یاد آگیا جہاز کا کپتان بہت بدخو جنگ جو انسان ہے نہایت ہی روکھا پھیکا اور بدمزاج۔ مجھ سے بھی نرمی سے پیش آیا لیکن جونہیں میں نے حضور کا نام لیا تو اُس کی کایہ پلٹ گئی سر جھکا کر بیٹھ گیا مؤدب ہو کر بولا او ہو تو آپ اچھے نواب دام اقبالہ کے مصاحب ہیں اچھے نواب کا نام تو لندن اور روس تک مشہور ہے۔ آج سے تم ہمارے مہمان ہوئے بس حضور آپ کی بدولت جہاز میں بھی دن عید رات شبرات ہے۔ اگر ہو سکے تو مرزا فہیم بیگ کی معرفت کپتان جہاز کو شکریہ کہلا دیا جائے۔ تاکہ اس ذرہ حقیر کی عزت افزائی ہو جائے۔ اراکین دربار کی خدمت میں سلام شوق۔

طالب دیدار میر گلبار

شیخ چھٹن۔ حضور مبارک ہو اب صبح ہی صبح ہے۔

کالے خاں۔ میر صاحب تو اپنے وقت کے جالینوس ہیں۔

مرزا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ہما لیکر آئیں گے۔ لائیں گے اور بیچ کھیت لائیں گے خدا کی قسم لیکر آئیں گے۔

شیخ چھٹن۔ حضور مناسب ہے کہ جہاز کے کپتان کو ایک تار دیدیا جائے۔ کیا اچھے کہ اس میں سرکار کا نام اور خانہ زادوں کی عزت ہے۔

نواب۔ ضرور۔ داروغہ جی سے تار تحریر یہ لیکر تار دیدو۔

شیخ چھٹن۔ حضور بھی بادشاہ ہیں یہ تحریری تار ہے چار روپے حرف کے حساب کم از کم پچاس روپے درکار ہونگے حضور کا نام روشن ہو جاویگا۔

کالے خاں۔ اس معاملہ میں صرفہ نہ ہونا چاہئے۔

نواب۔ ہرگز نہیں بلا تامل تار دو ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

مراد بندہ و حاتم را شنیدہ
شنیدہ کے بود مانند دیدہ

نواب۔ مرزا جی تم لپک کر بار گھر جاؤ بجلی کی طرح جاؤ اور آندھی کی طرح آؤ اس اثنا میں ہم سوار ہوتے ہیں آج ہوا خوری کا ارادہ ہے۔ گھسیٹا کوچوان کو کوٹھی سوار کر کے لئے آتے۔

مرزا جی نے بار گھر کہاں جانا تھا اپنے ساتھیوں کو کچھ اشاروں میں سمجھا کر تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے کہیں سرک گئے اور نواب صاحب نے جوڑا بدلا۔ اچھے نواب کا لباس ملاحظہ ہو سر پر لیسدار معلق سر اونچی ٹوپی۔ ریشمی ڈوریئے کا کرتا۔ اس پر کمخواب کا انگرکھا گلبدن کا چوڑی دار گھٹنا پاؤں میں کارچوبی جوتا۔ اگر آج کل کے فیشن کا کوئی جامہ زادہ نواب صاحب کے جامہ زیب بدن پر ہاتھ آنکھوں میں کاجل کی تحریر دانتوں پر مسی ہونٹوں پر لاکھا ماتھے پر ٹیکا۔ دیکھتا تو بلا مبالغہ سمجھ لیتا کہ کوئی ... ساجن مردانہ لباس میں کھڑی ہوئی مٹک رہی ہے۔

اچھے نواب نے بناؤ سنگار میں پورا ایک گھنٹہ صرف کیا اور دستار باندھ کر محل سرا سے باہر ہوئے تو ڈیوڑھی پر بیش بہا فٹن جس میں سبک سیر صبا رفتار سمند ... رنگ گھوڑوں کی جوڑی جتی ہوئی کھڑی تھی اور جان صاحب ... صاحب مرزا صاحب اپنے دلی نعمت کا انتظار کر رہے تھے ساتھی کی لیتے ہیں اچھے نواب حلوہ افروز ہوئے او اُن کے مالمال حواص میں مونس مصاحب ڈٹ گئے آن کی آن میں جوڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی گھوڑوں کی کنوتیاں قابل دید تھیں اس وقت جھنکار سے دیکھنے تو چوکڑی بھول جاتے نواب صاحب قہقہے لگا رہے مصاحب گپیں ہانک ... [illegible] ہاں میں ہاں ملا رہے تھے کہ ... آباد آگیا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

موقع پر واقعی بہت شاندار نظارہ اور رونق ہوتی ہوگی یہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تواریخ دکن کے مشہور سردار ملک عنبر اور اس کی بیوی کے مقبرے ہیں یہ بلند اور شاندار پٹھانی طرز کی عمارات ہیں اور عمدہ حالت میں ہیں یہاں سے قریب ہی حضرت شاہ قتال کا مقبرہ ہے بہت مختصر عمارت اور چھوٹا سا گنبد اس مقبرے کے پہلو میں قبر کی کرسی سے نیچے ایک مختصر مگر بالکل سادہ قبر دیکھنے میں آئی جس کے سرہانے ایک سِل پر خط طغریٰ میں کسی کا نام کندہ ہے اگر یہ سل سرہانے نہ ہوتی تو شاید ہم اس قبر کا خیال بھی نہ کرتے ناظرین یہ اُس بادشاہ کی قبر ہے جس کی فوج نے اورنگ زیب عالمگیر کو ۱۲ سال تک مسلسل لڑائی اور محاصرہ رکھنے کے باوجود قلعہ گولکنڈہ سر نہ ہونے دیا اور اگر ایک نمک حرام باورچی خانہ کی کھڑکی رات کو نہ کھولدیتا تو قلعہ نامعلوم کب تک اور رکتا ہوتا یہ اس بادشاہ کی قبر ہے جس کی نازک مزاجی آج تک ضرب المثل ہے ... میں آتا ہے اور یہ بادشاہ اللہ آپ بھی کیا بادشاہ ہوگئے۔ یہ ابوالحسن تانا شاہ ۱۰۸۷ء تا ۱۰۹۷ء والیٔ قطب شاہی (جنکا دارالخلافہ گولکنڈہ تھا) کے آخری بادشاہ کی آرام گاہ ہے جو قلعہ دولت آباد میں قید اورنگ زیب عالمگیر فوت ہوئے ... یہاں حضرت شاہ قتال کے مقبرے کے پاس دفن کئے گئے مرنے کے بعد جاتے دفن ... تانا شاہ اور ممدوح کے درمیان ایک میل سے کچھ زیادہ فاصلہ ہوگا بارہ برس ... گولکنڈہ میں کس قدر خلق خدا کا خون ہوا ہوگا مگر آج فاتح اور ممدوح دونوں پہلو بہ پہلو میں سوتے ہیں ... اورنگ زیب کی اولاد کے قبضہ میں اورنگ آباد اور ... تانا شاہ کی اولاد کے تصرف میں گولکنڈہ اور حیدرآباد۔ سورۃ فاتحہ کے بعد یہ شعر پڑھتا ہوا شہر سے باہر نکلے ہے

الا در کار حق مے کس نظر ہا　　کہ در راہ تو می ملیم خطر ہا
گر ما خواب جستم ما میں　　نگوس ہوش تو گو ہم سے ہم
مگر در خلق گورستان فگندہ　　ز یک سر نیا جملہ سر ہا
انسانان مہر و شاد جاک　　کہ انسان در جہان ماندہ از ما

گذرگاہ ہے اس دنیائے فانی [illegible] مرد غافل درگذر ہا

جو دریہیں اس سے مرگ است سر الصا

یہاں سے جہاں کس [illegible] ہا

اب یہاں سے سڑک [illegible] گھاٹی جو [illegible] کو جاتی ہے۔ اور تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد۔ ایک لمبی سی پہاڑوں کا سلسلہ ملتا ہے جو بالکل سبزہ سے ڈھکی ہوئی ہیں [illegible] کی چوٹی [illegible] درخت [illegible] دکھائی دیتے ہیں [illegible] کہ ہماری گاڑی پہاڑی کے اس [illegible] معلوم ہوا کہ وہ [illegible] اور وہی پہاڑوں کے اندر ہیں جو دسویں یا گیارھویں صدی عیسوی میں کھودی گئی [illegible] سامان [illegible] میں سے سب سے اول علاؤالدین خلجی (۱۲۹۵ سے ۱۳۱۶) نے انکو دیکھا [illegible] ان کی فوج دکن کو تاخت و تاراج کرنے میں مصروف تھی۔ اور دولت آباد [illegible] آباد سے [illegible] سے مقابلہ تھا اس سے پہلے کسی نے انکو نہ دیکھا تھا [illegible] وقت میں دولت آباد سے یہاں تک [illegible] فاصلہ تقریباً دس میل سے کم نہیں [illegible] راستہ تھا مگر [illegible] معلوم [illegible] ہم ان پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے [illegible] ان کے [illegible] چلے [illegible] شکل کا [illegible] پہاڑ [illegible] سلسلہ [illegible] ہوا آبشار کا گرنا اور [illegible] ایسا سماں تھا جو ہمیشہ یاد رہے گا

(باقی) [illegible]   سید [illegible] علی [illegible]

آخری پیغام

عزیزو! دوستو! رخصت ہوا اب [illegible]

وہ وقت آگیا [illegible] ہم [illegible] ہوں

بتاتی کیا کبھی یہ منزلیں تو اب مسافر کہتے ہو
کہ رستے مسافر کو یہاں انجان راہوں سے
ہمارے کام کا سیدھا ہے ستاروں کی تجلی سے
شعور کی بستی روشن ہے ان کارگاہوں سے
جو بیٹھے دوستوں میں جیسا تم سمجھے کر لے
تو دو آنسو ملا لینا ہماری سرد آہوں سے
سفر کا کوئی ساتھی ہے نہ زادِ راہ ہے ممکن
نہ کوئی رہبر ایسا ہے ہم واقف ہیں راہوں سے
نہ کوئی ہے منزل کا نہ سنگِ راہ ظاہر ہے
سفر پر ان ملا یک تو چل پڑا ان بے کناہوں سے
وُہی ہم ہیں کہ اب کوئی سلام ایسا نہیں لیتا
وہی ہم تھے کہ جھکتے ہی نہیں تھے بادشاہوں سے
اگر ہم سے کوئی پوچھے تو اہلِ بزم کہہ دیں سب
فقیری میں بھی ساغر کم نہیں تھا بادشاہوں سے

آغا ساغر

دنیا کا قدیم ترین اور مقدس درخت

ابھی اس دن خبر آئی ہے کہ گذشتہ ۳ جولائی کو صبح سات بجے کے لگ بھگ کسی کمینے شخص نے بدھ گیا کی درگاہ کے احاطے میں رکھا کی رات چلائی اور دو بودھ کے ساتھ ... اور بودھ لوگوں کے قابلِ عظیم اور تاریخی "بودھی" درخت کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ آس پاس کا ... درخت کی ... شاخ کو جھاڑ کر کاٹ ڈالا تھا۔ اگر چہ ...

اسے اور کاٹ دیا ہوتا تو ایک بڑی تواریخی شجر کا نام و نشان مٹ جاتا لیکن خوش قسمتی سے ہندوستان کی یہ بہت اہم نشانی ضائع ہونے سے بچ گئی۔ کٹے ہوئے پیڑ کی بحالی کے لئے کئی ماہرین نباتات مقرر کئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ درخت جلدی ہی پہلی حالت میں آ جائیگا۔

اس شجر کی کہانی بہت پرانی اور عظیم الشان ہے۔ آثار قدیم کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس سے زیادہ پرانا اور تواریخی درخت دنیا کے کسی حصہ پر کوئی نہیں۔ یہ درخت نہیں بلکہ ایک درخت کی شاخ ہے۔ حضرت عیسیٰ مسیح سے ۲۷۶ برس پہلے شہنشاہ اشوک کی لڑکی سنگھ مترا جو کہ بھکشنی (بودھ سادھو عورت) بن گئی تھی اس درخت کی شاخ کو لاکر لگایا تھا اور آج تک وہ انورادھاپور میں کھڑا ہوا گذشتہ زمانہ کی یاد دلا رہا ہے جس پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھکر مہاتما بدھ نے بودھی گیان حاصل کیا تھا اور بعد میں بطور شکریہ جس کی پوجا ہونے لگی تھی۔ یہ بودھی گیا کی اُسی درخت کی ایک ٹہنی کو مہاراج اشوک کی لڑکی نے لنکا میں لاکر لگایا تھا جس سے یہ پیدا ہوا لہذا یہ اُسی درخت کی شاخ ہے جس پر مہاراج اشوک نے اپنے عقیدت کے نیچے پاکیزہ پانی چھڑکا تھا اور جسکو اشوک کی مہارانی اسندھی میترا اور تشیا رکشتا وغیرہ راجاؤں کی نظر قہر کا نشانہ بننا پڑا۔ تواریخ بتاتی ہے کہ اس درخت کی ساری نگہداشت مذکورہ بالا مہارانی کے ہاتھوں ہی ہوئی۔ لیکن لنکا والی شاخ پہلے کاٹ لی گئی تھی۔ یہ مقدس تواریخی شجر دو ہزار برس سے زیادہ پرانا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے قدیم درخت دنیا بھر میں کہیں نہیں۔

عیسوی سن سے ۲۷۶ برس پہلے مہاراج اشوک نے بدھ مت قبول کیا اور دیگر ممالک میں بدھ مت کے پرچار کو سادھو بھیجے۔ اگرچہ ہندوستان اور لنکا کے تعلقات اُسوقت بہت گہرے تھے تو بھی وہاں ابھی تک بدھ مت نہ پھیلا تھا جب مہاراج اشوک لنکا لے جانے انہوں نے اپنے دوست لنکا کے فرمانروا مہاراجہ دیوانام پیا تس کو ایک چٹھی لکھی جس میں انہوں نے اپنے بودھ ہونے کا ذکر کیا۔ اور اُن سے بھی بودھ ہونے کی درخواست کی تھی اس سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ بدھ مت اور اُس کی موٹی موٹی باتیں لنکا میں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں

یہ بھی ظاہر ہے کہ اسوک کو لنکا کے آریوں سے خاص انس ہوا اور اسی وجہ سے انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے مہامہندر کو بھکشو بنا کر وہاں بھیجا ہو۔ سنگھمترا مہاراج کی لڑکی بھی ہمراہ بھیجی گئی تھی۔ ان حالات میں سمجھتے ہیں کہ مہامہندر اپنے ہمراہ پانچ ساتھ بھکشوں سمیت [illegible] کی [illegible] لنکا کو سدھارے۔ اسی دن انہوں نے لنکا کے مہاراج کو بودھ بنایا اور [illegible] مہاراج کے [illegible] میں تمام لنکا بدھ کی پیرو ہو گئی۔ لنکا کے راجہ کی [illegible]

[illegible] اور مہاراج بدھ دھرم میں تبدیل کرتے۔ لنکا میں [illegible]

[illegible] بدھ دھرم کے اصولوں کے مطابق کوئی بھی مرد اس کام [illegible]

[illegible] مہاراج اسوک کو اطلاع دی کہ [illegible]

[illegible] اولاد لوی (لنکا کے مہاراج کی بھاوج) کو بدھ دھرم [illegible]

[illegible] کے استقلال کا [illegible]۔

[illegible] اسوک بہت خوش ہو گئے۔ وہ خود بدھ گیا (بودھوں کا [illegible]) گئے اور اس متبرک بودھی درخت کی داہنی شاخ کو کٹوا کر بڑی عزت و تکریم سے [illegible] آئے۔ ملک اسوک ایک مشہور بندرگاہ تھی اور آج بھی ایک چھوٹے سے [illegible] خلیج بنگال کے کنارے پر واقع ہے۔

سات دن کے سفر کے بعد ایک ماہ کی ساتویں کو مہاراج اسوک نے [illegible] [illegible] ہمراہ [illegible] بھکشوؤں سمیت جہاز پر چڑھایا پھر اس [illegible] کے لئے وہ چھاتی بھر پانی میں گئے۔ اور اپنے ہی ہاتھوں [illegible] آنکھوں سے او جھل نہ ہوا بھارت ورش کا [illegible] پانی میں [illegible] دیکھتا رہا۔

مہاراج اسوک کو اس متبرک درخت کا بہت فکر تھا انہوں نے [illegible] لنکا [illegible] انہوں نے اور ان کی نسل نے مدت تک اس کی حفاظت [illegible] لمبے کانوں والے) نام سے مشہور ہیں۔

اور لنکا کے مہاراج بھی اس کے استعمال میں مصروف [illegible]

راجدھانی انورادھاپور سے لنکا کے بندرگاہ جمبوکول تک راستہ خوب آراستہ پیراستہ کروایا اور خود بھکشوؤں کو ہمراہ لیکر بندرگاہ میں جا شاخ کا انتظار کرنے لگے۔ جس دن کو جہاز بندرگاہ میں لگا۔ مہاراج بھی خوشی کے مارے گلے گلے پانی میں چلے گئے اور اپنے ہاتھوں سے شاخ کو اتارکر اپنے سر پر لئے آئے ساحل پر منڈپ (پوجا کی جگہ) تیار کرکے اُس کی پوجا کی گئی اس اثنا میں مہاراج خود دربان بنکر تمام عرصہ شاخ کے سامنے کھڑے رہے۔ دسویں کے دن شاخ کو رتھ پر چڑھا کر جگہ جگہ ٹھہراتے اور تعظیم و تکریم کرتے ہوتے چودھویں کے دن انورادھاپور لے آئے۔ شام کو وہ شہر کے شمالی دروازہ سے داخل ہوکر گھومتے گھماتے جنوبی پھاٹک سے باہر نکلے۔ اور مہامیگھ نامی شاہی باغ میں جس جگہ آج یہ درخت موجود ہے قریب آئے وہاں انھوں نے اپنے ہاتھوں اس شاخ کو زمین میں گاڑا۔ درخت کی حفاظت کے لئے جو لوگ ہندوستان سے آتے تھے اُنکی بڑی خاطر تواضع کی گئی اُنھیں گاؤں دئے گئے اور اُنکو درخت کا محافظ مقرر کیا گیا۔

آج اس درخت کی عمر ۲۲۵ سال سے بھی زیادہ ہے لیکن اسمیں بڑھاپے کی جھلک تک نہیں ہندوستان اور لنکا کے عام پیپل سے اسمیں یہ خصوصیت ہے کہ اس کے پتے کچھ چھوٹے اور پتلے ہیں درخت میانے قد کا اور شاخ کی شکل کا ہے۔ اسمیں کوئی خاص کمی بیشی بھی معلوم نہیں ہوئی پہلے سال اس میں آٹھ پھل لگے تھے لیکن بعد میں کوئی پھل لگا سُنا نہیں گیا تب سے اب تک بودھ لوگ بڑی عقیدت سے اسکی خبرداری کرتے آتے ہیں اور یہی سبب اسکی درازی عمر کا ہے۔ لنکا کے بادشاہوں نے اسکی بڑی تعظیم و مناسب انتظام کیا دیر اور لوگوں کے ہاتھوں سے اسے کئی بار بچایا گیا۔

آج کل لنکا میں سب سے قدیم جیتی جاگتی چیز یہی ’بودھی‘ درخت ہے۔ اس کے دیکھنے کو ہر پورنماشی کو ہزارہا بودھ آتے ہیں۔ اور جیٹھ کی پورنماکو تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ملتی اس درخت کے لئے نہ صرف لنکا بلکہ تمام دنیا کے بودھوں کے دلوں میں گہری عقیدت پیاری بھگتی اور زبردست جذبۂ احترام موجود ہے۔

بھارت ورش کے مختلف ادبا شعرا کو جو کئی حصوں میں عنایت کی ہیں، میں سے ایک یہ "بودھی" درحقیقت آج بھی ہماری طرح دلی اور ... کی ... حاجت بالسانی ہے۔

راقم سرو ... زمانہ ...

غزل

شرماں قامت رعنا کو جسے یاد کریں
اور پھر جلدے میں وہ سرو کو آزاد کریں

بس بھی ہم نہ بنے اور نہ مسلماں ہی جاؤ ...
بخت غربت پھرا وہ سوں سے برباد کریں

رحم دل پر میرے اگر نہ آئے تو نہ آئے
ایسی بیداد جفا ہر کوئی فریاد کریں

ہم دکھاؤ تو غزالاں حرم کو آنکھیں
قید زلف نہ پھر آنکھوں کے وہ صیاد کریں

کیچ مہمانی ہے مل رستے غریباں ہم کو
... مالی کو مجھے فکر نہ ... کریں

کھینچ لیتے ہیں تصور سے ہم اس کی تصویر
آپ تکلیف نہ اسے مانی و بہزاد کریں

سر جھکاتے ہیں جلاد ... گئی سے
آپ سے ... ظلم حضرت جلاد کریں

[illegible]

صبر کس کو ہو آرام بھڑک سے لینے دے
پھر نہیں اور لو احسان نہ جلا دکریں
دل ستمات میں ہم آئینہ رو رہتے ہو
اسے اس بسس محل کو تو نہ برباد کریں
آغا سید قاصی ستمات

رسالدار کی سرگذشت

جب سال ہوئے مجھے اپنے کاروبار کے متعلق ریاست جموں میں جانے کا اتفاق ہوا تو ... ان دنوں ... اور ابھی جموں میں بجلی نہ آئی تھی کہ ... میرا جانا ہوا ... کے مسائل ... دیکھا جا سکتا ہے کے بعد میں ... ایک ... یکا
... ہی کچھ وقت گذار دیں لیکن میرے ... مہربان نے کہہ دیا ...
... نے ... کچھ نہ کہا اور وہ بھی ... ہم کو ... بولے
... آپ نے لیے لگا میرا ... مہربان میری ... دیکھ کر بولا
... اور ... یہاں اس قدر اندھیرا ہے جہاں رات کے وقت بھی بجلی کی روشنی کی ...
... کا ... جار ... یہاں اگر آپ اکیلے گھر سے باہر قدم رکھیں تو
... آپ کے کپڑے پھاڑ ڈالیں آؤ رسالدار ... کی ...
... گئے ہوں اور حسب معمول اپنی سرگذشت سنا رہے ہوں ...
... توقع ہے کہ آپ ان کے کارنامے سن کر بہت محظوظ ہوں گے ...
... وقت بھی کٹ جاوے گا یہ کہہ کر ہم دونوں گھر سے نکلے اور
... کا ... کیا ... میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ رسالدار
... کون ... بولا کہ رسالدار ... قوم کے راجپوت ہیں

اور ملنسار ہیں ان کی عمر اگرچہ ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی لیکن چہرے بشرے سے اب بھی وہی
جرأت و شجاعت ٹپکتی ہے۔ بڑے امور ہیں بسیار مہمے سے چکے ہیں کئی بار لڑائیوں میں شریک
ہوئے اور میدان مارے لیکن اس بہادری کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہمارے گاؤں میں اچھا
درجے کے رحمدل اور فیاض مشہور ہیں غریبوں اور بیکس بیواؤں کی مدد کرنا وہ اپنا فرض
اولین سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے حال ہی میں یہاں کے لوئر اسٹیٹ مدرسے کو جو بہت مدت سے
خستہ حال تھا اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کر کے نئے سرے سے بنوا دیا ہے لطف یہ ہے
کہ رسالدار صاحب نہایت خوش مزاج اور زندہ دل واقع ہوئے ہیں اور اگر آپ رات
کے وقت کھانا کھا چکنے کے بعد اُن کے پاس جائیں تو جوانوں اور لڑکوں کا ایک ہجوم لگا ہوگا
جو کہ اُن کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے ہیں اور رسالدار صاحب بھی اُن کو مایوس
نہیں کرتے بلکہ ہر روز اپنی طویل ملازمت کے زمانہ میں سے بات یا قصہ سناتے
ہیں +

غرض اسی طرح میں راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے ہم منزلِ مقصود پر جا پہنچے
جا کر دیکھتے کیا ہیں کہ وہاں تو ایک میلہ لگا ہوا ہے اور نمبردار کی بیٹھک کھچا کھچ بھری
ہوئی ہے میرے دوست نے مناسب نہ سمجھا کہ ایسے وقت میں اپنا تعارف کرا دے
اور ان سب کی گپ شپ میں مخل ہو اس لئے ہم چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گئے رسالدار
صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے کوئی بات سنا رہے تھے اور حاضرین مارے ہنسی کے
لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ کہ اتنے میں رسالدار صاحب کا لڑکا کھٹ کھٹ کرتا آ گیا کسی
نے پوچھا آج آپ کے مقدمہ کی تاریخ تھی۔ کیا فیصلہ ہوا وہ بولا جی کہاں کا فیصلہ ابھی تک
تو شہادت بھی مکمل نہیں ہوئی پہلے آدمی نے استعجاب سے کہا کیا ابھی گواہ بھی نہیں ہوئے۔
آپ کو تو دو سال سے کچہری جاتے دیکھتا ہوں نمبردار بولا آپ دو سال پر تعجب کرتے
ہیں مجھے تو یہ بھی امید نہیں کہ اگلے چھ سال سے پہلے یہ قضیہ نپٹے اس پر رسالدار صاحب
بول اٹھے ہاں بھئی یہ بالکل سچ ہے کہ ہمارے ملک میں عدالتوں کی رفتار ایسی سست ہے
کہ اگر چیونٹی بھی اُس کے ساتھ دوڑ لگائے تو آگے نکل جائے ابھی کل ہی پٹواری رام ل

ایک اور واقعہ سے پڑھکر بیمار ہا ہے کہ حال ہی میں ولایت کی عدالت سے ایک [illegible] کا فیصلہ سنایا گیا ہے جو کہ اسی سال ہوئے واقعہ کیا گیا تھا اس میں [illegible] والوں ہر طرح سے مکمل ہے اور [illegible] کہ [illegible] دیکھوا ہو [illegible] لیکن [illegible] کہ اس والوں کے [illegible] کا لحاظ نہیں کرتا اور [illegible] دونوں کو [illegible] لوگوں کو [illegible] ہوگا کہ [illegible] رفتار [illegible] لیکن [illegible] آئی ہوگی ؟

[illegible]

[illegible]

کیا تھا کہ [illegible] موجود رہو [illegible] ہوتا ہے کہ وہ لوگ [illegible] کیا ہے ہمیں
کی [illegible] کی تباہ [illegible] ہوئی ہیں۔ ایک [illegible] سوسائٹی کی حسرت [illegible]
[illegible] کہ رعایا کی [illegible] رسوم کا
احترام تو [illegible] میں آپ کو
[illegible] اور میں [illegible] سمجھ کر میں [illegible]
زیادہ [illegible] ہوگیا۔ آخر کار [illegible] شروع کیا
اتفاق دیکھیے کہ پہلے [illegible] میں [illegible] آدمی [illegible] سے
گھبرانے لگے۔ لیکن وہ کامیابی [illegible] ہوئی اور میں نے [illegible] شروع کیا
[illegible] لگے [illegible] رسالے میں مشہور ہوگئی کہ [illegible]
[illegible] ہوگیا ہے [illegible] حوالہ [illegible]
[illegible] سلام کیا [illegible]
[illegible] کیا ہے [illegible] داڑھی میں [illegible] احسان کیا کہ [illegible] سے میری [illegible]
کردی ہے۔ [illegible] جلدی جلدی [illegible] لگا [illegible]
[illegible] کیا۔ صاحب [illegible] کی روش [illegible] کیا اور [illegible] لگا
صاحب [illegible] سوال سے [illegible] مجھے تو واقع
[illegible] ہوگیا کہ [illegible] لیکن [illegible]
اور [illegible] طرح [illegible] میری [illegible] ہوا [illegible] کر دیتے
سادہ سوال کا [illegible] میری [illegible]
[illegible]

گورنمنٹ نے مجھے لکھا ہے کہ میں کسی دلیر آفیسر کو نامزد کردوں تنخواہ بہت معقول ہے اور کام بھی بالکل تھوڑا۔ اگر تم کہو تو تمہارا نام اس آسامی کے لئے بھیج دوں میں نے یہ سنکر ایسا سر ہلادیا اور کہا حضور۔ آپ کے حکم کی تعمیل سے تو انکار ہو نہیں سکتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں سپاہی زادہ ہوں۔ میں کیا عدالت کروں گا اور علاوہ اس کے مجھے مدراسی زبان بھی تو نہیں آتی صاحب بولے تشویش کی بات نہیں تم انگریزی زبان جانتے ہو اور تمہیں ایک مترجم ملیگا تم خاموش کرسی پر بیٹھے رہنا مترجم تم کو کارروائی مقدمہ سمجھاتا جائیگا جب تم سن چکو تو اگر ملزم بے گناہ ہو تو چھوڑ دینا اور اگر جرم ثابت ہو تو تین چار مہینہ کی قید سنا دیا کرنا لیکن بہتر یہی رہیگا کہ ہر ایک کو سزا دی جائے کیونکہ اس طرف کے لوگ بہت بدمعاش ہیں اور اگر تم سختی کروگے تو تمہاری سربسر یاد کریں گے میں نے جواب دیا اگر یہی بات ہے تو میں آج سے تیار ہوں یہ تو بہت آسان کام معلوم ہوتا ہے۔

صاحب۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ میں تم پر ایک بات واضح کردینا چاہتا ہوں گورنمنٹ اس علاقہ کے لوگوں سے بہت تنگ ہے یہ بہت مقدمہ باز واقع ہوتے ہیں مقدمات کی روزانہ اوسط معمولی طور پر بیس پچیس ہے اور ہر ایک مقدمہ میں کم از کم دس گواہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر سابقہ مجسٹریٹ نے تبدیلی کی درخواست اسی وجہ سے کی ہو۔ یا سچ مچ عاجز ہوکر چلا گیا ہو اس لئے گورنمنٹ بہت خوش ہوگی اگر تم کسی طریقہ سے مقدمات کی تعداد کم کردو اگر تم کامیاب ہوگئے تو میں تمہیں علاوہ تنخواہ کے معقول انعام بھی دلواؤنگا۔

میں۔ اس سے بہتر اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ میں ہر ایک ملزم کو خوب سزا دیتا جاؤں لوگ خود بخود جرم کرنا چھوڑ دیں گے۔

صاحب۔ صرف یہی خوب نہیں کیونکہ اس طرح تو پولیس جھوٹے چالان پیش کرنا شروع کردیگی اور جتنا بھی کسی ملزم سے سختی زیادہ ہوگی وہ اُسی قدر خلاف جھوٹا مقدمہ دائر کردیگا۔

میں۔ تو میں سب کو رہا کرتا جاؤں گا

صاحب۔ یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ اس سے تمام پیشہ لوگوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے میں نے پریشانی میں اپنی ڈاڑھی کو کھجلایا اور کہا سرکار حضور مجھے معاف کیا جائے یہ بہت مشکل کام معلوم ہوتا ہے صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کچھ فکر نہیں دو چار روز میں ٹھیک سمجھ آجائے گی۔ ہم آج مدراس تار دے دیتا ہے کہ تم کو مقرر کیا جاوے۔

اگلے دن جب کچہری گیا تو وہاں عجب تماشہ نظر آیا احاطۂ عدالت میں کوئی بیس چالیس آدمی بیٹھے تھے۔ کئی بیٹھے دھوپ میں سینک رہے تھے۔ اور کیا مستغیث اور کیا ملزم آہستہ آہستہ دس دس آدمیوں کا جھرمٹ لیے ہوئے قانون چھانٹ رہے تھے حکم ہوا کہ پہلا مقدمہ بلایا جاوے چپڑاسی نے کڑک کر آواز لگائی چلو کوئی دھنگا رام حاضر ہے اس پر یک دم بارہ آدمی کمرۂ عدالت کے اندر گھس آئے۔ میں نے مترجم سے انگریزی زبان میں پوچھا یہ سب لوگ کون ہیں۔ مترجم بیچارہ بھی انگریزی کی صرف ٹانگ ہی توڑ سکتا تھا ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اُس نے مجھے بتلایا کہ اس میں دو فریق ہیں۔ اور پانچ پانچ ہر ایک فریق کے گواہ ہیں کارروائی مقدمہ شروع ہوئی۔ مستغیث نے بیان کیا کہ ملزم میری دوکان پر آیا اور جوڑا دھوتی کا مانگا قیمت پر تکرار ہوگئی۔ اس پر ملزم نے دھوتی کا جوڑہ بازار کی نالی میں پھینک دیا اور مستغیث کو مارنے لگ گیا اور اگر دو چار آدمی جو اُس وقت پاس سے گذر رہے تھے۔ بیچ بچاؤ نہ کرتے تو جان جاہی چکی تھی۔ اس بیان کی تائید حرف بحرف پانچ گواہوں نے کی ملزم سے استفسار ہوا اُس نے کہا کہ وہ مستغیث کی دوکان سے کپڑا خرید رہا تھا قیمت پر تکرار ہوگئی مستغیث نے ملزم کے گلے میں پٹڑا ڈال کر گرا لیا اور بہت مارا۔ اور اگر دو چار راہ گیر نہ چھڑاتے تو وہ حلال ہو ہی چکا تھا اس بیان کی تائید ملزم کے پانچ معتبر گواہوں نے حلف صادق اٹھا کر کی۔ جب مترجم نے سارے بیانات مجھے سنائے تو میں۔ دل میں کہا کہ جی تم بھی آج ہی چالو آتے ہو بلوا کر کا دھی ہو یا اور بات ہے اگر یہی ہوا ہے تو ٹھیک انصاف کریا اور بات۔ اس وقت میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ طرفین میں سے کس نے سچ اور کس نے جھوٹ بولا ہے لیکن فیصلہ سنانے میں

زیادہ نتیجوں بھی عدالت کی شان کے شایاں نہ تھی۔ سب کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جی میں آیا کہ اسی مجسٹریٹی پر لعنت بھیجوں اور قلم کو توڑ دوں اسے چھوڑ ابھی بارکوں میں واپس چلا جاؤں لیکن پھر خیال آیا کہ صاحب کیا کہیگا بارے مشکل کام ابھی طبیعت پر ضبط کیا سوچا کہ زیادہ تاکید کسی کو ڈرا سکے وہم کا یا اور پیشاب آمیز آواز میں حکم دیا کہ ملزم کو چار ماہ کے لئے جیل خانہ میں بھیجا جائے اور دوسرا مقدمہ پیش ہو۔ ہر ایک مقدمہ میں یہی دیکھا کہ پانچ پانچ گواہ ایک فریق کے حق میں گواہی دیتے جاتے ہیں اور پانچ پانچ دوسرے کے لئے۔

ڈیرے پر واپس آکر بھی اس بات کو سوچتا رہا کہ ان مقدمات سے کس طرح چھٹکارا پاؤں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ولایتی شاعروں اور مصوروں نے انصاف کو ایک اندھے آدمی کی تشبیہ دی ہے اور وہ اندھا آدمی ایک ترازو کو ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ اس تصویر بنانے والے کا اصلی مدعا تو شاید یہی ہو کہ انصاف کسی کی رعایت نہیں کرتا لیکن میرے خیال میں تو اس کا یہ مفہوم زیادہ موزوں ہے کہ انصاف اصلی معنوں میں اندھا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کیوں نہ جبکہ ایک گروہ آدمیوں کا قسم کھالے کہ علی احمد کو حسن کی چھاتی پر سوار دیکھا اور اس پر دوسرا گروہ قسم کھالے کہ انھوں نے حسن کو علی احمد کو مارتے دیکھا اور جو ترازو انصاف کے ہاتھ میں نظر آتا ہے وہ تو ملزم کی رشوت یا کسی مقصد کی اجرت کو لینے کے لئے ہے۔ ہاں میں آپ کو بتا رہا تھا کہ کس طرح ایک ہی دن کی مجسٹریٹی نے میری ساری ہستی ہلا دی۔ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ ان کم بخت مقدمہ بازوں سے کوئی سپاہیانہ داؤ ہی کیا جائے۔ تو چھٹکارا ہوگا جھٹ اپنے اردلی کو بلایا اور حکم دیا کہ کل عدالت میں دو سپاہی مضبوط ڈنڈوں سے مسلح حاضر رہیں اگلے دن پھر وہی کھیل شروع ہوا مقدمہ بلایا گیا اور دھڑا دھڑ چودہ آدمی کمرے میں گھس آئے میں نے ملزم سے دریافت کیا کہ یہ سب کون لوگ ہیں۔ بولا دو فریقین مقدمہ میں اور باقی گواہان میں نے اپنے اردلی کو جسے میں نے پہلے سے ٹھیک کر لیا تھا۔ اشارہ کیا وہ سب کو باہر لے گیا۔ اور لگے تڑا تڑ ڈنڈے پڑنے۔ جب ان کی اس طرح تواضع ہو چکی تو میں نے حکم دیا کہ اب کارروائی مقدمہ شروع کی جائے ملزم نے جس کا رنگ مارے ڈر کے جلدی کی

اسا ر پردہ رہا تھا۔ کاشتکار نے عرض کی حضور مستغیث کا بیان ہے کہ ملزم رات کو
اُس کی دوکان پر آیا اور قفل توڑ کر روپے پیسے والی صندوقچی اٹھا کر لے گیا چھ گواہوں
نے حلف اٹھا کر اس بیان کی تائید کی اور کہا کہ انھوں نے ملزم کو معہ صندوقچی گرفتار
کیا ملزم نے بیان کیا وہ واردات کے وقت کسی دوسرے گاؤں میں ایک شادی میں گیا ہوا
تھا دو گواہوں نے حلف اٹھائی کہ یہ شخص تمام رات ان کے سامنے رہا گواہوں
کے بیان شروع ہوئے۔ بھلا وہ بیچارے کیا گواہی دے سکتے تھے اُن کے تو سر پہ درد
کر رہے تھے جن میں نے حسب معمول ملزم کو تین ماہ قید سخت کی سزا دی اور دوسرا
مقدمہ بلایا کچھ دیر انتظار کے بعد دو آدمی کمرۂ عدالت میں آئے۔ میں نے پوچھا کہ گواہ
کہاں ہیں مسٹر جم نے کہا حضور گواہ بھاگ گئے ہیں میں نے حکم دیا کارروائی شروع
کرنے سے پہلے فریقین کو بید بید بید لگاتے جاویں مستغیث چلایا یہ کہاں کا
انصاف ہے میں نے کہا۔ اس کو بھی بید لگاؤ۔ جرمانہ وغیرہ لینے کے بعد میں نے
ملزم کو تین ماہ قید کی سزا دی جب تیسرے مقدمہ کی باری آئی تو بہت دیر تک فریقین میں
سے کوئی بھی نہ آیا۔ آخر کار تنگ آکر مسٹر جم خود اٹھ کر باہر گیا لیکن احاطہ عدالت میں تو اُلّو
بول رہا تھا کیا اہل مقدمہ اور کیا گواہ سب اپنے گھروں کو بھاگ گئے تھے اس دن کے
بعد میں نے اور بھی مہینہ عدالت کی لیکن آپ کو یہ سنکر حیرانی ہوگی کہ مشکل تمام پانچ
یا چھ مقدمے فیصل ہوں گے نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں سے مقدمہ بازی کی قبیح عادت
چھوٹ گئی اور میری شہرت بطور ایک بے لوث عادل کے قائم ہوگئی کیونکہ میں فریقین کو
برابر بید لگوایا کرتا تھا گورنمنٹ بھی مجھ پر بہت خوش ہوئی۔ اور مجھے بہت سا انعام ملا
یہ کہانی سنکر تمام حاضرین نے قہقہے لگائے اور رسالدار صاحب نے خوشی سے جھومتے
ہوئے کہا یہ واقعہ کچھ اتنا دلچسپ نہیں میری زندگی میں اس سے بہت زیادہ
دلچسپ واقعات ہو چکے ہیں اسی طرح اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں میرے دوست نے
جو میرے پاس بیٹھے تھے میرے کان میں کہا کہ چلو اب چلیں یہ لوگ نہ جانے کب تک
گپ شپ میں لگے رہتے معلوم ہوتے ہیں ہم دونوں اٹھے۔ اور گرتے پڑتے گھر

ہو بچ گئے۔

ارجن داس ایم اے

استقلال

رام چند کا باپ کوئی صاحبِ ثروت و دولت نہ تھا۔ بلکہ وہ ادنیٰ درجہ کا مزدور تھا۔ اُس کی حالت اسقدر خستہ آگیں تھی۔ کہ جب وہ دوسرے مزدور پیشہ لوگوں کی "بزمِ تکلّم" میں بیٹھ کر کسی معاملہ میں اپنی "لکنت آمیز" زبان کو حرکت بھی دینا چاہتا تو ایک دل شکن لقب ۔ ایک مستقل حقارت سے نہایت بے دردی کے ساتھ اُس کے ناتواں دل کو مجروح کر دیا جاتا "چپ رہ"! —— آخر کار جب اُس کی دل آزاریاں انتہا حدود کو پہنچ گئیں تو اُس نے سب سے قطع تعلق کر لیا —— دن بھر کی محنت و مشقت کی جانکاہ تکالیف برداشت کرنے کے بعد جب وہ گھر واپس آتا تو اپنی تنگ و تاریک کوٹھری میں ایک ٹوٹی ہوئی پلنگ پر دراز ہو جاتا اور اپنی مفلوک زندگی پر گھنٹوں غور کر تا رہتا۔

جب رام داس کی عمر ساٹھ سال کی ہو گئی تو ایک روز اُس نے رام چندر کو بلا کر کہا۔

بیٹا اب میں ضعیف ہو گیا ہوں ہاتھ پاؤں بیکار ہو گئے لیکن مجھے اس کا افسوس نہیں میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے تمھاری تعلیم کے لئے ہر چند ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس غریبی کی وجہ سے کوئی مفید صورت نہیں پیدا ہوئی اور نہ آئندہ پیدا ہونے کی امید ہے۔ اس لئے میں مجبوراً کارخانہ میں لوہا وغیرہ اٹھانے پر داخل کرائے دیتا ہوں —— کل سے تم ہری چند کے ساتھ چلے جایا کرو۔

رام چندر نے ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح "اچھا" کہا اور چلا گیا ۔ ۔ ۔

دوسرے روز صبح ہی اُس نے کپڑے بدل لیے۔ اور پھر چندر کے ہمراہ کارخانہ گیا لیکن اول اول تو اُسے بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا مگر رفتہ رفتہ محنت و مشقت کا عادی ہو گیا۔ چنانچہ وہ چھ سال تک برابر باوجود سخت سرزنش اور لعن و ملامت سہنے کے اپنے کام کو انجام دیتا رہا۔ جب اُس کی عمر سولہ سال کی ہو گئی تو وہ میجر کی خوشامد کر کے پرزے وغیرہ بنانے کے کام پر مقرر ہو گیا ——— ایک روز اس کو اتفاق کہئے یا سوء قسمت کہ اس کے ہاتھ سے ایک پرزہ بگڑ گیا انجینئر کو جب خبر ہوئی تو وہ فرط غضب سے آگ بگولا ہو گیا ——— تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ ——— کمین! ——— نالائق! ——— تم جیسے ذلیل لوگ کسی طرح یہ کام سیکھنے کے لائق نہیں ہیں

رام چندر نے نہایت خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ سنا اور ایک مشتعل ۔ ایک پُر حسرت نظر انجینئر کے غضبناک چہرے پر ڈالتا ہوا کارخانہ سے چلا گیا ۔ ۔

(۲)

رام چندر! رام چندر! آج تم یہاں کیسے پہنچے ہو؟

رام چندر نے گھبرا کر جو آنکھ کھولی تو اُس کا بچپن کا ساتھی دینی دیال جو میٹرک کلاس میں تعلیم پا رہا تھا کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا ——— اس قدر غافل! ——— اُس نے اسی تبسم کے ساتھ کہا۔ تم کیسے آ گئے۔

دینی دیال (اس نے سادگی مسکراہٹ سے) میں تو اسکول سے آ رہا ہوں ۔ ۔ لیکن تم یہاں کیسے ہو؟ کیا کارخانہ نہیں گئے؟ ———

کارخانہ کا نام سنکر اُس کا دل فرط انفعال سے شکستہ ہو گیا "تم جیسے ذلیل لوگ" ۔ یہ الفاظ یکایک پھر اُس کے کانوں میں گونجنے لگے اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان سا ہو گیا ——— "تم جیسے ——— نہیں! ——— مجھ جیسے ذلیل لوگ کارخانہ میں کام سیکھنے کے لائق نہیں" ——— اُس نے دینی دیال سے کہا

اور پھر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

رام چندر! ارے یہ تم کیوں رونے لگے؟ —— کیا ہوا؟

"کچھ نہیں"

"کچھ تو؟"

دینی دیال! ..... بات یہ ہے کہ رام نے جتنی مصیبتیں اور ذلتیں سہی ہیں وہ صرف ہم غریبوں ہی کے لئے ہیں —— ہر شخص ہمیں نہایت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے —— معمولی سے قصور میں بھی ہمیں جعلساز ..... دغاباز ..... مکار قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن کسی امیر کے کان سخت سے سخت قصور میں بھی ان الفاظ سے آشنا نہیں ہوتے

بد قسمتی سے آج ایک پرزہ میرے ہاتھ سے خراب ہو گیا چنانچہ جب انجنیر صاحب کو خبر ہوئی تو انھوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ ہزاروں گالیاں مجھے دے ڈالیں —— کمینہ ..... نالائق —— اور کارخانہ سے نکال دیا۔

سارے دوست! یہ تمہارا کہنا سب بجا اور درست ہے لیکن رام کسی کی محنت ضائع تو نہیں کرتا۔ وہ اچھے کام کا ضرور اجر دیتا ہے یہ دوسری بات ہے۔ کہ اُس نے غریب و امیر کے مراتب جدا گانہ رکھدئے ہیں۔ لیکن یہ امیر جتنے ہیں کون ہیں؟ —— یہ بھی تو ہماری تمہاری طرح غریب و حقیر تھے۔ لیکن انھوں نے کوشش کی اور "جاہ و حشمت" کے آسمان پر آفتاب بنکر چمکنے لگیں۔ تم بھی نہایت استقلال کے ساتھ کوشش کرو اور ان ہی کی طرح ہو جاؤ —— اٹھو! اور انجنیر کی خوشامد کر کے پھر کارخانہ میں کام سیکھو —— اور اس مرتبہ نہایت استقلال اور محنت کے ساتھ +

(۳)

رام چندر نے دینی دیال کی باتوں کو نہایت غور سے سنا اور لڑکھڑاتے

ہوئے قدموں سے کارخانہ گیا ــــــ انجینئر ملازموں کو احکام دے رہا تھا اُس نے نہایت عجز اور انکسار کے ساتھ کہا ــــــ انجینئر صاحب میں آپ سے اپنے قصور کی معافی مانگنے آیا ہوں آپ میرا قصور معاف کر دیجئے۔

تم نالائق آدمی پھر آ گئے؟ ــــــ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔

حضور میں غریب آدمی ہوں ــــــ آئندہ مجھ سے قصور نہیں ہوگا

اچھا جاؤ لیکن آئندہ تم نے کام بگاڑا تو میں ہرگز تمہیں نہیں رکھونگا

رام چندر یہ سکر یہ ادا کرتا ہوا آنکھوں سے انجینئر کی جانب دیکھا اور اچھا حضور کہتا ہوا اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔

جب دو سال اُس کو کام سیکھتے ہوئے ہوگئے تو وہ "انجینئری" کے امتحان میں سب سے اول نمبر کامیاب ہوا چنانچہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار پر اُس کا تقرر احمد آباد کے کسی کارخانہ میں ہوگیا ــــــ جانے سے پہلے وہ انجینئر کے پاس ملنے گیا ــــــ انجینئر نے نہایت تپاک سے اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا ــــــ مسٹر رام چندر میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں!

عصمت آرا عصمت ٹونکی

نمکدان ظرافت

گیس داس پرسوتم کی ملاقات کو آیا تو دیکھا کہ وہ مکان کے تختہ فرش کے سگاف میں روشنی ڈال رہا تھا

گیس۔ یہ کیا کر رہے ہو پاگل تو نہیں ہوگئے۔

پرسوتم۔ اس سگاف میں ایک اٹھنی چلی گئی تھی وہ نکل نہیں سکتی صرف ایک اٹھنی کے لئے کون فرش کھدوائے اٹھنی کے لئے ایک روپیہ اور خرچ جاتا ہے اس لئے

سگار میں اور روپئے ڈال رہا ہوں ۔

(۲)

اماموں اماں کوڑں کو سطبرگڈہ میں بہت تکلیف اٹھانی پڑی ۔
فیضو ۔ بھلا ؟ میں تو سمجھا تھا کہ آپ ملتان میں پیدا ہوتے تھے ۔

(۳)

بی رحیمن نے کسی کسمپری کا معصوم لڑکا پیدا ہوتے ہی گود لے لیا ہمسائی مبارکباد دینے آئی اور بولی بہن رحیمن تم کسمپری زبان سیکھو ۔ رحیمن نے حیران ہو کر پوچھا کیوں ؟ تو ہمسائی نے جواب دیا کہ جب یہ لڑکا بولنے لگے گا تو تم اُس کی زبان کیسے سمجھ سکو گی

(۴)

لڑکی ۔ اماں کیا مچھلیاں بھی دریائی مدرسوں میں پڑھنے جاتی ہیں ۔
ماں ہاں بیٹی وہ بھی پڑھنے جاتی ہیں ۔
لڑکی اور جب اسمانی مچھلی کانٹے یا جال میں پھنس جاتی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے

(۵)

ماسٹر ۔ دیکھو لڑکو جب بولنے لگو تو بولنے سے پہلے اس بات کو سوچو ضروری بات ہو تو دل میں پچاس گنکر بولو اور اگر بہت ضروری بات ہو تو سو گنکر بولو
لڑکے ۔ بہت اچھا ماسٹر جی "
دوسرے دن جب ماسٹر جی انگیٹھی کی طرف پشت کر کے اُس کے قریب کھڑے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ تمام جماعت کے ہونٹ جلد جلد ہل رہے ہیں آخر جب وہ سو گن چکے تو بولے ۔ ماسٹر جی آپ کا کوٹ پیچھے سے جل رہا ہے ۔

(۶)

کلو ۔ سنا ہے تمھاری کوٹھڑی کو آگ لگ گئی تھی اور تم بال بال بچگئے ۔
ولی ۔ یہ جھوٹ ہے میرا تمام جسم بچ گیا

رسیدہ سلطانہ اسسٹنٹ اڈیٹر

نیرنگ دنیا

(سلسلہ کیلئے اگست نمبر ملاحظہ ہو)

(٦)

شہر گیا کی گنجان آبادی میں ایک مختصر مکان واقع ہے جہاں بچوں کے شور و غل ماماؤں کے چیخ پکار ڈومنیوں کی ڈھماچوکڑی سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ہے بہت سی مہمان بیبیوں کی آمد کی ہوائی لہر سی کام دے رہی ہے۔ مہمان بھی ایک دوسرے سے اسطرح گفتگو کر رہی ہیں کہ گویا لڑ رہی ہیں ڈومنیاں آنے والے مہمانوں کی تواضع سٹھنیوں سے کر رہی ہیں اور وہ بھی ہنس ہنس کر اُن کی زبان درازی کی داد دیتی ہیں غرضکہ گھر کا ذرہ ذرہ بے نظمی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ایک خادمہ بار بار خالہ جانی کو پکار رہی ہے اے بوی سلام لے شور و غل موقوف کرو ناحق گانا بند کرو بیگم صاحبہ آتی ہوں گی مہمان کہہ گئے ہیں ایسا ہنگامہ وہ دیکھیں گی تو فوراً واپس چلی جائیں گی"

بوی (تیوری چڑھا کر) اے آتی ہیں تو آنے دو شادی کے گھر میں ایسی تو بس نہ ہو گی جائیں گی تو چلی جائیں کچھ خدائی کی خدار تو ہے نہیں۔

خادمہ (جھلا کر) اب تم جانو مگر مہمان جب بگڑ بیٹھیں گے تو معلوم ہو گا۔

ایک مہمان۔ اے تو جانے دو نصیبوں کا جھگڑا ہی ہے کیا تمکو معلوم نہیں کہ اگر بیگم صاحبہ بگڑ کے گئیں تو تمہارے میاں کی نوکری پر بات آئیگی۔

ابھی یہ بحث مباحثہ ہو رہا تھا کہ موٹر کے ہارن کی آواز آئی گھر والی کمال بدحواسی سے دروازہ پر دوڑیں۔ تو دیکھا بیگم صاحبہ اتر چکی تھیں یہ جھک کر آداب بجا لائیں بیگم نے جواب میں سلام علیک کہا اور اسی خادمہ کی طرف مخاطب ہوئیں "نرگس" تم تو پہلے بھی آئی تھیں تعارف کراؤ میں نہیں پہچانی؟

نرگس۔ حضور یہ مسی جی کی بہو ہیں انہی کے لڑکے حسنو کی شادی ایک ہفتہ کے بعد ہونے والی

ہے آج لڑکی کو مانوں بٹھایا جائیگا

منشی کی بیوی لڑکی بھی گھبرا گئی ہے میری بہن کی بیٹی کا بیاہ ہے اچھا میں اسے آپ کیلئے لئے لاتی ہوں

نرگس (بہت آہستہ) بیگم صاحبہ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ میں نے دیکھا یہ بہت مفلس ہے شادی پر کسی طرح راضی نہیں یہ لوگ خدا جانے کیسے ظالم ہیں

بیگم (افسردگی سے) نرگس میں کیا یہاں آتی کبھی نہیں اور یہ ڈپٹی صاحب اپنے ذلیل لوگوں میں مجھے محسوب کرتے وہ تو صرف غریب لڑکی کی کسمپرسی یہاں کھینچ لائی ہے۔ آہ کیا معلوم مظلوم پر کیا افتاد پڑی کیسے ان لوگوں کے پاس آئی جہاں تک معلوم ہوا لڑکی کسی عالی خاندان کی ہے۔ انشاء اللہ میں اُسے ان ظالموں کے پنجے سے ضرور رہا کروں گی۔

کہا جاسکتا بیگم نے یونہی سا کچھ کہا تھا وہ بدنصیب دولہن کے لئے جسم براہ تھی۔ جو اُس وقت بالکل بے ہوش تھی اور گھر والے پریشان تھے جب سے اُس بدنصیب نے اپنی آیندہ قسمت کا فیصلہ سنا تھا اُسے دن میں کئی کئی بار غش کے دورے پڑتے تھے بیگم خود معہ نرگس دوسرے کمرے میں گئیں جہاں ایک نوعمر خوبصورت لڑکی میلی سی چٹائی پر بیہوش پڑی تھی

بیگم۔ نرگس تم دیکھتی ہو اس کے چہرے سے وجاہت عیاں ہے خدا جانے کس چمن کی پھول کس باغ کی کلی ہے۔ تم منشی کی بیوی کو کہو وہ اسے میرے حوالے کرے۔ جب صبح ہو جائیگی۔ میں اُسے پہنچا دوں گی۔ اگر وہ شادی پر راضی ہوئی ورنہ ناممکن ہے۔

نرگس نے منشی کی بیوی کو ملکہ کا حکم سنایا جسے سنکر وہ بھونچکا گئی گھر کی ساری عورتیں بگڑ اٹھیں کہ واہ۔ خوب یہ لوگ ایسی ذلت کیسے گوارا کریں کہ جو لڑکی اُنکی بہو بننے والی ہے اُسے آپ کو علاج کے لئے دیدیں نرگس نے ہزار سمجھایا مگر الٹا نتیجہ ہوا عورتیں لڑائی پر آمادہ نظر آنے لگیں نرگس کو اس بیگم کی توہین سے بہت رنج ہوا اور وہ بیگم کے حکم کی منتظر تھی کہ وہ کہیں کہ اُن کی طرف سے یہ جواب دے مگر بیگم نے کہا ع

جوابِ جاہلاں باشد خموشی

اور موٹر پر سوار ہو گئیں۔

(۷)

افتخار وہ افتخار جو انسان کا زندہ مرقع تھا مسرت و شادمانی کی لہر جس کے دل میں ہر وقت موجزن تھی آہ اب وہ بدنصیب یاس و حرماں کا شکار ہے وہ ہے اور رنج و غم ماں کی موت اُس کے لئے تمام رنج و مصیبت تھی وہ کبھی رنج و غصہ کے دریا میں غوطے کھاتا رہتا تھا کبھی اپنی بھائی کے خیال سے رو پڑتا تھا کبھی نمکیں آرا کا خیال اُسے زیست سے بیزار کر دیتا تھا غرضکہ عجب مجسمہ میں اُس کی جان تھی۔ ایک شخص دوشیزہ کا اس طرح سے گم ہو جانا اُس کے چاہنے والوں کے لیے صرف الم انگیز نہیں ہے۔ روح فرسا نہیں ہے بلکہ عزیزوں کے لئے بالعموم اور منسوب کے لئے بالخصوص نہایت ذلت و رسوائی کا موجب ثابت ہوتا ہے اس لئے افتخار کی غم والم سے عجب حالت تھی آخر اُس نے تمام جائداد اپنے معتمد خاص کے حوالہ کر دی اور نمکیں آرا کی تلاش میں ایک طرف روانہ ہو گیا اُس کا تکیہ کلام یہ شعر تھا ؎

مشکل نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

(باقی آئندہ) مسز ام الحلیمہ مریم جمیل

غزل

از مس زاہدہ خاتون زاہدہ لکھنوی دختر حاجی محمد ارتضا خاں صاحب ارتضا لکھنوی

ظالم کو قسم کھاتے ہیں کہ جیسے انکار بھی ہے اقرار بھی ہے
اے زاہدہ ضبط آہ و فغاں آساں بھی ہے دشوار بھی

اے میری بیمار آنا آساں بھی ہے دشوار بھی ہے
اس سوچ کا ہے وعدہ سے انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

اُس کافر الفت کا مذہب سمجھے تو کوئی کیونکر سمجھے
اے واعظو جس کی گردن میں تسبیح بھی ہے زنار بھی ہے

نازاں ہوش لے قاتل کیا اسکے مٹانے سے حاصل — دیکھا تیرے وفا میں مگر دل مجبور بھی ہے ناچار بھی ہے
تو نکلی جوانی آ بھی اب کیسے بچیں گے دل و جگر — اُس پر بھی نظر کے قبضہ میں جس پر بھی ہے تلوار بھی ہے
نالیں نہ آئینگے وہ کبھی ہاں درد جگر میں ہوگی کمی — نہ چھوٹی تسلی چارہ گرو بیکار بھی ہے ناکار بھی ہے

ویراں ہے دل نہ داغ جگر ای آہ وہ پہلے تو کہیں
زنداں میں کسی وحشی کیلئے جنگل بھی ہے گلزار بھی ہے

نیت کا پھل

(بچوں کے لئے)

کہتے ہیں ایک بادشاہ ایک دن شکار کیلئے جنگل میں گیا وہاں اپنے ساتھیوں سے جدا ہو گیا لو چل رہی تھی۔ دوڑ دھوپ میں پیاس کی شدت نے بیتاب کر دیا حیران تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے اس اثنا میں دور سے ایک خیمہ دکھائی دیا بادشاہ کی جان میں جان آئی گھوڑا دوڑا کر وہاں پہنچا دیکھا تو ایک ٹوٹا سا خیمہ ہے جس میں ایک بوڑھی عورت اور اُسکی لڑکی بیٹھی ہوئی ہے ؞

بڑھیا نے بادشاہ کو دیکھا اٹھ کھڑی ہوئی دوڑ کر گھوڑے کی رکاب تھامی اور بادشاہ کو گھوڑے سے اتار کر خیمہ میں لے گئی جو کچھ موجود تھا پیش کیا بادشاہ نے کھانا کھایا ٹھنڈا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا اُس وقت بڑھیا کی پیش کردہ روٹی شیرمال اور مرغ کباب سے بڑھکر مزیدار معلوم ہوئی۔ کھانا کھا کر بادشاہ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا جاگا تو رات ہو گئی تھی۔ ناچار رات اُس خیمہ میں بسر کی شام کو ایک گائے وہاں آئی لڑکی نے دودھ دوہا بہت دودھ ملا۔ بادشاہ حیران ہوا۔ اور اپنے دل میں کہنے لگا یہ لوگ جنگل میں اس لئے رہا کرتے ہیں کہ ان کے حال سے کوئی آگاہ نہ ہو ایک گائے سے اتنا دودھ پاتے ہیں اگر مہینہ میں ایک دن کا دودھ بھی بادشاہ کو دیا کریں تو انکا نقصان بھی نہ ہو اور نہ

سپاہی سرا سے میں معقول آمدنی ہو جاتی یہاں سے واپس جا کر ان پر محصول لگاؤں گا

جب صبح ہوئی تو لڑکی نے گائے کو دُہا تھوڑا سا دودھ نکلا روتی ہوئی ماں کے پاس آئی اور کہا کہ اماں شاید ہمارے بادشاہ کی نیت بدل گئی دودھ سے برتن خالی رہی دعا کرو خدا بادشاہ کو نیکی کی ہدایت کرے بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا کہ تجھے کیونکر معلوم ہوا اُس نے کہا کہ ہر صبح میری گائے بہت دودھ دیتی تھی آج بہت ہی کم دیا۔ جب بادشاہ کی نیت خراب ہو جاتی ہے تو خدا ہر چیز سے برکت اٹھا لیتا ہے۔

بادشاہ نے کہا تو سچ کہتی ہے اور اپنے دل سے محصول کا ارادہ رد کر کے کہا کہ اب جا اور پھر گائے کو دوہ۔ لڑکی نے جا کر پھر گائے کو دُہا تو بہت دودھ ملا دوڑی ہوئی ماں کے پاس آئی اور کہا کہ خدا کا شکر ہے ہمارے بادشاہ کی نیت درست ہو گئی۔

مبارک بیگم بنت شیخ غلام محمد

نیرنگئ دل

مخاطب جب کبھی ہوتی ہے چشم یار قاتل کی
گھڑی ساعت میں ہو جاتی ہے حالت کچھ سے کچھ دل کی

یہی صورت اگر ہے اے ہوائے فصل گل تجھ میں
ہری ہو کر رہیں گی دیکھنا چوٹیں مرے دل کی

کہاں اے بیکسی مجھکو دماغ عشرت ایسی
کہ میں لطف و تماشا کی ہوس اے ہمدرد دل کی

قفس میں رہ کے حالات جس کا علم ہے اُس کو
ذرا سرو ارم دیکھا تھا سے لطف تر دل کی

یہ طرز بے سہاری چھوڑ بھی اے حسن بے پروا
وبائے متصل اک حشر ہے کم آنسا دل کی

مرا ذوق زیاں تیز مسدہ حسن طلب کا ہو
کبھی بھی کروں شاداں دل شاداں دکھی ہوئی دل کی

چلو میں نکلیں ہوا اس اندر ما میں جنوں
یہ مدت آرہی ہے کیا کسی سر سبز دل کی

ہمارا اشتیاق ہمرنگ ہے رسم یا بھی
سماں کس لو یہ رنگ دکھا سماں دل کی

اگر ہم چند ساعت کیلئے بھی جلوہ فرما ہو تو ظلمت دُور ہو جائے ہمارے خانۂ دل کی

خدا کا شکر ہے وہ بیوفا آیا نہ مایوس ہر دم آخر سہی کچھ تو شکایت مٹ گئی دل کی

میر کا ترنم رندانہ ہو گئے اب ہم کیا کریں راحت

کہاں باقی ہیں اب پہلی سی وہ رنگینیاں دل کی

محمد دوست علیخاں راحت

وادئ پونچھ سے خطاب

اے میرے بچپن کے گہوارے جوانی کے مانۂ نشاط وطن! میری دلفریب وادی! میرے نظر فریب آبشار میرے چھوٹے دریا۔ میرے شیریں شفاف چشمے چاندنی میں کھلنے والے پھول شفق شام کی رنگین بہائی میں بادِ نسیم کی اٹھکھیلیاں دامن صحرا میں برسنے والے موتی شب تار میں چمکنے والے جگنو۔ میں تیری کس کس شان رعنائی کی تعریف کروں

تیری بلند چوٹیوں پر جھلملانے تاروں میں جب نور کی پہلی شعاع اور برسات کی کہ جب اگر ظلمت میں برق شرر انگیز تڑپتے ہوئے دیکھتا ہوں تو عمر خیام کی شاعری اور شیلی شعرا کی تشبیہات دور از کار مہمل نظر آتی ہیں۔

تیرے وسیع مرغزاروں میں جب طلوع مشرق کے ساتھ ہی لالۂ خودرو مسکراتا ہے تو وادی کی ہر مخلوق پر ایک کیف انگیز سرور چھا جاتا ہے۔

موسم برسات میں تیرے بہتے ہوئے جھرنوں سے بہشتی ترنم پیدا ہوتا ہے ہلکی پھوار سبزہ افسردہ پر آب حیات چھڑکتی ہے ساون کے درخت مستانہ انداز سے جھومتے ہیں گھنے اور تاریک جنگلوں میں ہوا سرگوشیاں کرتی پھرتی ہے۔ بچے و جوان سب سرشار پرندے تیرے محبت بھرے گیت گا گا کر جھولا جھولتے ہیں۔ فرشتوں کی دعا تجھ پر آسمانی برکتیں نازل کرتی ہے

تیری شاداب وادیوں میں ہر ایک کسان لہلہاتے کھیتوں کو حریصانہ نظر سے دیکھتا ہے جو اس کا سرمایہ حیات ہیں۔ میرا جانکس مردہ زہدت دنیا کی گناہ آلودہ مسرتوں سے نا آشنا دل پھر کی خانقاہ کاوش کے بعد فکر فردا کے بعد سے بے نیاز ہو کر بے غم ہو جاتا ہے۔ تیرے خمدار راستوں میں جب ریوڑوں کا گلہ منتشر ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو بے فکر گڈریا ایک شکستہ بربط کی تانیں اڑاتا ہے۔ میں وہ خوبصورت ڈھور دیکھتا ہوں جو گوالوں کی معیت میں آزادانہ چرتے ہیں میں اُن آشیانوں کے پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ سنتا ہوں جو شام کی آمد کا پتہ دے رہے ہیں

یہ سب کچھ ہے مگر اے فردوس نظر وطن کچھ بھی نہیں!

میرے دل پر پھوڑا جلتا ہے۔ جو اب تجھے قدرتی زیوروں سے مالا مال　　لیکن تہذیب و تمدن کی رعنائیوں سے معرا دیکھتا ہوں۔ تو شاداب پھول ہے۔ مگر تجھ میں مہک نہیں نہ حسن شمیم ہے لیکن تیرا ضعیف بیری اونچی نیچی گھاٹیوں میں زندگی سے بسر کرتا ہیں لیکن انسانیت سے نا آشنا۔ تیرے کسان مفلس۔ تیرے دوکاندار شٹ پونجیے۔ تیرے نوکر پیشہ مقروض۔ تیری تہذیب اُس جہالت سے ملی ہے۔ جو کسی زمانہ میں افریقہ کے وحشیوں پر مسلط تھی۔ کیا اے میرے پیارے وطن یہ تیرا قصور ہے۔ نہیں۔ یہ میرے ہم وطنوں کا فقدان احساس ہے۔ جنہوں نے تجھے فردوس بریں سے جہنم وحشت بنا دیا۔ اے خدا کیا یہ کاشانہ تاریک کبھی منور نہ ہوگا —————— کیا لکشمی ماتا کی عنایت علم و ہنر کی برکت تہذیب و تمدن کی جھلک یہاں نظر آئے گی۔ آئے گی اور ضرور آئے گی مگر کب ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

چودھری دیال کشور



معرکۂ سخن

مطلع

اُس گل کا دل اس واسطے افسردہ ہوا ہے　بسمل　اے بادِ صبا تو نے جو منہ چوم لیا ہے
رخسار کا سایہ وہ نشانِ کفِ پا ہے　شوکت　شوخی کہے دیتی ہے ابھی کوئی گیا ہے
امید بس وصل کی تو دل سے لگی ہے　بسمل　دل ہی سے چراغ آج مرے گھر کا جلا ہے
کچھ اُس کی خبر بھی تجھے اے ماہ لقا ہے　شوکت　فرقت میں شب و روز جو مر مر کے جیا ہے
بے مثل ہے تو سارے حسینانِ جہاں میں　بسمل　آئینہ تجھے دیکھ کے حیران ہوا ہے
طالب کبھی اپنا کبھی مطلوب بنایا　شوکت　اے حسنِ ازل تجھ کو سزاوار یہ کیا ہے
بھائی غربت میں جو ہمدرد تھا میرا　بسمل　یعنی وہ دلِ زار مرا مجھ سے جدا ہے
سنتے ہیں عیادت کیلئے آتے ہیں تشریف　شوکت　لحظہ کو نہ دردِ جگر، بستر اُٹھا ہے
راحت کی تمنا ہے تو راحت کو کرو ترک　بسمل　راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے
اے درد بڑھا اور خلش لذتِ غم کی　شوکت　سائلِ دل کل سے یہی کہتا اور سوا ہے
اب دیکھئے انجام خدا جانے کہ کیا ہو　بسمل　پھر دل میں مرے درد کا آغاز ہوا ہے
اب خون رگوں میں ہے نہ دل اور جگر میں　شوکت　جو سایہ قسائی کا کہیں لطف رہا ہے
ہوتی ہے کسک کس لئے نشتر کے جگر میں　بسمل　اُس چشمِ فسوں ساز نے کیا سحر کیا ہے
کیوں ہجر میں یا سید وہ آلام کا ہونا　　دل تم کو دیا بس یہی شوکت کی خطا ہے

سید ظہیر علی صاحب بسمل
محمد اسد اللہ خاں صاحب شوکت

نوحۂ غم

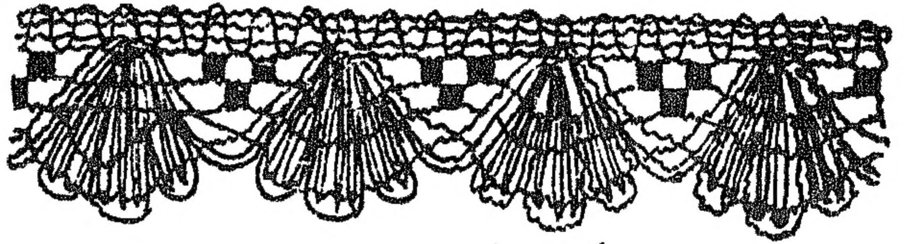
جاملاں عرش اک شخص کی قسمت دیکھنا　　اُس کی ہستی دیکھنا اور بار آفت دیکھنا
دیکھنے والو ذرا اِس کی حالت دیکھنا　　درد فرقت دیکھنا اُس کی مصیبت دیکھنا
کیا مری قسمت میں لکھا تھا یہی اے ہمنفس　　یہ غم و رنج و الم یہ درد و کلفت دیکھنا
ہوگئی میری انیسِ زندگی مجھ سے جدا　　ہائے قسمت میں لکھی تھی یہ مصیبت دیکھنا
کس قدر جانکاہ وہ منظر تھا میں بتلاؤں کیا　　پاس سے وہ اُٹھنا مجھ کو وقتِ رخصت دیکھنا
وہ سماں آنکھوں میں میری پھر رہا ہے آج تک　　اُن کا بھی بچوں کا منہ یہ حسرت دیکھنا
اُن کا یہ کہنا کہ اے سرتاج میرے غمگسار　　آسماں اِن پر نہ ڈھائے کوئی آفت دیکھنا
اور پھر کہنا کہ یہ دونوں ہیں میری یادگار　　چشمِ الفت سے ہمیشہ اِن کی حالت دیکھنا
نزع کی حالت میں بھی اولاد کا ایسا خیال　　دیکھنے والو ذرا ماں کی محبت دیکھنا
دیکھتے ہی دیکھتے یہ کہہ کے آنکھیں پھیر لیں　　میں ملوں گی تم سے اب روزِ قیامت دیکھنا

یا الٰہ العالمیں اَنْتَ مُجِیبٌ ہیں دعا
ہو نصیب اُس پارسا کو باغِ جنت دیکھنا

محمد یعقوب علیخاں صاحب نزہت

ملک دل محمد صاحب تاجر کتب مالک کتب خانہ "محمدی" کشمیری بازار لاہور سے ایک رنگین سنہری اور بہت عمدہ کیلنڈر برائے ۱۹۲۶ء ریویو وصول ہوا ہے جس کا نام "محمدی کیلنڈر" ہے۔ شروع میں دو خوبصورت گول دائروں کے اندر یا اللہ اور یا محمد لکھا ہے۔ اسکے نیچے کلمہ طیبہ اور پانچ سورہ کی لہریں ہیں درمیان میں ایک خوبصورت چاند ہے جسکے اندر سورۃ اخلاص اور کلمہ طیبہ کا طغریٰ بنایا ہے اس طغریٰ کے نیچے آیہ کریمہ درج ہے عیسوی اور ہجری دونوں قسم کی تاریخیں درج ہیں اور کیلنڈر کے دائیں بائیں حاشیوں پر اسمائے حسنیٰ لکھے گئے ہیں کاغذ بہت عمدہ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ جو صاحبان اپنے ڈرائنگ روم کمرے وغیرہ کو زیبائش دینے کے شائق ہیں میں اُن سے پُرزور سفارش کرتی ہوں کہ وہ اس کیلنڈر کو ملک صاحب موصوف سے ۸ر کا ٹکٹ بھیجکر بلا قیمت ضرور طلب فرماویں اور ملک صاحب موصوف کی کوشش کی داد دیں

زبیدہ سلطانہ اسسٹنٹ اڈیٹر



کلابتوں زری زربفت۔ کمخواب اطلس بادلہ ہمارے کارخانوں میں جرمنی استنبولی نقلی فیتے وگوٹہ ہر قسم وہر طرح کے جو سادہ بدہ ریشم دلیہ سدا اور کلابتوں وغیرہ جرمنی فرانس اور استنبول سے منگوا کر تھوک اور خوردہ فروخت ہوتے ہیں۔

لیس ہر قسم اور بنارسی فیتے ہزاروں اقسام کے ہمارے بمبئی اور سورت کے کارخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور یکمشت تمام ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور دیگر ممالک میں جاتے ہیں۔

ہماری ایک دوکان بنارس میں ہے جہاں [illegible] اور کاریگروں سے ہر قسم کا بھاری کپڑا [illegible] گودام میں ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

ہر دو دوکان پر فرمائش کی تعمیل [illegible] ہمارے قول کی تصدیق فرمائیں۔

پتہ بمبئی

عبد العلی عیسے بھائی زری والے بھنڈی بازار محلہ بمبئی

بمبئی تار کا پتہ

ستنبولی گوٹہ

پتہ بنارس

عیسے بھائی عبد العلی زری والے رانی کنواں [illegible]

بنارس تار کا پتہ۔ فینسی فٹ

(رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۳۱۵)

سُندری سہاگ

[illegible] کمپنی لمیٹڈ [illegible] کولوٹولہ [illegible] کلکتہ